سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازی گر

پیش نوشت

بازی گر ایک آشفتہ مزاج اور سمجھ جوان بابر زماں کی آپ بیتی ہے۔ جس کی دھوم مچی ہے اس کی بہت شہرت کمائی ہے اس نے۔ یہ زیب رنگ کا ایک مقبول سلسلہ ہے۔ پڑھنے والے نہایت بے قراری سے اس کا انتظار کرتے ہیں اور بہت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں مگر اس کے مصنف کا نام کبھی شائع نہیں ہوا لیکن جو قارئین شکیل عادل زادہ کے اسلوب اور طرزِ نگارش سے آشنا ہیں ان کے لیے یہ راز بھی راز نہیں رہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شکیل عادل زادہ کا طرزِ تحریر اس قدر منفرد اور یکتا ہے کہ بقول شاعر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے!

بازی گر کا اسلوب بیانیہ ہے مگر بیانیہ طرزِ اظہار جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اس میں کبھی کبھی بڑے نازک مقامات آتے ہیں۔ ایسے ہفت خواں سر کرنے پڑتے ہیں کہ جھکائی دے کر نکلنے اور علامتوں کی بیساکھی کے سہارے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں۔ اس میں رمز و کنایہ سے اس خوبی اور مہارت سے کام لینا پڑتا ہے کہ تحریر میں جھول پیدا نہ ہو۔ سلاست و روانی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ برقرار رہے۔ سچ پوچھیے تو یہ الفاظ کے برمحل استعمال ان کی نشست و برخاست ان کی تزئین اور ترتیب کا فن ہے اور اس فن میں شکیل عادل زادہ کو مہارت حاصل ہے۔ یہ مہارت انھوں نے اپنی خداداد صلاحیت، محنت اور ریاضت سے حاصل کی ہے۔

شکیل عادل زادہ نے بہت لکھا اور خوب لکھا ہے۔ بازی گر ان کے تخلیقی سفر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صرف بابر زماں کی آپ بیتی نہیں جگ بیتی بھی ہے۔ اس کے کردار معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے انسان ہیں جو اندھیرے کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور اندھیرے ہی میں پروان چڑھتے ہیں۔ یہ چور اچکے، بدمعاش اور غنڈے ہیں۔ قتل و غارت جن کا پیشہ ہے مگر اس شر میں بھی خیر کا پہلو ہے اور یہ زندگی کی ایک بنیادی حقیقت کا اظہار ہے۔ معاشرے کا کوئی بھی فرد سراپا بُرا نہیں ہوتا۔ اس کے وجود میں ایک اچھا انسان بھی چھپا ہوتا ہے اور اسی بُرائی اور اچھائی کے امتزاج سے اس کی تشکیل اور تعمیر ہوتی ہے۔ اور اسی اچھائی اور بُرائی کے تضاد سے اس کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہی تضاد کہانی میں زندگی کا رنگ بھرتا ہے۔ فن کار کا کمالِ فن یہ ہے کہ اپنے کرداروں کے اس تضاد کو برتے اور اس خوبی اور چابک دستی سے کرے کہ ان کی محبت اور نفرت ان کے دکھ درد اور خوشیاں قاری کی اپنی محبت اور نفرت اور اپنی خوشی اور غم بن جائے۔ بات یہ ہے کہ قاری جب لکھنے کے حصار میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے سحر میں صرف کھو نہیں جاتا بلکہ اپنی خوشیاں اپنی ناآسودہ خواہشات اور وہ سب کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اسے زندگی میں نہیں ملتا۔ لکھنے والا جب اپنے قارئین کے یہ مطالبات مہیا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تب ہی قبولِ عام کی سند حاصل کرتا ہے۔ بازی گر ایک ایسی ہی ادبی تخلیق ہے۔ اس میں صرف تفریحِ طبع کا سامان نہیں ہے۔ زندگی کی ہنگامہ آرائی ہے۔ ہلچل ہے اور کہانی ہے جو کبھی خون کی گردش تیز کر دیتی ہے، کبھی دل گرفتہ کر دیتی ہے اور کبھی مبہوت اور دم بخود کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں اندھیروں میں رنگوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ شکیل عادل زادہ کے فن کی خوبی یہ ہے کہ اندھیرے میں جنم لینے والوں اور اندھیرے میں رہنے والوں نے اپنے کرداروں کی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ جس طرح ان کی عادات و اطوار اور اقدار مختلف ہیں۔ اسی طرح ان کی شناخت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر ایک کا اپنا علیحدہ مزاج ہے اور اپنی نرالی کج کلاہی اور سج دھج ہے۔

بازی گر کی تعمیر و تشکیل میں کلاسیکی داستان نگاری اور جدید افسانہ نگاری کا ایسا دل آویز امتزاج ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے الف لیلہ کا سندباد جہازی، آرائشِ محفل کا حاتم طائی، فسانۂ آزاد کا آزاد اور ایسے ہی دوسرے لازوال کردار بار بار آتے ہیں مگر جس طرح یہ تمام کردار اپنی اپنی جگہ منفرد اور یکتا نظر آتے ہیں اسی طرح بازی گر کا بابر زماں بھی اپنی انفرادیت اور اپنا علیحدہ تشخص رکھتا ہے۔ وہ دلیر ہے، حوصلہ مند ہے، خوب صورت اور وجیہ ہے۔ دہشت گرد ہے، محبت بھی ٹوٹ کر کرتا ہے۔ نفرت کی آگ میں بھی جلتا ہے۔ قدم قدم پر مصائب اور ابتلا سے دوچار ہوتا اور مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ موت سے آنکھ مچولی کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ حسینوں اور مہ جبینوں کے حسن اور رعنائی سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ بازی گر ایک ایسا نظامِ شمسی ہے جس میں بابر زماں کو سورج کا مقام حاصل ہے۔ دوسرے تمام کردار اور واقعات اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ شکیل نے اس کردار کو جس محنت سے تخلیق کیا ہے اسی احتیاط اور مہارت سے اس میں توازن اور اعتدال بھی برقرار رکھا ہے۔ اپنے شگفتہ اور دل نواز طرزِ تحریر سے اسے سجایا ہے، نکھارا ہے اور سنوارا ہے۔

بازی گر شکیل عادل زادہ کی ایک مقبول اور ہر دل عزیز ادبی تخلیق ہے۔ اسے کل بھی قبولِ عام کی سند حاصل تھی آج بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی اسے یہی مقام حاصل رہے گا۔

شوکت صدیقی

۱۲ جولائی سنہ ۱۹۸۷ء

اُمنگوں حوصلوں آنسوؤں اور آہوں کی داستان

یادگار

شاید میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آتی اگر میں اُس روز گھر جانے کے بجائے خلافِ معمول ریلوے اسٹیشن نہ چلا جاتا اور کلکتے سے آنے والی ہوڑہ ایکسپریس تین ساڑھے تین گھنٹے لیٹ نہ ہوتی۔ روزانہ صبح سویرے سیر کرنا میرا معمول تھا۔ یہ عادت میں نے اپنے والد سے سیکھی تھی۔ شروع شروع میں میں اُن کے ساتھ ہی آتا تھا مگر وہ گھٹنوں کے درد کے باعث زیادہ دُور چلنے سے معذور ہو گئے تھے اس لیے میں نے تنہا سحر خیزی شروع کر دی تھی۔ کبھی اس طرف کبھی اُس طرف، میں شہر کے مختلف حصّوں میں نکل جاتا اور کوئی آٹھ بجے گھر واپس پہنچتا۔ اُس روز اسٹیشن کی رونق شباب پر تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج ہوڑہ ایکسپریس خاصی تاخیر سے آ رہی ہے۔

ریل جب کسی بڑے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر گرجتی ہوئی داخل ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے زندگی کا سوئچ آن کر دیا ہے۔ بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ خصوصاً میری عمر کے لوگوں کے لیے یہ تماشا دیدنی ہوتا ہے۔ بھاگتے ہوئے قلی، چیختے ہوئے خوانچہ فروش، گھبرائے ہوئے مسافر، آنے والے، جانے والے، بچے بوڑھے اور جوان، نئے نئے چہرے، گورے کالے، چھوٹے لمبے، موٹے پتلے۔

میں جس شہر کا ذکر کر رہا ہوں اُس کا نام گیا ہے۔ گیا، بہار کا ایک چھوٹا سا شہر ہے، اُس کی آبادی ڈھائی لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اُس کے تین اطراف پہاڑیاں ہیں اور چوتھی طرف ندی ہے۔ اس محلِ وقوع کے اعتبار سے اُسے دلکش شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مہاتما بدھ سے گیان ملنے کے بعد وہ گوتم بدھ کہلائے۔ سدھارتھ جب یہاں آئے تو یہیں کے ہو گئے۔ اس شہر کی فضاؤں میں ایک سکون سا گھلا ہوا ہے۔ گوتم بدھ نے یہیں نروان حاصل کیا اس لیے اسے لوگ گوتم کے شہر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ گوتم بدھ کے اس شہر میں بدھ مذہب کے پیرو برائے نام ہیں۔ اس کے برعکس یہاں کی آبادی ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جن دنوں یاتریوں کی آمد شروع ہوتی ہے شہر کی گہما گہمی میں ایک دم اضافہ ہو جاتا ہے۔ زندگی تیز ہو جاتی ہے۔ بازار سجنے لگتے ہیں اور بہت سے بے کار لوگ روزگار سے لگ جاتے ہیں۔ مہاتما بدھ کی سالگرہ کا یہ میلا مسلسل ایک مہینے تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں شہر کی آبادی خاصی زیادہ ہو جاتی ہے۔ شہر کی انتظامیہ کو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ رضاکار طلبہ کے دستے بن جاتے ہیں، یہ دستے آنے والے بدھ مسافروں کی مدد کرتے ہیں اور انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اسٹیشن سے سات میل دُور بدھوں کا خاص علاقہ ہے جسے بدھ گیا کہتے ہیں۔ یہ علاقہ کئی مربع میل میں پھیلا ہوا اور ایک جزیرے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں کی دُنیا قطعی مختلف ہے۔ سارے علاقے میں گوتم بدھ کے چھوٹے بڑے مندر اور پگوڈے بنے ہوئے ہیں۔ گیروے رنگ کے کپڑوں میں بدھ پجاری ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تمام مندروں کی صنّاعی دیکھنے کے لائق ہے۔ بعض مندر تو ایسے ہیں جن میں ہیرے جواہر جڑے ہوئے ہیں۔ مندروں کے اس سلسلے کا سب سے نمایاں مندر وہ ہے جس کے احاطے میں پیپل کا ایک بہت قدیم درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ نے اسی درخت

کے سامنے میں ریاضت کی تھی اور نروان حاصل کیا تھا۔ یہاں ہر طرف گوتم کی
مورتیاں ہیں اور اس ترتیب سے نصب کی گئی ہیں کہ ان سے گوتم بدھ کی پوری
زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس مندر کا کلس بُدھ گیا پہنچنے سے بہت پہلے
دکھائی دینے لگتا ہے۔ جن دنوں یہاں میلا لگتا ہے اسٹیشن تک سات میل کا
راستہ مختلف رنگوں اور نسلوں کے یاتریوں سے آباد ہو جاتا ہے۔ بعض یاتری
پیدل چل کے آتے ہیں اور اس طرح گوتم بدھ سے اپنی والہانہ عقیدت کا
اظہار کرتے ہیں۔

یہ اُس دن کا ذکر ہے جب شاکیہ مُنی کی ولادت کا جشن منایا جا رہا
تھا اور سارا شہر بدل گیا تھا۔ مجھے بھی طلبہ کے رضاکار دستے میں شامل کرنے کی
کوشش کی گئی تھی مگر میری طبیعت ذرا مختلف تھی، اس لیے میں نے اپنی
والدہ کی علالت کا بہانہ کرکے چھٹی لے لی تھی۔ ہوڑہ ایکسپریس آنے والی تھی۔
مجھے معلوم تھا کہ بہت سے طلبہ کی ڈیوٹی اسٹیشن پر لگائی گئی ہے کہ وہ یاتریوں
کی رہبری کریں۔ آج انھیں خوب مزا آیا ہوگا۔ انتظار میں ساری رات گزر گئی
ہوگی۔ اُن کا حال احوال پوچھنے اور ہوڑہ ایکسپریس سے اُترنے والے مسافروں
کا تماشا دیکھنے کے لیے میں پلیٹ فارم پر آ گیا جیسے ایک دم کسی نے پلیٹ
فارم کی زور سے چٹکی لے لی، قلیوں میں افراتفری مچ گئی۔ ہوڑہ ایکسپریس کا
سیاہ انجن تیز سیٹیاں بجاتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہو رہا تھا۔ سب طالب علم
منتشر ہو گئے۔ میں ایک جگہ چائے کے اسٹال پر دیوار کے ساتھ لگ کر اتفاقاً میں
نے دیکھا کہ سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ کے سامنے ایک بوڑھا اور اُس
کی کم سن لڑکی بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ کسی قلی کی بھی نظر اُن پر نہیں گئی۔ یہ
سیزن کا زمانہ تھا۔ قلی کم، مسافر زیادہ تھے۔ ہر شخص اپنی دُھن میں مست تھا۔
کوئی رضاکار طالب علم بھی ان کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ گو اُن کے پاس سامان
مختصر تھا لیکن بوڑھا اُسے اپنے کاندھے پر اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کم سن
لڑکی اضطراب میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اُس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہیں
ہوگی۔ میری نظریں اسی پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ بہت نازک اور حسین تھی۔ میں اُس
کی طرف کھنچتا چلا گیا اور میں نے آگے بڑھ کے اُن کا سامان اٹھا لیا۔ بوڑھے نے
ٹوٹی پھوٹی ہندی اردو میں میرا شکریہ ادا کیا۔ لڑکی کی نگاہیں ممنونیت سے
جھک گئیں۔ بوڑھا شکل سے ہمالیا کی ترائی والے علاقے کا کوئی باشندہ معلوم
ہوتا تھا لیکن لڑکی کے نقش و نگار خالص ہندوستانی تھے۔ صرف اُس کے
ماتھے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا تعلق بوڑھے کی نسل سے بھی ہو سکتا ہے،
مجھے یقین تھا کہ سکم، نیپال، تبت اور بھوٹان کے سوا اُن کا وطن کہیں اور
نہیں ہو سکتا۔

اسٹیشن سے باہر آ کے میں نے کسی نہ کسی طرح جدوجہد کرکے ایک تانگا
حاصل کیا۔ میں تانگے والے کے ساتھ بیٹھا اور وہ دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ
گئے۔ میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُس کے رخساروں پر سُرخی چھائی ہوئی تھی
ویسے اُس کا رنگ خون میں تھوڑے سے پانی، سفیدا اور پیلا رنگ ملا کے
بنایا گیا تھا۔ وہ اپنے روایتی لبادہ نما ریشمی لباس میں ایک نازک سی گڑیا معلوم
ہو رہی تھی۔ اُس کے گندھے ہوئے لمبے سیاہ بال کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اُس
کے دانت موتیوں کے بنے ہوئے تھے۔ وہ بہت شرمیلی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔
جب وہ اپنی دراز پلکوں کو جنبش دیتی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے تانگا
ہچکولے کھانے لگا ہے۔ میری عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی سولہ سترہ سال
ہوگی۔ فرسٹ ایر کا طالب علم، گھر میں ضدی، تک چڑھا اور قنوطی مشہور تھا۔
آج تک کسی لڑکی کو اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ افسانوں اور ناولوں کے قصے
مجھے جھوٹ معلوم ہوتے تھے۔ خاندان میں کئی حسین لڑکیاں تھیں مگر اُن پر نظر
ہی نہیں گئی تھی۔ اسکول میں بھی میں اپنے ساتھیوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔
اعزا سمجھتے تھے کہ یہ لڑکا خود پسند، مغرور اور بد تہذیب ہے۔ چنانچہ والد صاحب
کی توجہ بھی میری جانب کم سے کم تھی۔ مجھے زندگی ہی کچھ بے مزہ اور بے رنگ معلوم ہوتی
تھی۔ صبح اٹھیے، شام تک محنت کیجیے۔ دوسروں کی برائیاں کیجیے، رات کو سو
جائیے۔ سب کا یہی معمول تھا۔ میں جب نویں میں تھا اُسی وقت سے میں نے یہ
فیصلہ کر لیا تھا کہ میں زندگی کے اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔ میں نے میٹرک
فرسٹ کلاس پاس کیا۔ کالج نے مجھے فرسٹ ایر میں وظیفہ آفر کیا جو میرے
زمیں دار باپ کی شان کے خلاف تھا۔ انھوں نے حقارت سے اُسے مسترد
کر دیا حالانکہ زمیں داری کوئی ایسی بڑی نہیں تھی۔ بس کھاتے پیتے لوگ تھے
عزت تھی، لوگ احترام کرتے تھے، جھک کے سلام کر لیتے تھے۔ چار بہنیں،
دو چھوٹے بھائی، ایک ماں، ایک باپ۔ اگر مجھے شامل کر لیجیے تو کل تعداد
تھی۔ بہتر ہے مجھے شامل نہ کیجیے کیونکہ والد صاحب مجھے کالی بھیڑ کے نام سے
پکارتے تھے۔ پتہ نہیں وہ کیوں کہتے تھے۔ میرا قد نکلتا ہوا، رنگ نکھرا ہوا اور
چہرہ زمیں داروں کے بیٹوں کے چہروں کی طرح دلکش اور با وقار تھا۔
میں اپنے مزاج، فکر اور اطوار میں عزیزوں سے مختلف تھا۔ ضبط کی یہ
حالت تھی کہ گرمی، سردی، برسات کچھ بھی ہو میرے معمولات میں فرق نہیں آتا
تھا۔ ایک بار طے کر لیا تھا کہ صبح سیر کے لیے جایا کریں گے چنانچہ میں جاتا رہا،
والد صاحب ہار گئے۔ میں نہیں ہارا۔

بوڑھے کے ساتھ اُس لڑکی کو دیکھ کے مجھ پر عجیب احساسات
طاری ہوئے۔ جسم میں کوئی چیز تڑپنے لگی۔ جی چاہا اُسے گھر لے جاؤں اور
شیشے کی اُس الماری میں بند کر دوں جس میں چینی کے برتن رکھے ہوئے ہیں۔
صبح و شام اُسے دیکھا کروں۔ زلفوں اور رخساروں کے متعلق میں نے
صرف شعر پڑھے تھے اور وہ شعر مجھے کبھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ میں شاعروں
کو پاگل سمجھتا تھا مگر آج اُن کی اور ان کے شعروں کی حقیقت مجھ پر واضح
ہو رہی تھی۔ راستے میں بوڑھے شخص نے شفقت سے میرا نام پوچھا اور اپنا
نام بتایا۔ اُس کا نام انجین تھا۔

"اور ان کا نام؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"اُس کا نام کورا ہے۔ میری بچی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا آپ تبت سے آ رہے ہیں؟" میں نے شائستگی سے پوچھا۔

"ہم بہت دُور سے آ رہے ہیں۔" بوڑھا کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن

ہمارا تعلق ہمالیائی بستیوں ہی سے ہے۔"

"وہاں کے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، شریف، نیک، مخلص۔"

"گیا کے لوگ بھی کچھ کم اچھے نہیں ہوتے۔"

باتیں شروع ہوئیں تو ہم تمام راستے باتیں کرتے رہے۔ اُس نے
مجھ سے میری تعلیم، خاندان کے بارے میں پوچھا۔ میری شرافت کی بڑی تعریف
کی۔ بوڑھے کی ہندوستانی صاف نہیں تھی لیکن اُس کا لہجہ بھاری بھرکم تھا۔
آنکھوں میں گہرائی اور چہرے پر تدبر تھا۔ وہ کوئی معمولی شخص معلوم نہیں ہوتا
تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "آپ وہاں کیا کام کرتے ہیں؟"

"پہاڑی کیا کر سکتے ہیں؟" اُس نے مختصر جواب دیا۔

"اور یہ؟" میں نے جھجک کر پوچھا۔ "یہ پڑھتی ہیں؟"

"ہاں، کورا بہت اچھی طالبہ ہے۔"

"کورا! آپ کو یہ شہر اچھا لگ رہا ہے؟" وہ اب تک خاموش رہی تھی۔
میں نے پہلی بار ڈرتے ڈرتے اُسے مخاطب کیا۔

اُس کے چہرے کی سُرخی گہری ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں پٹ پٹا کر
شکستہ لہجے میں کہا۔ "بہت اچھا۔" اُس کی ہندوستانی بھی ٹوٹی پھوٹی تھی مگر
آواز بڑی سُریلی اور لچک دار تھی۔

"آپ ہمارے گھر آئیے نا، ہماری بہنیں ہیں، ماں ہیں۔ وہ سب
آپ سے مل کے بہت خوش ہوں گے۔"

اُس نے شرما کے نظریں جھکا لیں۔ اُس کے بجائے بوڑھے نے
جواب دیا۔ "ضرور آئیں گے۔ ہم اپنے بیٹے کے گھر ضرور آئیں گے۔"

سات میل کا یہ سفر باتوں باتوں میں کٹ گیا۔ جب ہم بدھ گیا پہنچے تو
دھوپ میں تیزی آ گئی تھی۔ مندروں کے کلس چمک رہے تھے اور ہر طرف بدھ
یاتریوں کے غول رواں دواں تھے۔ میں ان دونوں کو خیموں کی طرف
لے گیا جہاں منتظمین نے اُن کے ناموں کا اندراج کیا اور جب انھیں قیام کا اجازت
نامہ مل گیا تو انھیں اُن کے خیموں میں بسا کے میں نے اجازت چاہی۔ بوڑھا
انجین مجھ سے بہت متاثر تھا۔ وہ مجھے بار بار دعائیں دے رہا تھا۔ کہتا تھا کہ اگر
اُس کا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ آج میرے برابر ہوتا۔ وہ اپنے بچپنے میں ایک گہری وادی
میں گر گیا تھا۔ بوڑھے کے لہجے میں سکون، وقار اور دکھ شامل تھا۔ جب میں
واپس ہونے لگا تو انجین نے مجھے روک کے اپنا صندوق کھولا اور موتیوں کی ایک
مالا نکال کے زبردستی میرے گلے میں ڈال دی۔ میں نے مالا کو واپس کرنا
چاہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ چلتے چلتے انجین نے میرے گھر کا پتہ
دریافت کیا۔ پتہ بہت آسان تھا، میرا مکان محلہ کریم گنج میں تھا۔ میں نے اُسے
مکان کا نقشہ بخوبی سمجھا دیا تھا تاکہ وہ بھول نہ جائے۔ اسی لمحے کورا نے اپنی
شیریں آواز سے مجھے روک لیا۔ "آپ ادھر آئیں گے؟" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

"ضرور آئیں گے۔" میں نے چہک کر کہا۔ "لیکن آپ بھی آئیں گی۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ضرور ضرور آئیں گے۔"

واپسی میں راستے بھر میرے ذہن میں کوئی اور چیز نہیں تھی۔
میں سارا دن اُن ہی کے متعلق سوچتا رہا۔ بوڑھے انجین کی دی ہوئی مالا میں نے
جیب میں رکھ لی تھی اور کورا کا چہرہ میری آنکھوں میں محفوظ تھا۔ آج کا
دن مجھے ایک نیا دن معلوم ہو رہا تھا اور میں خود کو اجنبی اجنبی محسوس کر
رہا تھا۔ گھر آ کے میں نے والدہ کو تاخیر سے لوٹنے کی وجہ بتا دی لیکن اس
روداد کی تصدیق کے لیے میرے پاس انجین کی مالا موجود تھی۔ اُسے والد صاحب
نے دیکھا تو کسی سوچ میں پڑ گئے، پھر کہنے لگے۔ "تمھیں یہ مالا کسی صورت
میں قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ بیش قیمت موتیوں کی مالا ہے۔ مجھے حیرت
ہے کہ اُس شخص نے اتنی معمولی خدمت پر یہ تمھیں کیوں بخش دی؟"

"ہاں، اُسی نے مجھے دی ہے۔" میں نے قدرے ناراضی سے کہا۔
"میں نے تو اُسے بہت منع کیا مگر وہ مانا ہی نہیں۔ وہ ایک بہت نیک، شریف
اور مالدار شخص معلوم ہوتا ہے۔"

انھیں مجھ پر شبہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ پہلے ہی میں ان کا
سب سے مشکل بیٹا تھا۔ انھوں نے مالا کئی بار پرکھی اور کسی جوہری کی طرح اسے
نگاہوں میں تولا اور والدہ کے سپرد کی جنھوں نے احتیاط سے اپنے زیور بکس
میں اُسے منتقل کر دیا۔

دن جیسے گزرنا تھا گزر گیا۔ رات آئی تو مجھے نیند نہیں آئی۔ حالانکہ
میں جلد سو جانے کا عادی تھا۔ پوری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ کورا کا چہرہ
نظروں میں بسا ہوا تھا۔ ایسی بے چینی تھی کہ کسی کروٹ قرار نہیں تھا۔ میں نے گھڑی
دیکھی تین بج رہے تھے۔ والد صاحب بڑی نماز سے پہلے جاگتے تھے اور مجھے اُٹھا دیتے
تھے۔ اُن کے بیدار ہونے سے پہلے گھر سے باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خدا
خدا کرکے وہ گھڑی آئی، میں پہلی ہی آواز پر اٹھ بیٹھا۔ انھیں سلام کیا اور جلد
سے جلد کپڑے بدل کے گھر سے نکل گیا۔ آج اِدھر اُدھر جانے کے بجائے سیدھا رُخ
بدھ گیا کی سمت تھا۔ آدھے راستے تک میں پیدل چلتا رہا، پھر ایک تانگے میں
بیٹھ گیا۔ بدھ گیا میں میرے پہنچنے سے پہلے ہی دن نکل آیا تھا۔ ہر شخص بھاگ رہا
تھا اور شاکیہ مُنی کے قدموں میں پھول نچھاور کرکے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے
کے لیے مضطرب تھا۔ شاکیہ مُنی کو سکون بہت پسند تھا اور صبح سکون اور امن
کی علامت ہوتی ہے۔ اس سال دُنیا کے مختلف حصوں سے گوتم بدھ کے پجاری بڑی
تعداد میں یہاں آئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ انجین اس وقت اپنی بیٹی کو لے کے
ساتھ کسی مندر میں ہوگا۔ احتیاطاً میں نے خیمے میں جھانک لینا مناسب سمجھا۔
خوش قسمتی سے دونوں وہاں موجود تھے جب کہ آس پاس کے خیموں کے باسی مندروں
میں عبادت کے لیے چلے گئے تھے۔ میں نے خیمے کے باہر سے آواز لگائی۔ بوڑھا
انجین برآمد ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کے کھل اُٹھا اور میری کمر پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ "آؤ
آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ۔"

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل۔ دیکھو کورا! بابر آیا ہے۔" "میں رات ہی سے اس کا ذکر کر
رہا تھا۔" انجین نے مجھے چٹائی پر بٹھا لیا جس پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔
سامنے ہی کورا کا بستر تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ میرے پہنچتے ہی اٹھ بیٹھی۔ اس نے

"کوئی اطلاع بھی نہیں دی؟" امی خفگی سے بولیں۔

"خیال تھا جلدی واپس آ جاؤں گا۔"

"یہ تم بدھوں وغیرہ کے مجسموں میں کیوں پڑ گئے؟ ہم مسلمان ہیں بیٹا!"

"تو کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں اپنا مذہب بدلنے گیا تھا؟"

"توبہ توبہ نعوذ باللہ۔" امی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ "تو کیسی باتیں کر رہا ہے ذرا اپنے ابا کے سامنے آ کے دیکھنا وہ تیری کیسی خبر لیتے ہیں۔"

امی نے اس بار مجھے کچھ زیادہ ہی برا بھلا کہا۔ پتہ نہیں کیوں؟ یہ امی کی ناراض ہونے والی بات تو نہیں تھی۔ حیرت ہے کہ اس دن والد صاحب نے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ دوسرے کمرے میں امی کی ساری باتیں سن رہے تھے۔ میں سمجھا یہ بھی ان کے خفا ہونے کا ایک انداز ہے یا امی نے ان کا کردار بھی ادا کر دیا تھا۔ میری بہن فرح اور فہمیدہ نے امی کی ڈور کھینچی تو کہیں وہ چپ ہوئیں۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں اس دعوت کا ذکر کرتا جو میں نے بوڑھے امین اور اس کی بیٹی کورا کو دی تھی۔ میں نے بڑی بے بسی محسوس کی اپنا گھر مجھے پڑوس کے کسی گھر کی طرح لگا۔ ایک جیل خانہ جہاں میں سزا کے دن کاٹ رہا ہوں۔ مجھے بے تحاشا غصہ آ رہا تھا میں نے اسے پینے کی کوشش کی تو اور بڑھ گیا۔ اس جھنجلاہٹ میں میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت دعوت کا ذکر کر دینا چاہیے۔ منع کریں گے تو میں گھر سے نکل جاؤں گا۔ ابا، میں نے آرام کرسی پر حقہ گڑگڑاتے ہوئے انھیں کسی قدر گستاخی سے مخاطب کیا لیکن میں اپنے لہجے پر قائم نہیں رہ سکا۔ "ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"کہو۔" وہ ترشی سے بولے۔

"ابا! اگر میں یہاں کسی کی دعوت کروں تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اعتراض کیوں ہوگا؟ یہ تمھارا گھر ہے۔"

مجھے اپنے کانوں کی صحت پر شبہ ہوا۔ "ابا!" میں نے ناز اور پیار سے انھیں مخاطب کیا۔ "میں نے کل رات دو معزز آدمیوں کی دعوت کر دی ہے۔"

"کون ہیں وہ؟" ابا نے غیر متوقع نرمی سے پوچھا۔

"وہ ایک بزرگ بدھ شخص ہے جس کا نام امین ہے اور اس کی لڑکی۔ وہ لوگ بے حد شریف ہیں کل مالا انھوں نے ہی مجھے دی تھی۔" میں نے محسوس کیا جواب دینے کے بجائے والد صاحب حقہ گڑگڑانے لگے۔ "میں ان سے کہہ چکا ہوں ابا! اب میرے منہ سے نکل گیا آپ انکار کر دیں گے تو میری بےعزتی ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے تم نے جو بات کہہ دی ہے اسے پورا کیا جائے گا۔" ابا نے آہستگی سے کہا۔ "مگر آئندہ اتنی جلدی اجنبیوں کو دعوت دینے میں احتیاط برتنا پتہ نہیں کون لوگ ہیں کہاں سے آئے ہیں۔"

"بہت اچھے لوگ ہیں آپ ان سے ملیے تو سہی یہ ایسے ویسے ہوتے تو اپنے گھر میں کیوں مدعو کرتا۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا اور بوڑھے امین کی تعریفیں کرنے لگا۔

والد صاحب نے میری لاج رکھ لی تھی مجھے ان پر بہت پیار آیا۔ تمام مسئلے ایک ہی بات میں ختم ہو گئے۔ میں جس کام کو بہت مشکل سمجھتا تھا وہ اتنا آسان نکلا۔ اب میری عقل میں آیا کہ وہ تو میری محبت میں مجھ سے ناراض رہتے ہیں دل کے بہت اچھے ہیں۔ اس سے میرے سچ کی تائید بھی ہو گئی کہ میں کہیں اور نہیں اصلاً وہیں گیا تھا۔ امی، بہنوں اور بھائیوں نے بدھ اٹری کے متعلق بہت سے سوال کیے۔ میں بتاتا رہا کہ وہ کتنا عقل مند، تجربہ کار اور خوش اخلاق شخص ہے۔ میں نے اپنے گھر میں اس کا ایسا تصور قائم کر دیا کہ جب وہ آئے تو سب عزت و تکریم سے پیش آئیں۔ امی کچھ کھنچی کھنچی رہیں۔ شام تک میں نے انھیں بھی منا لیا لیکن میں غرور سے روٹھا ہوا تھا۔

دوسری رات نیند تو آئی مگر عجب عجب طرح کے خواب آتے رہے کہ میں کورا کے ساتھ پہاڑوں وادیوں کا سفر کر رہا ہوں۔ وہ میرے گھر میں بیٹھی ہے میرے ساتھ پڑھ رہی ہے۔ وہ چھوٹی مہری کا پاجامہ اور کرتا پہنے ہوئے ہے گلے میں دوپٹا بھی ہے۔

***

صبح ہوتے ہی میں سیر کو نکل گیا۔ سیدھا بدھ گیا کی طرف ہوا تاکہ ایک بار پھر تصدیق کر آؤں کہیں کورا نے میرے گھر آنے کا ذکر امین سے نہ کر دیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے نہ آئے انکار کر دے۔ اور گھر میں سب میرا خوب مذاق اڑائیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ کورا خاموش رہی ہوگی۔ میں جلد ہی گھر واپس آ گیا اور چیزیں قرینے سے رکھنے لگا۔ قد آدم شیشے کی صفائی کی۔ دیواریں جھاڑیں۔ دیوار گیریاں صاف کیں۔ فرش دھلوایا۔ بیٹھک میں چاندنی بدلی چھوٹا سا فانوس لٹکایا۔ گاؤ تکیوں کے غلاف بدلوائے۔ بہنیں بھی میرا ساتھ دیتی اور مجھے چھیڑتی رہیں۔ امی نے مختلف قسم کی لذیذ سبزیاں اور چاول پکائے۔ چٹنیاں، مربہ جات، گوشت کا کوئی سالن نہیں پکایا گیا۔ کورا کو تحفے میں دینے کے لیے امی نے سلیم شاہی جوتیاں اور کانوں کے بالے علیحدہ نکال کے رکھ لیے۔ [illegible] گھر میں مہمان آ رہا تھا۔

سر شام میں کپڑے پہن کے تانگے میں سوار ہو کے بدھ گیا کی جانب روانہ ہو گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ بدھ گیا کا جانا پہچانا راستہ آج طویل معلوم ہو رہا تھا۔ ڈر تھا کہ امین کا ارادہ نہ بدل گیا ہو۔ یہ بھی خیال آیا کہیں وہ واپس نہ چلا گیا ہو۔ دل میں ہزار اندیشے لیے میں اس کے خیمے پر پہنچا تو وہ موجود تھا اور خوش خوش نظر آ رہا تھا۔ میری جان میں جان آئی۔ رسمی سلام دعا کے بعد میں نے کہا۔ "آپ کو مکان ڈھونڈنے میں مشکل پیش آتی اس لیے میں خود ہی چلا آیا، چلیے تیار ہو جائیے۔"

"میں منتظر تھا بابر! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا تم نے بے کار تکلیف کی۔ بہرحال ابھی بیٹھو ذرا انتظار کرو پھر چلتے ہیں۔" کورا نے پہلے ہی سادہ سا لباس پہن رکھا تھا اس نے اپنا تبتی لباس اتار دیا تھا اور پاجامے ٹائپ کرتے پر ڈھیلا ڈھالا کرتا پہن رکھا تھا۔ ہلکی سی نیلی شال شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ اس لباس سے وہ اور دل کش ہو گئی تھی۔

"آپ کی بہنیں کتنی بڑی ہیں؟" پہلی بار اس نے مجھ سے سوال کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے اس نے میری بہت سی باتوں کا جواب دے دیا ہے۔ میں نے اسے اپنی تمام بہنوں کے نام بتائے اور عمریں بتائیں۔ بوڑھا بھی انہماک سے سنتا رہا۔ اندھیرا ہوتے ہی اس نے مجھ سے معذرت چاہی اور کہا کہ لباس تبدیل کرنا ہے اس لیے میں اور کورا کچھ دیر کے لیے باہر چلے جائیں۔ ہم نے اس کی درخواست کی تعمیل کی۔ جب ہم دونوں باہر آ گئے تو میں نے چپکے سے پوچھا۔ "آپ نے کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں۔" وہ چہکتی ہوئی بولی۔ "میں نے نہیں بتایا۔"

"میں بہت ڈر رہا تھا پتہ نہیں وہ کیا سمجھیں۔" یہ کہتے کہتے میں جھینپ گیا پھر بولا۔ "آپ تو اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔"

وہ لجا گئی اور کہنے لگی۔ "آپ کو اچھا لگ رہا ہے؟"

"آپ کچھ بھی پہن لیں مجھے اچھا لگے گا۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ "دیکھیے گھر والوں سے خوب گھل مل جائیے گا۔ میں نے اپنی بہنوں سے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔"

"اور میں نے بابا سے آپ کی۔"

"آپ نے بالکل غلط تعریف کی میں تو بہت برا ہوں۔"

"ہوں۔" اس کے ہونٹ [illegible] چٹکنے لگے۔

"آپ سے برسوں کی ملاقات ہوئی ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں آپ کو ایسا لگتا ہے؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"گھر جا کے بھی آپ کا خیال رہا۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

اس اثنا میں بوڑھے امین نے آواز دی۔ "اندر آ جاؤ۔" ہم دونوں اندر گئے تو وہ لباس بدل چکا تھا۔ "میں تیار ہوں۔"

اندھیرا ہو چکا تھا بوڑھے کی بغل میں کسی موٹی کتاب کے سائز میں سفید کپڑے میں لپٹا ہوا بقچہ دبا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "یہ مجھے دے دیجیے۔" اس نے شکریے سے انکار کر دیا۔ میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ ہم تانگے میں بیٹھ گئے۔ سڑکوں پر روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔ میں خوشی اور فخر کے جذبات سے سینہ پھلائے گردن اکڑائے تانگے کی اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ تانگا رکنے کی آواز سن کے والد صاحب دروازے پر آ گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے پرانے شناساؤں کی طرح بغل گیر ہوئے۔ ڈیوڑھی میں امی اور بہنوں نے کورا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ امی نے تو اسے گلے لگایا۔ کاش میں امی ہوتا۔ وہ سب چہکتی ہوئی اندر زنان خانے میں چلی گئیں اور میں، والد صاحب اور امین بیٹھک میں آ گئے۔ چاندنی کے اوپر درمیان میں قالین بچھا ہوا تھا۔ امین کو عزت کے ساتھ وہاں بٹھا دیا گیا۔ "آپ نے میری عزت بڑھائی۔" والد صاحب نے خالص مذہبی دلنواز لہجے میں کہا۔ یہ لہجہ وہ اس وقت اختیار کرتے تھے جب گھر میں کوئی معزز مہمان آتا تھا۔

امین میرے کردار اور اخلاق کی تعریف کرنے لگا۔ "اس بچے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔"

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" والد صاحب نے اپنی انداز میں پوچھا۔ "بابر نے تو بس آپ کی تعریفیں کیں کچھ بتایا نہیں۔"

"جناب یوں تو کہانی بڑی لمبی ہے کسی وقت فرصت میں سناؤں گا۔ تبت سے چلے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ چند برس پہلے بدھ گیا چلا گیا اب وہیں سے آ رہا ہوں۔ تبت میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ آپ بھی زمیندار ہیں۔ خوب!" والد صاحب نے ہنس کر کہا۔ "اپنا بھی ایک زمانے سے یہی پیشہ ہے۔"

دونوں بزرگوں میں جلد ہی مغائرت ختم ہو گئی اور وہ دنیا جہان کی باتیں کرنے لگے۔ والد صاحب اپنے بچوں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ پرانی یادیں، تجربے اور غیر معمولی واقعات سنانے لگے۔ ایسا سامع آج کہاں دستیاب ہوتا۔ میری بڑی بہن فہمیدہ نے آواز دے کے مجھے بلایا۔ میں صحن میں گیا تو وہ کہنے لگی۔ "بابر! یہ تو بہت پیاری ہے۔ بہت پیاری پیاری باتیں کر رہی ہے گڑیا سی لگتی ہے اگر یہ مسلمان ہوتی تو ہم اسے گھر سے نہ جانے دیتے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتے۔ اب سمجھ میں آیا کہ کل تم کہاں غائب تھے۔ اچھا یہ بات ہے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے مصنوعی ناگواری سے پوچھا۔

"ہم سب سمجھتے ہیں جناب؟ تم ادھر کیوں نہیں آتے؟" وہ شوخی کرنے لگی اور مجھے کھینچتی ہوئی اندر کمرے میں لے گئی جہاں کورا میری دوسری بہنوں اور بھابیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ انھوں نے اتنی جلدی دوستی کر لی تھی کہ اسے چوڑیاں تک پہنا دی تھیں۔ وہ ابھی تک اس کے نازک نازک ہاتھوں، اس کے رنگ، زلفوں، ہونٹوں اور دمکتے ہوئے رخساروں سے مسحور تھیں۔ گو میری بہنیں بھی خوب صورتی میں کسی سے کم نہیں تھیں لیکن کورا کے آگے ان کے چہرے گہنا گئے تھے۔

"بھائی جان! ہم انھیں اب جانے نہیں دیں گے۔ آج یہ کچھ دن ہمارے گھر رہیں۔" میری چھوٹی بہن فرح کہنے لگی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں بھی جھینپا جھینپا سا تھا۔ "امی سے کہو یا پھر امین صاحب سے۔"

"آپ جائیں گی تو نہیں؟" میرے چھوٹے بھائی جہانگیر نے معصومیت سے پوچھا۔

کورا کو جواب دینے میں مشکل پیش آئی۔ "نہیں۔" اس نے جہانگیر کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

جہانگیر اور فرح امین کے پاس پہنچ گئے اور ضد کرنے لگے کہ وہ کورا جی کو آج رات جانے نہیں دیں گے۔ والد صاحب نے انھیں سمجھایا کہ پھر آئیں گے۔ امین نے فرح اور جہانگیر کو گود میں بٹھایا اور ان سے وعدے کرنے لگا کہ ہم لوگ دوبارہ آئیں گے۔

میں گھر میں ادھر ادھر تھرکتا پھر رہا تھا۔ کبھی اس طرف کبھی اس طرف۔ امی نے ایک پرتکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ رات کے دس بجے تک

وہ دونوں موجود ہے۔ کورا کو یہاں لا کے احساس ہوا کہ میں اُسے اپنے لیے کہاں لایا تھا' اتنے لوگوں کی موجودگی میں اُس سے کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی پھر بھی دل مطمئن تھا۔ بوڑھے امین نے چلتے وقت امّی کے لیے قدیم طرز کا ایک قیمتی نگ بند دیا۔ والد صاحب کے شدید انکار کے باوجود بھی وہ نہیں مانا' اپنا بقچہ جس طرح وہ دبا کے آیا تھا' اُسی طرح واپس لے کے گیا جب کہ میرا خیال تھا کہ اُس میں کوئی تحفہ ہوگا جو وہ گھر جا کے والد صاحب کے حوالے کر دے گا۔ اُس میں ضرور کوئی ایسی قیمتی چیز تھی جو وہ خیمے میں بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چلا گیا لیکن دوبارہ آنے کا وعدہ بھی کرتا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد گھر میں اُس کی اور کورا ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے خوشی تھی کہ والد صاحب نے اُس کی ذہانت اور شرافت کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ وہ پہلی بار کھل کے اُس کی اعلیٰ نسبی اور سماجی حسنِ سلوک کا تذکرہ کرتے تھے۔ اب جب وہ اُس کی تعریف کرتے تو مجھے لگتا تھا۔ جیسے وہ میری صفات بیان کر رہے ہوں۔

★

پھر تو اپنا یہ عالم ہوا کہ نیند بھی اُچاٹ ہو گئی۔ کتابوں میں جی نہیں لگتا تھا' کتابیں کیا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ دوسرے دن بھی میں ایک دوست کے گھر کا بہانہ کر کے بدھ گیا پہنچ گیا۔ بوڑھا امین گھر کی خیریت پوچھنے لگا۔ کورا نے نام لے لے کے تمام گھر والوں کا بہن بھائیوں کا حال احوال پوچھا۔ اُس کے کان میں وہی بالیاں لٹک رہی تھیں جو امّی نے کل رات اُسے دی تھیں۔ چوڑیاں بھی وہ پہنے ہوئے تھی چُنری کا بھی اُس نے سر پہ ڈال رکھی تھی۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا کہ کسی نہ کسی وقت موقع نکال کے بدھ گیا پہنچ جاتا۔ میلا شباب پر تھا۔ بدھ گیا کی رونق میں پہلے سے کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ پھر ایک رات کورا کے ساتھ والد صاحب سے ملنے آیا اور رات گئے واپس گیا۔ گو کہ ایک ہفتے میں کئی بار میں نے کوشش کی تھی کہ کورا سے تنہائی میں ملاقات ہو جائے مگر مجھے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ بوڑھا بدھ گیا میں شاید خیمے میں رہنے کے لیے آیا تھا۔ وہ بہت کم باہر نکلتا۔ دن بھر اپنے خیمے میں پڑا رہتا اور باہر جاتا بھی تو جلد واپس آ جاتا۔ پہلے والا تکلّف ختم ہو گیا تھا اور اب ہم دونوں ایک دوسرے سے نام لے کے مخاطب ہوتے تھے۔

تین دن مجھے ایسا موقع مل گیا جب امین اپنی کسی ضرورت کے تحت شہر گیا تھا۔ کوئی بہت ہی اہم ضرورت ہوگی۔ خیمے کے اوپر پردہ پڑا ہوا تھا۔ احتیاطاً میں نے اندر جھانک لینا مناسب سمجھا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہاں تنہا کورا موجود تھی۔ اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ "بابا کہاں ہیں؟" میں نے ناقابلِ یقین لہجے میں پوچھا جیسے امین وہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو۔

"وہ کسی کام سے شہر گئے ہیں' دیر سے آئیں گے۔" کورا نے سادگی سے جواب دیا۔

"تم کیا کھاؤ گے؟ باہر جانے سے پہلے بابا مجھے کہہ گئے تھے" میں نے "ابھی تک نہیں کھایا ہے۔"

"ہاں۔ بشرطیکہ تم ساتھ کھاؤ۔" اُس نے چٹائی کا بنا ہوا دسترخوان بچھایا۔ چٹائی پر سبزیاں اور ملکی چٹنیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کے کھاتے رہے۔ "میں ایک ہفتے سے یہ کوشش کر رہا تھا کہ تم سے تنہائی میں ملاقات ہو جائے۔"

"میں بھی۔"

"سچ؟" میں نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"کورا جب تم چلی جاؤ گی تو بہت اُداسی ہو جائے گی۔"

"ہم لوگ جانے ہی والے ہیں۔"

"کب؟" میرے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔

"بابا کہہ رہے تھے اب تین چار دن میں ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ اُداسی سے بولی۔

"تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔" میں نے شکایت کی۔

"کیا بتاؤں۔" وہ دکھ سے بولی۔

"تمہارے بابا بھی......" میں کہنا چاہتا تھا کہ عجیب پُراسرار شخص ہیں۔ دن بھر خیمے میں گھُسا رہتا ہے حالانکہ اتنی دور سے یہاں آیا ہے۔

"وہ میرے بابا نہیں ہیں۔"

"کیا؟" میرا لقمہ حلق میں اٹک گیا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ......"

"میں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ میرے بابا ہی ہیں لیکن میرے باپ نہیں ہیں۔" اُس کی آنکھوں میں اچانک آنسو لرزنے لگے۔

"کیا بات ہے؟ مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"میرا باپ مارا گیا۔" اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "وہ تبّت کے ایک قبیلے کا سردار تھا۔ میرے چچا نے اُسے مار دیا۔ بابا امین میرے باپ کا دوست بھی تھا اور مجھے پڑھاتا بھی تھا۔ جب ہمارا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تو وہ مجھے لے کے ہندوستان چلا آیا۔"

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ بوڑھے امین کے کسی طرزِ عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کورا کا باپ نہیں ہے۔ "تو کیا تم اب یہیں رہو گی ہندوستان میں؟"

"مجھے نہیں معلوم وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹکتے۔ شہر شہر گھومتے رہتے ہیں۔" کورا نے معصومیت سے کہا۔

"ایسا کیوں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا صرف آنسو تھے۔ اُس نے خوب آنسو بہائے۔ میں اُسے دلاسا دیتا رہا۔ سمجھاتا رہا حالانکہ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "وہ کسی ایک جگہ قیام کیوں نہیں کرتا؟" میرا ذہن اُلجھ گیا۔ ابھی میں اسی گتھی میں اُلجھا ہوا تھا کہ غیر متوقع طور پر بوڑھا امین وحشت زدہ انداز سے

خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کی بغل میں وہی بقچہ دبا ہوا تھا اور اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ "کوئی مجھے پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا؟" اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" کورا نے اور میں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"تھوڑی دیر ہوئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" اُس نے کورا سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں یہ کہہ رہی تھیں تم تین چار دن میں جا رہے ہیں۔ میں نے نفیسہ اور فرخ وغیرہ کا ذکر کر دیا تو رونے لگیں۔"

امین مسکرانے لگا اور فرش پہ بیٹھ گیا۔ "آپ شہر نہیں گئے بابا؟" کورا نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں درمیان سے لوٹ آیا' پیسے تو میں بھول گیا تھا۔"

"تو آپ نے گھر جا کے آپا سے لے لیے ہوتے۔"

"ارے نہیں نہیں بابا یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔"

"آپ تو غیریت برتتے ہیں' وہ آپ ہی کا گھر ہے۔"

"تم بہت اچھے لڑکے ہو' بہت یاد آؤ گے۔"

"آپ میلے تک تو ٹھہرتے' اتنی بھی کیا جلدی ہے؟"

بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ "بابا! میں ضرور ٹھہرتا مگر مجھے جلدی یہاں سے جانا ہوگا۔ شاید ہم آج کل ہی چلے جائیں۔"

"کیوں؟ کورا تو بتا رہی تھیں کہ آپ تین چار دن اور رہیں گے۔ میں آپ سے کہنے والا تھا کہ ان دنوں کے لیے آپ انھیں ہمارے ہاں رہنے دیجیے۔ بہنوں نے بہت اصرار کیا ہے۔"

"ہم پھر آئیں گے بابا! پھر آئیں گے۔" وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔ "اب تو گیا میں بھی ہمارا ایک گھر ہے۔"

"نہیں نہیں ہم آپ کو ابھی نہیں جانے دیں گے۔"

"اچھا دیکھو۔ کل بتائیں گے۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے ٹال رہا ہے لیکن میں اُسے کیسے روک سکتا تھا۔ اُسے ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ بوڑھے نے صندوق سے چند کاغذات نکال کے انھیں غور سے دیکھنا شروع کر دیا تھا اور مجھ سے کچھ بے نیازی اختیار کر لی تھی۔ میں نے کورا کو اشارہ کیا اور امین کی دعا لیتا ہوا چلا آیا۔ سات میل کا یہ سفر میں نے پیدل ہی طے کیا۔ تنہا تنہا' اُداس اُداس۔ نہ جانے گھر کیسے پہنچا۔ جاتے ہی میں بستر پہ گر گیا۔ امّی لاکھ چیختی چلاتی رہیں۔ پھر انھوں نے آ کے میرا ہاتھ دیکھا۔ میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور جسم گرم تھا۔ "وہیں گیا ہوگا بدھ گیا۔ نہ جانے کہاں کہاں کے لوگ روگ لگ کے وہاں آتے ہوں گے۔ باہر یہ بیماری وہیں سے لایا ہے۔"

امّی سچ کہتی تھیں۔ میرا تو جسم ٹوٹ رہا تھا اور بدھ گیا ہی سے مجھے یہ روگ لگا تھا۔ میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ اوپر کے کمرے میں پڑا رہا۔ جانے کیا سوچتا تھا۔ بہنیں آئیں' بھائی آئے' ابّا آئے۔ میں اُٹھ کے نہیں گیا۔

کوئی ایک بجے رات کو زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز آنے لگیں۔ میں جاگ رہا تھا۔ اس بے وقت دستک پہ حیران رہ گیا۔ پھر نیچے آ کے صحن میں پہنچا۔ ابّا اور امّی بھی جاگ گئے تھے۔ "آخر اتنی رات گئے کون یہاں آ سکتا ہے؟" کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کون ہو سکتا ہے؟ میں آہستہ آہستہ دروازے پر پہنچا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا' سکتے میں رہ گیا۔ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں' اُس کا خیال تھا۔ وہی سامنے کھڑی تھی کورا' کسی ہرن کی طرح سہمی ہوئی دروازے پہ کھڑی تھی اور اُس کی بغل میں گٹھری دبی ہوئی تھی۔ مجھے دروازے پہ دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف لپکی۔ چونکہ والد صاحب بھی پیچھے آ گئے تھے اس لیے میں ایک طرف ہو گیا۔ "تم؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "خیریت تو ہے؟" وہ ڈیوڑھی میں بار بار مڑ کے گلی میں جھانکنے لگی۔

"اندر آ جاؤ۔" والد صاحب نے تذبذب کے لہجے میں کہا۔

"امین صاحب کہاں ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"بتاتی ہوں۔" اُس نے بدحال آواز میں کہا اور گرتی پڑتی اندر گھر میں آ گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ روشنی میں آئی اب اُس کی طرف تکنے لگے۔ اُس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں وحشت بسی ہوئی تھی اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ بال گرد میں اور جسم ننگے پاؤں مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ گھر میں آتے ہی وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے محسوس کیا کہ امّی اور ابّا کے چہرے کچھ کیا ہو گئے تھے لیکن ان کا انداز تو جارحانہ تھا۔ "کیا ہوا بیٹی؟ تم اتنی رات یہاں اکیلی کیسے آ گئیں؟ امین صاحب کہاں ہیں؟" ابّا نے بھاری سی آواز میں پوچھا۔

وہ ہچکیاں لینے لگی۔ "انھیں مار دیا گیا ہوگا۔"

"مار دیا گیا ہوگا؟" ابّا نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ خیمے میں ایک آدمی گھُس آیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چھُرا تھا۔ وہ بابا پر چڑھ گیا اور بابا نے مجھ سے کہا کہ بیٹی بھاگ جاؤ' بھاگ جاؤ۔ میں نے جلدی سے یہ سامان سمیٹا اور وہاں سے چلی آئی۔

میں بہت دُور تک بھاگتی رہی۔ پھر مجھے ایک تانگے والا مل گیا۔ میں نے اُسے بہت دُور چھوڑ دیا تاکہ وہ یہ گھر نہ دیکھ سکے۔ پھر میں چھپتی چھپاتی یہاں آ گئی۔ میرا کوئی گھر بھی نہیں ہے۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

امّی کو چاہیے تھا کہ وہ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتیں اور اُسے سینے سے لگا کے کہتیں' یہ تمہارا گھر ہے مگر امّی اور ابّا بُت بنے کھڑے رہے۔ "تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ امین صاحب مارے گئے؟" ابّا نے کسی پولیس والے کے لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"اُس کے ہاتھ میں چھُرا تھا۔ بابا خالی ہاتھ تھے اور کمزور تھے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ زہریلا چھُرا ہوگا۔ وہ تبّت ہی کا کوئی آدمی تھا۔ جب بابا نے مجھ سے یہ کہا کہ میں بھاگ جاؤں اور اپنے دوست کے پاس چلی جاؤں تو وہ

میری طرف بھیجا لیکن بابا نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ میں خیمے سے نکل کے اندھیرے میں کھڑی ہو گئی اور راستہ چل کے سڑک کے کنارے بھاگتی رہی پھر مجھے تانگا مل گیا۔"

"ممکن ہے وہ زندہ ہوں۔"

"بیٹا کیسے جا ہیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

ابا خاموش گم صم سے ہو گئے پھر چونک کے بولے۔ "تمھیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"مگر امین صاحب تو بہت شریف آدمی ہیں اُن کے ایسے دشمن کیسے ہو گئے؟ وہ تو بہت ...." ابا اُلجھتے ہوئے بولے۔

"ہم شہروں شہروں بھاگتے پھر رہے تھے، آخر اس نے ہمیں پکڑ لیا۔ وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔"

"کون بھاگتے پھر رہے تھے؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟" والد صاحب نے تشویش سے پوچھا۔ "پھر وہ یہاں بھی تو آ سکتے ہیں۔"

"آپ نہیں جانتے وہ بہت بڑے ہیں، پتہ نہیں وہ کیوں بابا کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، ویسے یہاں اُن کا آنا مشکل ہے کیونکہ بابا نے کسی سے آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا کہ ابا ایک معصوم لڑکی سے کیسے سوالات کر رہے ہیں۔ انھیں ایسے وقت تو خاموش رہنا چاہیے تھا مگر ابا بہت عجیب آدمی تھے۔ "اس میں کیا ہے؟"

"اس میں ہیرے جواہر اور کچھ کاغذات ہیں۔" کرن نے کہا۔

"ہیرے جواہر؟" والد صاحب نے اس سے چھوٹی سی گٹھری لے کے ... "کیا... یہ تو خاصی بھاری ہے۔" پھر وہ اس کی اجازت کے بغیر گٹھری کھولنے لگے۔ کاغذات میں ... زبان میں آڑی ترچھی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ وہ کاغذات ایک ... کے موٹے کاغذ میں لپٹے ہوئے تھے۔ گٹھری میں وہ بقچہ بھی رکھا ہوا تھا جو امین اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ ابا نے بقچہ کھول کے دیکھا تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ روشنی میں جواہر جگ مگ کر رہے تھے۔ میں نے ابا اور امی کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہروں کے رنگ بار بار بدل رہے تھے، کبھی سُرخی، کبھی زردی، کبھی سفیدی۔ ابا نے انھیں خاموشی سے گٹھری میں باندھ دیا۔ "یہ تو بہت قیمتی ہیرے جواہر معلوم ہوتے ہیں۔ تمھاری اور ان کی حفاظت دونوں مشکل کام ہیں۔ بہرحال اب تم آ گئی ہو تو اللہ مالک ہے، دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔" وہ لمبی سانس کھینچ کے بولے اور امی سے مخاطب ہوئے۔ "انھیں حفاظت سے رکھ دو۔"

امی نے گٹھری ہاتھوں میں لینے سے انکار کیا۔ ابا نے انھیں گھور کے دیکھا۔ وہ سہم گئیں اور جھجکتے ہوئے انھوں نے اُسے اُٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئیں۔ فہمیدہ بھی اُٹھ گئی تھی۔ ابا نے اُسے حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے کرن کو پہنائے اور صبح اُسے اُوپر والے کمرے تک محدود رکھے تاکہ محلے والوں کی نظر اُس پہ نہ پڑ سکے۔ ہمارے محلے کے مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، بعض کا تو چھتوں چھتوں راستہ تھا۔ اوپر کے کمرے میں عموماً میں رہتا تھا۔ وہاں ایک پلنگ تھا اور میز کرسی موجود تھی، ایک الماری میں میری نصاب کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ فہمیدہ بھی سہمی ہوئی تھی، سب ہی خاموش اور گم صم سے تھے۔ کرن کو فہمیدہ نے اپنا لباس پہنا دیا۔ صرف فہمیدہ ہی ایسی تھی جس نے اُس کے آنسو پونچھے اور میں نے ابا اور امی کے سامنے تسلی اور تشفی کے بہت سے جملے ادا کیے۔

فہمیدہ اُسے لے کے اوپر کے کمرے میں چلی گئی اور میں نیچے آ گیا۔ نیچے ابا کرن کی عدم موجودگی میں آزادی سے تبصرہ کر سکتے تھے۔ "بابر!" انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔ "اس لڑکی کا انتظام جلد سے جلد کہیں اور کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ معاملہ اُلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے یہ یہاں سے چلی جائے ورنہ ہم کسی بڑی مصیبت میں گھر سکتے ہیں۔ اب تک زندگی میں جو عزت اور مرتبہ حاصل کیا ہے وہ سب خاک میں مل جائے گا۔ ہم اسے کہاں کہاں تک چھپائیں گے جب کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ پولیس اسے ضرور ڈھونڈ رہی ہوگی۔ وہ یہاں بھی آ سکتی ہے۔"

"مگر ابا وہ ہماری پناہ میں آئی ہے۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ہمیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اُس کے ساتھ قیمتی زیورات ہیں اور نہ جانے کس قسم کے کاغذات ہیں۔"

"ابا وہ سیدھی سادی معصوم لڑکی ہے، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"اس کی عمر ہی کیا ہے۔" امی نے بڑا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اس کی ہمت تو دیکھو، سات میل کا سفر تن تنہا طے کرتی ہوئی آ دھمکی۔"

"زندگی بچانے کے لیے آدمی سات میل تو کیا ستر ہزار میل بھی جا سکتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"فہمی کی ماں! کیا تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں ہو سکتیں؟ ہمیں پہلے سے کوئی فیصلہ کرنا چاہیے اور فیصلہ کرنے کے لیے جذبات کی نہیں، سکون کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے یہ بچی کا محض گمان ہو کہ امین کو کچھ ہو گیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ امین زندہ ہو؟ یا اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ... محدود رکھنے چاہئیں ورنہ آدمی خواہ مخواہ پریشان ہو جاتا ہے۔"

"ابا! صبح تک ہم انتظار کیوں نہ کریں؟ اُس وقت تک کرن کی حالت بھی سنبھل جائے گی اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ امین صاحب زندہ ہیں یا..."

میں نے اپنی زبان قابو میں کی۔

"نہیں وہ مر گئے۔ ٹھیک ہے صبح تک دیکھے لیتے ہیں مگر ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا۔" ابا یہ کہہ کے خاموش ہو گئے۔

میں اُن کے برابر ہی لیٹا ہوا تھا۔ آج وہ کرن میرے گھر میں تھی جسے گھر میں لانے کے لیے میں نے صرف چند روز میں کتنے خواب دیکھ لیے تھے ... انھیں ... کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ ایک منزل اوپر تھی، بہت ہی قریب مگر ... تو وہ اُس دن سے تھی جب میں نے اُسے اسٹیشن پہ دیکھا تھا۔ امین مجھے ... ہی کوئی غیر معمولی شخص معلوم ہوتا تھا۔ کرن کے بیان سے اس کی تصدیق ...

گئی تھی۔ وہ مارا گیا اور کرن اکیلی رہ گئی۔ اب کرن کا کیا ہوگا؟ اگر والد صاحب نے انکار کر دیا تو؟ اگر پولیس نے تفتیش کی تو؟ ابا کبھی یہ بات گوارا نہیں کریں گے۔ یہ گھر میرا ہے مگر یہ گھر تو ابا کا ہی ہے اور انھی کا ہے، میرا کیا ہے۔ کرن کے آنے سے اچانک جو خوشی ہوئی تھی وہ چند ہی لمحے باقی رہی، اب تفکرات نے ذہن پر قبضہ کر لیا تھا۔ اوپر کرن بھی نہیں سوئی۔ ابا بھی ساری رات کھنکارتے رہے اور میری نیندیں تو پہلے ہی اُچاٹ ہو چکی تھیں۔

ابا صبح نماز کے لیے اُٹھے تو انھوں نے مجھے جگا کے تاکید کی کہ میں بدھ گیا کی طرف نہ جاؤں۔ میں نے حامی بھر لی اور حسبِ معمول سیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ سیر کا تو نام ہے۔ جب سے کرن کو دیکھا تھا صبح کی خوب صورتی، تر و تازگی اداس اداس نظر آنے لگی تھی۔ کرن بھی ایک صبح تھی، صبح کی طرح ... صبح کی طرح ... کی طرح جھلملاتی ہوئی، ہرن کی طرح خوش گوار، پھولوں کی طرح دل کش۔ والد صاحب کی تاکید کے باوجود میرے قدم خود بہ خود بدھ گیا کی طرف اُٹھ گئے۔ میرا ارادہ امین کے خیمے میں جانے کا نہیں تھا، صرف حقیقتِ حال جاننے کا ارادہ تھا۔ بدھ گیا کی رونق کا وہی عالم تھا۔ کہیں بھی کسی قسم کی تشویش کے آثار نہیں تھے۔ میں نے دور سے دیکھا امین کے خیمے پہ پردہ پڑا ہوا تھا۔ کیا امین اندر موجود ہے؟ میں وہاں جاتے جاتے رہ گیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو گھر ضرور آتا۔ پھر کیا قاتل اسے مار کے فرار ہو گیا اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ اندر مُردہ پڑا ہے؟ مرنے سے پہلے اس کی چیخیں گونجی ہوں گی اور قریب کے خیموں کے لوگ جاگ گئے ہوں گے۔ موت کے وقت تو آدمی کو ضرور چیخنا چاہیے۔

مجھے اپنے چند طالب علم ساتھی مل گئے۔ اچھا ہوا کہ میں نے کسی سے کرن کا ذکر نہیں کیا تھا ورنہ وہ مجھ سے میرے مہمانوں کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ انھیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ امین کے خیمے پہ سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں بدھ گیا سے جلد ہی واپس آ گیا تاکہ والد صاحب کو شبہ نہ ہو جائے۔ گھر پہ ابا اور امی کے چہروں پہ ابھی تک تکدر تھا اور اس میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو مجرم سا سمجھا۔ میرے پہنچتے ہی وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔ "کچھ پتہ چلا؟"

"کیسے پتہ چلتا؟" میں نے ٹکا سا جواب دیا۔

"تو پھر وہ مر ہی گیا۔" ابا افسردگی سے بولے۔ "اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک کرن کی خبر لینے ضرور آتا۔"

"ممکن ہے کوئی اور مجبوری ہو۔"

"تم اس کا بند و بست کرو، بھئی مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" ابا ایسی اجنبیت سے بولے جیسے میرا اُن کا کوئی رشتہ نہ ہو۔

"آپ ہی بتائیے کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے ہمیں پولیس میں بتا دینا چاہیے یا مندر کے پروہت یا بدھ گیا کے منتظم کو صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔" ابا بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔

"ابھی سے کسی کو کیسے مطلع کریں؟ ہم کچھ انتظار بھی تو کر سکتے ہیں۔ معاملات بگڑ سکتے ہیں۔" ابا نے متوحش ہو کے کہا۔

"کرن پولیس وغیرہ کا سامنا کس طرح کرے گی؟ ایک ایسی لڑکی جس کا کوئی سہارا نہیں ہے، اُسے ہم پولیس کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ تو ویسے ہی مر جائے گی۔" میں نے تندی سے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ ایک طرف اس لڑکی کا سوال ہے، دوسری طرف اپنی عزت کا۔ اس لڑکی نے تو اچھی خاصی زندگی حرام کر دی اور اس کے ذمے دار تم ہو، صرف تم۔" وہ غصے سے بولے۔

میں نے سوچا کہ ابا کی باتوں کا کیا جواب دوں؟ اُن کی نظر میں گھر کی عزت، خاندان اور برادری یہی سب کچھ ہے۔ میں کرن کی خیر خبر پوچھنے اُوپر چلا گیا۔ فہمیدہ اور دوسری بہنوں کے چہرے بہت تاباں نظر آ رہے تھے۔ وہ اُسے گڑیا کی طرح درمیان میں لیے ... بیٹھی تھیں۔ مجھے آتے ہی کرن بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی مگر ... کا خیال کر کے پھر سے بیٹھ گئی۔ "یہ تمھارا ہی گھر ہے کرن! تمھیں گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ کسی چیز کی تکلیف تو نہیں ہے؟" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"یہ ہم سے بول نہیں رہیں۔" فرخ نے شکایت کی۔

"ہاں ہم سے ناراض ہیں۔" جہاں گیر نے تُتلا کے کہا۔

"نہیں نہیں ان کی طبیعت خراب ہے۔" میں نے اُنھیں ڈانٹ کر کہا۔ "تم لوگ انھیں پریشان کر رہے ہو گے؟"

کرن نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔ "بہت شریر ہے۔"

اِدھر اُس کی پریشانی کا یہ عالم تھا، اُدھر ابا پر خفقانی دورے پڑ رہے تھے۔ شام تک وہ متعدد مرتبہ مجھے بُرا بھلا کہتے اور ... ظاہر کرتے رہے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ممکن ہے کرن ہی اپنے باپ کو قتل کرا آئی ہو اور امین اُس کا باپ نہ ہو۔

میں نے تائید نہیں کی کہ واقعی امین اُس کا باپ نہیں تھا مگر کیا وہ قتل کر سکتی ہے؟ ابا کو کیا ہو گیا تھا، انھوں نے میری زندگی عذاب میں مبتلا کر دی۔ شام کو میں ایک بار پھر بدھ گیا گیا۔ وہاں تو میلا لگا ہوا تھا، کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ابا کے تلخ اور ترش جملوں میں ایک رات اور گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر کو میرے ایک کلاس فیلو ہری شنکر نے مجھے بتایا کہ ... کے ایک خیمے میں ایک شخص قتل کر دیا گیا ہے۔ ہری شنکر بدھ گیا ہی سے آ رہا تھا۔ تفصیل پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ امین ہی تھا۔ ہری شنکر کے بیان کے مطابق خیمے کے اردگرد پولیس لگی ہوئی تھی۔ یاتریوں میں دہشت پھیلنے کے خیال سے یہ واقعہ چھپانے کی بڑی کوشش کی گئی تھی پھر بھی بہت سے لوگوں کو معلوم ہو ہی گیا۔ "لوگ کہتے ہیں اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی، لڑکی غائب ہے۔" ہری شنکر نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

میں نے چاہا کہ یہ اطلاع والد صاحب کو جا کے دے دوں لیکن پھر ان کا کیا حال ہوگا؟ وہ اور گھبرا جائیں گے۔ گھر جاتے ہی مجھے امی کی احتیاطی تدابیر ...

سنتی پڑیں۔" میں کہتی ہوں بابا یہ لڑکی کب تک ہمارے گھر میں رہے گی؟ تمھیں کچھ پتہ نہیں تمھاری جوان بہنیں بھی ہیں اس کا اتا پتہ پوچھ کے اسے کہیں چھوڑ آؤ۔"

"چھوڑ آؤں گا، چھوڑ آؤں گا۔" میں نے غصے میں کہا۔

ایک دن، دو دن، تین دن، چوتھے دن تو ابا نے الٹی میٹم دے دیا۔ انھیں کہیں سے معلوم ہوگیا تھا کہ انجین کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اور اب صرف فہمیدہ کو بھیجا جاتا تھا۔ گورا کو ویسے بھی کمرے میں بند رکھا گیا تھا، پڑوس والوں کی عورتیں آتیں تو فہمیدہ کو آواز دے کے بلا لیا جاتا۔ گھر میں ایک دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی تک مجھے گورا سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج رات ضرور اس سے ملاقات کروں گا لیکن وہاں فہمیدہ موجود ہوگی۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے ابا سے کہا، "آپ اس سے یہ کیوں نہ پوچھیں کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کا پتہ بتائے تاکہ انھیں مطلع کیا جا سکے۔"

"یہ بات تو میں خود پوچھ چکا ہوں مگر وہ تو کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتی، بس رونے لگتی ہے۔"

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے فہمیدہ کو وہاں سے ہٹا دیجیے۔" میں نے جرأت کر کے کہا۔

"کوشش کر لو مگر جتنی جلدی ہو سکے اسے جلد از جلد یہاں سے جانا چاہیے۔ کھانا پینا بھی ختم ہوگیا ہے۔ میں گھر سے باہر بھی نکل نہیں سکتا کہ نہ جانے میری عدم موجودگی میں کیا واقعہ پیش آ جائے۔"

"ٹھیک ہے، میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔"

ابا نے فہمیدہ کو آواز دے کے نیچے بلا لیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری حالت دگرگوں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ گورا سے تنہائی میں ملنے کا خیال بھی مجھے وحشت میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ میں اس سے کیا کہوں گا اور وہ کیا جواب دے گی؟ تسلی و تشفی کے لیے میرے پاس چند جملے تک نہیں تھے۔ میں اوپر پہنچا تو گورا کو پھر رونا آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی قمیص سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ "روتی کیوں ہو گورا؟" مجھے خود بھی رونا آ گیا۔

"میں نے گھر والوں کو بہت پریشان کر دیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے گورا، کاش میں بڑا ہوتا۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن اب بھی کیا ہے، میں دنیا بھر کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ میں نے سوچا ہے میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ "نہیں نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں، میں جانتا ہوں کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔ وہ کون شخص تھا جس نے بابا کو قتل کر دیا؟ ممکن ہے تم نے کچھ باتیں والد صاحب سے چھپائی ہوں اور صرف مجھے بتانا چاہتی ہو۔"

"وہ انھی لوگوں میں سے کوئی تھا جو میرے چچا کے دوست ہیں۔ وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں اور بابا کے کاغذات حاصل کرنا چاہتے ہیں جو میں نے ابا کو لا کے دیے ہیں۔"

"وہ تمھیں کیوں مارنا چاہتے ہیں اور وہ کاغذات کیسے ہیں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔ "اور یہ زیورات کس کے ہیں؟"

"یہ زیورات ہمارے ہیں میرے۔ بابا انجین نے چلتے وقت انھیں اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ کاغذات میں بھی کوئی خاص بات ہے جو مجھے نہیں معلوم مگر انجین بابا بار بار انھیں دیکھتے تھے اور کسی سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ وہ لوگ مجھے اس لیے مارنا چاہتے ہیں کہ اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کی سرداری کی حق دار میں بن جاؤں۔ ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ اگر کسی سردار کے ہاں صرف لڑکی پیدا ہوتی ہو تو وہ ولی عہد قرار دی جاتی ہے مگر اسے اس وقت تک سرداری نہیں سونپی جاتی جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے، پھر اس کا شوہر اس کے نام پر سرداری کرتا ہے۔ میرے باپ بہت رحم دل اور نیک تھے۔ قبیلے میں کئی شادیاں کرنے کا رواج ہے مگر انھیں ایک ہندو عورت یعنی میری ماں سے محبت ہو گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے ان کے سوا کسی سے شادی نہیں کی۔ میری ماں میری پیدائش پر مر گئیں، پھر میرے باپ نے شادی نہیں کی اور مجھے پرورش کرتے رہے۔ انھوں نے قبیلے کے سب سے دانا شخص انجین کو میرا اتالیق مقرر کیا۔ قبیلے کے سبھی لوگ ان کے انصاف اور رحم کے باعث ان سے محبت کرتے تھے مگر میرے چچا نے انھیں مار دیا اور خود سردار بن بیٹھا۔ پھر اس نے مجھے بھی مارنا چاہا کیونکہ میری شادی ہو جانے پر اسے سرداری چھوڑنی پڑے گی۔ ہمارا قبیلہ بہت بڑا ہے۔ ہماری کئی بستیاں ہیں، پکے مکانات ہیں، سڑکیں ہیں۔ اسے جانگی قبیلہ کہتے ہیں۔ یہ سب باتیں کرولنے انجینے تفصیل سے بتائی ہیں۔ وہ بری طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، مجھے بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کاغذات پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ تمھیں حاصل نہیں کر سکیں گے۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "تم اب قطعی محفوظ ہو۔ میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا، بہت دور لے جاؤں گا۔ میں تمھاری خاطر سب کو چھوڑ دوں گا۔"

"میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی، مر جاؤں گی۔"

"تو میں بھی مر جاؤں گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ سادگی سے بولی۔

"تم ایسا کرو کہ آج رات جاگتی رہو۔ صبح پانچ بجے یہاں سے ایک گاڑی جاتی ہے۔ میں تمھیں فہمیدہ کا برقع دے جاؤں گا، تم برقع پہن کے ساتھ چلنا۔"

"نہیں کوئی دیکھ لے گا، رات کے وقت نکلنا مشکل ہوتا ہے۔"

"دن کے وقت نکلنا کون سا آسان ہوتا ہے۔ محلے میں سبھی ... لگے مگر تم تو برقع پہنے ہوئے ہوگی۔ لوگ سمجھیں گے کہ تم فہمیدہ ہو یا میری بہن جا رہی ہے۔ میں اپنی بہن کے ساتھ اکثر جاتا رہتا ہوں۔ ہم ... ڈالیں گے لیکن دن میں گھر سے کیسے نکلیں گے۔ رات کو گاڑی کے ... تو سبھی نکلتے ہیں۔ میں ایک سوٹ کیس میں کپڑے تیار رکھوں گا اور ...

اکٹھی کرلی ہوگی، زیورات تو ہمیں لے جانے چاہئیں۔"

وہ منع کرتی رہی اور سوچتی رہی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ رات کو وہ میری ہلکی سی دستک پر اٹھ بیٹھے۔ نیچے آ کر میں نے والد صاحب سے کہا: "اس کا کوئی عزیز موجود نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ مشتعل ہو کر بولے۔

"وہ یہی کہتی ہے۔"

"اسے کہنے دو۔" انھوں نے ڈپٹ کر کہا۔

"مجھے تو وہ بڑی حرافہ معلوم ہوتی ہے۔ میں کہتی ہوں اس سے صاف کہہ دو کہ وہ اپنا ٹھور ٹھکانا ڈھونڈ لے ورنہ نکال باہر کرو۔" امی نے کہا۔

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

دن کے وقت چپکے سے میں نے فہمیدہ کے کپڑے چرائے، کچھ اپنے کپڑے رکھے اور ایک سوٹ کیس تیار کر لیا۔ میں نے یہ کام کئی گھنٹوں میں کیا۔ پھر میں نے وہ مالا بھی رکھ لی جو انجین نے مجھے دی تھی۔ یہ سب کام ہو گیا۔ اب مجھے رات کا انتظار تھا۔ میری عمر خاصی کم تھی۔ رات کو ایک برقع پوش لڑکی کے ساتھ گھر سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ کوئی بھی جاننے والا دیکھ سکتا تھا مگر ان تمام اندیشوں کے باوجود مجھے رات کا انتظار رہا۔ گھر جو پہلے بھی میرا کب تھا؟ اسے تو مجھے کبھی نہ کبھی خیر باد کہنا ہی تھا۔ اب امی رویا کریں، ابا جھلایا کریں، نہیں یاد کیا کریں۔

آدھی رات کے بعد میں گھڑی دیکھ کے اٹھا۔ سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ننگے پیر چل کے سوٹ کیس اٹھایا اور دروازے کے پاس رکھ دیا۔ کنڈی میں نے پہلے ہی کھول دی تھی۔ پھر میں اوپر گیا اور ہلکی سی دستک دی۔ گورا فوراً اٹھ کے باہر آ گئی اور مجھ سے خفتیں کرنے لگی کہ میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ فہمیدہ کے سینڈل بھی میں نے سوٹ کیس ہی میں رکھ لیے تھے۔ وہ ننگے پیر ہی نیچے آئی۔ برقع اوڑھا تو میں نے سرگوشی میں کہا۔ اسے برقع اوڑھنا نہیں آتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اس کی مدد کی۔ پھر ہم دونوں دبے پاؤں نیچے آئے اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ڈیوڑھی میں آ گئے۔ سوٹ کیس اٹھا کے میں نے دروازہ آہستگی سے کھولا اور گورا کا ہاتھ پکڑے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کے میں نے ادھر ادھر دیکھا اور سوٹ کیس کھول کے فہمیدہ کے سینڈل اسے پہنا دیے۔ پھر میں دروازہ بند کر کے ہم گلی سے سڑک پر آ گئے۔ میں نے شیروانی پہن لی تھی تاکہ میری عمر سولہ سترہ سال سے کچھ زیادہ معلوم ہو۔ ہم بڑھتے رہے کہ اس وقت عجیب سی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ ہم اندھیرے میں لپکتے ہوئے گلی سے نکل آئے۔ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں بھاگتے رہے۔ گلیاں جانی پہچانی تھیں۔ میں ان گلیوں سے ہزاروں بار گزرا تھا۔ مگر اس وقت بڑی عجیب اور ڈراؤنی محسوس ہو رہی تھیں۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی تو ہم سانس روک کے اندھیرے کی اوٹ میں ہو جاتے۔ پتا کھڑکتا تو دل لرز جاتا۔ ہم گھر سے خاصی دور نکل آئے تھے مگر ابھی تک ہول طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر قدم پر کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ جیسے ڈراؤنی آوازیں اور آہٹوں سے خوف آ رہا تھا۔ گلیوں میں اونگھتے ہوئے کتے قدموں کی ہلکی چاپوں سے بیدار ہو جاتے اور غلط انداز نگاہ ڈال کر دوبارہ پیروں پہ سر رکھ کے سو جاتے۔ جب وہ غراتے تھے تو ہم خاموش کھڑے ہو جاتے اور انھیں ہم پہ ترس آ جاتا۔ گورا مجھ سے زیادہ ہراساں تھی۔ "گھر واپس چلو۔" اس نے ایک جگہ میرا ہاتھ دبا کر منت کی۔

کئی بار خود میرے ذہن میں گھر واپس جانے کا خیال آیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، گھر میں سب سوئے ہوئے ہوں گے، ہم بڑی آسانی سے واپس جا سکتے تھے اور اس اذیت سے نجات پا سکتے تھے۔ کوئی بھی اگر دیکھ لیتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ ہم تو کہیں کے نہ رہتے۔ غم اور غصے میں ابا تو مہینوں تک کھانا نہیں کھاتے۔ گورا پولیس کے سپرد کر دی جاتی۔ "نہیں۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اب تھوڑا سا راستہ رہ گیا ہے۔" میں نے جھوٹ کہا تھا۔ گلی کے نکڑ سے اسٹیشن کا راستہ دو میل کے قریب تھا اور یہ دو میل ہمارے لیے دو سو دو ہزار میلوں سے کم نہیں تھے۔

آگے بڑھتے رکتے، چھپتے راستہ بدلتے ہم وہاں تک پہنچ گئے جہاں تانگا ملنے کا امکان تھا۔ کوچوان، گھوڑا اور تانگا سب غنودہ تھے۔ میں نے ہمت کر کے ایک تانگے والے کے اونگھتے ہوئے جسم پہ ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ "کہاں جانا ہے؟" اس نے آنکھیں ملتے ہوئے بے دلی سے پوچھا۔

"اسٹیشن۔" میں نے اپنی آواز بھاری بنانے کی کوشش کی۔

"مجھے ادھر نہیں جانا، دوسرے تانگے والے سے پوچھ لیجیے۔" یہ کہہ کے اس نے ایک جمائی لی اور پھر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"کتنے پیسے لو گے؟" میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔

"میں نے آپ سے کہہ دیا بابو جی، مجھے ادھر نہیں جانا۔"

"دو روپے لو گے؟"

اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "دو روپے دیں گے بابو جی؟ رات کا وقت ہے، گھوڑا تھکا ہوا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے حجت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ یہاں سے اسٹیشن تک کا یہ بہت زیادہ کرایہ تھا مگر اس وقت وہ دس روپے بھی طلب کرتا تو میں اسے دینے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ہم تانگے میں بیٹھے تو سردی کچھ کم ہوئی۔ دل قابو میں آنے لگا۔ رات کے وقت سڑک پر صرف ایک شور تھا، تانگے اور کتوں کا شور۔

"کہاں جائیں گے بابو جی؟" تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگاتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ راستے میں تانگے والا اپنی عادت کے مطابق سوال و جواب ضرور کرے گا۔ گھوڑے کو ذرا ڈھیلا کر کے اور بڑھیا تانگے کا اس کے سوال پر میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟

کسی اور شہر کا نام ذہن میں نہیں آیا۔ میں نے مختصراً کہا۔ "کلکتے۔"

"گاڑی پونے پانچ بجے آتی ہے مگر آج کل سالی گاڑیوں کا کیا اعتبار۔ ابھی کل ہی، اب آدھے دن لیٹ آئی تھی۔" وہ میری موجوں سے بے نیاز اپنی زبان چلائے جا رہا تھا۔ "زمانہ خراب آگیا ہے بابوجی! کسی چیز کا ٹیم نہیں رہا۔ اب دیکھیے آپ کو کب تک انتظار کرنا پڑے۔"

میں نے اس دوران کورا سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ برقع میں اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ رہا ہوگا، ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔ وہ مڑ مڑ کے برقع کی جالی سے پیچھے دیکھتی تھی اور سہمی سہمی سی تھی۔ اس سیاہ مضبوط سڑک پر گھوڑے کے نعل کی آواز آج مجھے بہت بُری معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں خود ایک مجرم ہوں اور گھوڑا مجھ پر دوڑ رہا ہے۔ گھوڑے کا ہر اٹھتا ہوا قدم فاصلہ کم کر رہا تھا لیکن راستہ بھی آج طویل ہو گیا تھا۔ "تیز چلاؤ۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"ہوا سے باتیں کر رہا ہے بابوجی! اور ابھی گاڑی آنے میں بھی بہت دیر ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت پر پہنچا دوں گا۔" کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ یہی عذاب ناک کیفیت۔ تانگے والے کو میری خاموشی پسند نہیں آئی چنانچہ اس نے پیچھے ایک نظر ڈال کے پہلے برقع پوش کورا کو دیکھا پھر مجھے اور کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ "ساتھ میں آپ کے گھر سے ہیں؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو میں کہتا۔ تیری کس سے ساتھ ہے۔ یہ ایک غیر متعلق اور بے ہودہ سوال تھا لیکن مجھے خوش اخلاقی کا ثبوت دینا تھا۔ میں نے بمشکل تمام ہنستے ہوئے کہا۔ "بھابی ہیں۔ میکے آئی تھیں اب واپس جا رہی ہیں۔ بھیا کو چھٹی نہیں مل سکی اس لیے میں پہنچانے جا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" تانگے والا بولا۔ "بھائی کیا کام کرتے ہیں؟"

"انجینیر ہیں۔ عمارتیں ہیں نا کلکتے میں بڑی بڑی، وہ سب وہی بناتے ہیں۔ بہت بڑے انجینیر ہیں۔ کلکتہ کبھی دیکھا ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب بس سنا ہی سنا ہے۔" وہ آہ بھر کے بولا۔ "سنا ہے بڑا ظالم شہر ہے۔ آدمیوں کا جنگل ہے۔ وہاں ہر وقت روشنی رہتی ہے اور لوگ جاگتے رہتے ہیں۔ کلکتے کے بہت سے لوگ یہاں آتے ہیں تو انہی سے اس شہر کے بارے میں سن لیتا ہوں۔ بہت بار ارادہ کیا جانے کا مگر......" وہ ایک مصرع گنگنانے لگا "ہزاروں خواہشیں ایسی......"

کلکتے کا ذکر بہت سودمند ثابت ہوا گو میں نے خود کلکتہ نہیں دیکھا تھا مگر میں اسے اس شہر کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں کر کے چونکاتا رہا۔ آخر اسٹیشن تک راستہ کٹ ہی گیا۔ اسے مجھ سے میرے سفر اور کورا کے متعلق کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یقیناً یہ بات اس کے لیے حیرت انگیز ہوگی کہ میکے سے واپس جانے والی کسی لڑکی کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن

پر کوئی نہیں آیا مگر ممکن ہے میکے میں اس کے تمام رشتے دار ضعیف ہوں بیمار ہوں۔ اس کا دیور تو بہرحال اس کے ساتھ ہے۔ اسٹیشن کے باہر عمارت میں تیز روشنی تھی۔ میں نے پہلے ہی جیب سے تین روپے نکال کے ہاتھ میں رکھ لیے تھے تاکہ تانگے والے سے کوئی اور گفتگو نہ ہو سکے۔ اترتے ہی میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس نے مجھے دعائیں دیں۔ کئی قلی ہماری طرف دوڑے مگر میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس دیکھ کے ٹھٹک گئے۔

میرے لیے گھر سے باہر قدم نکالنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ میں والد صاحب کے ساتھ قریب کے شہروں میں کئی بار جا چکا تھا۔ گھر سے اسٹیشن تک آنے کا مشکل مرحلہ گزر چکا تھا۔ اب مجھے کہیں لوگوں کی نظروں سے بچ کے گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی۔ کہاں جاؤں، ہم کون سے شہر میں جا کر رہیں؟ میں یہ طے کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ قریب کے کسی شہر میں جانا مناسب نہیں تھا۔ پھر صرف ایک ہی شہر ذہن میں آیا اور وہ تھا کلکتہ۔ تانگے والے سے گفتگو کر کے مجھے کورا کے ساتھ سفر کرنے کی دشواریوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ہر آدمی چہرے پر لکھی ہوئی عمر دیکھتا ہے۔ ذہن کی بھی ایک عمر ہوتی ہے مگر وہ نظر نہیں آتی۔ جوان بوڑھے بچے ہوتے ہیں اور بچے بوڑھے ہوتے ہیں۔ میں زندگی کے بارے میں ہر چیز جانتا تھا۔ میں نے کتابیں پڑھی تھیں اور بہت کچھ سوچتا رہتا تھا۔ میرا ذہن خیالوں اور خوابوں کا کارخانہ تھا۔ رات مجھے ہزاروں خواب دکھاتا تھا۔ ہزاروں تصورات اس میں ڈھلتے تھے۔ کورا کا چہرہ برقع میں چھپ گیا تھا، قد اس کا پہلے ہی نکلا ہوا تھا۔ کوئی قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اندر ایک نوخیز لڑکی ہے۔ میں نے بھی شیروانی اسی لیے پہنی تھی کہ میرا قد بھی نکلا ہوا تھا مگر میں کورا کی طرح برقع نہیں پہن سکتا تھا۔ میں آواز چاہے کتنی ہی بھاری بنا لیتا، چہرے پر سنجیدگی کی کتنی ہی تہیں جما لیتا اور چال میں کتنا ہی وقار پیدا کر لیتا، میرے چہرے پر عمر صاف لکھی ہوئی تھی۔ میں اسٹیشن کی روشنیوں سے بچتا ہوا بکنگ آفس پہنچا اور کلکتے کے دو ٹکٹ خرید کے تیزی سے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ یہاں قلی اپنی سرخ چادریں بچھائے اونگھنے لیٹے ہوئے تھے۔ ابھی چار بجے تھے اور گاڑی آنے میں پون گھنٹا باقی تھا۔ بکنگ کلرک نے بتایا تھا کہ آج گاڑی وقت پر آ رہی ہے۔ پلیٹ فارم پر تیز روشنیاں نہیں تھیں۔ میں دور ایک دھیمی روشنی کے نیچے دھری ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور میں نے کورا سے کہا کہ وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹانے کی غلطی نہ کرے۔

بہت ممکن تھا کہ محلے کا کوئی شخص، کوئی رشتے دار یا کوئی شناسا بھی آج کی گاڑی سے کلکتے جا رہا ہو۔ اس لیے میں پلیٹ فارم سے ہٹ کر ایک سنسان بنچ پر چھپا بیٹھا تھا اور میں نے اپنا چہرہ اس طرح جھکا لیا تھا جیسے مجھ پر نیند کا غلبہ ہو۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ مدرسے کے ساتھیوں کو لینے کے لیے آنے والے رضاکار طالب علم کسی طرف نہ آ جائیں۔ جب تک گاڑی نہ آ جائے اسٹیشن پر بے حرکت رکنا میرے لیے سنگین محال تھا۔ شیروانی کے اندر سارا جسم

پسینے سے تر بتر تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" کورا کی سہمی ہوئی کمزور آواز ابھری۔

"بہت دور۔ جہاں کوئی ہمارے پیچھے نہ آ سکے۔" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم کلکتے چل رہے ہیں کورا! ابھی کچھ دیر میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے پھر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔"

"اب بھی ہم گھر واپس جا سکتے ہیں۔" کورا کے لہجے میں لرزہ تھا۔

"اب تو چلے آئے ہیں۔ اب گھر کا خیال چھوڑ دو کورا! ہم اپنا ایک گھر علیحدہ بنائیں گے۔ ٹھیک ہے اب جو کچھ بھی ہو۔"

"بابر!" اس نے میرے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ہمت رکھو کورا! دنیا بہت بڑی ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی حالانکہ میری حالت خود دگرگوں تھی۔ میں بڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"گھر والے کیا سوچیں گے۔ وہ سب بہت روئیں گے۔"

"رونے دو، انہیں کون سی میری فکر تھی۔ رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ سمجھ لیں گے کہ میں مر گیا، یا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔"

"سب مجھے برا بھلا کہیں گے۔ میں ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہوں۔"

"کورا! ایسی باتیں مت کرو۔ تم نہ آتیں تب بھی شاید میں کسی دن گھر چھوڑ دیتا۔ اب ان کا ذکر مت کرو۔"

ایک قلی کے قریب آنے کی آہٹ ہوئی تو میں نے سر جھکا لیا۔ کورا بھی چپ ہو گئی۔ قلی نے ہماری بنچ پر آ کے کہا۔ "بابوجی! جگہ چاہیے؟"

"جی نہیں۔" میں نے گردن جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"اس گاڑی میں جگہ ملنی مشکل ہوتی ہے۔" قلی نے حجت کی۔

"نہیں بھائی! ہم خود جگہ تلاش کر لیں گے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

قلی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ یہاں کے قلیوں کا یہی حال تھا۔ وہ جگہ فراہم کرنے کے بہانے ایک دو روپے اینٹھ لیتے تھے۔ گاڑی میں اتنی ہی جگہ ہوتی تھی جتنی ہو سکتی تھی۔ قلی جگہ کھینچ کے بڑی نہیں کر سکتا تھا۔ مستورات کے لیے گاڑی میں علیحدہ ڈبے ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کورا کو وہاں بٹھا دوں گا تو وہ بڑی محفوظ رہے گی اور میں اسٹیشن پر اتر کے اس کی خیریت لیتا رہوں گا مگر مستورات کے ڈبے میں کورا کا نقاب اٹھانا لازمی تھا اور عورتوں کا پوچھ گچھ کرنا بھی یقینی تھا۔ کورا کی ہندوستانی خاصی صاف تھی مگر اتنی بھی نہیں۔ بہرحال ہندوستان میں ہر جگہ مسلمان عورتیں صاف اردو یا ہندوستانی نہیں بولتیں لیکن ڈر یہ تھا کہ اگر ڈبے میں کوئی مسلمان عورت ہوگی اور اس نے ادھر ادھر کے سوالات شروع کر دیے تو کورا کانپ جائے گی۔ اسے مردانے میں اپنے پاس بٹھانے میں بھی خطرہ تھا۔ ڈبے میں تمام لوگوں کی نظریں اس برقع پوش لڑکی پر جم جائیں گی اور خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ ایک برقع پوش مسلمان لڑکی کا مردانے ڈبے میں سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں گرفتار تھا جیسے جیسے

گاڑی آنے کا وقت قریب آ رہا تھا پلیٹ فارم کی زندگی گرم ہونے لگی تھی۔ قلیوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ کسی آوارہ انجن کی تیز سیٹیوں کی آواز آتی یا اس کی تیز روشنی نظر آتی تو گمان ہوتا جیسے گاڑی آ گئی ہے۔ مسافروں میں بدھ راہب اپنے مخصوص لباس میں علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ گاڑی آنے کے وقت تک اسٹیشن پر خاصا ہنگامہ ہو گیا تھا۔ مجھے چند طالب علم بھی نظر آئے۔ میں اپنی بنچ سے اٹھ کر جنگلے کے قریب اندھیرے میں ہو گیا کیونکہ کئی دکاندار اور شناسا چہرے اسٹیشن پر گشت کر رہے تھے۔ کورا اکیلی بنچ پر بیٹھی رہی۔ یہ بہت کرب ناک وقت تھا کیونکہ کمبخت گاڑی نہ جانے کہاں اٹک گئی تھی۔ جب پلیٹ فارم پر ٹہلنے والوں کی بھیڑ بڑھ گئی اور بہت سے لوگ ہوس ناک نظروں سے کورا کے اردگرد منڈلانے لگے تو میں اندھیرے سے نکل کے بنچ پر آ گیا۔ بھیڑ خود بخود چھٹ گئی۔ میں ایک طرف غور سے دیکھنے لگا جیسے کسی کے آنے کا انتظار ہو۔ جیسے ابا ٹکٹ لینے گئے ہوں اور بیٹے اور بیٹی کو یہاں بٹھا گئے ہوں۔ کورا کے چمکیلے ہاتھ برقع سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے خوب صورت پیر بھی سیاہ لباس میں صاف نظر آ رہے تھے۔ جب بھی ہم طالب علم اسٹیشن آتے اور کسی برقع پوش عورت کو دیکھتے تو سب سے پہلے اس کے پیروں پر ہماری نظر جا پڑتی۔ پیروں اور ہاتھوں سے اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی گوری ہوگی اور گوری ہوگی تو اس کا چہرہ کتنا دل کش ہوگا۔ اب یہی صورت میرے ساتھ تھی۔ ہم پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر بھی لوگ یہاں تک آ رہے تھے۔ انہیں کون روک سکتا تھا کہ اس طرف مت آؤ۔ اس طرف مت دیکھو۔ جب وہ اس طرف سے گزرتے تو کورا کی جانب گردن موڑ کے ضرور دیکھتے۔ میں نے تصور تصور میں ان میں سے بعضوں کی آنکھیں پھوڑ دیں۔

کسی کو کیا خبر تھی کہ برقع میں ایک شہزادی چھپی ہوئی ہے۔ اگر وہ نقاب اٹھا دے تو اسٹیشن پر بجلی گر جائے اور سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے۔ یہ احساس کہ میرے پاس ایک خزانہ موجود ہے۔ حسن و جمال کا خزانہ، ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی۔ یہی احساس مصائب و ابتلا کے وقت میرا سہارا بنا ہوا تھا۔ احتیاطاً میں نے ابا کا ایک تیز دھار والا رام پوری چاقو بھی سامان میں رکھ لیا تھا۔ یہ چاقو دستے کے اوپری حصے پر لگا ہوا پیتل کا ایک چھوٹا سا کھٹکا دبانے سے کھٹ سے کھل جاتا تھا۔ ابا قربانی کے موقعے پر اسے ہی استعمال کرتے تھے۔ میں نے سوچا یہ چاقو بنچ کی لکڑی میں اپنے اور کورا کے درمیان گاڑ دوں۔ میں اسی طرح کی باتیں سوچتا رہا کیونکہ آنے جانے والوں کی نظریں ناقابل برداشت ہو گئی تھیں۔ مجھے غصہ تھا، خوف تھا، ڈر تھا۔ مجھ پر متضاد کیفیتیں غالب تھیں۔ اسٹیشن پر سناٹا ٹوٹنے لگا۔ گاڑی کی آمد کا غلغلہ ہوا۔ مغرب کی طرف سے آنے والی گاڑی کی روشنی ایک ننھے سے نقطے کی صورت میں ابھری۔ یہ نقطہ جب بڑھتا گیا سب لوگ گاڑی کی طرف جھپٹ پڑے۔ میں بھی سوٹ کیس اٹھا کے بنچ سے اٹھا مگر میں نے اتنی وحشت کے بجائے

تحمل سے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ مستورات کے ڈبے کے اوپر ایک عورت کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ رات کے وقت وہ تصویر روشن ہو جاتی تھی۔ میں نے گاڑی پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ لوگ ڈبوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ جانے والوں کو بھی جلدی تھی، آنے والوں کو بھی۔ گاڑی وہاں کوئی پندرہ منٹ ٹھیرتی تھی مگر لوگ بہت بے تابی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے اس لیے بھی سوار ہونے میں تاخیر کی تاکہ بدھ یاتریوں کی رہبری کے لیے آنے والے رضاکار طالب علم اسٹیشن سے نکل جائیں۔

ہمارے سامنے عورتوں کا کوئی ڈبا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کورا کو اشارہ کیا اور تیزی سے انجن کی طرف جانے لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے ڈبے ڈھونڈتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ قدم کس بے ترتیبی سے پڑ رہے ہیں۔ اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کورا مجھ سے پیچھے تھی، وہ وہیں ٹھٹک گئی جہاں کھڑی تھی۔ ایک لمحے میں جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھالا۔ وہ میرا کلاس فیلو جگ دیش تھا۔ "کہاں؟" اُس کی آواز مجھے زہر لگی۔

"کچھ نہیں، ذرا بردوان تک، دو تین روز میں آ جاؤں گا۔" میں نے گھبرا کے جواب دیا۔ "تم نے کہیں سے چھوٹے بھائی کو تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، کیا وہ نہیں مل سکا ہے؟" اُس نے ہمدردی ظاہر کی۔

"شاید ماموں کے ساتھ ہو، لیکن بڑے ماموں کو کہیں اور جگہ مل گئی ہو۔ میں انھی کو تلاش کر رہا ہوں۔"

اُس نے میری لڑکھڑاہٹ محسوس کر لی تھی۔ قریب ہی سہمی ہوئی کورا کھڑی تھی۔ "سسٹر؟" اُس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"ہاں! اب تم ایسا کرو جگ دیش! ذرا گاڑی کے اُس سرے تک چلے جاؤ، ممکن ہے چھوٹا بھائی تمھیں نظر آ جائے۔ میں اِدھر دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کے میں نے اُس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ جگ دیش ڈبوں میں جھانکتا ہوا مجھ سے دور ہوتا گیا۔ سب سے آگے کے ڈبوں میں عورتوں کا ڈبا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے رک کر کورا سے کہا کہ وہ کسی سے بات نہ کرے۔ گونگی اور بہری بنی رہے۔ کورا میری نصیحت گرہ میں باندھ کے سر ہلاتی ہوئی ڈبے میں داخل ہوئی۔ خوش قسمتی سے جگہ کم نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اُن میں مسلمان عورتیں بھی موجود تھیں۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ کورا کے پیچھے سب ہی نے منہ بنایا کیونکہ وہ اُن کی تنہائی میں خلل کا سبب بنی تھی۔

میں نے عورتوں کے برابر کے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن مسافروں نے مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ میں چیختا چلاتا رہا۔ انھوں نے سامان ہی دروازے کے نزدیک رکھ دیا تھا تاکہ دروازہ آسانی سے نہ کھل سکے۔ "جگہ نہیں ہے، کوئی اور ڈبا دیکھو۔" ایک کرخت آواز آئی۔

"جناب! میں کھڑا ہو کے سفر کر لوں گا۔" میں نے التجا کی۔

"دوسرا ڈبا دیکھو میاں!" ایک مولوی صاحب نے کہا۔

"جناب! مجھے بس ذرا سی جگہ چاہیے۔ میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔ گاڑی چلنے والی ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے آرام میں مخل نہیں ہوں گا۔"

"میاں! آپ سے کہہ رہا ہوں، یہاں بالکل جگہ نہیں ہے۔"

"مولوی صاحب! کچھ تو انسانی ہمدردی کیجیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"کہاں اُترنا ہے بالک؟" ایک نسبتاً نرم آواز نے پکارا۔

"جناب! جانا تو دور ہے مگر میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔"

ڈبے میں کھلبلاہٹ ہوئی۔ مسافر کسمسانے لگے۔ ایک صاحب نے سامان ہٹایا، دوسرے نے دروازہ کھولا، تیسرا اوپر کی برتھ پر لیٹے لیٹے حکومت کو برا بھلا کہنے لگا۔ مولوی صاحب بھی بڑبڑا رہے تھے۔ ذرا سا دروازہ کھلا تو میں تیر کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ ڈبے میں اتنے زیادہ مسافر نہیں تھے مگر ایک برتھ پر دو دو آدمی سوئے تھے۔ کچھ نے فرش پر چادر بچھائی ہوئی تھی۔ میں بیت الخلا کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

"صاحب زادے! کیا تنہا سفر کر رہے ہو؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، ساتھ میں بھی ہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ہیں، وہ کہاں ہیں؟" انھوں نے تشویش سے کہا۔

"ساتھ والے ڈبے میں۔"

مولوی صاحب نے کچھ سوچ کر کہا، "اچھا۔ میاں! مسافروں کا حال عجیب ہے، سب ایک ہی ڈبے پر پل پڑتے ہیں، جگہ تلاش نہیں کرتے۔ بے آرام ہوتے ہیں اور بے آرام کرتے ہیں۔"

میں سہما اور دبکا کھڑا رہا۔ اسی اثنا میں کسی نے مجھے آواز دی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ وہ جگ دیش ہی تھا، کم بخت پیچھے پڑ گیا تھا۔

"بابر!" اُس نے کھڑکی کے اندر جھانک کے آواز لگائی۔

میں نے جواب دینے سے گریز کیا مگر اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ "میں آ گیا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"چھوٹا مل گیا؟" اُس نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں، دونوں مل گئے۔ پچھلے ڈبوں میں تھا۔"

"یار! کھڑے کیوں ہو؟ ٹرنک پر بیٹھ جاؤ۔" اُس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ٹرنک میرا نہیں ہے۔"

"تو کیا ہوا! اس طرح کب تک کھڑے رہو گے، کہاں جانا ہے، بردوان؟" ڈبے کے ہر شخص نے اُس کا سوال سنا۔

سب دم سادھے بیٹھے تھے۔ جگ دیش کی یہ مداخلت مجھے بہت بری لگی۔ بڑی مشکل سے تو جگہ حاصل کی تھی، وہ مسافروں کو ناراض کیے دے رہا تھا۔ "بیٹھ جاؤں گا، جگ دیش! سفر ہی کتنا ہے۔"

انجن کی تیز سیٹی کے ساتھ ساتھ گاڑی کے پہیے چرچرائے۔ جگ دیش ڈبے سے چپکا ہوا کچھ دور تک دوڑا، پھر دعا سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ یقین نہیں آیا کہ گاڑی گیا شہر سے روانہ ہو چکی ہے۔ وہ جب روشنیوں سے دور نکلنے لگی اور [illegible] سے گزری تو کلیجے میں ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ زنجیر کھینچ کے گاڑی سے اُتر جاؤں۔ بے اختیار گھر یاد آ گیا۔ سب کے چہرے نظروں میں گھوم گئے۔ ابا جاگ گئے ہوں گے اور انھوں نے بستر پر مجھے نہیں دیکھا ہو گا تو اُن کا کیا حال ہوا ہو گا؟ پھر انھوں نے امی کو جگایا ہو گا۔ امی کا دل دھک سے رہ گیا ہو گا۔ وہ زار و قطار رونے لگی ہوں گی۔ ابا نے دروازہ کھلا دیکھا ہو گا تو ساری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ پھر انھوں نے چھت پر جا کے کورا کی عدم موجودگی کی تصدیق کی ہو گی۔ وہ کیسے پریشان ہو گئے ہوں گے۔ پھر اُتر کے سامان دیکھنے لگے، اپنی جیبیں اور نقدی دیکھنے لگے اور سر پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائیں گے۔ پھر اماں انھیں [illegible] ابا اسٹیشن تک آئیں گے، اس وقت تک گاڑی گیا سے بہت دور آ چکی ہو گی۔

❤

گاڑی نے رفتار پکڑ لی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے تو لوگ دوبارہ اونگھنے لگے۔ میں کمپارٹمنٹ کی دیوار سے لگا کچھ دیر کھڑا رہا اور اپنے زاویے بدلتا رہا۔ درمیان میں مولوی صاحب کی آنکھ کھلی تو انھوں نے مجھے دیکھا۔ "بیٹھ جاؤ میاں! کھڑے کیوں ہو؟ اب آپ تھک گئے ہو تو آرام سے بیٹھو۔"

"شکریہ جناب! میں ٹھیک ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔ وہاں تکلیف ہے تو اِدھر آ جاؤ۔" مولوی صاحب نے حکم دیا۔

میں نے ٹرنک پر بیٹھ کے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ نیند آنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ یہ بیداری کی بھی سب سے آگے کی کیفیت تھی۔ صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا، اُدھر کورا موجود تھی۔ اُس کا خیال میرے دل سے لپٹا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہو؟ گھبرا تو نہیں گئی ہو گی؟ اُس کی طبیعت تو ٹھیک ہو گی؟ کاش میں اُس کے پاس ہی بیٹھ سکتا تاکہ اُسے تسلی دیتا رہتا۔ سنا تھا، کلکتہ دن کے ساڑھے دس گیارہ بجے آتا ہے۔ یہ وقت انتہائی مناسب تھا مگر میں کلکتے میں کہاں جاؤں گا؟ کہاں ٹھیروں گا اور لوگ میرے اور کورا کے بارے میں پوچھیں گے تو انھیں کیا بتاؤں گا؟ [illegible] طرح طرح کے خیال آتے تھے۔ کبھی حوصلہ، کبھی خوف۔ کبھی آنے والے دنوں میں کورا کے ساتھ رہنے کی سرشاری، کبھی سوء اندیشے لیکن میں اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ مولوی صاحب کو چونکنے کی عادت تھی۔ ہر پانچ منٹ بعد اُن کی آنکھ کھل جاتی تھی اور وہ انگڑائی لے کے میری خیریت دریافت کر لیتے تھے۔ کچھ دیر آگے اندھیرا مٹنے لگا اور ہر طرف ایک مٹیالی روشنی پھیلنے لگی اور [illegible] ہو گئی۔ ڈبے کے بہت سے مسافر جاگ پڑے۔ گھٹے ہوئے سر والا ایک ہندو سب سے پہلے جاگا۔ [illegible] کی اجازت [illegible] دی تھی، پھر مولوی صاحب اٹھے [illegible] وضو کرنے کے بعد جیسے ہی انھوں نے مصلّیٰ بچھایا، لڑکوں نے [illegible] انھوں نے نماز جلدی ختم کر لی۔ پھر ڈبے کے لوگ جیسا سنتے گئے اور [illegible] انھوں نے میری شکل دیکھی۔ میری شکل پر کوئی بھی علامت [illegible] اُن کی توجہ میری جانب مبذول ہو گئی۔ ایک صاحب نے کھسک کے مجھے [illegible] سیٹ پر بٹھا لیا۔ "ماشاء اللہ، میاں کسی اچھے خاندان سے تعلق [illegible]" مولوی صاحب نے میرا چہرہ اور لباس دیکھ کے رائے دی۔

"کچھ پڑھتے ہیں آپ؟"

"بی اے کے پہلے سال میں ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔"

"یہ لڑکے کی عمر تھوڑی ہے۔" ایک صاحب نے کہا۔ "بیٹا! [illegible] آپ کی آنکھوں پر چشمہ ہونا چاہیے تھا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بھئی حد سے زیادہ پڑھنے والے تمام بچوں کی آنکھوں پر چشمہ لگا رہتا ہے۔" ڈبے میں سب ہنسنے لگے۔ میں نے بھی مسکرا کے ان میں شامل ہونے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ ماحول کی اجنبیت ختم ہو گئی۔ مولوی صاحب نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔ انھوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنے نام کا دوسرا لفظ بتایا، زمان۔ وہ مجھ سے میرے خاندان، والد صاحب وغیرہ کے متعلق سوالات کرتے رہے اور میں انھیں کچھ سچ کچھ جھوٹ بتاتا رہا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو میں نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

"تمھیں تو آگے جانا ہے۔" مولوی صاحب نے نکتہ چینی کی۔

"مگر میں نے آپ سے اگلے اسٹیشن تک بیٹھنے کی اجازت مانگی تھی۔ اب میں کوئی دوسرا ڈبا ڈھونڈ لوں گا۔" مولوی صاحب کے ساتھ تمام مسافروں نے یک زبان مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے پر اصرار کیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں ضرور اسی ڈبے میں آؤں گا۔ زنانے ڈبے میں خیریت دریافت کر لوں۔ وہاں سے [illegible] میں برابر کے ڈبے کی کھڑکیوں پر گیا۔ اندر جو عورتیں بیٹھی تھیں، اُن کے مردوں نے کھڑکیاں گرا دی تھیں۔ کورا نے مجھے دیکھا تو بیتاب ہو گئی۔ اُس نے نقاب تک بھی لی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں اور پیشانی کے کچھ حصے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے پاس ایک برقع پوش مسلمان عورت بیٹھی تھی۔ میں نے کھڑکی سے گردن ڈال دی تھی، میں کچھ کہنے ہی والا تھا مگر فوراً خیال آ گیا۔ اُلٹا میں نے اُس عورت سے اُس کی خیریت پوچھی۔ اُس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا کہ وہ ٹھیک ہے۔ پھر میں نے اشاروں سے چائے کی پیالی کی شکل بناتے ہوئے پوچھا کہ وہ چائے پیے گی یا کچھ کھائے گی؟ کورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی مرحلے پر اُس کے برابر بیٹھی ہوئی عورت بول پڑی۔ "بھیا! یہ تمھاری بہن ہیں؟" میرے اقرار پر اُس نے کہا۔ "مجھے بہت دکھ ہوا ہے، بے چاری گونگی بہری ہے۔ ایک

باہر سے بیٹھی ہوتی ہے ویسے تم بے فکر رہو، میں اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔"

میں نے اس نیک خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اسٹال سے دو پیالیاں چائے اور بسکٹوں کی ایک پلیٹ لا کے ان کے سپرد کر دی۔ کورا کے چائے پینے کے لیے نقاب ہٹانی تو ڈبے میں جو لوگ ادھر کھڑے ہوئے تھے وہ مبہوت رہ گئے۔ ناچار کورا کو اپنا رخ بدلنا پڑا۔ گرم چائے والی دوسری عورت نے اس کی پیالی پینے میں تعاون کیا۔ جب تک گاڑی نہیں چلی، میں پلیٹ فارم پر کھڑا رہا پھر واپس اپنے ڈبے میں آ گیا۔ مولوی صاحب نے اپنا ناشتے دان کھول لیا تھا۔ جبراً انھوں نے مجھے بھی شریک کر لیا اور میں ہر اسٹیشن پر اتر کے کورا کی خیریت دریافت کرتا رہا۔ کلکتہ آنے تک مولوی صاحب سے بہت سی باتیں ہو چکی تھیں۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، یہی کوئی پینتالیس سال کے ہوں گے۔ ان کے چہرے پر تراشی ہوئی داڑھی تھی، ان کی آنکھیں چمکیلی اور ذہین تھیں، پیشانی اور چہرے کا رنگ کھلتا ہوا تھا، قد بھی مناسب تھا۔ کھلے ہوئے ٹخنوں کی شیروانی میں وہ خاصے سلجھے ہوئے، سنجیدہ اور تعلیم یافتہ آدمی معلوم ہوتے تھے۔ وہ پکے مسلمان تھے۔ مولوی صاحب کا نام محمد شفیق تھا۔ وہ مراد آباد سے آ رہے تھے اور انھی کے قول کے مطابق وہ ایک جلسے میں درس دینے کے لیے کلکتے جا رہے تھے۔ جز وقتی طور پر وہ مراد آبادی برتنوں کی کمیشن ایجنسی بھی کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک صندوق میں مختلف قسم کے برتنوں کے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ یہ نمونے وہ دکانوں پر دکھا کے آرڈر لیا کرتے تھے اور آرڈر مراد آباد بھیج دیتے تھے۔ مولوی صاحب بہت شائستہ گفتگو کرتے تھے اور تب تاب سے رہتے تھے۔ کلکتے تک وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ سیاحت ان کا مشغلہ تھا۔ وہ سارا ہندوستان دیکھ چکے تھے۔ میں نے ان سے کلکتے کا پتہ لیا۔ اس جانے میں نے بازاروں اور محلوں کے نام بھی معلوم کر لیے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کلکتے میں ان سے ضرور ملاقات کروں گا۔

ہوڑا اسٹیشن پر ظاہر ہے مجھے میرے ماموں جان لینے نہیں آئے۔ مولوی محمد شفیق بھی سخت پریشان ہوئے۔ میں کورا کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔ از راہ ہمدردی مولوی صاحب بھی رک گئے تھے اور گھور گھور کے کورا کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ میرے ان کے ٹھہر جانے سے میں بھی رکا رہا ورنہ اب تک میں اسٹیشن سے باہر ہوتا۔ دیکھتے رونق دیتے لندن عجیب گڑبڑ کا عالم تھا۔ میں اپنے خود ساختہ ماموں کا انتظار کر رہا تھا اور مولوی صاحب کو مجھ سے اتنی انسیت ہو گئی تھی کہ انھوں نے میرے بغیر اسٹیشن سے باہر جانا ملتوی کر دیا تھا۔ ماموں جان کو بھلا کیوں آنا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا۔

"میاں! تمھارے پاس ان کا پتہ بھی ہے؟"

"جناب! ان کا آنا بالکل یقینی تھا۔ تار کلکتے سے آیا تھا۔ ایک ہفتے پہلے خط لکھ دیا تھا۔ وہ کولوٹولا اسٹریٹ میں کہیں رہتے ہیں۔ نمبر اور بلڈنگ کا نام وغیرہ تو مجھے یاد نہیں ہے۔"

"مجھے بھی قریب ہی جانا ہے آؤ وہیں کہیں تلاش کرتے ہیں۔ اب ان کے آنے کی امید نہیں ہے۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو چلا ہے اور گاڑی پہلے ہی آدھ گھنٹے لیٹ آئی ہے۔ آؤ میاں! اٹھو۔ اگر وہ آج نہ ملیں تو آپ دونوں میرے ساتھ رہ لیجیے گا۔ اپنا ٹھکانا بھی برا نہیں ہو گا۔"

"شکریہ جناب! آپ کہاں زحمت کریں گے۔ میرا خیال ہے میں کچھ دیر اور انتظار کر لوں۔ آپ اپنا وقت ضائع نہ کیجیے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"تکلیف کا نام لے خوب ذکر کیا۔ تم تو غیریت برتنے لگے۔ میاں! آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔ میں یہاں سے اس وقت تک نہیں ٹلوں گا جب تک تمھارے ماموں جان تم کو نہیں مل جائیں گے۔ یہ کلکتہ ہے صاحبزادے! بہت منحوس شہر ہے یہاں بدذات جنات بستے ہیں۔ آدمی کھو جاتا ہے تو پتہ نہیں چلتا۔ دیکھ رہے ہو، لوگ کیسے بھاگ رہے ہیں۔ جدھر دیکھو آدمی ہی آدمی نظر آتا ہے۔"

مولوی صاحب سچ کہتے تھے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ انسان گروہ پسند ہوتا ہے۔ یہاں تو اتنے لوگ تھے کہ وحشت ہونے لگی تھی۔ مجھے حبس سا محسوس ہوا۔ ادھر مولوی صاحب کو [illegible] ہو گیا تھا۔ وہ تو دھرنا دے کے ایک بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے کورا کو بھی ان کے ساتھ بٹھا دیا۔ وہ میری مجبوری اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پھر مولوی صاحب سے اصرار کیا کہ وہ ہم لوگوں کی خاطر اپنا وقت برباد نہ کریں مگر وہ نہ مانے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ان کے ساتھ باہر نکلوں اور کولوٹولا اسٹریٹ میں ماموں جان کو تلاش کروں۔

"ماموں جان کا نام اکبر میاں ہے۔ وہ اجناس کے بڑے بیوپاری ہیں اور اس سلسلے میں انھیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں جانا پڑتا ہے۔" یہ باتیں میں نے پہلے ہی مولوی صاحب کو بتا دی تھیں مگر قسمت میں بھی وہی لکھا تھا جس میں مولوی صاحب موجود تھے۔ میں نے اس برے وقت کو کوسا۔ ڈوبتے ہوئے دل سے مولوی صاحب کے ہمراہ اسٹیشن سے باہر آیا۔ پہلی نظر میں اس شہر کا کوئی اچھا تاثر ذہن پر مرتب نہیں ہوا۔ اب تک میں نے صرف چھوٹے چھوٹے شہر، قصبات اور دیہات دیکھے تھے۔ یہ تو دنیا ہی اور تھی۔ میں نے بے بسی سے کورا کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب نے ایک ٹیکسی روک لی تھی۔ "آؤ میاں بیٹھو!" انھوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں اور کورا ٹیکسی میں قربانی کے بکروں کی طرح پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب ڈرائیور کے قریب بیٹھے تھے۔ کچھ سامان ڈکی میں رکھ دیا گیا تھا اور کچھ ہم نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

میں سوچتا رہا، مولوی صاحب بے چارے ماموں جان کی تلاش میں کہاں کہاں مارے مارے پھریں گے؟ کن کن لوگوں سے پوچھیں گے؟ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا۔ "جناب! کیوں نہ ہم آپ کی قیام گاہ چلیں، وہاں نہا دھو کر اطمینان سے ماموں جان کی تلاش میں نکلیں گے؟"

"بخدا میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا۔" مولوی صاحب اچھل کر بولے۔ "مکان تو نہیں البتہ ایک کمرے کا انتظام ضرور ان لوگوں نے کیا ہو گا جیسے تیسے گزر کر لیں گے۔ مجھے تو تمھارے ماموں جان کی فکر کھائے جا رہی ہے، پتہ نہیں کیا حادثہ ہوا؟ خدا خیر کرے۔ انھیں تمھارا تار اور خط مل جانا چاہیے تھا۔" میں خاموش رہا اور شیشے سے کلکتے کا نظارہ کرنے لگا۔ عمارتیں ہی عمارتیں، سڑکیں، ٹرامیں، بسیں، ہاتھ گاڑیاں، ہر جگہ انسان، دکانیں، ہوٹل، بڑے بڑے بورڈ، نیلے پیلے، کالے، ہرے، سفید، سرخ رنگوں کا شہر۔ مولوی صاحب کے اشارے پر ٹیکسی ایک بڑی مسجد کے قریب ٹھہر گئی۔ مسجد سے ملحق عمارت میں مدرسہ تھا۔ مدرسہ بند تھا۔ ٹیکسی ٹھہرا کے مولوی صاحب اندر خبر کرنے چلے گئے۔ میں نے سوچا، یہیں سے فرار ہو جاؤں مگر مولوی صاحب کا سامان بھی ٹیکسی میں رکھا تھا، اسے کہاں چھوڑتا اور ٹیکسی والے سے کیا عذر پیش کرتا۔ مولوی صاحب جلد ہی واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور دراز ریش بزرگ تھے۔ انھوں نے سامان اتروانے میں مدد کی۔ کرایہ بھی انھی صاحب نے ادا کیا۔ پھر ہمیں ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جس میں ایک دریچہ تھا اور دروازہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی تھی۔ سیلن تھی اور اندھیرا تھا لیکن کمرے کے باہر چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ ایک طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ روشنی ہونے پر کمرہ کچھ ایسا برا معلوم نہیں ہوا۔ "میں باہر چلا جاتا ہوں۔" مولوی صاحب نے چارپائی پر بستر بچھا کے کہا۔ "عزیزہ سے کہو کہ اطمینان سے بیٹھیں، برقعہ اتار دیں، چاہیں تو غسل کر لیں۔ ہم لوگ کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو صابن، تولیہ، لوٹا، وہ سب میرے سامان میں موجود ہے۔"

اصولاً مجھے اتنے مہربان آدمی کے سامنے کورا کا پردہ اتروا دینا چاہیے تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں مولوی صاحب کے ساتھ کھانا لینے کے لیے روانہ ہو گیا۔ بیگانہ مخمصہ تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ مولوی صاحب کو صاف صاف بتا دوں مگر ہمت نہیں پڑی۔ اتنے افسانے تراشنے کے بعد اب حقیقت بیان کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ یہ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ مولوی صاحب نے خاصا پرتکلف کھانا خریدا۔ کورا کو ان کھانوں کی عادت نہیں تھی۔ میں نے ساتھ میں اس کے لیے ماش کی دال بھی لے لی۔

جب ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو صحن میں ایک اور چارپائی رکھی جا چکی تھی۔ مولوی صاحب صحن میں بیٹھ گئے۔ میں کورا کے لیے کھانا لے کے اندر چلا گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ میری بہن فہمیدہ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ یہ نئے نکھار گئی۔ اس لباس میں تو وہ کوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا اور خود مولوی صاحب کے ہمراہ کھانے کے لیے صحن میں آ گیا۔ مولوی صاحب [illegible] اپنی ان کے ساتھ ہی کھانا کھا لوں۔ جی تو میرا بھی چاہتا تھا مگر میں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ کورا کو دیکھ کے سفر کی ساری تکان دور ہو گئی تھی، اتنے قریب تو وہ گھر میں بھی کبھی نہیں آئی تھی۔ صحن سے میری نظریں اندر ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کورا کو مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانا تھا۔ مولوی صاحب تھوڑی دیر کے لیے مدرسے کی طرف چلے گئے تو مجھے آزادی نصیب ہوئی۔ میں نے دروازے کی کنڈی بند کی اور سامنے کمرے میں گھس گیا۔ کورا چارپائی پر اوندھی پڑی تھی۔ چلتے ہوئے میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس خیال سے میرا حوصلہ بڑھا کہ وہ [illegible]۔ میں دوسری طرف کھڑا رہا۔ کورا بھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں، پلکیں جھکائیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میرے دل میں ایک درد اٹھا لیکن میں نے اپنے آنسو روک لیے۔ "غم مت کرو کورا۔" بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔ "غم مت کرو۔ اس اجنبی جگہ پر چند دن پریشانی ہے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تھوڑے پیسے ہیں، کچھ دن تو ویسے بھی گزر جائیں گے۔"

"مگر اب ہم جائیں گے کہاں؟" وہ ڈری ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ تو مجھے خود نہیں معلوم۔ یہ شہر تو بہت خراب ہے۔ ہمارا اس جگہ گزارا نہیں ہو گا۔" پھر مجھے خیال آیا کہ میں خود اس کی ہمت شکنی کر رہا ہوں۔ مجھے تو اس کی ڈھارس بندھانی چاہیے۔ میں اس کے اور قریب ہو کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک تازگی اور روشنی معلوم ہوتی تھی۔ ایک انوکھی خوشبو ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ "بیٹھ جاؤ کورا!" میں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ "مولوی صاحب ابھی آ رہے ہوں گے۔ ان کے سامنے پردہ کرتی رہنا اور مجھ سے کم ہی بولنا۔ کل ہم شاید باہر جائیں اور ماموں جان کی تلاش میں ناکام ہو کے واپس آ جائیں۔ ہم مولوی صاحب سے زیادہ دیر جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اگر حضرت نے کہیں تمھاری شکل دیکھ لی تو یقیناً شک میں پڑ جائیں گے۔ چنانچہ کل یہاں سے چلا جانا ہو گا۔"

"مگر کہاں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"کہیں بھی۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"باہر میرا زیادہ گھومنا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ "وہ میرے پیچھے پڑے ہوں گے۔ اگر انھوں نے پتہ چلا لیا تو مصیبت آ جائے گی۔ اگر ہمیں مکان نہیں ملا اور تم کسی کام پر نہ لگ سکے تو ہمارا کیا ہو گا؟ سب پیسے ختم ہو جائیں گے۔"

"ہو جانے دو۔ خدا کے لیے تم مجھے کمزور نہیں سمجھا کرو۔ تمھیں گھر سے بھگا کر کوئی برا کام کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو تم سے زیادہ چاہتا ہوں۔"

"بابا! مولوی صاحب سے سب کچھ کہہ دو۔ شاید وہ ہماری مدد کریں۔"

"اور اگر وہ خود بگڑ اٹھے تو کیا ہو گا؟"

کورا کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ آنسو تھے۔ آنسو بہتے

رکھ دیا۔ میں نے اپنا نام انور علی لکھا، عمر ۳۰ سال، پتہ محلہ قبیل گنج مراد آباد۔
اس جگہ کا نام میں نے مولوی صاحب سے سنا تھا۔ ساتھ میں ایک بہن
بہن کا نام کیا بتاؤں اور عمر؟ عمر کا خانہ آیا تو میں جھجکنے لگا۔ ۱۵، ۲۰ یا ۲۵
اگر میں ان میں سے کسی کی تفکر کر کے چہرے پہ پڑھتی تو؟ میں نے بہن لکھ
کے جگہ خالی رہنے دی۔ منیجر میرا ہی قد پیش نظر گیا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"
اس نے مہذب لہجے میں کہا۔ "ہم خواتین کے نام اور عمریں نہیں لکھتے۔"
"شکریہ۔" میں نے شکر ادا کیا اور اس کے مطالبے پر ۵۰ روپے
پیشگی دے دیے۔ اب تک ہر کام اطمینان بخش طور پر انجام پایا تھا۔ دوسری
منزل پہ دونوں طرف کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ درمیان میں ایک تنگ راستہ
گزرتا تھا۔ اس کے آخری سرے پر ہوٹل کے بیرے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں ان سے
نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ "اب کیا ہوگا؟" کورا نے پوچھا۔
"اب کچھ دیر آرام کریں گے پھر سیر کو چلیں گے کلکتہ۔ کچھ شہر کی تفریح
کریں گے" اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دل اچھل کے حلق
میں آ گیا۔ "بیرا ہوگا۔" کورا نے یہ کہہ کے میری دہشت دور کی۔
میں نے کورا کو آڑ میں ہونے کا اشارہ کیا اور ذرا سا دروازہ کھول
کے دیکھا۔ بیرا ہی تھا۔ "کچھ کھانا چاہیے حضور صاحب؟ میں سامنے بیٹھا ہوں
جس چیز کی ضرورت ہو گھنٹی بجا دیجیے گا۔"
میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے اسے دو روپے تھما دیے۔ مولوی صاحب
نے اپنے واقعات بتاتے ہوئے مجھے ایک بیرے کو زیادہ بخشش دینے کا حال
سنایا تھا۔ وہ بات میرے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ واقعی اس کے چہرے کا
موسم ہی بدل گیا۔ اس نے ادب سے مجھے سلام کیا اور ایک بار پھر اپنی
خدمات کی پیش کش کی۔ میں نے جلد سے جلد اس بلا کو ٹالنے کے لیے دروازہ
بند کر دیا۔
"کچھ کھاؤ گی؟" میں نے کورا کے کانوں کے قریب جا کے زور سے پوچھا۔
"نہیں۔" وہ اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
"کھایا پیا کرو، نہیں تو دُبلی ہو جاؤ گی۔"
"تم ذرا غور کر کے دیکھو، چہرہ کیسا ہو رہا ہے، پیلا ہو گیا ہے۔ ایک دن
میں تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔"
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس ذرا رہنے کی جگہ اور کام مل جائے۔
پھر دیکھنا میں کیسا موٹا ہو جاؤں گا۔"
"بابر!" وہ کچھ خیال لہجے میں بولی۔ "کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں انسان
نہیں رہتے؟ چلو کسی پہاڑ پر، کسی جنگل میں چلیں۔ جب ذرا شبہ ہو جائیں گے
چلے آئیں گے۔"
"انسان؟ وہاں بھی ہوں گے۔ انسان ہر جگہ موجود ہیں۔" میں نے بستر پہ
دراز ہوتے ہوئے کہا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور اس نے اپنی گردن میرے
شانوں پہ ٹکا رکھی تھی۔

"جب میں یہاں آئی تھی تو سب لوگ مجھے گھور گھور کے دیکھ رہے
تھے۔ یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں بابر؟"
"پتہ نہیں۔ شاید ان لوگوں کے گھروں میں عورتیں نہیں ہوتیں۔" میں
نے تلخی سے کہا۔
"چلو تم تیار ہو جاؤ۔ اس شہر میں رہنا ہے تو جانے پہچانے والے گلی
کوچوں سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔"
پہلے میں نہایا پھر وہ نہائی۔ جب وہ غسل خانے سے نہا کے برآمد
ہوئی تو مجھے ایک نئی سی لڑکی نظر آئی۔ وہ شرمائی ہوئی تھی، نگاہ اٹھاتے ہوئے
جھجک رہی تھی۔ ہمارے پاس کپڑے کہاں تھے، اس لیے اس نے اپنے وہی کپڑے پہن لیے
جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ میں نے صندوق سے مال نکال کے اپنی جیب
میں رکھ لیا۔ پھر ہم تالا لگا کے ہوٹل سے باہر جانا ہی چاہتے تھے کہ بیرا لپکتا ہوا
آیا۔ "سرکار کہیں جا رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مجھے
اچھی نہیں لگی۔ "کب تک واپسی ہوگی؟"
"معلوم نہیں کب آئیں۔" میں نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔ "کیا یہاں بتانا
پڑتا ہے یا یہاں آنے جانے کے اوقات مقرر ہیں؟"
"نہیں حضور، ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ سرکار کچھ خدمت
کا موقع دیں، کچھ کھانے پینے کا انتظام کر سکوں؟"
"جب آئیں گے تو بتا دیں گے۔" میں نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔ کورا میرے
پیچھے پیچھے تھی۔ نیچے اترنے تک میں نے کئی نگاہوں کو دیکھا۔ کسی کے لبوں پر
مسکراہٹ آئی، کسی کی نگاہ میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ ہم یہ سب کچھ برداشت
کرتے ہوئے سڑک پہ آ نکلے۔
چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ ایک معقول شکل و صورت کے ٹیکسی
والے نے ہمارے قریب ٹیکسی روک کے پوچھا۔ "کہاں چلیے گا جناب؟"
"کہیں نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا پھر مجھے خیال آیا کہ کسی نہ کسی
سواری میں تو بیٹھنا ہی ہوگا۔ "ٹھہرو۔" میں نے اسے حکم دیا۔
"جناب! کلکتے کی سیر کیجیے۔" ڈرائیور نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔
"بہت کی ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "ہمیں بڑے بازار
تک لے چلو۔" بڑے بازار کا نام میں نے اسٹیشن پر لگے ہوئے اشتہاری
بورڈوں میں کہیں دیکھ لیا تھا۔ ڈرائیور نے ایک لمحے کچھ سوچا
اور دروازہ کھول دیا۔ اب وہ تھا اور کلکتے کی سڑکیں تھیں۔ ہم میلوں چلتے
رہے۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک بازار سے دوسرا بازار، بڑا بازار آ کے نہیں دیا۔
مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ایسی جگہ کا نام کیوں لے دیا جو ہوٹل سے
اتنی دور ہے۔ ڈرائیور سے یہ پوچھتے ہوئے بھی جھجک ہو رہی تھی کہ وہ کتنا
فاصلہ طے کرے گا۔ ممکن ہے بڑا بازار آتا ہی نہ ہو۔ آخر بہت دیر
بعد میں نے اسے ٹوکا۔ "تم نے گاڑی غلط راستے پر ڈال دی ہے۔"
وہ کچھ حیرت کا شکار ہو کر بڑے اطمینان سے کہنے لگا۔ "صاحب!
راستہ تو غلط نہیں ہے، البتہ میں آپ کو صاف ستھرے راستوں سے لے

کے آیا ہوں، ذرا کلکتے کی بہار بھی دیکھیے۔"
ہمارا مقصد بھی یہی تھا کہ کلکتہ خوب دیکھا جائے۔ پھر ڈرائیور گاڑی
ایک ایسی جگہ لے آیا جہاں بڑی بڑی عمارتیں ختم ہو گئی تھیں اور غیر شہری
علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ جگہ دیکھ کے مجھے کچھ پریشانی ہوئی۔ ہم بتدریج
کسی ویران علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ "یہ تم کہاں لے جا رہے ہو؟"
میں نے بے چینی سے پوچھا۔
"بڑے بازار۔" ڈرائیور نے گردن موڑ کے کہا۔ "جناب! ہم غریبوں
کی بستی بھی دیکھیے۔ آئیے میں آپ کو اپنا گھر دکھاؤں۔"
"میں نے تم سے صرف بڑے بازار چلنے کے لیے کہا تھا۔ یہ تم
کہاں لے آئے؟" میں نے گھبرا کے کہا۔
"بڑے بازار ہی چل رہا ہوں صاحب!"
"چلو نہیں جانا، واپس چلو۔" میری آواز غصے سے کانپنے لگی۔
کورا تو جیسے سانس روکے بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ ہی دور
آگے جا کے اس نے گاڑی روک لی اور انجن بند کر دیا۔ یہ درختوں میں گھرا
ہوا ایک سنسان علاقہ تھا۔ وہ گردن گھما کے اطمینان سے پیچھے مڑا۔ "ذرا
ان کا مکھڑا تو دکھا دیجیے۔" اس نے عیارانہ مسکراہٹ سے کہا اور ایک
دم کورا کے نقاب پہ ہاتھ ڈال دیا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" میں اس کا ہاتھ روک کے چیخا۔ "اپنا
ہاتھ ہٹاؤ ورنہ۔"
"ورنہ کیا؟ صاحب! ابھی تمہاری عمر ان باتوں کی نہیں ہے۔
اتنا کام تم پہ چھوڑ دو۔" اس نے خشونت سے کہا۔
"میں کہتا ہوں گاڑی واپس لے چلو۔" اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔
"ان نازک ہاتھوں کو کیوں زحمت دیتے ہو صاحب!" اس نے
زور سے جھٹکا دیا۔ میرا ہاتھ ٹوٹ جانے سے لگا۔
کورا نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا لیا تھا اور چیخنا شروع
کر دیا تھا۔ ڈرائیور اس کا چہرہ دیکھ کے بدحواس ہو گیا۔ اس نے اس کے
رخساروں پہ ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے منہ پر ایک مکا
رسید کر دیا۔ اس پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے میرے سر پر ایک
زور کا ہاتھ مارا اور دروازے کا ہینڈل گھما کے مجھے باہر پھینکنے کی کوشش
کرنے لگا۔ کورا نے اس کے ہاتھ نوچنے اور کاٹنے شروع کر دیے تھے۔
ڈرائیور بُری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میری گردن پکڑ
لی۔ کورا نے بے بسی میں اسے کاٹنا اور نوچنا بند کر دیا۔ کورا اس کا بھی
[illegible] میں نے اگلی سیٹ سے لپٹتے ہوئے کہا۔ میری گردن اس کے پنجے میں
تھی۔ کورا نے اتنے زور سے اس کی کلائی کاٹی کہ اس نے بلبلا کے میری گردن
چھوڑ دی۔ اس عرصے میں مجھے اپنی اندرونی جیب سے چاقو نکالنے کا موقع مل گیا۔
میں نے چاقو کا کھٹکا دبایا تو اس کا پھل بجلی کی طرح دستے سے نکل آیا۔
میرے ہاتھوں میں چاقو دیکھ کے ڈرائیور کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ اگر

چاقو دیکھ کے اس کی آنکھیں کچھ دیر جھپکتی رہیں۔ یہ چاقو دستے تک اس کی
گردن میں اتار دیتا۔ وہ بہت سہم گیا۔ میں نے اس کی گردن پہ چاقو
رکھ کے کہا۔ "ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔" مجھے اس کی [illegible]
کی توقع نہیں تھی، اس لیے میں نے [illegible] [illegible] نہیں ہے
کہ کم کرتے ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس لیے [illegible] ہیں؟
"گاڑی چلاؤ۔" کورا نے بھی تحکمانہ لہجے میں کہا۔
ڈرائیور سکتے میں رہ گیا تھا۔ چاقو کی نوک اس کی گردن میں چبھ
رہی تھی۔ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ چاقو فریدی اور شاہ کے رفقوں کے
علاوہ گھر میں پڑا رہتا تھا۔ اس کی قدر و قیمت آج معلوم ہوئی جب میں
نے دوسری بار ڈرائیور کی گردن میں نوک چبھوئی تو اس کے جسم میں حرکت پیدا
ہوئی۔ کورا کو اشارہ کر کے میں نے پھرتی سے چاقو الٹے ہاتھ میں لے لیا اور
دروازہ کھول کے اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے صرف ایک جھٹکے
میں چاقو کو الٹے ہاتھ سے ڈرائیور کی دائیں پسلی میں چبھو دیا۔ اس نے
سسکاری بھری اور دائیں گھما کے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ جب
وہ دوبارہ آبادی میں نکل آئی تو میں نے سوچا کہ پولیس کے حوالے کر دوں، لیکن میرا
چاقو مسلسل اس کے جسم سے چپکا رہا۔ جب گاڑی [illegible]
کر کے دروازے کی جانب مڑتا تھا تو [illegible]۔" میں نے [illegible]
اُسے حکم دیا۔
"جی؟" وہ بُری طرح گھبرا گیا۔
"ہاں قتل! پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم نے کس کے ساتھ گستاخی
کی تھی۔ تمہیں دس سال کی سزا کراؤں تو کیسا؟" میں نے [illegible] کہا۔
"مجھے معاف کر دیجیے صاب! بال بچے ہیں۔ مجھ پر شیطان سوار
ہو گیا تھا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔" وہ گڑگڑانے لگا تھا لیکن میں ہوٹل
تک پہنچنے تک اپنے فیصلے پر قائم رہا۔
کورا نے اسے معاف کرنے میں عجلت کی۔ ہم تھوڑی دور جانے کے
بعد اسے راستے میں چھوڑ دیا۔ ہمیں یہ پتہ نہ تھا کہ وہ ہمیں ہوٹل
کے دروازے پر چھوڑ کے چلا جائے گا۔ میں نے اس کے سامنے ٹیکسی کا نمبر اور اس
کا نام نوٹ کر لیا۔ بعد میں مجھے یہ دلچسپ بات معلوم ہوئی کہ بڑا بازار ہوٹل
سے زیادہ دور نہیں ہے۔ خیر جب وہ چلا گیا تو ہوٹل پہ چلنا جانا بھی
مشکل ہو گیا۔ اب ہمارے راستے اور ہمارے سوتے [illegible] تھی۔ ہمارے
دلوں پر ایک ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں فٹ پاتھ پر گم سم
کسی دوسری ٹیکسی کی تلاش میں جا رہے تھے۔ کورا نے اچانک میرا بازو
پکڑ لیا۔ میں نے اضطراری حالت میں ادھر ادھر دیکھا۔ کورا کی دہشت زدہ
آواز سے میرے سینے پہ جیسے کوئی گولی گر پڑی۔ "وہ۔" وہ [illegible]
میرے بازو سے چپک گئی۔
"کون؟" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"وہی۔ بھاگ چلو، وہی لوگ۔" وہ جیسے مرتی ہوئی بولی۔ "اسے

پیشانی کا بوسہ لیا اور بلائیں لیں۔ کرو شنگ کے لیے میں نے کورا کی طرف دیکھا۔

اُس کے چہرے پر بھی اضطراب چھایا ہوا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی تمام کپڑے سوٹ کیس میں ڈال لیے۔ اب یہاں ایک لمحے ٹھہرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ وقت کا میں نے ایک گھنٹا گزار دیا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ کمرے کے دروازے سے جھانک کے دیکھا۔ ہوٹل پر پُراسرار خاموشی مسلط تھی جیسے ہی دروازہ کھول کے نکلے بیرے نے ہمیں حیرت سے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا نوٹ رکھ کے اس کا تجسس دور کر دیا۔ وہ سوٹ کیس تھام کے نیچے دفتر میں آیا۔

دو روز کا بل ادا کر کے میں تیزی سے نیچے آ گیا۔ نیچے ملازمین کی حیرت بھی میں نے پانچ روپے ادا کر کے دور کر دی۔ ٹیکسی ملنے میں دیر لگی تو ہم پیدل چل پڑے۔ رات کے وقت ایک مرد اور پردہ پوش عورت کے ساتھ سوٹ کیس ہاتھ میں لے کے چلنے کی دشواری کا مجھے اندازہ تھا۔ خوش قسمتی سے کچھ ہی دور ایک ٹیکسی مل گئی۔ زیادہ کرایے کے لالچ میں وہ آمادہ ہو گیا۔ چاقو جیب سے نکال کے میں نے ہاتھ میں رکھ لیا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے اچانک مجھ سے کہا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے پیچھے کے شیشے سے مڑ کے دیکھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر تیز روشنیاں تھیں۔ جہاں جہاں کار مڑتی تھی وہ روشنیاں بھی مڑ جاتی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کی جیب میں کچھ روپے ٹھونس کے میں نے خوشامد کی کہ وہ گاڑی تیز بھگائے۔ میری نظریں عقبی شیشے کی طرف تھیں۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ وہ علاقہ آ گیا تھا جہاں ہمیں اترنا تھا۔ پچھلی گاڑی ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں کورا کو لے کے تیزی سے اترا اور جیب سے روپے نکال کے گنے بغیر ڈرائیور کو تھماتے ہوئے کہا کہ وہ گاڑی آگے بڑھا لے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا پھر اس نے حکم کی تعمیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ ہم کسی تاخیر کے بغیر ایک پتلی سی گلی میں رینگ گئے اور اندھیرے میں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے چاقو کا کھٹکا دبا کے اسے بروئے کار لانا تھا۔ دو ایک منٹ بعد پیچھے والی گاڑی کی روشنیاں سڑک پر نظر آئیں۔ گاڑی زناٹے سے گزر گئی۔ ہم اس تنگ گلی میں اور آگے بڑھ گئے۔

گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے زور زور سے پھاٹک پیٹا اور آوازیں لگائیں۔ ایک بوڑھے شخص نے کھانستے ہوئے اندر سے پوچھا "کون ہے؟"

میں نے بلند آواز سے کہا "زمان! میں مولوی محمد شفیق کا جان ہوں۔ دروازہ کھولیے۔"

بوڑھے نے کھڑکی کھول کے ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور اندر آنے کی اجازت دے دی۔ مولوی صاحب نے ایک ہی دستک پر دروازہ کھول دیا اور ہمیں دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔ "آؤ، اندر آ جاؤ۔" انھوں نے سرگوشی سے کہا۔

ہم دونوں سر جھکائے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ "کہاں سے؟" انھوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے لہجے میں شدید ناراضی بھی ہو رہی تھی۔ "ہمیں معاف کر دیجیے مولوی صاحب! خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے۔ ہم نے آپ کو ناراض کیا لیکن ہم نے بہت سے جھوٹ بولے تھے۔ ان

کے خوف سے ہم چلے گئے تھے۔ آپ کے سوا اس شہر میں ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا اس لیے ہم آپ کے پاس آ گئے ہیں۔ اب آپ جو بھی چاہیں سزا دیں۔ ہمیں معاف کر دیجیے اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ ہمیں اپنی پناہ میں لے لیجیے۔ آپ ہمیں اپنا غلام سمجھ لیجیے۔ ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ ہمیں اپنے ساتھ مراد آباد لے چلیے۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔"

"سکون! اطمینان! بیٹھے بیٹھے سلام کرتے ہو؟" مولوی صاحب نے ہاتھ اٹھا کے میری تیز زبان کو لگام دی۔

"کورا! تم مولوی صاحب سے پردہ مت کرو۔ نقاب اٹھا دو۔" کورا نے نقاب اٹھا دی اور جھکتے ہوئے ان سے معافی مانگنے لگی۔

"ارے تم اتنی چھوٹی ہو؟" مولوی صاحب پر حیرت طاری تھی۔ وہ کورا کو تعجب سے دیکھنے لگے۔

"اب میری بات سن لیجیے۔ میں آپ سے بالکل جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ایک لفظ جھوٹ نہیں کہوں گا۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں فیصلہ کر دیجیے گا۔ ہمیں دھکے دے کے گھر سے نکال دیجیے یا ہمارا گلا گھونٹ دیجیے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا "یہ لڑکی جسے آپ دیکھ رہے ہیں یہ ایک غیر مسلم لڑکی ہے۔ اس کا نام کورا ہے۔"

میں نے شروع سے آخر تک تمام روداد انھیں سنا دی۔ میں نے ان واقعات اور جواہر کا واسطہ ذکر نہیں کیا جو ہمارے گھر میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ تبت کے قبیلے جاگ کی جاتو سردار ہے۔ میں نے ذرا سی ترمیم مناسب سمجھی اور یہ کہا کہ کورا ایک سردار کی لڑکی ہے۔ نیا سردار اس کی کم عمری کے باوجود اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا تایا تھا جو اس کے باپ کی موت کے بعد اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ وہ اسے لے کے ہندوستان چلا آیا۔ نئے سردار نے ان دونوں کے پیچھے آدمی لگا دیے تھے۔ ان آدمیوں نے بھوپال میں اس کے تایا کو قتل کر دیا اور کورا چپکے سے گھر بھاگ آئی۔

مولوی صاحب نے ایک ایک بات توجہ سے سنی۔ "تمھیں یہاں آتے ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا؟ میری مراد ان لوگوں سے ہے جو تمھارا تعاقب کر رہے تھے۔"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ پھر ہوٹل سے روانہ ہونے تک پہنچنے کا واقعہ تفصیل سے انھیں سنایا۔ "ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں کل تک اپنے شہر لے چلیے۔ وہاں کچھ بھی کر دیجیے گا۔ میں وہاں کام کروں گا۔ آپ پر بوجھ ہرگز نہیں بنوں گا۔ کورا کے لیے میں سب کچھ کروں گا۔ مزدوری کروں گا۔ بوجھ ڈھوؤں گا۔ ہمیں صرف سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے۔"

مولوی صاحب چند لمحوں تک خاموش بیٹھے۔ ان کی یہ خاموشی ہمیں گراں گزری۔ ہم عدالت میں کھڑے ہوئے تھے اور ان کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔ انھوں نے اچانک اپنے دونوں بازو وا کیے اور کھڑے ہو گئے۔ پھر انھوں نے ہم دونوں کو سینے سے لگا لیا۔ "بابر! کورا!" انھوں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اچھا ہوا کہ تم دونوں واپس آ گئے۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ البتہ غلطی ضرور کی ہے۔ یہ غلطی [illegible] ہی سے ہوتی ہے اور تم تو ابھی بچے ہو۔

جو غلطی ہو گئی اسے بھول جاؤ۔ وہ ماضی کا حصہ بن گئی۔ تم نے اس چھوٹی عمر میں بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ اب تم فکروں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ میں تمھاری دیوار بنوں گا۔ یہ تمھارا گھر ہے۔"

"مولوی صاحب!" ہم سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بس ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس رات ہم کوئی چار پہر کے بعد اطمینان اور سکون کی نیند سوئے۔

❤

اب اس شہر میں ایک پل بھی ٹھہرنے کا جواز نہیں تھا مگر مولوی صاحب نے تین دن بعد جانے کا پروگرام بنایا۔ انھیں کچھ کام نمٹانے تھے اور ان کا خیال تھا کہ جب ہم نکلتے آئے ہیں تو ان کے ساتھ کچھ سیر و تفریح بھی کر لیں۔ اب وہ مجھے بے چارہ بے خبر لڑکا سمجھنے لگے۔ انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی۔ کبھی باہر نہ جانے دیا۔ ہمیں گھما پھرا کے صرف دو دنوں میں انھوں نے ہمارے تمام خوف اور رنج کو دھو دیا۔ کورا بھی ان کی خوب خدمت کرتی رہی۔ کورا کو مولوی صاحب کی شکل میں ایک مشفق باپ مل گئے تھے۔ ان دو دنوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ انھوں نے میرے اور کورا کے لیے نئے نئے کپڑے خریدے۔ چادریں خریدیں۔ گھر کا کچھ سامان لیا۔ پھر تیسری رات کو دریا کا منظر دکھانے کے لیے لے گئے۔ میں جہاں جہاں گیا ان سے سنسان مقامات پر بیٹھنے کے لیے زور دیتا رہا۔

ہم دریا کے ایک خاموش کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا ساتھ لے گئے تھے۔ کورا نے کھانا پکایا۔ منظر ایسا دلکش تھا کہ اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ ابھی ہم کنارے کنارے چل رہے تھے۔ مولوی صاحب سب سے آگے تھے۔ کورا ان کے پیچھے، میں کورا کے پیچھے۔ سامنے سے تین چار آدمی آتے ہوئے نظر آئے۔ تاتا فانا ان میں سے ایک نے بڑھ کے مجھے اس شدت کا دھکا دیا کہ میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ پھر کورا کی گلا پھاڑ چیخ بلند ہوئی اور سرد ہو گئی۔ مولوی صاحب نے شور مچایا۔ دو آدمی کورا کو اٹھا کے ایک طرف بھاگے۔ تیسرا مجھ پر جست لگانے کے لیے بڑھا۔ میں نے چاقو کھول لیا تھا۔ چاقو اس کے پیٹ میں اتر گیا۔ اس کی ایک کربناک چیخ ابھری۔ میں اس کے جسم سے چاقو کھینچ کے دیوانوں کی طرح آگے بڑھا۔ جو شخص مولوی صاحب سے زور آزمائی کر رہا تھا میں نے پیچھے سے اس کی پیٹھ میں چاقو اتار دیا تھا۔ مولوی صاحب آزاد ہو کے ان لوگوں کی طرف بے تحاشا بھاگ رہے تھے کیونکہ وہ لوگ کورا کو لے کے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ مولوی صاحب بچاؤ بچاؤ کی آوازیں لگا رہے تھے۔ مجھے دوسرے شخص کی پشت سے چاقو نکالنے میں دیر ہو گئی کیونکہ چاقو اس کی کمر میں پورا دھنس گیا تھا۔ اس نے وار کرتے ہوئے مجھے دبوچ لیا۔ مجھے سنبھلنے کا موقع نہ ملا اور میں نے اس کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ وہ بلبلایا ہوا مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹا۔ میری ایک لات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ پشت کے بل گرا۔ چاقو زمین پر پڑا تھا۔ اسے اٹھا کے میں نے اس کی پسلی میں اتار دیا اور ایک لمحے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ کسی جگہ سے اس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ پھر میں نے آگے کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ اندھیرے میں گم ہو گئے تھے۔ مولوی صاحب بھی نظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں خون میں تربتر تھا۔ میں اندازہ لگا کے تیزی سے

اس سمت بھاگا جہاں مولوی صاحب بھاگتے ہوئے گئے تھے۔ اچانک کسی نے میرے پیروں پر ٹانگ مار دی۔ میں اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے نظر اٹھا کے دیکھا، وہ کانسٹیبل تھا۔ اس نے تیز سیٹی بجائی پھر چاروں طرف سیٹیاں بجنے لگیں اور جب میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو میں سپاہیوں سے گھرا ہوا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو قصہ ختم ہوا۔ کانسٹیبل میرے پاس آ گئے تھے [illegible]۔

ان میں ایک اور کانسٹیبل کا اضافہ ہو گیا۔

پہلے کے تین کانسٹیبل میرے قریب آئے تو دیکھ کے مجھے قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ آتے ہی ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کے شانے پر اپنی رائفل کے بٹ سے ضرب ماری۔ میں یہ ضرب برداشت نہ کر سکا۔ کہیں دور سے کورا کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پھر ان کے حصار سے نکلنے کے لیے زور لگایا۔ کانسٹیبل نے دوسری ٹھوکر کے لیے پیر اٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے بے دم کرتا، میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ بے اختیار ہو کے زمین پر گر پڑا۔ دوسرا کانسٹیبل چیختا ہوا میری طرف جھپٹا۔ میرا چاقو اس کے پیٹ میں گہرائی تک اتر گیا۔ پھر مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں چاقو نکالنے کی کوشش میں تھا کہ انھوں نے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ میری فریادوں اور چیخ پکار سے ان کی گرفت اور سخت ہو گئی اور کسی نے پیچھے سے میری کمر میں اس زور کا گھونسا مارا کہ میں بلبلاتا ہوا زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میں کچھ دیر زمین پر تڑپا لیکن پھر مجھے ہوش نہیں۔ سارا ہوش تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

آنکھ کھلی تو میں ننگی اور گندی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ سامنے جیل کی سلاخیں نظر آ رہی تھیں۔ کروٹ لینے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ میرے بال بکھرے اور خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ شیروانی پر سفیدی برائے نام رہ گئی تھی۔ ہر طرف خون کے دھبے تھے۔ ہاتھوں پر، چہرے پر، پیروں پر، ہر جگہ خون جما ہوا تھا۔ کمرے میں ایک قسم کی روشنی کا بلب ٹمٹما رہا تھا اور انھی سلاخوں کے پیچھے دو مسلح سنتری پہرا دے رہے تھے۔ میری آہٹ پا کے انھوں نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی پاگل کتا ہوں۔ ان کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت تھی۔ "جاگ گیا، جاگ گیا حرامی بچہ۔" انھوں نے صدا لگائی۔

ان کے صدا لگانے کی دیر تھی کہ سلاخوں کے سامنے بہت سے سپاہیوں کا اجتماع ہو گیا۔ وہ سب حیرت اور غصے سے مجھے گھور رہے تھے۔ کسی کی نظر میں ہمدردی نہیں تھی۔ طرح طرح کی گالیاں دی جا رہی تھیں۔ میری ماں اور بہن کے متعلق شرمناک تبصرے ہو رہے تھے۔ "سالا شکل سے کیسا معصوم نظر آتا ہے۔"

"ایک دم درس بُری ہے ابھی اس کی عمر تو دیکھو۔"

"یہ سیدھا پھانسی پر جائے گا، عمل کریں گے۔"

یہ سب آوازیں میرے کانوں میں چھید رہی تھیں۔ میں بار بار ان کی آوازوں سے لرزنے لگا۔ میں نے دل کو تسلی دی کہ یہ تو ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ ابھی

"تو تم تو ابھی بہت سی باتیں پردہ میں ہے میرا خیال ہے۔ ہمیں آج صبح اسے عدالت میں پیش کرنے کے لیے خاصی معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔"

"اسے خاص سنتریوں کی حفاظت میں رکھا جائے۔ پولیس میں ابتدائی بیان لیا جا چکا ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"اس مال کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" انسپکٹر نے دریافت کیا۔

"میں سمجھتا ہوں یہ ایک بیش قیمت مال ہے۔"

"مجھے تو نقلی نقرئی ہے ذرا غور سے دیکھو۔" انسپکٹر نے اُسے افسر کی طرف اچھال کے کہا۔

افسر نے گھما پھرا کے مال کا جائزہ لیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی پھر پہلے افسر نے مال دوسرے افسر کی طرف بڑھا دی۔ "کیا خیال ہے؟"

"یہ قتل کا کیس ہے۔" اُس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "میں یہ مال لا کر سیل کر دینی چاہیے اس سے پہلے کہ...."

"تمہاری رائے صحیح ہے۔" انسپکٹر نے ہیلمٹ اُس کی زبان سے اور مال اُس کے ہاتھ سے تقریباً چھین لی اور لفافے میں بند کر کے اسے سیل کر دیا۔ لفافے پر تینوں پولیس افسروں نے دستخط کیے اور اسے ایک الماری میں مقفل کر کے الماری بھی سیل کر دی گئی۔ "تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟" انسپکٹر نے گرجدار آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "ورنہ ہم تمہیں تمہارے اس ابتدائی بیان کے بعد عدالت میں پیش کر دیں گے۔"

"مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

میری انگلیوں کے نشانات لے کے مجھے پھر حوالات کی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔ صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میں ایک کونے میں سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ میں نے تھانے اور حوالات کے بہت قصے سن رکھے تھے اور بہت کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں کئی بار روزانہ تھانے کی عمارت سے گزرتا تھا لیکن اندر سے تھانہ کبھی نہیں دیکھا تھا اور میری کسی پولیس والے سے بھی دوستی نہیں تھی۔ محلے کا ایک شخص پولیس میں ملازم تھا۔ محلے والوں کے چہرے سے ڈر لگتا تھا کیونکہ ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ اس وقت حوالات میں بیٹھا تھا۔ ایک جیتے جی ایسا کیا ہو گیا۔ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ اگر کسی طرح ابا اور امی کو خبر ہو گئی کہ اُن کا بیٹا قاتل ہو گیا ہے تو اُن دونوں کی حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ کمزور ٹانگوں سے اتنی تیز دوڑنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے اب پچھتانے کا کیا فائدہ ہے۔ میں نے اعتراف کر لیا ہے اور مجھے قتل کی سزا ابھی معلوم ہے۔ کاش سزا پانے سے پہلے مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کرن محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ کاش ایسا ہی ہو ورنہ میری روح بے چین رہے گی۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے تو مولوی صاحب کو منع کیا تھا کہ وہ رات کے وقت دریا کے کنارے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو بہت سے دریاؤں کے کنارے جا کے سیر کریں گے مگر مولوی صاحب نے شوخی کی اور مجھے یہاں جہنم میں پھنسا کے نہ جانے کدھر چلے گئے۔

ممکن ہے مولوی صاحب کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ وہ تنہا دو بدمعاشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ صحیح و سلامت ہیں تو مجھے ضرور پوچھنے آئیں گے۔ شاید آ جائیں یا شاید نہ آئیں جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ میری گردن پر تین آدمیوں کا خون ہے تو وہ وہیں میرا رشتہ توڑ لیں گے اور کسی الجھن سے بچنے کے لیے میری خیر خبر لینے نہیں آئیں گے اور اگر وہ کرائے کے غنڈوں کے قبضے سے آزاد کرا لیے گئے یا بچ گئے، جس کا امکان بہت کم ہے تو بھی وہ ادھر نہیں آئیں گے انھیں سارا معاملہ معلوم ہے وہ مجھ سے کسی طرح اپنا تعلق ظاہر کرنا نہیں چاہیں گے پھر پولیس اُن کے سراغ میں لگ جائے گی اور کرن تک پہنچ جانے کی ... مولوی صاحب کا نہ آنا ہی بہتر ہے وہ بیچارے میری وجہ سے کیوں الجھن میں پڑیں۔

علی الصباح سنتری مجھے انسپکٹر کے کمرے میں لے جا رہے تھے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لیکن اب کسی زخم کا احساس نہیں تھا مردہ آدمی کو زخم کہاں ستاتے ہیں۔ میں نے جھرجھری لی ... حوالات کی کوٹھڑی سے بھی اجنبیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک سنتری نے سلاخوں سے پانی کا گلاس اندر کر دیا۔ "منہ دھو لے۔" اس نے حقارت سے کہا۔

منہ کس کے لیے دھوؤں؟ سنتری اور تھانے دار کے لیے؟ میں نے گلاس لے کے دو گھونٹ پیے منہ پر پانی مارا اور کرتے سے پونچھ کے پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ سنتری نے پھر ایک گلاس چائے سلاخوں سے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ تشتری میں کالا پانی انڈیل دیا گیا تھا۔ کبھی گلاس میں چائے نہیں پی تھی مگر حوالات میں بھی پی نہیں سکا تھا۔ صبر کر کے ایک گھونٹ حلق سے اتاری۔ پھر یاد آنے لگا امی، بھائی، ابا، امی اور کرن، دعا نے کو رات پہ کیا گزر رہی ہوگی؟ میں نے آہستہ آہستہ ... بے اختیار رونا آ گیا۔ سنتریوں نے بھی میری ہچکیوں کی آواز سن لی ... آنسو پونچھے ... کہ یہ خبر نہیں ہوئی کہ کرن کہاں ہے اور کرن جس کے سامنے مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ پھر میں اپنے سے بیگانہ سو گیا۔

سنتریوں نے اندر آ کے مجھے جھنجھوڑا تو مجھے اپنا پتہ چلا۔ "تمہیں عدالت میں چلنا ہے۔" سنتری کی آواز میں پہلے جیسی گرج نہیں تھی۔ ... اُس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں ... تھانے کی چار دیواری سے باہر کھڑی ہوئی بند گاڑی کے قریب مجھے دوسرے سپاہیوں کے سپرد کر دیا گیا اور انھوں نے مجھے گاڑی میں ٹھونس دیا۔

کوئی ایک میل راستہ طے کیا ہوگا کہ میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے سپاہی نے تاسف سے کہا۔ "کیا کر لیا تم نے بھی، صورت شکل سے تو تم شریف ..."

میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "کیا تم خاموش نہیں رہ سکتے؟"

"تیری مرضی بھی، مجھے تجھ پر ترس آتا ہے۔" سپاہی نے ہمدردی سے کہا۔

"میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا کم عمر قاتل نہیں دیکھا۔"

میری خاموشی پر سپاہی بھی چپ ہو گیا۔ گاڑی معتدل رفتار سے چلتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔ سپاہیوں نے مجھے اشارہ کیا۔ "چلو نانا جان کے پاس چلو، چاہو تو بیان بدل دینا۔ میں پیر صاحب سے تیرے لیے ضرور دعا کرواؤں گا۔" ایک سپاہی نے چپکے سے کہا۔

وہ میرے اردگرد گھیرا ڈالے ہوئے ایک بڑی عمارت میں داخل ہو گئے۔ عدالت میں معمولی بھیڑ تھی۔ مجرم، سپاہی، وکیل، محرر، گواہ، تماش بین، اہلکار ہر قسم کا آدمی نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آج ہی سب کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ چار سپاہیوں اور انسپکٹر کی نگرانی میں مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ہر شخص مجھے دیکھ رہا تھا۔ لوگ اشارے کر رہے تھے اور جن کی نظریں مجھ پر نہیں پڑی تھیں انھیں میرے دیدار کے لیے اکسا رہے تھے۔ وہاں وہی سرگوشیاں تھیں۔ انسپکٹر میرے متعلق اشارے اور سرگوشی سے بے نیاز فخر کے ساتھ ہجوم کے درمیان گزر رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ ایک کمرے میں داخل ہو کے انسپکٹر نے مجسٹریٹ کے سامنے میری فائل پیش کر دی۔ میں قریبی دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔ فائل کے سرسری مطالعے کے بعد مجسٹریٹ نے عینک اُتار کے میرا جائزہ لیا۔

"یہ ہے وہ؟" اُس نے متعجب ہو کے پوچھا۔ "یہ، یہ قاتل ہے؟"

"جی جناب عالی! اس نے اعتراف کر لیا ہے۔" انسپکٹر کے اشارے پر مجھے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔

اُس نے پھر عینک چڑھائی اور فائل پڑھنے لگا۔ "یہ بیان اسی کا ہے؟" اُس نے تذبذب سے پوچھا۔

"جی جناب عالی!" انسپکٹر نے مختصر جواب دیا۔

مجسٹریٹ کچھ دیر کشمکش میں مبتلا رہا۔ "تمھیں مزید تین دن کا ریمانڈ ملتا ہے۔" اس نے انسپکٹر سے کہا۔ "حالانکہ یہ کیس تو صاف ہے۔"

"ہماری تفتیش مکمل نہیں ہوئی ہے جناب عالی!" انسپکٹر نے مودبانہ کہا۔ مجسٹریٹ نے کاغذ پر دستخط کر کے فائل پیش کار کی طرف بڑھا دی۔ مجھے ... لیا گیا تھا پھر انسپکٹر اور مجسٹریٹ کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ ... سرگوشی سے ہی ظاہر ہوتا تھا کہ مجسٹریٹ پر حیرت طاری ہے وہ کبھی میری شکل دیکھتا تھا کبھی انسپکٹر کی۔ فائل کی کارروائی مکمل ہو جانے کے بعد مجھے عدالت سے اٹھا لیا گیا اور جس طرح لایا گیا تھا اسی طرح ... کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔

دوپہر کو ایک جلی ہوئی روٹی اور پتلی دال سلاخوں کے اندر سرکا دی گئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے شاید بھوک لگی ہوگی۔ میں نے ... اُن سے کہا۔ "اسے لے جاؤ۔"

"کیوں؟ میاں جی کھانا۔" سنتری نے پچکار کے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیا کھانا پسند نہیں آیا؟ یہاں گوشت اور حلیم کی ریڑی نہیں ملتی۔ یہاں بھی اپنی عادت ڈالو، آگے بھی یہی کھانا ہے گا۔"

دال اور روٹی شام تک یوں ہی پڑی سڑتی رہی اور میں ایک گوشے میں سکڑا سمٹا بیٹھا رہا۔ شام تک کمزوری میں اور اضافہ ہو گیا۔ آنتیں بل کھا کے تڑپ رہی تھیں۔ اچانک بھوک کی ہوک اٹھتی تھی اور آنکھوں میں تارے ناچنے لگتے تھے۔ کبھی ایسا خوف طاری ہوتا کہ سامنے کی نظر پڑتی ... جسم میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے کی قوت بھی نہیں رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا، ویرانی اور تنہائی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دیواریں مجھ پر گر جائیں گی اور دیواروں میں ابھرے ہوئے نوکیلے پتھر میرے سر پر پڑنے لگیں گے۔

شام کو پھر مجھے انسپکٹر کے کمرے میں طلب کر لیا گیا اور رات کی تکرار کی گئی۔ میرے جوابات سے انھیں مایوسی ہوئی کیونکہ میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب کو آنا ہوتا تو اب تک آ گئے ہوتے۔ وہ کرید کرید کے مجھ سے مختلف قسم کے سوال کرتے رہے پھر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ اس بار اُن کے چہروں پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ اُن کی آپس کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ پولیس مقتولوں کے گروہ سے کچھ معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اُن کے تجزیوں کے مطابق دونوں مقتول محلے کے اوسط درجے کے بدمعاش تھے۔ اُن کے ساتھیوں سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن کوئی تسلی بخش معلومات نہیں معلوم ہو سکیں۔ سب نے شاید لاعلمی ظاہر کی تھی۔ پولیس کو موقع واردات سے بھاگنے والے دو بدمعاشوں کا بھی کچھ علم نہیں تھا اس لیے کہ اُن کا ذکر ہی نہیں کیا جا رہا تھا۔ اگر پاسبانوں نے صرف مجھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مولوی صاحب، کرن اور باقی دو بدمعاش سپاہیوں کی نظروں سے بچ گئے۔ میرا واقعہ ہی اتنا سنگین تھا کہ وہ کسی دوسری طرف توجہ دیے بغیر ہی ... تھے ورنہ تیر اُن کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ مجھے آخری بار دور سے کرن کی ایک چیخ سنائی دی تھی جو شاید انھوں نے نہیں سنی تھی۔ اگر مولوی صاحب کرن کو چھڑانے میں کامیاب بھی ہو گئے اور پولیس نے مطلوبہ بدمعاشوں سے ... اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں جائے واردات پر اپنی موجودگی کا اقرار کر لیں گے۔ پھر مجھے بار بار بلایا جاتا رہا اور مجھے بتایا گیا کہ مقتولین کی لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے ظاہر ہے کہ زخموں کے نشانات اسی چاقو سے لگائے گئے ہیں جس کی ملکیت کا میں نے پہلے ہی اقرار کر لیا۔

ایک دن گزر گیا میرے معدے میں غذا کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔ دوسرے دن دوپہر مجھے جبراً کھانا کھلایا گیا اور شام کو میرے منہ پر طمانچے مارے گئے تاکہ میں اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤں۔ وہ لوگ مجھے ڈرانے کی کوشش کرتے تھے، دھمکاتے تھے اور مجھ پر تشدد بھی کرتے تھے لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ میں اپنے پچھلے بیان پر اصرار کرتا رہا۔ میں نے چیخ چیخ کر اُن سے کہا۔ "جب ...

تھا اور غنڈوں کے ایک بڑے گروہ کا سرغنہ۔ مغل پیشے سے تعلق رکھتا
تھا۔ جنہیں میں اُس کے ساتھ پہلے پہل ایسے حالات میں پیش آتے کہ اُس نے
اپنا آبائی شہر چھوڑ دیا اور کلکتے چلا آیا اور یہاں ترقی کرتے کرتے وہ
بدمعاشوں کا بادشاہ بن گیا۔ وہ اونچی اونچی کوٹھی کی سی باتیں کرتا تھا۔
معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ بارہا جیل آ چکا تھا۔
یہاں کے سب لوگ اُس سے واقف تھے ہماری کوٹھری پر تعینات سنتری
بھی اُسے اچھی طرح جانتا تھا جب رات کا کھانا آیا تو سنتری نے چپکے سے
ایک تھیلا اُس کی طرف اُچھال دیا۔ اس میں سموسے رکھے تھے۔ مغل
نے کھانے پر مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا اور چار دن بعد نہ جانے کیوں میں نے
بہت اطمینان سے جیل کا کھانا کھایا۔ پتلا شوربہ، ادھ کچی روٹیاں اور دال
چاول [illegible] کے تھے۔

رات کو ہم دونوں ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ میرے ساتھ مغل کے
رویے میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی ہم اپنے بازوؤں کا تکیہ بنائے ایک دوسرے
کے سامنے کروٹ لیے لیٹے تھے۔ اگر مغل نہ ہوتا تو مجھے جیل کے آداب سمجھنے
میں بڑی دشواری ہوتی اور اس مختصر تاریک کوٹھری میں میرا دم نکل جاتا۔
میں نے دیکھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے کہیں گم ہو جاتا ہے۔ پھر اچانک چونک کر
آہیں بھرنے لگتا ہے پھر اچانک ہڑبڑا کے مجھ سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔
میں نے اپنے بارے میں اُسے کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا لیکن مجھے احساس تھا
کہ اُسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا ہے۔ وہ ہنستے اور قہقہے لگانے لگتا
تھا۔ اُس نے میرا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ مجھے مسلسل لاڈلے کہہ کر ہی مخاطب
کر رہا تھا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں آدھی رات کے وقت اُٹھ کے کوٹھری
میں ٹہلنے لگا۔ بیڑیوں کی آواز سے سنتری چونک گئے۔ اُنھوں نے مجھے
حکم دیا کہ میں چپ چاپ لیٹ جاؤں۔ شاید مغل بھی جاگ رہا تھا سنتری کی
آواز سن کر اُس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ سناٹے میں اُس کی جمائی جیسی
کی آواز دور تک گئی ہوگی۔ اُس نے گھرے ہوئے لہجے میں آواز بلند کی۔
"کیا ہے سنتری! کیوں بگڑ رہے ہو؟ ابھی نیا نیا ہے۔ جیل رات اسی طرح
گزرتی ہے رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سو جا
لاڈلے سو جا، یہ تو باہر ہی سے حکم لگایا کرتے ہیں، اندر آ کے دیکھیں
تو نانی یاد آ جائے۔ زمین کتنی سخت ہوتی ہے۔"

میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ سیلن اور تاریکی کی وجہ سے
کوٹھری میں طرح طرح کے کیڑے مکوڑے موجود تھے۔ مغل بھی میرے قریب
آ کے بیٹھ گیا۔ "لاڈلے!" اُس نے نرمی سے کہا۔ "تو تو واقعی کوئی شہزادہ معلوم
ہوتا ہے۔ اس نامراد شہر میں کیسے پھنس گیا؟"
"میں جو کچھ تھا وہ پورا ہو چکا۔" میری آواز بھرا گئی۔
"یہ چادر اوڑھ لے کیڑوں سے بچا رہے گا ورنہ تیری نازک جلد
خراب ہو جائے گی۔ اب گھر کے بستر کا خیال چھوڑ دے۔"
"کیسا گھر؟" میں نے آہ بھر کے کہا۔
اُس نے اپنی چادر میرے جسم پر ڈال دی۔ "یہ سنتریوں کی مہربانی
ہے۔ رات کو چادر دے جاتے ہیں اور صبح ہوتے ہی واپس لے لیتے ہیں۔"
"نہیں، پھر تو کیا اوڑھے گا؟ تم پریشان ہو، مجھے سب چیزوں کا عادی
ہونا چاہیے۔" میں نے چادر واپس کرتے ہوئے کہا۔
"اب یہ مت جلا لاڈلے! مغل بستر کے خرابات میں کیوں مان لیا
کہ مجھے حکم دینے کی کچھ عادت ہو گئی ہے؟"
مغل اور میں یوں ہی ساکت و صامت رات گئے تک بیٹھے رہے۔
دوسرے دن تعطیل تھی۔ اس لیے مجھے عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔ مغل
نے بتایا کہ اب مجھے سیشن کورٹ کے سپرد کیا جائے گا۔ بیانات، جرح اور
پیشی در پیشی کی انکوائری کا آغاز ہوگا۔ وکیل عدالت میں عورتوں کی طرح
ایک دوسرے کو کوسنے دیں گے اور جیلوں کی طرح عدالت کے اکھاڑے
میں داؤ پیچ اور لگائیں گے۔ وہ مجھے کچہری کی اصطلاحیں اس طرح سمجھا رہا
تھا جیسے کوئی وکیل ہو۔ دوسرے دن اس کا بڑا وکیل اُس سے ملنے کے لیے
جیل آیا۔ وہ واقعی کوئی تھا۔ سیاہ فام اور پستہ قد۔ اُس کے گال اندر
دھنسے ہوئے تھے اور ناک پر موٹی سی عینک رکھی ہوئی تھی۔ پہلے تو بڑا
وکیل مغل سے اس کے کیس کی پیچیدگی کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ مغل کے چہرے
پر تشکر تک نہیں آئی۔ پھر مغل نے اُس سے میرا تعارف کرایا۔ وکیل میری مختصر
روداد سُن کے کچھ دیر سوچتا رہا۔ مغل نے مجھے کہنی ماری۔ "دیکھا کوئی بات بنے
لا سرا ہے بحث کرنے لگا سرکاری وکیل کو ناک چنے چبوا دے گا، پھر وہ پتہ ہے
لگی کھاتا نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے جسم میں تو عقل بھری ہوئی ہے۔"
چند لمحے غور و فکر کرنے کے بعد بڑے وکیل نے مجھے مشورہ دیا کہ
میں عدالت میں اپنے بیان پر جما رہوں اور بہت کم بات کرنے کی کوشش
کروں۔ اس پر مغل وکیل کو برا بھلا کہنے لگا کہ وہ غلط مشورہ دے رہا ہے۔
"دیکھو بڑے صاحب اگر کوئی ایسا تیر چلاؤ کہ سیدھا جج کے دل میں جا کے
اترے وہ ترس کھا کے اسے ایک دم رہا کر دے۔"
"یہ ناممکن ہے، مغل!" وکیل نے سکون سے کہا۔
"ناممکن؟" مغل بھڑک اُٹھا۔ "ہر کے لونا! مجھے اس لفظ سے نفرت ہے۔"
مجھے معلوم تھا کہ وکیل کا یہی جواب ہوگا۔ اُس نے میرے معاملے میں کوئی دلچسپی
نہیں لی۔ مغل اُس پر گرم ہوتا رہا اور اسے گالیاں دینے لگا۔ مگر وکیل مغل کی
خوب سمجھتا تھا اس لیے چار پیگ باکے چپ چاپ چلا گیا۔
اگلے دن مجھے اور مغل دونوں کو ساتھ ہی گاڑی میں بٹھایا گیا۔
کچہری پہنچ کر ہم جدا ہو گئے۔ مجھے ایک جج کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ پھر پیشیوں کا
ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرکار کی طرف سے مجھے اپنی صفائی کے لیے ایک وکیل
دیا گیا۔ وکیل نے مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہا۔ اُس نے کچھ اُگلوانے کے لیے

پھر بے حد جرح بھی ہوئے مجھے ڈرایا دھمکایا بھی۔ ملازمت سے بھی پوچھا اور
غصے سے بھی لیکن میں نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ مجھے عدالت
میں پیش کیا جاتا رہا اور اُن سوالات کی تکرار ہوتی رہی جو تھانے میں کیے
گئے تھے۔ ایک ایک نکتے پر بحث ہوتی تینوں کانسٹیبل گواہوں نے میرے
خلاف بیانات دیے۔ چاقو اور بالا دونوں چیزیں عدالت میں پیش کی گئیں۔
چاقو پر میری انگلیوں کے نشانات تھے اور بالا جوہریوں کی رپورٹ کے
مطابق سچے موتیوں کا ایک بیش قیمت بالا تھا جج کی ہدایت پر مجھے ایک
ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ جس نے مختلف طریقوں اور آلوں سے میرے جسم کا
معائنہ کیا۔ پیشی والے دن مغل مجھے برنگ کہتا اور میری ہمت بندھاتا
رہتا۔ مغل کے رخصت ہونے سے مجھے اب ایک اُنسیت سی
ہو گئی تھی۔ ادھر میرا وکیل مقدمے کو نئے نئے رنگ دینے کی
کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب تک تم مجھے پوری تفصیل سے
واقف نہیں بتاؤ گے میں اندھیرے میں رہوں گا اور صحیح طرح تمھاری
وکالت نہیں کر سکوں گا۔ پیشیاں، سوالات اور بیانات ہوتے رہے۔ تین
ماہ گزر گئے۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق میری جسمانی اور ذہنی حالت
نارمل تھی لیکن اُس نے میری رپورٹ میں کوئی ایسی بات ضرور لکھی تھی
جو کئی دنوں تک بحث کا موضوع بنی رہی۔ اُس نے لکھا تھا کہ مجھے کوئی شدید
صدمہ پہنچا ہے لیکن میں عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قوت برداشت اور
مالی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا ہوں۔ ڈاکٹر نے میری عمر سولہ سال سے زیادہ بتائی
تھی۔ مقتولین کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور اُن کے ساتھیوں کے بیانات
جن باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا، دونوں وکیلوں کے درمیان
میں نوک جھونک ہوتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہائی سکول کالج
کا کوئی تقریری مقابلہ ہے جس میں سب سے اچھی تقریر کرنے والے کو انعام ملنے
والا ہے اور موضوع میری ذات ہے۔
میرے وکیل نے سارا زور بیان اس نکتے پر صرف کیا تھا کہ میں
نے جوانی جملے سے واقف کرتے ہوئے پہلے دو آدمیوں کو قتل کیا پھر
الا وحشت کا اثر تھا کہ مجھے پولیس والوں کی پشت پر بھی شبہ ہوا۔ اگر میرے
لیے یہ بہت شرم ناک بات تھی۔ میری زبان سے اپنے بارے میں ایسے الفاظ ادا
نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر مغل اُس کے بڑے وکیل اور اپنے وکیل صفائی کے
پیہم اصرار پر میں اپنے بیان میں اضافہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بڑی مشکل سے
عدالت میں میری زبان کھلی۔ بات بھی یہی تھی کہ میں نے اپنی مدافعت میں
غنڈوں پر چاقو چلایا۔ وہ مجھ سے کوئی بھی مجھ سے کچھ چھین لینا
چاہتے تھے۔ وہ صرف دو سامنے تھے اگر چار بچے ہوتے اگر دس بھی ہوتے تو
میں سب کے جسموں میں چاقو اتار دیتا۔
وکیل صفائی عدالت میں میرے ماضی کے متعلق عدالت کی رائے
معلوم کرنے اور ہمدردی حاصل کرنے کا کام انجام دیتا رہا۔ اُس نے اتنی باتیں کیں کہ پھر
بات سمجھ اور مشکل نظر آنے لگی۔ میں کٹہرے میں حیرت زدہ ہو کے اُس کے
دلائل سنتا رہتا تھا۔ اُس نے بار بار میری عمر کی طرف توجہ دلائی۔ میرے چہرے
کی شرافت پر اصرار کیا۔ جج سے اپیل کی کہ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے کی
کوشش کرے۔ اُس نے مجھے زمانے کا ستایا ہوا ایک مظلوم شخص قرار دیا۔
جو اپنا وکیل بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے ایسی ایسی جذباتی باتیں کہتے ہوئے آخر اتنا
بھی کہہ کر اگر میں جج ہوتا تو اُسے ضرور انعام دیتا۔ بڑا وکیل بھی مشوروں
میں اُس کے ساتھ شامل تھا۔ وکیل صفائی نے عدالت میں یہ شبہ ظاہر کیا
کہ ممکن ہے میرا موکل طویل عرصے پہلے کسی زبردست حادثے میں
اپنی یادداشت کھو چکا ہو اور اب ماضی کے دھندلے دھندلے نقوش
اُس کے ذہن میں رہ گئے ہوں یا اسے اپنے معزز خاندان کی نیک نامی کا
اس قدر شدید احساس ہو کہ وہ اس شرم ناک واقعے میں ان اہم ناموں اور
شخصیتوں کو رسوائی سے بچانے کے لیے ایثار پر آمادہ ہو گیا ہے۔ یقیناً اُس
نے جھگڑوں اور رسوائیوں سے بچنے کے لیے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔
ساتھ ہی اپنی حیثیت بھی مشکوک کر لی ہے۔
اُس نے عدالت پر زور دیا کہ اُس کے موکل کا کوئی خراب کارنامہ ریکارڈ میں
موجود نہیں ہے جب کہ مقتولین کا ماضی اور کردار بے حد گھناؤنا تھا۔ وہ کئی
بار جیل جا چکے تھے اور متعدد مقدمات میں ماخوذ تھے۔ بدمعاشوں کے
ساتھیوں اور رشتے داروں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وکیل صفائی
نے اس نکتے کی طرف جج کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی۔ اُس نے پُرزور
آواز میں کہا۔ "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرے موکل اور مقتولوں کے
درمیان کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُنھوں نے اسے سڑک کے کنارے تنہا
بیٹھے ہوئے دیکھا تو اُن کے خلاف کردار کی رگ جاگ اُٹھی۔ وہ وحشی ہو گئے۔"
جب سرکاری وکیل نے میرے جیب چاقو کی موجودگی کا ذکر کیا تو وکیل صفائی
نے اس کی حفاظت مند پیش کر دی کہ وہ چاقو میں نے اپنی حفاظت کے خیال سے
رکھا تھا کیونکہ میں دنیا میں تنہا تھا۔ میرے وکیل نے اصرار کیا کہ غنڈوں نے
اپنے شرم ناک منصوبے میں ناکامی کے بعد مجھ سے بالا چھیننی چاہی جو مجھے جان
سے زیادہ عزیز تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ آخر بڑا پیچیدہ جرح کا وقت آیا۔ سرکاری
وکیل نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں پہلے ہی تھک گیا تھا پھر وہ
مجھ سے جان سوز سوالات کرنے لگا۔ جہاں تک بنا، میں شرماتا اور جھجکتا ہوا
بہت مختصر جوابات دیتا رہا لیکن پھر حد ہو گئی۔ سرکاری وکیل کو معلوم نہیں تھا کہ
وہ کس سے مخاطب ہے؟ وہ اس شخص سے مخاطب تھا جسے اب زندگی کی کوئی
پروا نہیں تھی۔ اُس کے سوال جواب بہت جارحانہ ہو گئے تو میں نے بھری
عدالت میں چیخ کر کہا۔ "ایسے سوال مت کرو۔ مجھے پھانسی دے دو۔ میں قتل
کا اعتراف کر چکا ہوں۔ ایک آدمی موت قبول کرنے کے لیے تیار ہے
تم اُسے سزا دینے سے کیوں کتراتے ہو؟ موت کے لیے یہ دلیل کیوں
اور کس کا حق ہے؟ اب بہت ہو چکا بس کرو، بس کرو۔" میں نے بھرائی
ہوئی آواز میں کہا۔ "سیدھی اور صاف بات ہے، تنگ کیوں کرتے ہو؟"

نصیب میاں کی باتیں آج بہت دل کو لگیں کچھ مجھے بھی ایسی چنگاریاں ابھرتی محسوس ہوتی تھیں لیکن میں نے کتابوں کے بوجھ سے انھیں دبا دیا تھا۔ جیلر نے مجھے اپنے گھر دے جا کے بہت برا کیا۔ میں رات کو جیل کی سلاخوں سے لپٹ کر سوتا رہا اور اپنا بکھرا ہوا جسم سمیٹنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ رات بھر میں کروٹ کے بجائے رہا، وہ کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے کبھی اس طرف سے آتی رہی۔ میں سلاخوں سے اپنا سر پھوڑنے اور چیخنے لگا۔ بیرک کے سارے قیدی جاگ گئے۔ نصیب میاں مجھے اپنے پاس سے ہوا دینے لگا۔ پھر جیلر کے گھر میں میری آمد و رفت بڑھ گئی اور سونیا مجھ سے اپنے مضامین اور کتابوں کے بارے میں مشورے کرنے لگی۔ یہ دیکھ کے جیلر نے مجھ سے سونیا کو پڑھانے کی باقاعدہ فرمائش کر دی۔ میں روزانہ دو گھنٹے اس کے گھر میں بیٹھ کر سونیا کو پڑھاتا رہتا۔ سارے گھر والے میرا احترام کرنے لگے۔ یہ احترام رفتہ رفتہ ایسے تعلق میں بدل گیا جو عزیزوں کو عزیزوں سے ہوتا ہے۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی اور بی اے میں آ گئی۔ میں نے بی اے میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔

سنجیدہ، شفیق اور حسین سونیا بڑے انہماک سے پڑھتی تھی۔ ہم دونوں میں تعلیمی موضوعات کے سوا، دوسری باتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ میں جب دوپہر کو وہاں جاتا تو وہ کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوتی اور جب میں واپس ہوتا تو وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی۔ میں روز اس کی مسکراہٹ کا متوقع خوش ہو کر سوچتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے میری نظریں ٹکراتیں تو وہ کچھ لرز کے اپنی لانبی اور گھنی پلکیں جھکا لیتی۔ اس کی متانت میں ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی مگر وہ فوراً اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ شروع شروع میں سونیا کی ماں بھی ہم دونوں سے کچھ دور بیٹھی اپنا کام کرتی رہتی تھی، پھر اس نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

میں ڈیڑھ سال تک بلا ناغہ وہاں جاتا رہا۔ اب میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ جیل کے ہی معلوم تھا کہ میں وکالت کا امتحان دینے والا ہوں۔ وہ چھوٹی موٹی عرضیاں کر کے ایک ایک دو دو مہینے کے لیے میرے پاس بھیجا کرتا تھا۔ میں جیل میں ہر طرف سے ہی گزر جاتا۔ لوگ میرا حال پوچھتے، سلام کرتے ہر طرف "لاڈلے میاں، لاڈلے صاحب" ہی کی آوازیں سنائی دیتیں۔ جیل میں ان نصیب میاں کو رہائی ملی تو وہ میرے گلے لگ کے بہت رویا۔ "میں باہر آپ کا انتظار کروں گا لاڈلے صاحب۔" وہ ہر وقت شوخیاں کرتا اور چل چھریاں چھوڑتا رہتا تھا مگر رخصت ہوتے وقت بہت اداس تھا۔ جیل کے بہت سے ساتھی چلے گئے لیکن یہ تو جیل تھی قیدیوں کا بازار۔ جیل کی دکان ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ آنے والوں کو اس کے دروازے کبھی مایوس نہیں کرتے مگر واپسی کے لیے یہی دروازے بڑے تنگ ہو جاتے ہیں۔

نصیب میاں بھی چلا گیا اور اس کے جانے سے جیل خالی خالی معلوم ہونے لگی۔ سب ہی پرانے قیدیوں میں میرے سوا چند ہی قیدی اور رہ گئے تھے۔ سارے چار سال گزر گئے اور ایک دن سونیا نے مجھ سے کہا کہ جیلر کا تبادلہ ہو گیا ہے اور اب وہ لوگ جلد ہی یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔ یہ خبر سناتے ہوئے سونیا کی آواز بھرا رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ میری زبان کو تالا لگ گیا۔ تب میں نے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کی گھنی پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ میرا دل کٹ گیا۔

"ہم یہاں سے شہر چلے جائیں گے۔ پتا جی کہہ رہے تھے کہ آپ کی سزا کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔" اس نے انگلیوں سے اپنے [illegible] آہستگی سے کہا۔ "آپ وہاں تو آئیں گے نا؟"

"ہاں۔" میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

"آپ سیدھے یہیں آئیے گا؟" اس نے سرگوشی کی۔

"ہاں" میں اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکا۔

"یہاں سے چھوٹنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں معلوم" میں نے سرد آہ بھر کے جواب دیا۔

"پتا جی کہتے تھے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے وہ آپ کا بہت ذکر کرتے ہیں، آپ... آپ آئیں گے نا؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"آپ کب جائیں گی؟" میں نے اپنی آواز مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

"تین چار روز میں۔" اس نے اداسی سے جواب دیا۔

ہم دونوں دیر تک چپ بیٹھے رہے، نہ کوئی سوال نہ کوئی جواب۔ اس کی ماں نے آ کے ہمیں چونکا دیا۔ سونیا نے جلدی جلدی آنسو خشک کیے اور کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی ماں میرا حال پوچھتی رہی۔ میں سیاہ وسفید کا حال پوچھ رہا تھا۔

پرانا جیلر چلا گیا، نیا جیلر آ گیا۔ نیا جیلر بہت درشت آدمی تھا۔ اس کے آنے کے بعد جیل میں سخت احکام جاری ہونے لگے۔ قیدیوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بد منتظر کرنے سے ہونے لگے حالانکہ میرے متعلق پرانا جیلر اس سے سفارش کر گیا تھا اور میرا سابقہ ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا مگر وہ اپنی طبیعت کا غلام تھا۔ جیل کے لیے انتہائی موزوں۔ جیل کے گروہ کے لوگوں کا بھی اس نے ناطقہ بند کر دیا۔ قیدیوں کو بیرک کے باہر ملنے جلنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مجھ سے کلرکی کا کام چھین لیا گیا اور مجھے دوبارہ مشقت پر لگا دیا گیا۔ رات دن کسی وقت جیل کے حکام معائنے کے لیے آ جاتے اور نت نئے احکام صادر کر جاتے۔ جیل شعلوں کا تنور بن گیا۔ نصیب میاں اور بہت سے دوسرے ساتھیوں کے جانے سے جیل یوں بھی اجڑ گئی تھی۔ نیا جیلر آیا تھا سارا نقشہ ہی پلٹ گیا۔ پھر سونیا بھی چلی گئی۔ جیل میں جو چند گھنٹے آزادی کے مل جاتے تھے وہ بھی ختم ہو گئے۔ گھر گیا، کدا گئی، سب چلا گیا۔ جو کچھ باقی ہے یہ بھی کیوں ہے؟ مجھے بعض اوقات خود پر حیرت ہوتی کہ میں کیوں باقی ہوں! میرے باقی رہنے کی اب کسی کو بھی ضرورت ہے؟

جیل میں سختی کے اسی زمانے میں ایک نیا قیدی داخل ہوا جو مجھے بیرک کے باہر نظر آیا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا لیکن وہ مجھے شناخت نہیں کر پایا کیونکہ میرا قد درخت کی طرح لمبا اور جسم گھوڑے کی طرح پھیل گیا تھا، گالوں پر بھوری بھوری داڑھی تھی اور مونچھوں سے چہرہ اور رنگ بدل گیا تھا۔ سنتریوں کا پہرا سخت تھا مگر میں اس کے قریب پہنچ گیا اور جاتے ہی میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ وہ فوراً گر پڑا۔ میں اس پر چڑھ کے اس کا نرخرا دبانے لگا۔ سنتریوں اور دوسرے قیدیوں نے اسے میرے پنجے سے نجات دلائی۔ سب حیران تھے کہ آج یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اسے دیکھ کے میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، میرے غیظ و غضب کی ایسی کیفیت قیدیوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کئی آدمیوں نے مجھے پکڑا لیکن میں ان سب سے آزاد ہو کے اس پر پل پڑا۔ وہ میری گرفت میں آتے آتے رہ گیا اور میدان میں ادھر ادھر بھاگنے اور شور مچانے لگا۔ پیچھے پیچھے سنتری دوڑ رہے تھے۔ انھوں نے سنگینیں تان لی تھیں مگر وہ میرے پیروں پر گر گیا۔ "میں تمھیں پہچان گیا ہوں مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو۔" اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "تمھیں اپنی ماں اور بہن کی قسم، مجھے معاف کر دو۔"

میں نے اپنے مضبوط پیروں سے اس پر ٹھوکر ماری۔ "میں تجھے نہیں چھوڑوں گا کمینے۔" میں نے ہیبت ناک لہجے میں کہا۔ سنتریوں نے مجھے پکڑ لیا تھا اس کے باوجود وہ میرے پیروں پر سر رکھ کے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔ وہ کریم گل تھا، وہ ظالم کریم گل جس نے اپنی بچی کے ساتھ مل کر مجھے ایک مجرم بنا دیا تھا۔ سنتری مجھے پکڑے ہوئے تھے ورنہ میں اس کا کام تمام کر دیتا۔

"وہ کہاں ہے؟" میری گرج سے وہ لرز گیا۔

"کون؟" اس کی کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

"وہی جسے تو نے [illegible] زمانے کے ہاتھوں فروخت کر دینا چاہتا تھا کمینے مجھے بتا دے وہ کہاں ہے؟ ورنہ میں تجھے یہیں زندہ دفن کر دوں گا۔"

"خدا کی قسم مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ عاجزی سے بولا۔

سنتری مجھے پکڑ کے ایک طرف لے گئے، کچھ میرے پرانے ریکارڈ کا اثر تھا کہ انھوں نے صرف جھڑک کے مجھے چھوڑ دیا لیکن جیسے ہی میں ان کی گرفت سے آزاد ہوا، میں نے کریم گل کی گردن دبا لی۔ "مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔" سنتریوں نے مجھے دوبارہ پکڑ کے جیلر کی خدمت میں پیش کر دیا اور جیلر نے کسی تاخیر کے بغیر مجھے ایک ہفتے کی قیدِ تنہائی سے نواز دیا۔ مجھے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ سزا کاٹنے کے بعد جب میں اپنی بیرک میں واپس آیا تو وہاں جمیل پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے بچوں کی طرح [illegible] میں سمیٹ لیا۔ "بھائی! یہ تجھے کیا ہو گیا؟ تمھارا حال سن کے مجھے فوراً یہاں آنا پڑا۔" میری خاموشی پر اس نے بتایا کہ اسے کریم گل کی زبانی سارا حال معلوم ہو گیا ہے کہ کون تھی وہ لاڈلے؟

"تیرے لیے تو میں آسمان سے تارے لا سکتا ہوں! جیلوں میں کافی سے زیادہ قیدی عورتوں کی دعائیں لی ہیں۔ تو نے بہت چھپایا، لاڈلے! اب بتا، آخر ہی وہ کون تھی اور کہاں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم کہ وہ اب کہاں ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تو اتنی عمر میں تو اسے کہاں سے لایا تھا اور تیرا اس سے رشتہ کیا تھا؟ کیا تو پاگل ہو گیا تھا؟"

"مجھ سے کچھ مت پوچھو۔" میں نے اشتعال میں کہا۔

"میں جانتا ہوں میں جانتا ہوں لاڈلے!" وہ میری کمر پر ہاتھ رکھ کے بولا "تیرے ساتھ کیا گزرا ہے؟ پر یہ تو کہتا ہے کہ اس نے بُری نیت ضرور کی تھی مگر اس کے سوا کچھ نہیں معلوم۔"

"جھوٹ بکتا ہے۔"

"وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہاں اس کی بہت بری حالت ہے جس طرح خالق کی ہے اس میں آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

جمیل کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک رات بیرک میں اس کے ساتھیوں نے ایک ساتھ اسے اتنا مارا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ بیرک کے سارے قیدیوں کو سزا مل گئی۔ ان کی کمر تنگی کر کے لٹکائے رکھا گیا مگر انھوں نے اُف تک نہیں کی۔ انھوں نے میرا انتقام لیا تھا۔ پہلے پہل لاڈلا کریم گل نے اعتراف کیا تھا میرے دل سے قرار رہنے کے بعد اس کے آدمیوں نے کسی نامعلوم کا تعاقب کیا تھا جو اسے یقین تھا کہ وہ مری ہوئی نہیں ہے لیکن شکاری کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کیا۔

پھر وہ کون لوگ تھے جو ہمارا پیچھا کرتے کرتے دریا کے کنارے تک پہنچ گئے؟ کریم گل اس سے زیادہ نہیں بتا سکا۔ وہ اب بھی ایک لڑکی کے اغوا کے جرم میں سزا کاٹنے آیا تھا۔ وہ کوئی اور لوگ تھے جو ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ممکن ہے وہ اپنی بی بی اور اس کے شوہر کے زر خرید غلام ہوں۔ کریم گل نے بتایا کہ حویلی والوں کو خبر ہو گئی تھی کہ میں نے ایک کانسٹیبل کو قتل کر دیا ہے مگر انھوں نے میرے بارے میں پولیس کو بتانے کے بجائے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی کیونکہ اس طرح ان کا راز پولیس کی نظروں میں آنے کا خطرہ تھا۔ جمیل دو مہینے کی سزا کاٹنے کے بعد مجھے کہہ کے باہر چلا گیا۔ کریم گل اب دن رات میری خدمت میں لگا رہتا تھا۔ کبھی میرے پاؤں دباتا اور سر کی مالش کرنے لگتا، کبھی میرے قریب بیٹھ کے مجھے تکتا رہتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس لڑکے سے اپنا پیچھا چھڑایا۔

کریم گل کے واقعے سے جیل کے حکام کی نظروں میں میری حیثیت کمزور ہو گئی تھی۔ وہ دوبارہ سال اول کے امتحان کی کامیابی کے بعد کچھ بحال ہو گئی۔ نیا جیلر بھی احکام دیتے دیتے تھک گیا، جیل کا پہیہ پھر اپنی رفتار سے چلنے

وہ میری طرف متوجہ ہوکے تذبذب سے بولا: "تو یہاں کہاں نظر آ رہا ہے؟ تو کب آزاد ہوا؟ استاد کو خبر نہیں کی؟"

"میں آج ہی آزاد ہوا ہوں۔ استاد کے پاس نہیں گیا۔"

"کیوں؟" اُس کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"مجھے پہلے ایک اور جگہ جانا تھا۔ میں جلدی واپس آ کے استاد سے ملوں گا۔" میں نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

"نہیں لاڈلے! اگر استاد کو خبر ہو گئی کہ تو اُس سے ملے بغیر چلا گیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوگا۔ آ چل ایک بار اُسے اپنی شکل دکھا آ۔ اُسے چین آ جائے گا۔ اُس کے بعد تو جہاں جانا چاہے چلا جا۔" اُس نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہا۔

"نہیں۔ میں ابھی نہیں جا سکتا۔" میں نے اپنا کندھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت بُری بات ہے لاڈلے!" اُس نے مجھے سمجھانا چاہا۔ "تو نے جیل میں بہت پڑھا لکھا ہے پھر بھی ایسی نادانی کی بات کرتا ہے۔"

"مجھے بہت ضروری کام ہے ساوٹے! اسی لیے میں جمل بھائی کے پاس نہیں گیا کہ وہ مجھے جلدی نہیں جانے دیں گے۔"

"ابے سالے! سات سال تک اکام پڑا رہا۔ جیل سے آزاد ہوتے ہی تجھے اتنی جلدی ہو گئی۔ ابے تو بڑا بے مروت ہے۔"

"دیکھ ساوٹے!" میں نے لجاجت سے کہا: "مجھے معلوم ہے کہ یہ اچھی بات نہیں ہے لیکن تجھے اندازہ نہیں ہے کہ مجھے اس دن کا کتنے سال سے انتظار تھا۔ میں تجھ سے بنتی کرتا ہوں کہ تو استاد کو مجھ سے ملنے کی بات مت بتانا۔"

"لاڈلے! اگر استاد کو معلوم ہو گیا تو وہ میری کھال کھینچ لے گا۔"

"تو کچھ نہ بتا۔" میں نے ٹوٹتی آواز میں کہا: "کہہ دینا کہ لاڈلے بہت بُرا آدمی نکلا۔ ہو سکے تو اسے منانے کی کوشش کرنا ورنہ تیری مرضی۔"

اس دوران میں وہ دونوں غنڈے جنھوں نے میری مالا اور تعویذوں پر ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا، اُلٹے میرے اُوپر آ گئے اور ساوٹے کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ ساوٹے نے کہا: "غلط آدمی پر ہاتھ ڈال دیا۔ میری نظر بھی چوک گئی۔ لاڈلے! تجھے دیکھے ہوئے اتنے دن ہو گئے کہ میں تیرا چہرہ پہچان نہ سکا۔ یہ داڑھی تو نے کب سے بڑھا لی؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تو کہیں کا پکا ملا یا مولوی بن گیا ہے۔ تجھے کیا ہو گیا ہے پیارے؟ خیر، کوئی چکر ہے کیا؟ میں بھی نہیں پوچھوں گا۔ آ، چل چائے پی۔"

"مجھے نہیں جانا ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"ابے چل۔" اُس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا: "اور سنا باقی دن جیل میں کیسے گزرے؟ کوئی لفڑا ہوا؟ درمیان اچھا ہی نہیں پڑا کر تیرے پاس آ جاتا۔ تجھے دیکھے ہوئے تین سال ہو گئے مگر تو نے مجھے خوب پہچانا۔ میں بھی آنکھوں کو ... ایسا جیالا آ گیا جس نے ایک ہاتھ میں دو آدمیوں کا دھڑن تختہ کر دیا۔ چلو بے۔" اُس نے اپنے ساتھیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا: "لاڈلے سے معافی مانگو۔ سالے اپنے آدمی پر ہاتھ ڈالنے کا گناہ کر بیٹھے۔" پھر اُس نے اپنے گال پر چار چانٹے رسید کیے۔ "کان پکڑ بے۔" "یار معاف کر دے لاڈلے!"

"جانے دے ساوٹے! تیری اور ان کی کیا غلطی ہے۔ یہ مجھے جانتے تھوڑی تھے۔ بس ہو گیا، ہو گیا۔ اپنی سنا، شہر کیسا ہے؟ کالا تا کا تا ہے یا نہیں؟ کانٹے کا کیا حال ہے؟ بندھو کیا کر رہا ہے اور وہ جواقو باز، نیاکو؟ نصیب میاں کیا کر رہے ہیں؟"

"یار سب ایک ساتھ مل لے گا۔ میں کہتا ہوں میرے ساتھ چل۔ رات کا وقت ہے، سبھی ڈیرا ڈالے بیٹھے ہوں گے۔ سفر پہ جانا ہے تو کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہن کے جا۔ استاد جمل کا آدمی اور اس حلیے میں سفر کرے۔ استاد کے نام کی تو لاج رکھ لے یار۔"

"بس کر ساوٹے! اور نہ کر۔ کچھ ایسی ہی مجبوری ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"استاد سے مت کہنا۔ میری تجھ سے یہی التجا ہے۔"

"دیکھ بھئی لاڈلے! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو بتا۔ ہاتھ پاؤں احتیاط سے چلانا۔ ابھی سات سال کی کاٹی ہے، خیال رکھنا۔ ورنہ جہاں جا رہا ہے مجھے بھی ساتھ لے جا۔ چل میں آ کے ٹیکا دیتا ہوں۔"

"نہیں ساوٹے! میں تنہا جاؤں گا۔ بے فکر رہ، میں اپنا پورا خیال رکھوں گا اور جلدی واپس آؤں گا۔ دعا کر میرا کام ہو جائے۔"

"ابے اپنی دعا کہاں قبول ہوگی۔ ہاں، سالی بددعا کرا تو وہ دعا میں بدل جائے گی۔ چل چائے پی۔"

چائے کے اسٹال پہ آ کے ساوٹے نے نہ صرف چائے سے بلکہ اُس کے لوازم سے بھی میری خوب تواضع کی اور مجھے ٹھونس ٹھونس کر کھلاتا رہا۔ گاڑی پلیٹ فارم پہ آ گئی تھی۔ وہ آخر وقت تک اصرار کرتا رہا کہ میں ایک بار جمل سے ضرور مل لوں۔ اُس نے مجھے اپنی قمیص اور واسکٹ اُتار کے دے دی۔ اُس کے ایک ساتھی کا جوتا میرے پیر میں فٹ آ گیا۔ ایک کے گلے میں رومال بندھا ہوا تھا۔ اُس نے رومال میں مٹھائی اور بڑھیا بسکٹوں کے بہت سے پیکٹ باندھ دیے۔ پھر ساوٹے نے ان سب کو حکم دیا کہ وہ اپنی جیبیں خالی کر کے جو کچھ بھی ان کے پاس ہے میرے حوالے کر دیں۔ میں منع کرتا رہا مگر انھوں نے میری جیب میں نوٹ ٹھونس ہی دیے۔ جب تک گاڑی چل نہیں پڑی اور انھوں نے مجھے اوپر کی ایک برتھ پہ آرام سے لٹا نہیں دیا، اُس وقت تک وہ پلیٹ فارم پہ کھڑے رہے۔ گاڑی حرکت میں آتے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

*

ساوٹے یا اُس کے کسی ساتھی کی زبانی جمل کو میری رہائی کا پتا چل جائے گا تو وہ بہت برہم ہوگا مگر اُسے یہ خبر دو تین دن بعد ملتی جب جیل میں حسبِ معمول اُس کے آدمی یا وہ خود مجھ سے ملنے کے لیے آتا۔ تب بھی وہ یہ جان کے بہت ناراض ہوتا جس انداز سے ساوٹے اور اُس کے ساتھیوں نے مجھے رخصت کیا تھا۔ اُس سے مجھے یہ توقع تھی کہ وہ جمل کو نرم کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔ وہ میری سفارش کریں گے۔ اب جو بھی ہو، ساری دنیا ناراض ہے تو جمل بھی سہی۔

میں دیر تک پڑا یہی سوچتا رہا۔ گاڑی اسٹیشن پہ اسٹیشن عبور کرتی رہی۔ مجھے ایک پل کے لیے بھی نیند نہیں آئی۔ اوپر سامنے کی برتھوں پر اوپر نیچے ہر شخص سو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب میں جاگ ہی رہا ہوں تو اُس بوڑھے شخص کو اپنی برتھ کیوں نہ دے دوں جو زمین پر سکڑا ہوا بیٹھا ہے اور بار بار کروٹیں بدل رہا ہے۔ نیچے اتر کے میں نے اُسے جگایا اور اپنی برتھ کی پیشکش کی۔ وہ ہکا بکا منہ دیکھتا رہ گیا۔

"نہیں نہیں بابو جی! میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"جاؤ، مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تیرا بال بچہ نہیں ہے بابو؟" اُس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"لیٹ جاؤ۔ ٹی ٹی آنے کا تو دیکھا جائے گا۔"

وہ جھجکتا اور ممنون ہوتا اوپر چلا گیا اور میں اُس کی جگہ فرش پہ بیٹھ گیا۔ باقی رات یوں ہی بیٹھے بیٹھے گزر گئی۔ مجھے کسی کل چین نہیں تھا۔ سفر خاصا طویل تھا اور ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ کسی اسٹیشن پہ معلوم ہوا کہ ابھی مراد آباد دور ہے۔ ڈبے میں ہر شخص ایک دوسرے سے مانوس ہو گیا تھا۔ کچھ درمیان میں اتر گئے تھے، کچھ نئے سوار آ گئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بات کرنا چاہا: "کہاں جا رہے ہو؟ کیا کرتے ہو؟" میں ہوں ہاں کر کے ٹالتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے مجھ سے بات چیت کرنا بند کر دی۔ میرے کپڑوں اور بالوں میں سفر کی خاک دھول اٹ گئی تھی۔ جب میں نے باتھ روم کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو پہچاننے میں نہیں آیا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور سوچتے سوچتے تھکے ہوئے۔ دل آئینے میں نظر نہ آیا ورنہ وہ بھی سہما سہما دکھائی دیتا۔ میں کسی اور دنیا کا آدمی تھا۔ یہاں ہر شخص مجھ سے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑی رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر اسٹیشن پہ اسے لیٹ بھی ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے بریلی اسٹیشن پار کر کے لوگوں نے بتایا کہ مراد آباد اب چار پانچ میل کے قریب رہ گیا ہے۔ پھر رام پور اسٹیشن پر یہ فاصلہ گھٹ کے صرف اٹھارہ میل رہ گیا۔ میں ڈبے سے کود کے پیدل ہو گیا۔ ایک سفر کر رہا ہوں کے ساتھ کیا تھا، اپنی زندگی کا سب سے بڑا سفر۔ لالہ جی کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ بار بار ہر اسٹیشن پہ اترنے کو جی چاہتا۔ اُسے دیکھنا، اُس کا گرنگی پہ رہنا، تعویذ کے سایہ کرتی ہوئی انگلیاں، چہرے کا کھلا ہوا حصہ، وہ لرزنا۔ وہ سوچتا۔ یہاں بھی کسی اسٹیشن پہ اترنے کے میں سوچتا تھا کہ شاید وہ کہیں نظر آ جائے، شاید کوئی اتفاق رونما ہو جائے مگر اب میں اُسے پہچانوں گا کیسے؟ وہ تو نو عمر لڑکی ہوگی۔ اور بڑی ہو کے کیسی ہو گئی ہوگی۔ آنکھیں اُس کی تو نظر کے کاجل لگی ہوں گی۔ میں اُسے ہر شکل میں، ہر روپ میں پہچان لوں گا اور وہ مجھے اس حلیے میں دور سے پہچان لے گی۔ میں ہر اسٹیشن پہ مشتاق نگاہوں سے داڑھی اور شیروانی والے لوگوں کو غور سے دیکھتا کہ ان میں کوئی مولوی صاحب جیسا شخص نہیں تھا۔ کوئی کردار بھی ایسی شخصیت نہیں کہ سب کالے ناگ سمجھتے ہیں۔ گنگ ہو گئے تھے مولوی صاحب کا شخص کا اور گڑیا جیسا گڑیوں اور پریوں کا معصوم چہرہ کسی کا نہیں تھا۔

تاخیر سے ہی سہی مگر آخر گاڑی مراد آباد اسٹیشن پہ پہنچ گئی۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے والا سب سے پہلا مسافر میں تھا۔ میرے حواس بکھرے ہوئے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح باہر آیا۔ سامنے تانگے کھڑے تھے۔ میں تانگے والے کو فیض گنج کا پتہ بتا کر جلد از جلد اپنی منزل پہ پہنچ سکتا تھا لیکن اسٹیشن کے عین مقابل ایک وسیع اور پُرشکوہ عمارت پہ میری نظر گئی۔ اس عمارت پر بورڈ لگا ہوا تھا: "اسلامیہ مسافر خانہ مراد آباد"۔ عمارت کی اوپری منزل کی تعمیر شاید ہو رہی تھی۔ مسافر خانے کے ساتھ اسلامیہ کا لفظ دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں کے منتظمین سے مولوی شفیق کے بارے میں پوچھوں تاکہ ان کا مکان ڈھونڈنے کی الجھن سے بچ سکوں۔ مولوی صاحب عموماً سفر کرتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا، ممکن ہے مسافر خانے کے منتظمین انھیں جانتے ہوں۔ میں سیدھا عمارت میں داخل ہو گیا۔ میرے پاس چونکہ کوئی سامان نہیں تھا اس لیے کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔

مسافر خانے کی دیواروں پر جگہ جگہ مسافروں کے لیے ہدایتوں کے بورڈ آویزاں تھے۔ مجھے خیال آیا کہ سارے نے صحیح کہا تھا۔ مجھ کو سر پہ بڑھے ہوئے بال ضرور ترشوا لینا چاہیے تھے لیکن اتنا ہوش کہاں تھا کسے؟ میں نے اسی حلیے میں منتظم کے دفتر پہنچ کے اپنا مدعا ظاہر کیا۔

"فیض گنج؟" اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں فیض گنج کے کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں لیکن یہ زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ پتا آسانی سے دستیاب ہو جائے گا۔ یہ فرمائیے کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

میں نے جھنجلا کے جواب دیا: "کلکتے سے۔"

"آپ کا سامان کہاں ہے؟ جب تک آپ انھیں تلاش کر رہے ہیں اُس وقت تک اپنا سامان یہاں محفوظ کروا سکتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو رات کو ٹھہرنے کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔ یہ مسافر خانہ خدمتِ خلق کے لیے تعمیر کیا گیا ہے اسی لیے واجبی سا کرایہ رکھا گیا ہے جو ہر شخص آسانی سے ادا کر سکتا ہے۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر مسافر خانہ کہیں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے پہلے آپ نہا دھو کے لباس تبدیل کر لیجیے۔ عمارت کے باہر دکانوں میں حجام موجود ہیں۔ کھانے پینے کا بھی معقول انتظام ہے۔ پھر اطمینان سے مولوی صاحب کی تلاش میں نکلیے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔"

میں اس باتونی منتظم کا شکریہ ادا کر کے اور مسافر خانے کے انتظام کی تعریف کر کے باہر نکل آیا۔ وہ توقع سے زیادہ خوش اخلاق شخص

تھا وہ میرے پیچھے پیچھے آیا لیکن میں تیز رفتاری سے ایک تانگے میں
بیٹھ گیا تھا۔ "کہاں صاحب؟" تانگے والے نے کبیدہ ہو کے پوچھا۔
"نیش گنج" میں نے مختصر جواب دیا۔
"پھر اور سواریاں بٹھا لوں؟"
"نہیں۔ میں پورے تانگے کا کرایہ ادا کر دوں گا۔ جلد سے جلد
چلو۔" میری عجلت پسندی نے پہلے گھوڑے کو دیکھا اور گھوڑے کو ایک
چابک رسید کیا۔ تانگا چلا اور مراد آباد کی سڑکوں پر سرپٹ جانے
لگا۔ مراد آباد گیا ہی کی طرح کا اوسط درجے کا شہر معلوم ہوتا تھا لیکن یہ رونق
یہاں گیا سے زیادہ تھی۔ تانگے والے نے حسبِ عادت مجھ سے مختلف
سوالات کرنے چاہے میں نے ٹال دیا۔ تانگا ایک لمبی سڑک سے
گزر کے پُر رونق بازار میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک گنجان علاقہ تھا۔
"نیش گنج میں کہاں اتریے گا؟" تانگے والے نے پوچھا۔
"یہاں نیش گنج میں اتار دینا۔"
تانگے والے نے مڑ کے گھوڑے کو ایک گالی دی۔ بیچارے
گھوڑے نے تو شاید ہی سنی ہو گی، یا گھوڑا گالیوں میں تمیز کرتا ہو گا
کون سی اُسے دی گئی ہے اور کون سی مسافر کو۔ میں چپ چاپ بیٹھا
رہا۔ ڈھائی تین میل کے سفر کے بعد تانگا ایک جگہ رک گیا۔ "لیجیے سرکار
جناب کا نیش گنج آ گیا۔ دیکھیے سامنے چوکی ہے نیش گنج پولیس چوکی" تانگے
والے نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ
رکھا تو اُسے اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی۔ مراد آباد میں [illegible]
سرکار؟" اُس نے پُر تکلف انداز میں کہا۔ "میرا نام خیر الدین ہے۔ لوگ مجھے
خیرو کہتے ہیں۔ یہیں نیش گنج کے قریب کیمپ کے قریب رہتا ہوں۔ گھر اور
[illegible] اسٹیشن پر ہے۔ مجھے بتا دیجیے گا صاحب کہ آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟
ابھی کچھ دن تو قیام رہے گا؟ جب ضرورت ہو بلا لیجیے گا۔"
"ٹھیک ہے" میں کوٹھی کی تلاش کے بہانے ایک گلی میں گم ہو گیا۔
نیش گنج ہے۔ کاش یہاں کہیں قریب ہی کرامت موجود ہوتا۔ اس کے تصور
سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے کلکتے
کے پتے سے آنے والے خطوں کا جواب دانستہ نہ دیا ہو اور اپنے کسی
عزیز سے جواب لکھوا دیا ہو کہ وہ تو جب سے کلکتے گئے ہیں واپس ہی
نہیں آئے کیونکہ خیال ہے مولوی صاحب نے ہر ممکن احتیاط برتی
ہوگی۔ کاش مجھے اُن کے گھر کا پتہ معلوم ہوتا اور میں اُن دونوں کو چونکا
دیتا۔ چند ہی لمحوں کی خوش خیالیاں تھیں، ہوا کی طرح گزر گئیں۔ گلی میں
چند لوگ نظر آئے میں نے ان میں سے معقول شکل و صورت کے ایک
شخص کو روک کے مولوی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ وہ میری [illegible]
کرنے کے بجائے حیرت میں پڑ گیا۔ "مولوی محمد شفیق؟" اُس نے ماتھے پر
انگلی مارتے ہوئے آنکھیں مٹکا کے کہا۔ "ہاں ہاں۔ وہ۔ اب تک کہیں
اُن سالا کی تو بات نہیں کرتے ہیں جو عرصے سے نظر نہیں آئے۔ ہاں کچھ
سُنا تو تھا کہ وہ کسی اور شہر میں جا کے بس گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔ بہر حال وہ
اب اس محلے میں نہیں رہتے۔ شہر میں رہتے تو کہیں نظر آتے۔ خدا جھوٹ
نہ بلوائے میں نے انھیں برسوں سے نہیں دیکھا۔"
مراد آباد کا یہ شخص باتونی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس کی زبان
روکی۔ "اب وہ یہاں نہیں رہتے؟" میں نے تحیر آمیز لہجے سے پوچھا۔
"ہاں صاحب۔ وہ یہاں نہیں رہتے۔ بالکل نہیں رہتے۔ اتنی بات تو
میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کہاں رہتے ہیں تو یہ
نہیں جانتا۔" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔
"اُن کا کوئی عزیز وغیرہ؟" میں نے نیم رازدانی لہجے میں کہا۔ "وہ اسی
شہر میں پیدا ہوئے تھے کوئی رشتے دار تو کوئی تو ہو گا جسے اُن کے
بارے میں کچھ علم ہو۔"
"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُن کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی
اور اُن کے والدین بھی نہیں ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ یہاں پیدا ہوئے
تھے اور اگر وہ یہیں پیدا ہوئے تھے تو اُن کے والدین کے بارے میں یقین
سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں باہر سے آئے ہوں۔
اس صورت میں عزیزوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دُور کیوں جائیے
یہ تیلی کو دیکھ لیجیے میں یہاں پیدا ہوا یہیں پلا بڑھا لیکن میرے ابا
بارہ بنکی سے آئے تھے۔"
"جناب جناب! کوئی بزرگ کوئی تو ایسا ہو گا جو ان کے بارے
میں آپ سے زیادہ جانتا ہو۔ ازراہِ کرم مجھے ایسے کسی شخص سے ملوا دیجیے۔" میں
نے تحمل سے کہا۔
"کیوں نہیں ہو گا۔ ایسے کوشش کر کے دیکھتے ہیں لیکن آپ نے
اپنا اسمِ گرامی اور دیگر حالات سے آگاہ نہیں کیا۔ خادم کو شبیر حسین کہتے
ہیں۔ [illegible] میں ملازم ہوں۔" اُس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
میں نے سرسری طور پر اپنا تعارف کرایا۔ ایک گھر دوسرا گھر تیسرا
گھر، وہ شریف آدمی اپنا کام چھوڑ کے مجھے کئی گھروں میں لے گیا۔ کسی نے
کچھ بتایا کسی نے کچھ۔ آخر ایک صاحب مولوی صاحب کے کچھ قریبی عزیز
نکل آئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کے بہت سے عزیز شہر کے
مختلف محلوں میں رہتے ہیں لیکن مولوی صاحب نے شروع ہی سے
اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ رکھا تھا۔ وہ لوگوں سے بہت کم ملتے
تھے اور زیادہ تر مطالعے میں مصروف رہتے تھے یا سفر کرتے رہتے تھے۔ مجھے
یاد آ رہا ہے کہ ایک رات انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ اُن کا کوئی
نہیں ہے۔ خاندان کے نام پر صرف ایک بہن ہے اور اس سے بھی ملے
عرصہ ہو گیا ہے۔ میں رات ہونے تک مختلف محلوں میں اُن کے عزیزوں
کے گھروں کے چکر لگاتا رہا لیکن ہر جگہ سے مایوسی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا

تھا جیسے مولوی صاحب کی کسی کو فکر ہی نہیں ہے۔ جس شخص سے بھی پوچھا،
اُس نے یہی کہا۔ "ہوں گے کسی پُر فضا مقام پر دوسروں سے دور
بیٹھے یا سیاحت کر رہے ہوں گے۔" تعجب ہے کہ اُن کے دو چار قریبی
عزیزوں نے بھی اُن سے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ مولوی
صاحب بڑی جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی گفتگو میں
شائستگی تھی اور لوچ تھا۔ وہ بہت جلد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے
تھے۔ لباس بہت عمدہ پہنتے تھے۔ بڑی نفاست سے رہتے تھے۔
احتیاط پسند ضرور تھے مگر ملاقاتی کے دل میں دوبارہ ملنے کی خواہش
یقیناً پیدا کر دیتے تھے۔ ایسی باغ و بہار شخصیت سے اُن کے عزیزوں
کی بے تعلقی اور لاعلمی عجیب بات تھی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔
خود میں بھی اپنے عزیزوں، محلے کے لوگوں اور گھر والوں سے الگ
تھلگ رہتا تھا۔ جیل میں ہم سب قیدی ایک ہی بیرک میں رہتے تھے
مگر میں حقیقت میں کبھی اُن کے ساتھ نہیں رہا۔ میں تو ہمیشہ کورا کے
ساتھ رہا۔
کتنے ہی گھر دیکھ ڈالے۔ اُن کے کتنے ہی عزیزوں سے
پوچھا۔ مولوی صاحب کے ذکر پر کچھ لوگ تو مجھ سے اُن کی شکایت
کرنے لگے کہ وہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ اُن کے والد کے
انتقال پر لوگوں نے اُن کی خبر گیری کرنی چاہی تھی مگر وہ کسی دینی
درسگاہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کے آئے
تو عزیزوں نے اُن سے شادی کرنے اور گھر بسانے کی خواہش ظاہر کی
انھوں نے انکار کر دیا۔ جب وہ خود ہی اپنے رشتے داروں کی فکر
سے آزاد تھے تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ اُن کی فکر کرتا۔ فکر ہی تو اُن
لوگوں کی کی جاتی ہے جو خود کسی کی فکر کرتے ہیں۔ محبت تو ایثار کا
باہمی معاملہ ہے مگر کچھ لوگ اس سے بلند ہوتے ہیں۔ وہ بڑی بے
[illegible] کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ [illegible]
گویا مولوی صاحب کلکتے کے مدرسے میں اپنا سامان واپس لینے نہیں
آئے اور بنگلور بھی نہیں آئے ہیں اس کے باوجود مراد آباد میں اُن کا نام جاننے والوں
کے حلقوں پر دستک دیتا رہا۔ بہت سے نیک لوگوں نے مجھے اپنے
گھر کا مہمان بنانے کے لیے اصرار کیا۔ میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔
حالت خاصی خراب ہو گئی تھی۔ اگر کچھ اور وقت ملتا تو میں مزید لوگوں سے
رابطہ قائم کرتا۔ تھک ہار کے میں مسافر خانے چلا آیا اور رات گہری
ہو گئی۔ ریل کی دو راتیں بھی جاگ کر گزری تھیں مگر نیند تو جیسے
آنکھوں سے غائب تھی۔ دل اُترا اُترا سا تھا۔ بُری طرح تھکا ہوا
تھا۔ بعض گھروں میں چائے، شربت، حلوے وغیرہ سے تواضع کی گئی تھی۔ وہ بھی
پیٹ میں پڑ گیا تھا۔ جیل سے باہر کی دنیا بہت وسیع تھی۔ صبح اُٹھ
کے میں پھر محلے محلے گھومتا رہا۔ بعض لوگوں سے دوبارہ ملاقات
ہوئی۔ اتنا ضرور پتہ چلا کہ مولوی صاحب کی والدہ بھی شاید حیدرآباد
دکن میں رہتی تھیں۔ کسی کو اُن کا پتہ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں مراد آباد کی
ایک مسجد میں بھی گیا جہاں ایک بڑی درس گاہ تھی۔ مولوی صاحب
دینی تعلیم دیتے تھے۔ یہاں بھی مولوی صاحب کا کوئی سراغ نہ ملا۔
کلکتے کے مدرسوں کی طرح وہ سب بھی مولوی محمد شفیق کی روپوشی
پر حیرت زدہ تھے۔ میں پوچھتا پوچھتا مراد آبادی برتنوں کی ایک دکان
پر بھی گیا۔ ان کے برتنوں کے نمونے دکھا کے مولوی صاحب مختلف
شہروں سے آرڈر لیا کرتے تھے اور انھیں مراد آباد بھیج دیا کرتے
تھے۔ یہ مولوی صاحب کا جز وقتی کام تھا۔
جہاں بھی مولوی صاحب کی خیر خبر کا ذرا امکان ہوا، میں وہاں
ایک پیشہ ور سُراغ رساں کی طرح گیا۔ دو دن میں مراد آباد کے بہت
سے لوگ مجھ سے واقف ہو چکے تھے۔ مراد آباد کے آخری کنارے کے
محلے کٹ گھر سے لال کُرتی تک، دیوان کا بازار، محلہ پیر غیب، [illegible]
مفتی ٹولہ، بھٹی محلہ، محلہ [illegible]، گل شہید، مغل پورہ، محلہ قانون
گویاں، مسلمانوں کے جتنے بھی محلے تھے میں مسلسل تین دن تک
اُن کی خاک چھانتا رہا۔ ان تین دنوں میں میری حالت اور خراب
ہو گئی۔ کپڑے سیاہ ہو گئے۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ مجھے پاگل کہا
جانے لگا۔ مجھے لگا شہر میں چلتا پھرتا آدمی بار بار نظروں میں آ جاتا ہے۔ لیکن وہاں
میں مراد آباد کے لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے استعجاب اور
تپاک کے بجائے تجسس، طنز اور مزاح پیدا ہو گیا اور مجھے یقین ہو
گیا کہ اس شہر میں کوئی شخص مولوی صاحب کے بارے میں کچھ نہیں
جانتا اور جب یہ امکان ختم ہو گیا تو میری آنکھوں کی روشنی ماند پڑنے
لگی اور میرا حلق خشک ہونے لگا۔ سانس رکنے لگی، کھانسی آنے لگی۔
حتیٰ کہ بخار آ گیا۔ میں اسی حالت میں ایک رات پھر نیش گنج گیا اور
گلیوں میں گرتا پڑتا مارا مارا پھرتا رہا۔ مسافر خانے واپس جاتے ہوئے
منڈی چوک کی ایک دکان کے تختے پر نڈھال ہو کے بیٹھ گیا۔
مجھ سے آگے نہیں چلا گیا۔ یہاں بھی کلکتے کے سٹیشن والا واقعہ
دُہرایا گیا۔ میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ دو تین لڑکے تھے۔
پہلے تو انھوں نے مجھے فقیر سمجھ کر پتھر مارا۔ میں نے اُن کی طرف
سے بے نیازی برتی تو وہ شرارت پر اتر آئے۔ وہ شاید آخری
شو دیکھ کے واپس آ رہے تھے۔ ترنگ میں تھے۔ کہنے لگے [illegible]
میاں جی! [illegible] پوچھتے ہوئے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔
میں نے اُسے ڈانٹ کر ہٹانا چاہا تو وہ سب ہنسنے لگے۔ ان میں
سے دو نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ
وہ میری تلاشی لے۔ میں بُری طرح اُن کی گرفت میں تھا۔ میں نے اپنے
آپ کو خود اُن کے حوالے کر دیا لیکن میری گردن میں مالا پڑی ہوئی

کے گھر والے جاگ کر شور نہ مچا دیں۔ میں نے تھکی تھکی سے جواب دیا: "ایک پناہ گیر ہے۔"
"پناہ گیر؟" عورت کی خوف زدہ آواز ابھری۔
"ہاں اماں، پناہ گیر۔ چور نہیں ہوں۔"
کچھ دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولی: "یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو؟"
"کچھ دیر میں چلا جاؤں گا۔ یقین کیجیے، آپ کی کسی چیز پر ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔ اطمینان سے سویئے۔"
"مگر۔ مگر۔ تم ہو کون؟" عورت کا خوف بڑھ گیا تھا۔
"میں ایک مسافر ہوں اماں! وہ شاید قریب آ رہے ہیں۔ از راہ کرم کچھ دیر کے لیے لالٹین اندر کر لیجیے اور خاموش ہو جائیے۔"
اس نے میری بات مان لی، موکھلے سے لالٹین اٹھا لیا۔ مرغیاں بھی شاید اپنی مالک کی آواز پہچان کے خاموش ہو گئی تھیں۔ دیوار کے قریب تیز سیٹیوں اور تیز قدموں کی آوازیں آئیں۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ عورت نے لالٹین پھر موکھلے سے نکال لی تھی۔ "آپ کا شکریہ۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔" یہ کہہ کے میں شکستہ دیوار سے باہر نکلا۔
"سنیے۔" اس نے مجھے جاتے دیکھ کے روکا۔ میں پیچھے مڑ کے دیکھنے لگا۔ لالٹین پھر موکھلے کے اندر ہو گئی اور آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ چادر میں لپٹی ہوئی ایک ادھیڑ عمر عورت برآمد ہوئی۔ اس کا چہرہ سفید تھا: "اگر آپ کے لیے رات بسر کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے تو آپ یہاں ٹھہر سکتے ہیں مگر صبح ہونے سے پہلے چلے جائیے گا۔"
"شکریہ۔" میں نے مہذب لہجے میں کہا۔ "میں مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں اور پہلی گاڑی سے واپس جانے والا تھا۔ گاڑی صبح چھ بجے جاتی ہے۔ راستے میں یہ لوگ پیچھے پڑ گئے۔"
"اندر آجائیے۔ میری نظریں زمانے کے سرد و گرم سے خوب واقف ہو چکی ہیں۔ اندر آجائیے۔"
"نہیں نہیں۔" میں نے تکلف کیا۔ "آپ کے گھر والے...؟"
"انھیں میں سمجھا لوں گی۔ آئیے۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں اصرار کیا۔ میں انکار کر کے تھک گیا اور اس کے پیچھے جھجکتا جھجکتا مکان کے اندر داخل ہوا۔ کسی زمانے میں یہ ایک چھوٹی سی خوب صورت حویلی ہوگی۔ اب کھنڈر میں بدل گئی تھی۔ رات کو خستہ، ویران اور پراسرار ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے برآمدے کی چوکی پر بٹھا دیا اور خود اندر جا کے شاید بستر کا انتظام کرنے لگی۔ پھر وہ مجھے ایک شکستہ کمرے میں لے گئی جہاں ایک چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا دیا گیا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ تب اجنبی کے لیے یہ اہتمام بڑی حیرت کی بات تھی: "آپ یہاں آرام کیجیے۔ میں فجر کی نماز سے پہلے آپ کو اٹھا دوں گی۔"
"آپ نے بہت زحمت کی اماں! آپ تو فرشتہ ہیں۔ آپ نے میرا ایسا بیکس دیکھنے کے باوجود احسان کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ یہاں تنہا رہتی ہیں؟"
"ہاں، آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ میرے شوہر مر چکے ہیں۔ میری دو بچیاں ہیں۔ ایک کو اس کے ماموں علی گڑھ لے گئے ہیں۔ دوسری یہیں ہے۔ یہاں اور گرد سب میرے شوہر کے عزیزوں کے مکانات ہیں۔ آپ کے چلتے ہی آپ نے مجھے متاثر کیا۔" وہ پڑھی لکھی عورت معلوم ہوتی تھی۔ "نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ آپ ایک اچھے آدمی ہیں اس لیے میں نے یہ جرأت کی اور پھر یہاں کیا رکھا ہے ------ ڈرتے تو مال و دولت والے ہیں۔ ہم غریبوں کے پاس خلوص کی دولت کے سوا کیا ہے۔ کچھ کھائیے گا یا پیجیے گا؟"
"نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ ایک گلاس پانی پلا دیجیے۔ شاید مجھے بخار ہے۔ مسافر خانے جاتے جاتے میں ایک دکان کے تختے پر سستانے کے لیے رک گیا تھا کہ ..." میں نے مختصراً اپنی روداد سنائی۔
"توبہ ہے۔" وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کے بولی: "آج تو آپ بچ گئے۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ایک شریف اور بہادر شخص میرے گھر مہمان ہے مگر آپ کو بخار ہے۔ لائیے مجھے اپنا ہاتھ دکھائیے۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کے میری کلائی پکڑ لی۔ "ارے واقعی۔ آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ مجھ سے گناہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یقیناً میرے گھر آپ کو اللہ نے بھیجا ہے۔ بھلا اتنے بہت سے گھروں میں آپ یہیں کیوں آتے۔ مگر میں آپ کو پانی نہیں پلاؤں گی۔ بغیر دودھ لا کے جاتی ہوں۔ آپ بالکل لیٹ جائیے۔ لحاف اوڑھ لیجیے۔ دیکھیے کوئی تکلف مت کیجیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"
بستر پر لیٹتے ہی جسم جیسے کسی نے بھٹی میں جھونک دیا۔ تین دن کی مسلسل تھکن اور بھوک سے حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ تھی۔ اب بستر کی اور اس نیک عورت کے گداز نے تمام طاقت چھین لی۔ بخار کے بخار آیا کہ ہوش و حواس جاتے رہے۔ نہ جانے وہ عورت کب واپس آئی اور میں بخار میں کیا کیا بکتا رہا۔ جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے دیکھا میرا سارا کرتا پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ میں کئی لحافوں میں دبا ہوا تھا اور عورت میرے سرہانے بیٹھی ہوئی میرے ماتھے پہ بھیگا کپڑا رکھ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی تیز تھی اور قریب ہی اس کی بچی ایک تسلے میں کپڑا بھگو بھگو کے دیتی جا رہی تھی۔ میں نے بے چینی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ عورت نے میرے سینے پہ ہاتھ رکھ کے مجھے لیٹے رہنے دیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ کو پسینہ آگیا۔ ورنہ آپ کی حالت تو بگڑ گئی تھی۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے ناتواں آواز میں پوچھا۔
"فجر قریب ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی۔
"مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سارا کمرہ گھومنے لگا۔
"آپ اس حالت میں کہیں نہیں جا سکتے۔"
"تو میں یہاں بھی تو نہیں رہ سکتا۔"
"مگر آپ جائیں گے کیسے؟" وہ فکر مند لہجے میں بولی۔
"کسی نہ کسی طرح مسافر خانے تک پہنچ ہی جاؤں گا۔"
"آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ------ دیکھیے اگر آپ کو ابھی دوا اور پرہیزی غذا نہیں ملے گی تو طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔ میرے لیے ایک اجنبی مرد کو یہاں ٹھہرانا مشکل ہے۔ طرح طرح کی باتیں ہوں گی لیکن میں آپ کو اس حالت میں باہر بھی نہیں جانے دے سکتی۔ اب ایک ہی شکل ہے کہ میں آپ کو اپنے مکان کی اس بوسیدہ کوٹھری میں ٹھہرا دوں جہاں کسی کی نظر نہیں جاتی۔ وہاں میرے مرحوم شوہر کا سامان بند ہے۔ مجبوری کی بات ہے۔ وہ کوٹھری رہنے کے لائق تو نہیں ہے مگر آپ بھی باہر جانے کے لائق نہیں ہیں۔"
یہاں کا فیصلہ تھا۔ کہنے کا انداز مختلف تھا۔ اس نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے مجھے اس بوسیدہ کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا اور دن کے وقت باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ جب کبھی کسی کے آنے کا اندیشہ نہ رہا تو وہ میرے لیے عجلت میں کھانا لے کے آئی اور اصرار کر کے ایک قدح مجھے پلوایا۔ باہر اس کی بچی پہرا دے رہی تھی تاکہ جیسے ہی دروازے پہ دستک ہو وہ باہر چلی جائے۔ یہ ترکیب سود مند ثابت ہوئی۔ وہ دن میں متعدد بار مجھے دیکھنے آتی۔ دوپہر کو اس نے مجھے دلیا بنا کے کھلایا۔ صرف ایک دن میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی جنت یعنی اپنی ماں، اپنی بہن کے گھر میں ہوں۔ اس نے مجھے رات کو بتایا کہ میں بخار کی حالت میں نگار، حمیدہ، امی، ابا، جھل جیل، جا قمر اور نہ جانے کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔ دوسرے دن رات کو وہ مسلسل کوٹھری میں رہی اور اس کی بیٹی کمرے کے پہرے پر باقی رہی۔ پہلے وہ سہمی ہوئی تھی۔ بعد میں اپنی ماں کو دیکھا دیکھی مجھ سے کھل گئی۔ وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن معلوم ہوتی تھی۔ بالکل ایسی ہی تھی، اتنی ہی پیاری، اتنی ہی معصوم۔ دوسری رات اور دوسرا دن بھی میں نے اس کوٹھری میں گزارا۔ عورت کا نام امتیاز تھا۔ وہ ریاست رام پور سے بیاہ کے مراد آباد آئی تھی۔ کہنے سننے کے بعد میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ تجربہ کاری، سنجیدگی اور متانت کے علاوہ عزم اور جرأت بھی اس کے چہرے سے نمایاں تھی۔ کسی زمانے میں اس کا رنگ سرخ سیب ہوگا، اب سفید پڑ گیا تھا۔
اب وہ غریبی اور مفلسی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے شوہر کے عزیزوں کے ظلم و ستم، طعن و تشنیع اور الزام تراشیوں کی ایک طویل اور درد ناک داستان سنائی۔ اسکول اور محلے کی بچیاں بھی اس کے ہاں پڑھنے آتی ہیں۔ وہ ایک خود مختار عورت تھی مگر غربت میں سلیقے کا رنگ نمایاں تھا۔ میری موجودگی کے دوران میں اس نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے اسکول سے چھٹی لے لی تھی اور بچیوں کو منع کر دیا تھا۔ چار دن تک وہ مقدور بھر میری تیمارداری کرتی رہی۔ چار دن بعد میری حالت کچھ سنبھلی۔ اس نے اپنے گھر کی کئی مرغیاں کاٹ کے ان کا شوربا بنا کے مجھے پلایا۔ وہ میرے بارے میں کچھ جاننے کی مشتاق تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میرے ایک استاد تھے جو اچانک غائب ہو گئے۔ میں انھی کی تلاش میں آیا ہوں۔ میں نے بخار کے ہذیان میں جن جن لوگوں کے نام لیے تھے وہ میرے عزیز تھے یا ملاقاتی۔
چوتھے دن بھی اس نے مجھے نہیں جانے دیا۔ پانچویں دن بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ میرے چلتے وقت وہ بہت روئی۔ وہ اس کی بچی رات بھر جاگتی رہی۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اس سے بار بار ملنے آؤں گا۔ صبح کاذب کے وقت میں نے جب اس کے گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا، جب میں آنسوؤں کے ساتھ اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے میرے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھما دیا۔ میں نے اسے کھول کے دیکھا، اس میں کرتے پاجامے کے دو جوڑے اور دو بنیان رکھے ہوئے تھے۔ ایک پوٹلی میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ کچھ نہیں بولی، سسکتی رہی۔ میں نے سوچا، اس کی بچی تقریباً گیارہ برس کی ہے لیکن یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگی۔ میں نے قریب کر کے گلے سے لگا کے خوب پیار کیا۔
مراد آباد اسٹیشن سے دلی جانے والی گاڑی صبح سویرے روانہ ہوتی تھی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ دو دن اور ایک رات کے بعد حیدر آباد دکن کے نامپلی اسٹیشن پر اترا۔
اسٹیشن سے باہر آتے ہی کچھ پرانی سی کیفیت ہوا۔ میرے ذہن میں اس شہر کا تصور کچھ اور تھا۔ یہ تو ایک وسیع اور گنجان شہر تھا۔ جیسا کلکتہ۔ قدیم و جدید طرز کی عمارتیں، چوڑی سیاہ سڑکیں، میلوں پھیلے ہوئے بازار مگر دوسرے شہروں کے مقابلے میں یہ ایک بدلا ہوا شہر تھا۔ یہاں کے ہنگامے میں بھی سکون تھا مشترک...

دکانوں میں بیٹھے ہوئے آدمی نظر آتے سب بند گلے کی شیروانیوں میں ملبوس تھے۔ سر پر اُردو کے بڑے بڑے بورڈ آویزاں تھے۔ لوگوں کے انداز میں ایک تکلف تھا، نفاست اور سجاوٹ تھی۔ میں سیارہ کی دی ہوئی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں ہوٹل میں ٹھیرنے اور اپنا حلیہ درست کرنے کے بجائے ارجمند بانو کا تھیلا ہاتھ میں لیے ادھر سے اُدھر، اُدھر نکل پڑا اور مختلف مدرسوں اور مسجدوں میں جاکے محمد شفیق نامی ایک مولوی کا پتہ پوچھتا رہا۔ لوگ مجھ پر ہنسنے لگے۔ میں عاجزی سے درخواست کرتا کہ وہ ذرا توجہ سے میری بات سُن لیں۔ مجھے مولوی محمد شفیق یا اُن کی بہن کا پتہ بتا دیں۔ اُن کا اور اُن کے شوہر کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ نام پلی اسٹیشن سے کئی میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا میں پُرانے شہر میں داخل ہو گیا اور اس آخری سرے تک گیا جہاں حاؤش بستے تھے اور جہاں نظام نے ایک پُرشکوہ عمارت فلک نما بنائی تھی۔ اب تو منہ کھولتے ہوئے بھی ندامت ہوتی تھی۔ پہلے ہی دن کی ناکامی دیکھ کے مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ یہاں تو وقت ضائع کرنا تھا مگر وقت کی کمی کس کے پاس تھی۔ میرے پاس زندگی باقی پڑی تھی۔ ابھی میری عمر ۳۳، ۳۴ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ جب کچھ نہ بنا تو میں نے حیدرآباد میں مرادآباد کے لوگوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ لوگ طرح طرح کے سوال کرتے کہ اُن کی شادی کب ہوئی تھی؟ وہ کب حیدرآباد منتقل ہوئیں؟ اُن کے شوہر کا نام کیا ہے؟ کہیں یہ تو نہیں ہے کہیں وہ تو نہیں ہے؟ اسی تگ و دو میں ایک اخبار نویس سے میری ملاقات ہو گئی۔ اُس نے میری درخواست پر اپنے اخبار میں اس مضمون کا اشتہار شائع کیا۔

مرادآباد (یوپی) کے جناب مولانا محمد شفیق بالقابہ اور اُن کی ہمشیرہ محترمہ جہاں کہیں بھی قیام فرما ہوں، توجہ فرمائیں اور مدینہ ہوٹل میں بابر خان سے رابطہ قائم کریں۔ بابر خان کے پاس ہر دو موصوف کے لیے ایک امانت محفوظ ہے۔

مشتہر: اختر بابر خان

اخبار میں اشتہار چھپنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اخبار پُرانا ہو گیا۔ میں حیدرآباد میں ایک ہفتے قیام کرنے کے بعد آخر دلّی آگیا۔ دلّی سے لاہور اور پشاور گیا اور وہاں سے دیوبند، بریلی پھر لکھنؤ آگیا۔ اس سفر میں مجھے دو مہینے لگ گئے۔ میں نے مختلف دینی درس گاہوں میں مولوی صاحب کو تلاش کیا لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کہیں نہیں ملے۔ آخر میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ لکھنؤ آخری شہر تھا جہاں مجھے اپنے آپ کو یہ جبراً سمجھانا پڑا کہ مولوی صاحب سے ملاقات اب ممکن نہیں ہے۔ نہ جانے اُن کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ وہ کس کونے میں گم ہو گئے۔ اتنے بڑے ہندوستان میں کس سے اُن کا پتہ پوچھوں؟ ابھی تو صرف چند شہر دیکھے ہیں۔ کہاں کہاں جاؤں۔ اب مجھے کچھ سکون ہو چلا تھا۔ مُردوں جیسا سکون۔ مفلوج اور معذور لوگوں جیسا سکون۔ اب مجھے کوئی جلدی نہیں تھی نہ وحشت۔ جیب میں صرف چند پیسے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے اور اہتمام کرنے کی فکر بھی نہیں تھی۔ بس ایک کرب ہوتا تھا کہ مرنے کی ہمت بھی نہیں ہے۔ سات سال کس اُمید پہ کاٹے تھے۔ پڑھا لکھا تھا اور قیدیوں سے زندگی سیکھنے کی کوشش کی تھی کہ کورا کو بھی پریشانی نہ ہو۔ میں اُس کے لیے اپنی ذات کا ایسا قلعہ بنا دوں کہ کوئی اُس پر نگاہ اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ قلعہ لینے لیکن کورا کو تلاش کر رہا تھا مگر ہوا کیا؟

قیاس کیا تھا کہ مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مجھ سے خون کی واردات سرزد ہو گئی ہے۔ اب کورا کی موجودگی میں مجھ سے رابطہ قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے جیل کا رُخ نہیں کیا۔ وہ کبھی خط کے ذریعے تو مجھے مطلع کر سکتے تھے مگر انھیں کیا معلوم ہوگا کہ میں نے جیل میں اپنا نام کیا بتایا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے میرے اصل نام پر خط لکھا ہو اور جیل کے حکام نے اُسے تلف کر دیا ہو کہ اس نام کا کوئی شخص یہاں موجود نہیں ہے۔ بہرحال اب سات سال گزر چکے تھے۔ درمیان میں وقت کی سرحد دیوار حائل ہو گئی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو کیا سانحہ پیش آیا۔ میں نے کسی اور خیال کو دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ شاید اسی مثبت خیال سے میں اپنی سزا کاٹ سکتا تھا۔ سوچا تھا کہ مولوی صاحب نے ضرور کورا کو حاصل کر لیا۔ جبھی تو وہ نہیں آئے۔ انھیں معلوم ہوگا کہ میں جیل سے چھوٹتے ہی مرادآباد آؤں گا۔ وہ کورا کو دلاسے دے کے زندہ رکھتے ہوں گے۔ کورا ایک ایسی لڑکی تھی جس کے لیے بڑے بڑے ایثار کیے جا سکتے ہیں۔ اپنی مثال خود میرے سامنے تھی۔ میں نے ابا کی بات نہیں مانی۔ امی نے صرف کہا تھا کہ میں کورا کو بدھ گیا کے بڑے بھکشو کے پاس چھوڑ آؤں لیکن امی اور ابا سے اتنا پیارا تعلق ہونے کے باوجود کورا کے لیے میں نے انھیں چھوڑ دیا۔ لڑکے میں نے اُس کی خاطر اپنا قبیلہ چھوڑ دیا تھا۔ مولوی صاحب نے اُس کا چہرہ دیکھا تو اُن میں شفقتوں کے سوتے اُمڈ آئے اور کورا اس بدنصیب کو کہیں سکون نہ ملا۔

اب بہت کچھ سوچا جا سکتا تھا۔ کہیں تو مولوی صاحب کا نام نشان ہوتا۔ یقیناً اُس رات وہ واقعات اُس طرح پیش نہیں آئے جس طرح میں نے سوچا تھا۔ غنڈے میری کورا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے اور انھوں نے مولوی صاحب کو ختم کر کے اُسے

چھپا دی ہو گی یا پھر کورا کا تعاقب کرنے والے لوگوں نے اُسے اور مولوی صاحب کو کسی جگہ دیکھ لیا ہوگا اور مولوی صاحب کا کام تمام کر کے کورا کو اپنے ساتھ واپس لے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے مولوی صاحب سے کہیں چوک ہو گئی ہو اور وہ کورا کو چھپانے میں ناکام ہو گئے ہوں۔ مولوی صاحب بھی میری وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بے چارے۔ کورا، مولوی صاحب، کانسٹیبل، نہ جانے کتنے لوگ میری وجہ سے متاثر ہوئے۔

کورا کو کوئی مل لے گیا ہو؟ اُس کے قبیلے کے لوگ یا غنڈے؟ وہ ضرور زندہ ہو گی۔ میں اُسے ایک بار صرف دیکھنا چاہتا تھا۔ صرف ایک بار۔ اس سے زیادہ اب میرا کوئی مطالبہ نہیں تھا۔ اس ایک بار کی دید پر کوئی معاوضے میں میری جان بھی لے لے۔ مجھے عمر بھر گرفتاری کا نام دے کے مجھے بیٹھنے کے لیے جیل میں رکھ دے۔ میری آنکھیں نکال لے، میرے ہاتھ کاٹ دے۔ مجھے بے دست و پا کر کے کوڑے پر پھینک دے۔ ایسے کسی کے تو میں اُس کے قدموں میں مال و زر کے انبار لگا دوں۔ میں مزدوری کروں گا۔ ڈاکو بن جاؤں گا۔ وہ جسے کہے میں اُسے قتل کر ڈالوں گا مگر ایک بار وہ مجھے کورا کی صورت دکھا دے۔

کہیں ایسا تو نہیں، نہیں نہیں۔ میری اُنگلیاں تھرتھرانے لگیں اور سر پھٹنے لگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کئی بار پہلے بھی یہ خیال دل میں آیا تھا۔ میں نے سر جھٹک کے خود پر لعن طعن کی تھی۔ مولوی صاحب کے کردار پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک فرشتہ صفت آدمی تھے۔ جب انھوں نے مجھے سینے سے لگا کر پناہ دی تھی تو اُن کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ پھر انھوں نے جانے سے پہلے سامان خریدا۔ کورا کے لیے بہترین لباس خریدا۔ وہ ہمیں کس ذوق و شوق سے کلکتے کی سیر کراتے رہے۔ وہ ایک مذہبی شخص تھے، ایک دین دار آدمی۔ اُن کی ساری عمر شرافت کے پیچھے گزری تھی۔ وہ اتنے پست نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ میرے اور کورا کے کون سے رشتے دار تھے؟ جب میں نے گیا اسٹیشن پر اُن کے ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی تو انھوں نے نہایت درشت انداز میں مجھے جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ محبت کے آدمی نہیں تھے۔ مرادآباد میں بھی اُن کے تعلقات محدود تھے۔ رشتے داروں تک سے رسمی مراسم تھے۔ نہ انھوں نے شادی کی تھی کہ اُن کے دل میں بیوی بچوں کی محبت کا گداز ہوتا۔ البتہ بہن سے بھی وہ عرصے سے نہیں ملے۔ اب کسی کو کیا پتہ۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ شکل و صورت سے ایک معصوم شخص نظر آتا ہوں مگر کون جانتا ہے کہ میں نے تین قتل کیے ہیں۔ کون کسی کے دل میں جھانک سکتا ہے۔ چہرے تو سب کے مختلف ہیں۔ دنیا میں ہر آدمی دوسرے سے الگ ہے لیکن اندر سے آدمی کریمنل ہو سکتا ہے۔ اندر سے عورت اُس کی تقاضا بھی پیدا ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کو اندر سے دیکھنے کا وقت مجھے کہاں ملا تھا۔ ریل میں ملاقات ہوئی۔ ایک رات ساتھ گزرا۔ کچھ دن۔ مگر انھوں نے جب ریل میں مجھ سے شفقت کا اظہار کیا تھا، اُس وقت انھوں نے کورا کو کہاں دیکھا تھا۔ کورا تو دوسرے ڈبے میں بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب اپنے رویے پر شرمندہ تھے۔ مجھے کھانا کھلایا تھا اور خوب محبت کی باتیں کرتے تھے۔ ہوڑا اسٹیشن پر بھی وہ ارادتاً چند لمحے ٹھیر گئے تھے کہ ماموں جان جیسے ہی لینے آ جائیں تو وہ جائیں گے۔ اُس وقت کورا حجرے میں تھی اور انھوں نے اُس کے چہرے اور عمر کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ نہیں نہیں۔ مولوی صاحب پر شبہ گناہ ہے۔ وہ بے چارے تو صرف میری وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ نہ جانے اُن پر کیا گزری ہو گی۔ نہ جانے وہ کس عالم میں ہوں گے۔ پتہ نہیں زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔

سوچتے سوچتے میرا دل پک گیا تھا۔ اب ایک آخری اُمید رہ گئی تھی کہ میں اُن غنڈوں کو تلاش کروں جنھوں نے دریا کے کنارے ہم پر حملہ کیا تھا۔ انھی سے کوئی صحیح بات معلوم ہو سکتی ہے۔ جو زندہ ہوں اور کلکتے میں موجود ہوں۔ غنڈوں کی زندگی کا کیا بھروسا۔ سات سال میں کتنے غنڈے مر گئے ہوں گے۔ میں نے لکھنؤ سے ناکام ہو کے کلکتے کا رخ کیا۔ لکھنؤ اور کلکتے کے درمیان گیا شہر تھا۔ گیا قریب آنے پر دل میں ہوک سی اُٹھی۔ جی میں آیا بس ایک بار گیا کی طرف سے گزر کے واپس ہو جاؤں گا۔ کوئی مجھے پہچان بھی نہیں سکے گا۔ میرا حلیہ ہی ایسا ہے۔ سات سال میں تو لوگ شکل بھول گئے ہوں گے۔ بس شرادا نہ۔ ایک نظر دیکھوں گا اور چلا آؤں گا۔ شاید کسی کا چہرہ بھی دیکھنے کو مل جائے۔ میں ایک فقیر کی صورت میں جاؤں گا۔ ایک کشکول خرید لوں گا اور شانے پر کپڑا رکھ کے بھیک کی صدا لگاؤں گا۔ کوئی تو دروازے پر آئے گا۔ ممکن ہے امی ابا آ جائیں لیکن اگر کسی نے پہچان لیا تو؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ داڑھی، بدلی ہوئی رنگت، میلے پھٹے ہوئے کپڑے۔ کوئی بھی شناخت نہیں کر سکے گا۔

گاڑی جب گیا اسٹیشن پر ٹھیری تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ اسٹیشن پر اچھی خاصی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ میں لرزتے ہوئے قدموں سے پلیٹ فارم پر اُترا۔ سوندھی سوندھی خوشبو آئی۔ آگے جاؤں یا نہ جاؤں؟ گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں ڈبے کی طرف بڑھا، پھر واپس آ گیا۔ دل و دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر جیسے مسافروں کی چیخ پکار، فضا تھمی تھی۔ یہی کیفیت میرے جسم کی تھی۔ اسٹیشن عبور کر کے میں ایک ادھڑی سڑک پر آگیا۔ گھاس کا وہ چھوٹا سا میدان ختم ہو گیا تھا جہاں میں کبھی کبھی صبح سویرے ٹہلنے آتا تھا۔ میرے جانے کے بعد شاید کسی نے اس کی خبر ہی نہیں لی تھی۔ مجھے بہت دکھ ہوا لیکن گیا

جیسے کسی حویلی پر بھی کائی جمی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا عرصے سے سفیدی
نہیں ہوئی ہے۔ جب میں یہاں تھا تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہر سال
دیوالی کے موقع پر سفیدی ہوتی تھی۔ اب تو یہاں ویرانی چھائی ہوئی
تھی۔ پکی عمارتیں نئی بن گئی تھیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ لوگ کلکتے کا نقشہ دیکھ لیتے۔
ایسی بے ہنگم بڑی عمارتیں بنائی تھیں۔ میونسپلٹی کو بھی سڑکوں کا خیال
اس زمانے میں کچھ کم رہا تھا۔ بڑی سڑک سے گزر کے میں تانگے والے
چوک میں آگیا اور فوراً کے رک گیا۔ آگے بڑھنے کی قوت جسم میں نہیں
تھی۔ سانس قابو میں نہیں آ رہی تھی کوئی جسم کی پسلیاں سے رہا تھا۔
درد بھر رہا تھا۔ کوئی بجلی کے تار جسم سے مس کر رہا تھا۔ کنپٹیاں سرخ
ہو گئی تھیں۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔

میں اپنے محلے میں داخل ہو گیا۔ محلے میں کوئی خاص فرق
نظر نہیں آ رہا تھا۔ احسان الٰہی پرچونی کی دکان بھی اسی جگہ قائم تھی
جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ میں ادھر سے بچ بچاتا ہوا گزر رہا۔ گلی
میں کھیلتے ہوئے بچوں اور راہ گیروں کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ محلے میں
کسی بھی اجنبی کی آمد پر یہی ہوتا ہے۔ ہر نگاہ مجھ پر ٹھہرتا ہوا گزر گیا۔ کوئی
مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔ ایک گلی مڑنے کے بعد میرا گھر تھا۔ میں نے اپنی
رفتار کسی قدر تیز کر دی۔ دکان دار احسان الٰہی بوڑھا اور موٹا ہو گیا
تھا۔ میں اسے دیکھتا ہوا گلی میں مڑ گیا۔ سامنے میرا گھر تھا۔ میرا گھر۔ جیسے کی
میری حالت خراب تھی۔ گھر کا دروازہ دیکھ کے سنسناہٹ ہونے
لگی۔ یقین نہیں آیا کہ میں ایک مدت بعد اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہوں۔
مکان کی دیواروں پر حال ہی میں رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ کھڑکیاں بھی
تبدیل کی گئی تھیں۔ گلی میں دیر تک کھڑا رہنا نامناسب بات تھی۔ وہاں
سے سرسری گزر گیا۔ دوسری بار پھر گلی میں آیا اور ڈیوڑھی میں جھانکنے
لگا۔ ڈیوڑھی کا آدھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دوسری بار بھی کوئی نظر
نہیں آیا۔ میں چوروں کی طرح واپس گلی۔ اپنے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ میں
جب تیسری بار ادھر سے گزر رہا تھا تو ایک خوش پوش لڑکا اندر سے
برآمد ہوا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کون ہو سکتا ہے یہ؟ یہ تو
کوئی اجنبی لڑکا ہے۔ مجبور ہو کے میں نے ایک راہ گیر کو روک لیا۔ وہ
جلدی میں تھا لیکن میرے منکسر لہجے نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں
ڈال دیں۔ "کیا ہے جی؟" وہ اکتاہٹ سے بولا۔
"بھائی۔ میں بڑی دیر سے زمیں دار مقصود زماں صاحب کا
گھر دیکھ رہا ہوں۔ کوئی شخص رہبری نہیں کرتا۔ آپ ہی کچھ بتا دیجیے۔"
"مقصود زماں۔ زمیں دار؟" اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔
"اب وہ یہاں کہاں بھائی۔ عرصہ ہوا انھیں گئے ہوئے۔"
"اچھا پھر وہ کہاں گئے؟"
"کچھ پتہ نہیں۔ کوئی کہتا ہے پٹنے میں جا کے بس گئے۔ کوئی کہتا
ہے دلی میں آباد ہو گئے۔ کوئی لکھنؤ کہتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔"
"وہ کب گئے اور اب یہاں اُن کے مکان میں کون رہتا ہے؟"
میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "معاف کیجیے میں آپ کے کام میں حارج ہوا۔"
"کوئی بات نہیں بھائی۔ لوگ ان کے بارے میں عجیب عجیب
باتیں کرتے ہیں۔ معاً مکان کوڑیوں کے مول فروخت کر گئے۔
اُن کا ایک جوان لڑکا گم ہو گیا تھا۔ شاید اس کا اُن پر بہت اثر تھا۔
ذہنی حالت بھی کچھ خراب سی ہو گئی تھی۔ گھر چھوڑنے کا قصہ ہے پہلے نہیں
سنیں۔ پھر بیوی کا انتقال ہو گیا۔"
"نہیں نہیں۔ کیا کیا امی؟" میں نے چیخ مار کر کہا۔ اگر وہ مجھے
جھٹ سے سنبھال نہ لیتا تو میں زمین پر بے سدھ پڑا ہوتا۔ میری اماں
مر گئی تھی۔ وہ کس دل سے یہ خبر سنا رہا تھا جیسے میں تو پتھر کا آدمی ہوں۔
"ارے ارے کیا ہوا بھائی؟ ایسے کیوں؟" وہ حیرانی سے بولا۔ "آپ اس
قدر پریشان کیوں ہو گئے۔ اور یہ آپ انھیں امی کیوں کہہ رہے ہیں۔
آپ کون ہیں؟" وہ سٹ پٹا کے بولا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میرے
کان بند ہو گئے تھے۔
"کہیں آپ۔" میری حالت دیکھ کے وہ اضطراب سے بولا۔ "کہیں
آپ وہ تو نہیں ہیں؟"
"تم سچ کہتے ہو یا جھوٹ؟" میں نے اس کا جسم جھنجوڑتے
ہوئے کہا۔ "کہہ دو کہ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔"
"بھائی مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی۔ مجھے افسوس
ہے کہ آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا مگر آپ سے ان کا کیا تعلق تھا؟
آپ کون ہیں؟"
"میں ایک بدنصیب ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"کب۔ کب ہوا؟"
"مدت ہوا۔ اُن کے صاحب زادے کے فرار ہو جانے کے بعد۔"
"اوہ۔ اوہ۔" میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ مجھے یہی خبر
سننے کے لیے آنا رہ گیا تھا۔ میرے ذہن میں کیڑے پڑیں۔ میں سوچ بھی نہ
سکتا تھا کہ وہ دونوں مر گئے۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں اپنی گلی یا
کس محلے میں کھڑا ہوں اور کس شخص سے مخاطب ہوں۔ میری انا
کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا۔
"کیا آپ۔ آپ اُن کے؟" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔
"میں ہی ان کا ایک بیٹا تھا۔" میں نے اس کے سینے سے
لگتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے نہیں جانتے۔"
"آپ بابر تو نہیں ہیں بابر زماں؟" وہ حیرت سے بولا۔
"نہیں۔ میں وہ نہیں ہوں۔ میں تو کوئی اور ہوں۔ میں ان کا
اصل بیٹا نہیں تھا۔ وہ مجھے بیٹا سمجھتی تھیں۔ میں تو اُن کے
پاؤں کی خاک بھی نہیں تھا۔ وہ مجھ پر احسان کرتی تھیں کہ
مجھے اپنا بیٹا سمجھتی تھیں۔ بابر زماں تو کم بخت اسی
دن مر گیا تھا جس دن گھر سے نکلا تھا۔ وہ سالا تو پاگل ہو گیا تھا۔ وہ بہت
برا لڑکا تھا۔ اپنی ماں کا قتل کر کے گیا۔" میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔
"آپ میرے گھر چلیے۔ آئیے آرام سے بیٹھیے گا۔ مجھے
بہت افسوس ہے کہ میں نے بے خبری میں نہ جانے کیا کہہ دیا۔ آئیے
میرے بھائی!"
"نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے بپھر کے کہا۔ "ہو سکے
تو یہ بتا دو کہ اس گھر کے باقی زندہ لوگ کہاں ہیں؟"
"کچھ نہیں معلوم۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "انھوں نے چلتے وقت
اپنے عزیزوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ یہاں
ان کے بہت سے عزیز رہتے ہیں۔ مقصود سے تو ہمارا بھی کوئی رشتہ
نکلتا ہوگا۔ بیٹے کے جانے کے بعد لوگوں نے انھیں بہت کم گھر سے نکلتے
دیکھا۔ انھوں نے ملنا جلنا ہی بند کر دیا تھا۔ بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔
کوئی دوست ان کے گھر ملنے جاتی تو وہ کمرے کا دروازہ بند کر لیتے۔
لگتا تھا جیسے ان کے دماغ پر برا اثر پڑا ہے۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ
گھر بیٹھے کیا بتاتے ہیں۔ بچوں پر باہر نکلنے کی پابندی تھی۔ بیوی
کی موت کے کچھ دنوں بعد ایک دن صبح اچانک لوگوں نے دیکھا کہ گھر
میں تالا لگا ہوا ہے۔ نئے مکینوں سے پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ
اُن کے ہاتھ مکان فروخت کر کے گئے ہیں۔ بہت دنوں سے بات
چیت چل رہی تھی۔ ایک رات وہ چابیاں دے کے چلے گئے۔ کچھ کہہ
کے نہیں گئے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ پھر کسی کو ان کے بارے میں خبر
نہیں ہوئی۔" وہ میرے کانوں میں زہر انڈیلتا رہا۔
"کسی کو بھی معلوم نہیں؟" میں نے سسکتے ہوئے پوچھا۔
اس نے دکھ سے انکار میں سر ہلایا اور مجھے اپنے گھر لے جانے
کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ میں ہی
اُن کا گم شدہ بیٹا ہوں۔ محلے کے دو ایک آدمی اور ہمارے گرد جمع
ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہاں بھیڑ لگتی، مجھے ہوش آگیا اور میں اپنے
مخاطب شخص کا کندھا پکڑ کے اسے ایک طرف لے گیا۔ وہ حیران و پریشان
تھا۔ پہلے ہی بہت رسوائی ہو چکی تھی۔ اب وہ یہاں سے منہ کالا کر کے گئے
تو میں انھیں پھر رسوا کرنے چلا آیا۔ بے خیالی میں نہ جانے کیا کیا منہ
سے نکل گیا۔ سامنے گھر کا دروازہ تھا مگر اب اس میں میرے
داخلے پر پابندی عائد ہو گئی تھی۔ یہ وہی گلیاں تھیں جہاں میرا بچپن
گزرا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا۔ رونے کے لیے بھی کوئی
جگہ مخصوص نہیں تھی۔ میں نے پھر اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش
کی۔ اس شخص سے کہا کہ میں بھولے سے ادھر آگیا۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ میری درخواست
ہے جو کچھ آپ نے دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے بھلا دیجیے گا۔" میں
نے عاجزی سے کہا۔
"مگر آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں؟"
ایک جھوٹ چھپانے کے لیے میں نے اس سے بات سے
جھوٹ بولے۔ وہ مجھے کریدنے لگا۔ وہ میری شکل ہو بہو سے کچھ خوف زدہ
بھی ہو گیا تھا۔ "یہ راستہ پوچھا ہے؟" میں نے گھگھیا کے کہا۔ وہ رخصت
ہو گیا۔ اس کے سوا اس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔
میں جب ایک طرف نکل گیا تو اس نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ میں نے اپنے
قریبی عزیزوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اب اور جھینپنے
کی تاب نہیں تھی۔ امی بھی چلی گئیں۔ مولوی صاحب اور گھر والے سب
ابا بھی کہیں گم ہو گئے۔ ٹھیک ہے جائیں سب جائیں سارا کنبہ
گم ہو جائے۔

مگر وہ چلے کیوں گئے؟ ایسی بھی کیا بات تھی کہ گھر بار تک
نہیں؟ گھر چھوڑ دیا ہے تو ضرور کوئی اور بات ہے۔ کوئی ایسی بات
جس سے وہ شخص بھی واقف نہیں تھا جس نے مجھے یہ سب بتایا ہے۔
میں تو بہت خاموشی سے چلا آیا تھا۔ ایسا میں نے اپنا اور ابا کے آرام
کے لیے کیا تھا۔ جب تک گھر رہا وہاں موجود رہتی وہ دونوں پریشان
اور خوف زدہ رہتے۔ میں نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ چند سو روپے لے
کے بغیر بتائے گھر سے آگیا تھا۔ اس میں امی کے لئے اتنا پریشان ہونے کی
کیا بات تھی۔ سنا ہے مائیں اپنی اولاد کا انتظار رہتا ہے موت بھی
انھیں انتظار کا وقت دیتی ہے۔ ان کی سانس رکی رہتی ہے۔ بڑے
بڑے مشکل وقتوں میں، میں نے ان کا نام نہیں لیا تھا۔ میں نے تھانے
میں ان کا نام چھپایا۔ جیل میں بھی کسی کو بتا نہیں سکتے کہ میرا باپ کون
ہے اور میں کس شہر سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایک ذرا انتظار کر لیتیں کیا
کیا ہوتا۔ جب میں واپس اسٹیشن جا رہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو
تھے۔ میں نے خود کو سمجھایا۔ مجھے رونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس گھر
سے میرا تعلق تو فرار کے وقت ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں اب بھاگے کہیں
جا رہا تھا۔ یہاں اتفاقاً آ گیا تھا۔ میرا گھر جانے کا ارادہ تھا۔ نہ کسی سے
بات کرنے کا۔ میں تو یوں ہی ادھر آ گیا تھا۔ بس اپنی حویلی اپنا
اور گھر دیکھنے کے لیے اپنا کالج دیکھنے کے لیے۔

میری جیب میں صرف چند آنے رہ گئے تھے۔ جیب میں وہ
ٹکٹ تھا جو میں نے لکھنؤ سے کلکتے کے لیے خریدا تھا۔ خیال تھا کہ ایک
گاڑی سے گیا جاؤں گا، دوسری سے کلکتے کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں
گا لیکن اسٹیشن پہ پہنچ کر دیکھا کہ میرا ارادہ ڈانواں ڈول
ہو گیا اور میں ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ یہ میلے کا زمانہ نہیں تھا۔

اس لیے دم بخود رہ گیا۔ میں شاکیہ منی کا سکون چھایا ہوا تھا۔ راہبوں کی ٹولیاں ایک مندر سے دوسرے مندر آ جا رہی تھیں اور اس پیڑ کے نیچے بھیڑ لگی ہوئی تھی، جہاں شاکیہ منی نے نروان حاصل کیا تھا۔ میں بھی ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میلا سا ہوا تھا۔ اگر بدھ گیا کے تنگ میرے اس طرح دھرنا دے کے بیٹھنے پر کئی مرتبہ مجھے ٹوک گئے تھے۔ اب کسی نے خبر بھی نہیں لی۔ دیر تک میں یوں ہی شکستہ سا بیٹھا رہا۔ شام کو ایک بھکشو ادھر سے گزرتے وقت مجھے دیکھ کے رک گیا اور ملائمت سے کہنے لگا۔ "شاکیہ منی تم پر سکون کی بارش کرے۔ تمھیں کیا دکھ ہے؟"

"زندگی کا دکھ ہے۔" میں نے سختی سے کہا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم ٹھیک جگہ آگئے ہو۔ ایسے دکھیاروں کے لیے شاکیہ منی کے پاس شانتی اچھی دوا ہے۔"

"زہر سے بھی سوا کون سی ہوگی؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"نہیں نہیں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "شاکیہ منی کے پاس آکر ایسی بات نہیں کرتے۔"

"میں نے پہلے بھی اس کے پاس آنا چاہا تھا۔ مجھے کلکتے میں جانگ قبیلے کا ایک بھکشو ملا تھا۔ وہ میرا دوست بن گیا۔ میں دنیا میں تنہا تھا اور زمانے نے مجھے بہت دکھ دیے تھے۔ پھر اس نے مجھے شاکیہ منی کے سکون کی تعلیم دی۔ میں نے جو کچھ میرے پاس تھا وہ لوگوں میں بانٹ دیا۔ ایک رات وہ غائب ہو گیا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب میرے پاس پیسے نہیں رہے تو سب مجھ سے روٹھ گئے۔ پھر مجھے ایک ناکردہ گناہ کے الزام میں جیل ہو گئی۔ میں سات سال کی سزا کاٹنے کے بعد اس کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ کیا تم اُسے جانتے ہو؟ اس کا نام کیرسانگ تھا۔"

"کیرسانگ، ایک بھکشو۔" وہ کسی سے بولا۔ "ایک بھکشو؟"

"ہاں جانگ قبیلے کا ایک بھکشو۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "میں شاکیہ منی سے اس کی شکایت کرنے آیا ہوں۔"

"شاکیہ منی ضرور تمھاری شکایت سن رہا ہوگا۔ میں کسی ایسے بھکشو کو نہیں جانتا لیکن یہاں تبت کے چند لوگ آئے ہوئے ہیں۔ میں تمھیں ان سے ملاتا ہوں، آؤ میرے ساتھ۔"

وہ ملائمت کا اظہار کرتا ہوا مجھے ایک بھکشو کے پاس لے گیا جو اپنی کٹیا میں ریاضت کر رہا تھا۔ وہ دوڑ کے باہر آیا اور میرے ساتھی بھکشو کی زبانی میری داستان سن کے حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے کیرسانگ کے متعلق لاعلمی ظاہر کی تو میں نے اُس کے متعلق کچھ اور معلومات سے اُسے آگاہ کیا۔ میں نے کہا۔ "وہ کہتا تھا کہ وہ اتھین نامی ایک شخص کی تلاش میں آیا ہے۔ اتھین اس کے قبیلے کی ایک لڑکی کو ہندوستان لے آیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے قبیلے کے سردار سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کی بیٹی ضرور واپس لے جاؤں گا۔ وہ تو بہت سی باتیں کرتا تھا۔"

"وہ بھکشو نہیں ہوگا، وہ بھکشو نہیں ہوگا۔ وہ جھوٹا ہوگا۔ کوئی بھکشو جھوٹ نہیں بولتا اور کوئی بھکشو ایسے کام نہیں کرتا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "دوست! تمھیں دھوکا ہو گیا۔ تم سچ کہتے ہو، اتھین نامی ایک شخص جانگ قبیلے سے ایک لڑکی کو ہندوستان لے آیا تھا۔ اتھین کو یہاں بدھ گیا میں کسی نے مار ڈالا، لڑکی کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تو پھر وہ لڑکی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہوگا۔"

"یہ بہت پرانی بات ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر مجھے یقین ہے وہ بھکشو نہیں تھا۔"

"کیا میں جانگ قبیلے جا سکتا ہوں؟ میں اسے تلاش کروں گا۔ وہ ایسا نہیں تھا، وہ میرے ساتھ کئی دن ٹھیرا تھا۔"

"تم جانگ قبیلے کسی وقت بھی جا سکتے ہو مگر تمھیں وہاں جا کے کیا ملے گا دوست؟ آؤ ہمارے ساتھ رہو۔ بھکشوؤں کو ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ آؤ ہم تمھیں شاکیہ منی کے پاس لے جائیں گے۔"

میں نے تذبذب سے حامی بھری اور پہلے بھکشو کے ساتھ اس کی کٹیا میں چلا گیا۔ تمام رات اس نے مجھے صبر و ضبط کی تلقین کی۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے ساتھ میرے ٹھیرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں کسی طرح اس بھکشو سے ملاقات کرلوں جو جانگ قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ یقیناً کوئی ایسا بھکشو یہاں موجود ہوگا، نہیں ہوگا تو آجائے گا۔ بدھ گیا میں ہزاروں یاتری روزانہ آتے جاتے رہتے تھے۔

دوسرے دن میرے ساتھی بھکشو شنکر نے بلا کے مجھے گیروے کپڑے پہننے کے لیے دیے۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس لیے کہ میں نے پہلے ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ میں شاکیہ منی کے پاس آنے کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکا ہوں۔ میں نے کپڑے پہن لیے۔ گیروے رنگ کا بھکشوؤں کا لباس لیکن اب مالا چھپانے کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ شنکر نے مالا دیکھی تو مجھ سے کہا کہ میں اسے اتار دوں لیکن میں نے بہانہ بنا کے اسے اپنے گلے میں ڈال لیا کہ یہ میری ماں کی یادگار ہے۔ شنکر نے سوچا ہوگا کہ چند دنوں بعد میں خود اسے اتار کے کسی کو دان کر دوں گا۔

میں پانچ چھ روز بھکشوؤں کی ٹولی کے ساتھ مندروں میں گھومتا اور بدھ کی تعلیمات سنتا رہا۔ وہ سب میری بہت عزت کرتے تھے۔ تمام راہبوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ ایک نئے شخص نے شاکیہ منی کی تعلیمات سے متاثر ہو کے ادھر کا رخ کیا ہے۔

وہ مجھے ریاضتوں کے طریقے بتانے اور یک سو ہونے کی مشقوں کی تعلیم دینے لگے۔ میں بار بار ان سے کیرسانگ کا ذکر کرتا تھا اور انھیں اپنی داستان سناتا تھا۔ بدھ گیا کا ماحول بہت پراسرار تھا۔ بھکشو کسی ایک جگہ جم کر بیٹھ جاتے تو تصویر بن جاتے تھے۔ پھر انھیں دنیا کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ ابھی تک خاص جانگ قبیلے کا کوئی ایسا بھکشو مجھے نہیں ملا تھا جس سے کیرسانگ کے بارے میں کوئی خبر مل سکتی۔ چھٹے روز آدھی رات گزرنے کے بعد میں کٹیا میں لیٹا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آواز لگائی۔ میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ راہبوں کے مخصوص لباس میں وہ شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ ادھر ادھر دیکھ کے اس نے یکایک اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ "یہ مالا تمھارے پاس کہاں سے آئی؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ میں نے پینترا بدلنا چاہا۔ اس نے خنجر کی نوک میرے سینے کے سامنے کر دی۔

اندھیرے میں اس کا چہرہ خوف ناک ہو گیا تھا۔ اس کی راہبوں جیسی معصومیت اور سادگی سفاکی اور درندگی میں بدل گئی تھی۔ اس کے خنجر کی نوک میرے سینے پر تھی۔ وہ اگر چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ پہلے پل تو میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ اس کی اچانک آمد اور حملے سے گھبرا اٹھا لیکن پھر میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ میری مزاحمت میں نرمی آگئی۔ یہ وہی شخص تھا جس کا مجھے انتظار تھا اور جس کے لیے میں نے بدھ گیا کے اس اجنبی ماحول میں بدھ راہبوں کا حلیہ اختیار کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ ضرور آئے گا۔ یہ، یا اس کے دوسرے ساتھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری گردن میں لٹکی ہوئی مالا دیکھ کے پریشان ہو جائیں گے اور تفتیش حال کے لیے ضرور میرے پاس آئیں گے۔ صرف مالا کا حصول اس شخص کے لیے اتنا اہم نہیں تھا جو خنجر بدست مجھ پر حملہ آور تھا۔ وہ یقیناً یہ بھی جاننا چاہتا ہوگا کہ میں نے یہ مالا کہاں سے حاصل کی تھی اور جب تک مکمل معلومات اُسے فراہم کر کے مطمئن نہ کر دیتا، اس وقت تک میری زندگی یقیناً محفوظ تھی۔ میرے لیٹے ہوئے بدن اور چہرے پر چھائے ہوئے سکون سے وہ مشتعل ہو گیا اور جھنجھلا سا گیا۔ اس نے میرے گال پر ایک تھپڑ مارا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر تان کر میرے اور قریب ہو گیا۔ اب میں حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"میری بات کا جواب دو۔" اس نے سفاکی سے کہا۔

"خنجر سینے سے ہٹاؤ اور جو کچھ پوچھنا ہے وہ اطمینان سے پوچھو۔" میں نے کسی قدر بے پروائی سے کہا۔

"نہیں۔" اس نے میری آنکھوں میں اپنی سرخ آنکھیں ڈال دیں اور سرگوشی سے بولا۔ "بتاؤ تم نے یہ مالا کہاں سے حاصل کی؟"

"اس کے پیچھے ایک طویل داستان ہے لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ اس کے ذریعے کوئی راز اگلوا لوگے تو تم غلطی پر ہو۔" میں نے جرأت سے کہا۔

اس نے خنجر کی نوک میرے سینے میں چبھو دی۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھیں باہر نکلنے لگیں لیکن میں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ "میں اسے تمام کا تمام تمھارے سینے میں اتار دوں گا۔" اس نے غصے سے کہا۔ اس کے لہجے میں رحم یک سر مفقود تھا۔ میرا اندازہ غلط نکلا۔ مالا کو دیکھ کر وہ کچھ پاگل سا ہو گیا تھا اور لمحہ بہ لمحہ متشدد ہوتا جا رہا تھا۔ "آنا ہے، ورنہ پھر کبھی کچھ بیان نہیں ہو سکے گا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جاؤ گے۔ بہت سال ہو گئے، اب تو تمھیں کچھ ہوش آ جانا چاہیے۔" میں نے اسے قصہ گو سمجھ کر بے سروپا باتیں شروع کیں۔ وہ کچھ سوچنے اور مجھے گھورنے لگا۔ اس نے خنجر کو پیچھے ہٹا لیا اور اپنے جسم کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میرے گلے اس کے ہاتھ سے کچھ آزاد ہو گئے۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور اس سے کہا۔ "یہ مالا میری ماں کی نشانی ہے۔"

"وہ کیا نام بتا گئے ہو؟ جھوٹ! میں تمھیں قتل کر دوں گا۔"

"میرے باپ کے ایک تبتی دوست نے یہ مالا تحفے میں دی تھی۔ شاید اس کا نام اتھین تھا۔ اس بات کو سات آٹھ سال گزر گئے۔"

"ہاں ہاں۔" وہ بے تاب ہو گیا۔ "اتھین، اتھین اس کا نام یہی تھا۔ بتاؤ کیا ہوا؟" وہ وحشت سے بولا۔

"اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ بہت پیاری سی لڑکی۔" میری آواز پگھلنے لگی۔ "بالکل گڑیا جیسی تھی۔ اس کے دانت چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ چہرے پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس کا جسم قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔" یہ کہتے کہتے میں خاموش ہو گیا اور کہیں کھو گیا۔

میرے بیان پر شاید وہ بھی مبہوت ہو گیا تھا۔ پھر جھرجھری لے کے بولا۔ "اتھین مر گیا؟"

"ہاں۔" میں نے دکھ بھری آواز میں جواب دیا۔ "اسے مار دیا گیا۔"

"اور لڑکی کہاں ہے؟" اس نے یہ سوال اتنی تیزی سے کیا کہ زبان لڑکھڑا گئی۔ میں نے اس کا سخت رویہ دیکھ کے جان بوجھ کر اتھین کا نام لیا تھا اور کیرسانگ کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ یہ وقت ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے ٹالنے اور کچھ [illegible] نے کا نہیں تھا۔ مجھے اس شخص سے کیرسانگ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا مگر دونوں کی حیثیت ایک سی تھی۔ اس کی تشویش سے ایک بات تو واضح ہو گئی کہ کیرسانگ اپنے قبیلے واپس نہیں پہنچا مگر یہ کیا راز ہے کہ لوگ ابھی تک اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں؟ اتنی مدت گزرنے کے بعد انھوں نے یہ کیوں نہیں سمجھ لیا کہ لڑکی کو کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آگیا ہوگا۔ اس کا نگراں بوڑھا اتھین مر چکا تھا۔ یقیناً کم عمر لڑکی نے کسی شخص کا سہارا لیا ہوگا۔ اتنے بڑے ہندوستان میں وہ نہ جانے کہاں اور کس عالم میں ہوگی۔ کیا یہ لوگ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ لڑکی کسی بھی وقت قبیلے میں نمودار ہو کے اور اپنا یار منتخب کر کے سرداری کا اعلان کر سکتی ہے؟ وہ مجھ سے کچھ جاننے کے لیے بری طرح مچلے

رہا تھا اور میں اس کی زبانی کچھ سننے کا شدت سے منتظر تھا۔
"تم چپ کیوں ہو گئے؟ میں پوچھتا ہوں کہ لڑکی کہاں ہے؟" اس نے
مجھ پر سے کا ہاتھ بلند کر کے دوبارہ اسے میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔
جیسے شاید میں اپنے اور اس کے درمیان اس تیز دھار خنجر کی موجودگی بھولا
جا رہا ہوں۔
"وہ زندہ ہے۔" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔
"وہ کہاں ہے؟" اس نے پھر سے تکرار کی۔
"تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے نفرت سے پوچھا۔
"میرا تعلق ہے؟" اس کے تیور بگڑ گئے مگر وہ جلد ہی سنبھل کے بولا۔
"میں اسی کے قبیلے کا ایک آدمی ہوں۔ ہم اُسے مدتوں سے تلاش کر رہے ہیں۔
وہ ہمارے سابق سردار کی بیٹی ہے اور قبیلے کی امانت ہے۔ ہم کسی بھی قیمت
پر اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہیں۔"
"تو تم نے اسے قبیلے سے نکال کیوں دیا تھا؟"
"اسے بوڑھا آتین اغوا کر کے لے آیا تھا۔" وہ مجھے جواب دینے پر مجبور
تھا کیونکہ میں اسے بتا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں کورا کے بارے میں
کچھ جانتا ہوں۔ اس کے پاگل پن میں کسی قدر کمی آ گئی تھی۔ راستے ویران میں کتنی
ہی بار میں نے جنگل اور اس کے ساتھیوں کے سکھائے ہوئے داؤ آزمانے کا ارادہ کیا
مگر وہ پوری طرح چوکنا تھا اور ہوشیار رکھنے کے آداب جانتا تھا۔ قبیلے کے
سردار نے لوگ چھانٹ چھانٹ کر کورا کی تلاش میں دوڑائے ہوں گے۔ اس نے
مجھے ایک بھی داؤ آزمانے کا موقع نہیں دیا البتہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہو چکا
تھا کہ میں نے اپنے سینے اور گردن پر پتھر کا خوف کم ہی محسوس کیا ہے۔
"بوڑھا آتین اسے اغوا کر کے نہیں لایا تھا۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "تم
جھوٹے ہو۔ آتین نے اپنے سردار سے دوستی کا فرض نبھایا تھا۔ اس نے اس کی بیٹی
کو ظالموں کے پنجے سے بچایا، اسے پناہ دی۔ ضعیفی اور ناتوانی میں دور دراز کا
سفر اختیار کر کے اسے زندہ رکھنے کے لیے یہاں تک لے آیا اور تم اس سے
زندگی چھیننے کے لیے گلی گلی گھومتے ہو جبکہ اس کا تعاقب کرتے ہو۔ تم آتین
کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر کان کھول کے سن لو کہ کورا تمہارے ہاتھ
نہیں آ سکتی۔ جاؤ اپنے قبیلے واپس چلے جاؤ۔ اپنے سردار سے کہنا سرداری تمھی کو
مبارک ہو۔ کورا واپس نہیں آئے گی۔"
"ارے تم اس کا نام بھی جانتے ہو؟" وہ وحشیانہ انداز میں بولا۔ "بتاؤ وہ کہاں
ہے؟" وہ میرے منہ پر پے در پے لاتوں سے مسلسل ضربیں لگانے لگا۔ میرا ایک
دانت ٹوٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ پھر اس نے میرے بال پکڑ لیے
اور وحشت ناک طریقے سے فرش کے ساتھ پٹخنے لگا۔
جنگل کہتا تھا کہ جب ایسی کوئی صورت پیش آ جائے اور تم خود کو بے دست
و پا محسوس کرنے لگو تو اپنے مخالف کو حد سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش
کرو۔ اشتعال میں وہ ضرور کوئی غلطی کرے گا بس تم اسی لمحے کے منتظر رہو۔

اب کورا کا ذکر ہو رہا تھا اور اس کا دشمن میرے سامنے تھا۔ وہ کورا کو مارنا چاہتا
تھا اور میں اسے تاقیامت زندہ دیکھنے کا آرزومند تھا۔ وہ کورا کا دشمن تھا
لہٰذا میرا دشمن تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے کورا جیسی پھول لڑکی کی زندگی
حرام کر دی تھی اور اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے
دل میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ میرے منہ سے خود ہی ایسی باتیں
نکل گئیں جو اس کے تن بدن میں پوری طرح اتر گئیں۔ وہ بہت
غضب ناک ہو گیا تھا۔ طیش کے عالم میں اس کا دھڑ بے اختیار میرے جسم سے
اوپر ابھرا۔ میں نے فی الفور پوری طاقت سے اپنے گھٹنے اس کے پیٹ میں
مار دیے۔ وہ گیند کی طرح اوپر اچھلا۔ میں جھک کر خنجر زدہ ان میں ایک طرف
ہٹ چکا تھا۔ وہ ایک لمحے کی مدت میں تڑپ کر سیدھا ہونا چاہتا تھا
کہ میں نے درمیان میں اسے جا لیا اور سینے کے بل دوبارہ زمین سے چپکنے
کا پابند کر دیا۔ میں اس کی پشت پر سوار تھا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ میری گرفت
میں آ چکا تھا۔ ویسے بھی وہ زمین پر پیٹ کے بل اوندھے منہ پڑا ہوا تھا اس لیے خنجر سے
کے ہاتھ دکھانے سے معذور ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت ڈھیلی کر دی۔
اس نے میری توقع کے مطابق پیچھے کی طرف سے میرے جسم پر ایک زور کا جھٹکا
دیا۔ میں اس جھٹکے کے لیے آمادہ تھا۔ وہ قبول کیا تھا کہ میں نے اپنا سارا زور
اس کے ہاتھ پر لگا دیا۔ اس کے جھٹکے سے میں ایک طرف لڑھک گیا لیکن میرے
ہاتھ چھوڑنے سے اس کی کلائی ٹوٹ گئی۔ وہ تکلیف سے بلبلانے لگا۔ خنجر اُس
سے میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر نشست جمالی۔
"تم پوچھ رہے تھے کہ لڑکی کہاں ہے؟ اب تمہیں لڑکی کی کیا ضرورت
ہے؟ وہ کبھی وہاں واپس نہیں جائے گی۔" میں نے تحمل سے کہا۔
"لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لڑکی کہاں ہے؟ اسے کون لے گیا؟"
اس کی آواز بالکل بدل گئی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔
"کیوں؟" میں نے تلملا کر کہا۔ "آخر کیوں؟ جب تمہارا اس سے کوئی
تعلق ہی نہیں رہا اور تم سے کہہ دیا گیا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی تو تم اس کے
پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ تم اسے اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"
"کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ کرب سے بولا۔
"ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ وہ تمہارے لیے مر چکی ہے۔ مجھے بتاؤ
تم اسے کس طرح معاف کر سکتے ہو۔" میں نے طنز سے کہا۔
"ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اسے تلاش کرنا ہی ہے۔"
"تم اس کی گرد بھی نہیں پا سکتے۔ میں تمہارے سینے میں تمہارا خنجر اتار
دوں گا تاکہ تمہارے سردار کو معلوم ہو جائے کہ کورا کو بچانے والے لوگ اس سے
زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔"
"مجھے مت مارو۔" وہ گڑگڑا کے بولا۔ "میں ان کا ایک کارندہ ہوں
میرے جیسے بہت سے لوگ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک کو مار کے
تم تمام آدمیوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ پورے جانگ قبیلے کو ختم نہیں کر سکتے۔ میں

جاؤں گا تو میری جگہ کوئی دوسرا اس کی تلاش میں نکل آئے گا۔"
"تم ہندوستان کے کتنے گھروں کتنے تہہ خانوں میں جا گھسو گے؟"
"پروہت کہتے ہیں کہ ایک دن وہ ضرور ملے گی۔"
"پروہت جھوٹ بولتے ہیں۔" میں نے نفرت سے کہا۔
"تو کیا، تو کیا وہ مر چکی ہے؟" اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔
میں نے اس بدزبان کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ "وہ زندہ ہے اور
زمانوں تک زندہ رہے گی۔"
"تو پھر مجھے اس کا پتہ بتا دو۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "اور میری بات کا
یقین کرو۔ میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اس سے صرف کاغذات حاصل
کر کے تبت چلا جاؤں گا اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔"
"کیسے کاغذات؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔
"وہ متبرک کاغذات جو آتین کورا کے ہمراہ قبیلے سے لے آیا تھا۔ آتین
کے ساتھ جواہر کا ایک بڑا خزانہ بھی تھا۔ ہمیں اس خزانے اور کورا سے
کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں کاغذات درکار ہیں۔ تم نہیں جانتے۔ وہ کاغذات
کسی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ردی کے ٹکڑے ہیں مگر ہمارے
قبیلے کے لیے ان کی حیثیت متبرک ہے۔ آج سے صدیوں پہلے ہمارے
بزرگوں نے شاکیہ منی کے فرمودات ان کاغذات پر لکھے تھے۔ شاکیہ منی اس
وقت ہم لوگوں کے درمیان زمین پر موجود تھے۔ پھر وہ آسمانوں میں چلے گئے۔
ہمارا عقیدہ ہے کہ جب قبیلے میں وہ کاغذات محفوظ رکھنے کی طاقت نہیں
رہے گی یا وہ ان کی حفاظت نہیں کر سکتا اور ایسے پجاریوں کے باعث ان سے محروم ہو
جائے گا تو قبیلے پر نحوست کے بادل منڈلانے لگیں گے۔ قبیلے میں خون ریزی
ہونے لگے گی۔ قبیلے کے سردار کے لیے لازم ہے کہ وہ یہ انمول دستاویزات
اپنی تحویل میں رکھے۔ وہ قبیلے کی جانب سے ان کا امین ہے۔ جب ایک سردار
کے بازوؤں میں طاقت نہیں رہتی تو اسے ہونے والے سردار کو کاغذات
حوالے کر کے اقتدار سے دستکش ہونا پڑتا ہے۔ قبیلے میں صرف بڑے پجاری
اور سردار کو اس کا علم ہوتا ہے کہ یہ متبرک دستاویزیں کہاں چھپا کے رکھی
جاتی ہیں۔ آتین انہیں ہم سے چھین کے لے گیا۔ اس وقت سے اب تک ہمارا
قبیلہ اپنے بہت سے آدمی کھو چکا ہے۔ کئی بار آسمانی آفتیں ہماری زمینوں
پر نازل ہو چکی ہیں۔ ہم دانے دانے کو محتاج ہو گئے ہیں۔ نئے سردار کے ساتھ قبیلہ
یہ شرط وابستہ کرتا ہے کہ وہ متبرک کاغذات ضرور حاصل کرے گا۔ اسے دس سال
کی مدت دی جاتی ہے۔ جب اس مدت میں وہ ناکام ہو جاتا ہے تو دوسرا سردار
منتخب کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم متعدد سردار بدل چکے ہیں اور قبیلے کی
بدنصیبی یقینی طور پر بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ہمیں وہ کاغذات دوبارہ مل جائیں تو
ہم اپنی مصیبتوں سے باہر نکل آئیں گے۔"
میں نے درمیان میں دخل نہیں دیا۔ اسے بولنے دیا۔ اس کی آنکھیں
شعلہ اگل رہی تھیں اور ان کی گہرائی میں حسرتیں تیر رہی تھیں۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا اور زبان

میں لکنت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے یہ انکشاف کرنے پر سخت
روحانی اذیت ہو رہی ہو۔ برسوں بعد اسے ایک شخص ملا تھا جس کے سامنے
کورا کا نام لے دیا تھا۔ پھر سے کی لڑکی اور موت کے خوف نے شاید اس کے
دل میں یہ اضطراب انگیز تجسس موجود ہو گا کہ میں ضرور اس کی مدد کر سکتا
ہوں۔ وہ مجھ سے مفاہمت کرنے اور اعتماد میں لینے کے لیے ہر وہ بات بہر
اہم انکشاف کرنے پر مجبور تھا۔ میرے لیے اب اس میں حیرانگی نہیں
رہ گئی تھی کہ کورا کا نام اسے پتہ تھا۔ وہ جن کاغذات کی بات کر رہا تھا، وہ
ابا جان کی تحویل میں تھے اور مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ انھوں نے انہیں محفوظ
بھی رکھا یا نہیں۔ میں ابا جان کے موجود ہونے سے بھی ناواقف تھا۔ اس
سے اور کیا بات کرتا۔ کاغذات کے بدلے کورا کا سودا کرتا تو کورا کہاں تھی۔ اسے
تو میرے رقیب نے مجھ سے چھپا دیا تھا اور کاغذات حوالے کر کے بانگ
قبیلے کا سکون واپس کرنے اور کورا کو ایک عذاب ناک تعاقب سے نجات دلانے
کی کوشش کرتا تو ابا جان کہاں تھے۔ میری خاموشی پر وہ مجھے بے تحاشا یاد
کرنے لگا۔ میں جست لگا کے اس کے سینے سے اٹھ گیا۔ "جاؤ مجھے کچھ نہیں
معلوم۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "خود میں بھی اس کی تلاش میں ہوں۔ جانے وہ ہرجائی
کہاں غائب ہو گئی ہے۔"
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ شاکیہ منی کی قسم تم سب کچھ جانتے ہو۔" وہ
میرے پیروں پر گر گیا۔ "میں دنیا بھر کا خزانہ تمہارے قدموں پر ڈال سکتا
ہوں۔ میرے قبیلے کا یقین مجھے واپس دلا دو۔ اسے نحوستوں سے بچا لو۔"
میں نے ٹھوکر مار کے اسے اپنے پیروں سے جدا کر دیا۔ وہ مجھ سے دولت
کی بات کر رہا تھا۔ میرے لیے کورا کے بغیر ہر دولت بیکار تھی۔ میرے لیے
کورا ہی سب سے بڑا خزانہ، سب سے بڑی دولت تھی۔ اس پر دوبارہ وحشت کا دورہ
پڑا۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی سے میرے سینے پر اپنا سر مارا۔ خنجر میرے
ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اس نے جھپٹ کر اسے اٹھا لیا۔ میں نے برداشت
ترک کر دی تھی۔ اس نے پلٹتے ہی کسی تامل و جھجک کے بغیر تن کر کھڑا ہو گیا تھا مگر یکایک
پھر وہ ہراساں ہو گیا اور اس کا بلند ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ "تم اپنی طاقت
ضائع کر رہے ہو۔ یہ خنجر پھینک دو اور انسانوں کی طرح بات کرو۔" میں نے
دھیمے لہجے میں کہا۔
"میں تمہیں قتل کر دوں گا۔" اس نے طیش میں کہا۔
"تم کبھی یہ حماقت نہیں کر سکتے۔"
"تو مجھ پر رحم کرو۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے صرف وہ کاغذات میرے
حوالے کر دو۔" وہ کبھی نرم پڑتا، کبھی گرم ہو جاتا۔ "نہیں تو۔" اس نے چیخ کے کہا
اور دفعتاً میری گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ الٹ کر نیچے گر پڑا۔ اس
کے دانے فرش پر بکھر گئے۔ میرے خون میں رعشہ ہونے لگا۔ وہ میرے
چہرے کی جانب متوجہ تھا کہ شاید اب میں اس کے سامنے کوئی انکشاف
کروں گا۔ اس کی اسی بے خبری کے لمحے میں نے اُڑنگا مار کے اسے

اور سوگواری صاف محسوس کر لی تھی جیسے اسے سفر کی صعوبتوں کی عادت نہ ہو۔ جیسے وہ تھک گئی ہو۔ جیسے اس نے گھر سے پہلی بار قدم نکالا ہو۔

کھڑکیوں سے بوندیں اندر آنے لگیں۔ عورت نے اٹھ کے کھڑکی بند کر لی اور تکیہ پر ہاتھ رکھ کے جماہی لینے لگی۔ اس بار پھر بے اختیار میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور جب میں نے اسے پہچانا تو پہچانتا چلا گیا۔ مجھے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ سات سال میں اس کے چہرے پر صرف معمولی رد و بدل ہوا تھا جسے اس نے غازے کی تہہ میں چھپانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ میری آنکھوں میں سوزش سی ہونے لگی۔ میری ساری رگیں تن گئیں اور خون شریانوں میں ابلنے لگا۔ وہ کریم گل کی چچی تھی۔ خود ساختہ بالیسٹ ورانچی۔ کلکتے کے ہوٹل میں اس نے مجھ پر بڑی نوازشیں کی تھیں۔ کورا پر تو وہ جان سے فدا تھی۔ جیسے شوہر سے سواب بھی کوئی بیگم نظر آتی تھی۔ اس نے کورا کو فروخت کرنے کا سودا کر لیا تھا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا؟ اس نے میری عزت، میری ناموس نیلام پر چڑھا دی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کی آنکھیں نکال لوں اور اس کی زبان کاٹ لوں۔ میں نے اسے خوب پہچان لیا تھا مگر اس نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا تھا کیونکہ سات سال میں میری وضع قطع بہت تبدیل ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کے میں خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ فرسٹ کلاس میں تنہا سفر کرنا، ساتھ میں ایک نوجوان لڑکی۔ گویا اس کا کاروبار اچھا چل رہا تھا۔ مجھے وہ لڑکی کورا کی طرح معصوم لگی۔ بے بس لگی۔ تاثر میں نے سوچا کہ یہ کسی معزز خاندان کی لڑکی ہو گی جو اس ذلیل عورت کے پھندے میں نہ جانے کس طرح پھنس گئی۔ اس کا چہرہ مضطرب تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے ڈر لگ رہا ہو گا۔ آگے نہ جانے کیا ہو؟ پریشانی ہو رہی ہو گی۔ گھر واپس جانے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گا مگر پیچھے کا تمام راستہ مٹا ہوا نظر آ رہا ہو گا۔ چند لمحوں میں ساری حقیقت میری سمجھ میں آ گئی۔ ان دونوں کے درمیان عزیزوں جیسا ربط ضبط معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بے ساختگی کے بجائے ایک جھجک تھی۔ میری عقل خبط ہو گئی۔ گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ میں خنجر بھی کلکتے ہی میں چھوڑ آیا تھا ورنہ اس کے سینے میں بھونک دیتا۔ میں شعلوں میں گھرا بیٹھا تھا۔

"بیگم صاحب! کچھ کھانے کو ہو گا؟" میں نے اپنی زبان پر بمشکل قابو پاتے ہوئے التجا آمیز انداز میں کہا۔

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ایک بار اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور طنطنے سے بولی۔ "بھوکا ہے؟"

"جی" میں نے بے تابی سے گردن ہلا کے جواب دیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اس نے تیکھے پن سے پوچھا۔

"کلکتے... روزگار کی تلاش میں۔"

اس نے کنڈیا میں سے کچھ بسکٹ اور پوریاں نکال کے میری طرف بڑھا دیں۔ مجھے ہر صورت انھیں زہر مار کرنا تھا۔ میں نے بسکٹ اور پوریاں اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیں اور بے تحاشا منہ میں ٹھونسنے لگا۔ چچی کے لبوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "اطمینان سے کھا۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "کہاں سے آ رہا ہے؟"

"بنارس سے بیگم صاحب!" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"بنارس میں کیا کرتا تھا؟"

"کوئی ایک کام کیا ہو تو بتاؤں۔ پر قسمت خراب ہے بیگم صاحب! پہلے ایک سیٹھ کے ہاں نوکر تھا۔ وہ مر گیا تو اپنا کام بگڑ گیا۔ وہ کیا گیا، اپنی قسمت بھی ساتھ لیتا گیا۔"

"کچھ پڑھا لکھا آتا ہے؟"

"بس جی اپنا نام لکھ لیتا ہوں۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"پتہ نہیں کہاں ہیں بیگم صاحب! سب اللہ کو پیارے ہو گئے شاید۔ مجھے تو سیٹھ کسی میلے سے پکڑ کے لایا تھا۔ بہت خاطر کرتا تھا اس کی اپنی۔ اب وہ مرد کبھی نہیں آئے گا۔ مسلمانوں سے نفرت کرتا تھا لیکن میرا بڑا خیال رکھتا تھا۔ جتنے بھی اچھے اچھے پکوان پکتے تھے، وہ مجھے کھلاتا تھا۔"

میں بولتا رہا مگر میرے ہی الفاظ میرے دل پر گھونسے لگاتے رہے۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا، بہت صبر کیا۔ تب کہیں اپنا لہجہ بدلنے پر قادر ہو سکا۔ اس نے میری کہانی میں خاصی دل چسپی لی۔ لڑکی بھی گوش بر آواز تھی۔ "نام کیا ہے تیرا؟" چچی نے پوچھا۔

"فقیرا جی۔" میں نے گھبرا کے کہا۔

"فقیرے!" وہ اونچی آواز میں بولی۔ "کلکتے میں کسی کو جانتا ہے یا یوں ہی منہ اٹھا کے چل پڑا ہے؟"

"بس چل پڑا ہوں بیگم صاحب! اللہ میاں کوئی سبب پیدا کرے گا۔ اتنی بڑی جگہ ہے۔ کہیں نہ کہیں تو سر چھپانے کو جگہ مل جائے گی اور اللہ میاں نے منہ چیرا ہے تو کھانے کو بھی دے گا۔ اب دیکھیے نا، وقت ڈالنے پر بھوک لگی ہوئی ہے۔ آج آپ کا دانہ قسمت میں لکھا تھا، کھینچ کے یہاں لے آیا۔"

"باتیں تو خوب کرتا ہے۔ پر تو کلکتے میں کام کیا کرے گا فقیرے؟ وہ تو بڑی نامراد جگہ ہے۔ میں کہتی ہوں واپس چلا جا۔ بنارس ہی میں کوئی کام تلاش کر۔"

"اب چلا آیا تو چلا آیا بیگم صاحب!" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"میری مرضی پر چلنا۔ تجھے کون سا کام پسند ہے؟"

"مجھے کسی کام سے عار نہیں ہے۔ جو کہے کر لوں، پیٹ کو چاہیے دو روٹی۔" میری زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ جیل سے آنے کے بعد اب تک میں نے کسی سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں اور جیل کی جمائی میں بھی کہانی کی تھیں لیکن وہ ایک کمین عورت تھی۔ وقت اور مقام دونوں بُرے تھے۔ پولیس پیچھے لگی ہوئی تھی۔ بردوان کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس بار پولیس

صرف پلیٹ فارم پر موجود ہو۔ وہ دونوں طرف کھڑی ہو کے اترنے والے مسافروں پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اگر میں چچی سے ایسی باتیں شروع نہ کرتا تو مجھے اگلے اسٹیشن پر اترنا پڑتا۔ پھر پولیس کی زد سے بچ کے دوبارہ کسی ڈبے میں چڑھنا پڑتا۔ ایک شخص جس کے پاس سفر کا ٹکٹ بھی نہ ہو، جو پولیس کو مطلوب ہو اور جس کا حلیہ بھی مشکوک ہو اور جس کے لیے فرار کے راستے مسدود ہوں، وہ کیسی کیسی بدترین مفاہمت پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ چچی سے اسی حال میں ملاقات ہونا رہ گیا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ کلکتے اترتے ہی میرا رخ جیل کی طرف ہو گا۔ وہاں میں کریم گل سے ملوں گا اور اس سے اس شیطان کا پتہ پوچھوں گا جو سات سال پہلے سینما میں کریم گل اور چچی سے کورا کا سودا کر رہا تھا۔ اسی نے ہمارے پیچھے بدمعاش لگائے ہوں گے۔ اب دو ہی امکانات تھے۔ یا تو کورا ان غنڈوں کے ہاتھ لگ گئی ہو گی جنھوں نے اس رات ہم پر حملہ کیا تھا یا اسے مولوی صاحب لے گئے ہوں گے اور آج کریم گل کے بجائے براہ راست اس کی چچی سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے کریم گل کی حیثیت محض ایک کارندے کی تھی۔ چچی! مجھے کہیں زیادہ وحشت ناک اور گھناؤنی عورت لگی۔ خیریت گزری کہ چچی مجھے پہچان نہیں سکی۔ اگر پہچان جاتی تو واقعات مختلف انداز سے پیش آتے۔ ممکن تھا کہ وہ مجھے کھڑکی سے پھینک دیتی۔ اندھیری رات میں اونگھتے ہوئے مسافروں کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کس گنہگار کے بوجھ سے گاڑی کا وزن کم ہو گیا ہے۔ دوسرے میں نے چچی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر غصے کے باوجود ہر طرح لڑکی کا جائزہ لے کے گفتگو کی ابتدا کی۔ میرا یقین پختہ سے پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس لڑکی کی حیثیت کورا سے مختلف نہیں ہے۔ یہ بھی کہیں سے خواب دکھا کے لائی گئی ہے۔ کسی بے غیرت نے اسے بیچ دیا ہے یا اپنے حالات سے تنگ آ کے چچی کی خواب آور باتوں پر ایمان لے آئی ہے۔ میں نے کورا کا کرب دیکھا تھا۔ میں نے جیل میں ایک نمبری بدمعاشوں سے بے غیرتی اور انسانیت سوزی کے ہزاروں واقعات سنے تھے۔ مجھے ان کی منزل معلوم تھی۔ "کیا بھی فقیرے!" چچی نے کندھے اچکا کے کہا۔ "بنارس اور کلکتے میں بہت بڑا فرق ہے۔ بنارس کی دنیا اور ہے، کلکتے کی اور۔ کلکتے میں تجھے نئی نئی باتیں سننے کو ملیں گی۔ تیرا دیدہ پھٹ جائے گا۔ اب اگر تو سیدھے سے حامی بھرے کہ تو میرے اشاروں پر چلے گا، میری مرضی کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھائے گا تو میں تیرے لیے کچھ سوچ سکتی ہوں۔"

"بیگم صاحب! بیگم صاحب!" میں نے مچل کے کہا۔ "میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ آپ رات کو دن کہیں گی تو میں بھی اسے دن کہوں گا۔ آپ دن کو رات کہیں گی تو میری بھی زبان پر ایک بھی لفظ شکایت کا نہیں آئے گا۔ بس آپ ہاں کر دیجیے۔ کر دیجیے نا!"

"اچھا! دیکھ فقیرے!" چچی نے گھراتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے نہیں جانتی۔ تیرا اچھا برا مجھے کچھ نہیں معلوم مگر تو انسان کا بچہ لگتا ہے اس لیے اعتبار کرتی ہوں۔ مجھے تیری جوانی پر ترس آ رہا ہے۔ بنارس کی گلی میں بندو جیسے ہاں طرح سے ٹھوکریں کھانے سے تیرے چہرے پر بے رونقی پیدا ہو چکی ہے۔ میں اس کا اثر تو نہیں لیتی پر تجھے اچھے گھر میں سب کچھ نصیب ہو گا۔ زمانے نے ہر چیز بدل دی ہے لیکن بس ایک بات کہتی ہوں۔ میں پرانے زمانے کی کسی چیز سے کوئی انحراف پسند نہیں کرتی۔ زمانہ بدل گیا ہے مگر لوگ پرانی چلوں اور بناوٹ رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ہیں۔ ہم قدیم بھی کہلاتے ہیں اور جدید عہد کی دنیا کا مزا بھی لیتے ہیں۔ سمجھا؟ کچھ آیا دماغ میں؟"

"سب کچھ آ گیا۔" میں نے جوش سے کہا۔ "میں بھی حیرت زدہ ہوں۔ بیگم صاحب! آپ مجھے ہر معاملے میں دو قدم آگے پائیں گی۔ ہر کوشش کی بخشش پاؤں گا لیکن...." میرا چہرہ لٹک گیا۔

"لیکن کیا فقیرے؟ کیا تنخواہ کی بات کر رہا ہے؟"

"نہیں بیگم صاحب!" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تو میں نے خود کو آپ کے قبضے میں دے دیا ہے۔ بیگم صاحب! ایک غلطی ہو گئی ہے۔" میں نے اٹک اٹک کے کہا۔

"کیسی غلطی؟" وہ چونک کے بولی۔ "کچھ منہ سے تو پھوٹ۔"

"گیا اسٹیشن پر ایک ہندو سے لڑائی ہو گئی تھی۔" میں نے تھمتماتے ہوئے کہا۔ "اس نے میری ماں کو گالی دے دی تھی۔ میں برداشت کر گیا۔ پھر تو جانے وہ کیا کیا اول فول بکتا رہا۔ میں چپ رہا۔ پھر اس نے میرے اوپر تھوک دیا۔ بس مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ اس کا خون بہنے لگا۔ آدمی کوئی بڑا تھا۔ پولیس میں رپورٹ کر دی گئی۔ اب پولیس مجھے اسٹیشن اسٹیشن پکڑنے کی فکر میں ہے۔"

"تو لڑتا جھگڑتا بھی ہے؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"بس بیگم صاحب! غصہ آ گیا۔ دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

"شریف آدمی کو کبھی کسی لڑائی جھگڑے سے دور رہنا چاہیے۔"

"اب وہ بردوان اسٹیشن پر پھر میری تلاش میں آئیں گے۔ اس لیے میں کچھ دیر کے لیے باہر جاؤں گا اور بردوان کے بعد آپ کی خدمت میں پیش آ جاؤں گا۔"

"آنے دے انھیں۔ تجھے کیا تھوڑی لے جائیں گے۔"

"ان پولیس والوں کا دین ایمان کچھ نہیں ہوتا بیگم صاحب! میں ان کے سامنے آنا ہی نہیں چاہتا۔" میں نے مضطرب ہو کے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو بے فکر رہ۔ اطمینان سے بیٹھا رہ۔" یہ کہہ کے چچی نے مٹی کے برتن سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا نکال کے مجھے دیا۔ میں نے بے ڈھنگے پن سے اسے سلام کیا۔ لڑکی میری داستان ادھر بے چین آنکھوں، حیرت اور حسرت سے سن رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ میرے کسی جملے پر مسکرانے کی کوشش کرتی اور پھر اداسی میں ڈوب جاتی۔ "یہ بچی بیگم آپ کی کون ہیں؟" میں نے چچی سے لڑکی کے متعلق پوچھا۔ "تیرا مطلب

نے دولت استعمال نہیں کیا تھا۔ چچی نے جس طرح ایک بار کورا کی بلائیں لی
تھیں، اسی طرح اُس کی ٹھوڑی پکڑ کے اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔
چچی کی اس وارفتگی پر لڑکی کا رنگ سرخ ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں شرم کے
ڈورے پڑ گئے۔ "یہ میری زندگی ہے، یہ میرا سہارا ہے۔" چچی نے اُسے بازو
سے پکڑ کے خود سے قریب کر لیا۔ لڑکی دُہری ہو گئی۔

بردوان اسٹیشن تک میں اُس سے بنارس کی باتیں کرتا رہا۔ پھر جب
پلیٹ فارم پر گاڑی کی رفتار سست پڑنے لگی تو چچی نے میری طرف دیکھ کے لیٹرین
کی جانب اشارہ کیا۔ اس کے سوا اُس کے ذہن میں مجھے چھپانے کے لیے
کوئی ترکیب ہی نہیں آ سکتی تھی۔ میں وہاں چلا گیا۔ پھر ڈبے کے اندر کون آیا؟
کون گیا؟ میں اس تمام روداد سے بے خبر رہا۔ پلیٹ فارم سے اُٹھنے والا شور
اتنا تیز تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پولیس والوں نے کھڑکی سے
جھانک کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والی ان دو برقع پوش معزز خواتین
سے ادب کے ساتھ پوچھا ہو گا کہ انھوں نے اپنے ڈبے میں کوئی شخص تو نہیں دیکھا؟
چچی کے تیور بگڑ گئے ہوں گے اور پولیس والے کوئی جواب دیے بغیر آگے نکل
گئے ہوں گے۔ اندر میرا دم گھٹتا رہا۔ ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ میں کریم
گل کی آج چچی کی مٹھی میں بند تھا۔ میں نے سوچا کہ فرض کرو اس نے بہروپ سے مجھے
پہچان کر پھر ادھر پولیس کے انتظار ہی میں بیٹھی ہو؟ مجھے جھرجھری آ گئی۔
بردوان اسٹیشن سے گاڑی کی روانگی میں خاصی تاخیر ہوئی۔ میرے لیے وقت
کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے جب گاڑی نے حرکت کی تو میرے اوسان
بحال ہوئے۔ پھر چچی کی دستک پر میں باہر نکلا۔ "آئے تھے وہ؟" میں
نے بے چینی سے پوچھا۔

"آئے تھے اور جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔" چچی مسکرائی۔

"کیا کہتے تھے؟" چچی اکیلے میں یقیناً مجھ پر احسان جتانے کے لیے
باتیں بنا سکتی تھی مگر لڑکی کی موجودگی میں مبالغے سے کام نہیں لے سکی۔ اُس
نے صرف یہ کہا۔ "بس بیٹھ جا آرام سے۔ کاہے کی فکر کرتا ہے۔ تیرے لیے
جھوٹ بولنا پڑا۔"

میں نے احسان مندی کے طور پر اُسے سلام کیا۔ میری سادگی پر وہ
کھل کھلا کے ہنس پڑی۔ لڑکی اُس کی ہنسی میں شریک نہیں ہوئی۔ جیسے
جیسے کلکتے کا فاصلہ گھٹ رہا تھا، لڑکی کے چہرے پر دھند سی چھائی جا رہی
تھی۔ کسی اسٹیشن پر ٹھہرنے کے لیے گاڑی کی رفتار معتدل ہونے لگی۔ میں نے
دوبارہ چھپنے کے لیے پر تولے۔ "بیٹھا رہ۔" چچی نے حکم دیا اور کھڑکی سے جھانک
کر دیکھا۔ "کہاں تک تلاش کریں گے۔ بس اب نچلا ہو کے بیٹھ جا۔"

چچی کا اندازہ درست تھا۔ پتہ نہیں وہ کون سا اسٹیشن تھا۔ وہاں
پولیس کا کوئی ہرکارہ ڈبے کی طرف نہیں جھانکا۔ دو اسٹیشنوں پر مطلوبہ
ملزم کی تلاش میں ناکامی کے بعد افسروں نے ہار مان لی ہو گی اور یہ قیاس
کیا ہو گا کہ ملزم گیا سے رات کو چلنے والی ہوڑا ایکسپریس میں سوار ہو گیا ہو گا۔
وہ اتنی ہی تگ و دو کر سکتے تھے۔ ممکن ہے انھوں نے شبہے میں چند بدنصیب
مسافروں کو پکڑ بھی لیا ہو۔ پولیس خانہ پری کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی
ہے لیکن ابھی گاڑی ٹھہرے ہوئے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ دو
ہٹے کٹے آدمی نہایت بے تکلفی سے کھڑکی پر کھڑے ہو گئے۔ مجھے وہاں دیکھ
کے اُن کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ شکل و صورت سے اُن کے مشغلے صاف
نظر آ رہے تھے۔ میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ ایسے ہی لوگوں کی صحبت میں
گزارا تھا۔ ایک کچھ لمبا اور دوسرا اوسط قد کا تھا۔ وہ معمولی کپڑے پہنے ہوئے
تھے۔ "خیریت تو ہے؟" لمبے قد کے آدمی نے چچی سے پوچھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" چچی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اُس آدمی نے میری جانب آنکھ کا اشارہ کیا۔ چچی نے اشاروں ہی
سے اُسے مطمئن کرنا چاہا لیکن وہ چچی کی خاموش زبان سمجھ نہیں سکا۔ اُس کی
آنکھوں میں ایک دم شعلے لپکے اور وہ مجھے گھور کے دیکھنے لگا۔ چچی نے کھڑکی
کی طرف بازو بڑھا کے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پہلے تو اُسے حیرت ہوئی
لیکن پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ لڑکی نے اُن دونوں کے آنے سے پہلے
منہ پھیر لیا تھا اور چہرے پر نقاب ڈال لی تھی۔ وہ چچی کے یہ اشارے کنائے
نہیں دیکھ سکی تھی۔ چچی کے ملازموں کے سامنے وہ بے پردہ اور بے حجاب
ہونا نہیں چاہتی ہو گی۔ ظاہر ہے چچی نے اُسے یہ بتایا ہو گا کہ اُس کے ساتھ دو
خدام چل رہے ہیں۔ پہلے مجھے تعجب تھا کہ چچی جیسی جہاں دیدہ عورت ایک
جوان لڑکی کے ساتھ تنہا کیسے سفر کر رہی ہے۔ دونوں خادموں کی آنکھوں میں
میرے لیے خشونت اور حقارت بھری ہوئی تھی۔ چچی نے پان والی ڈبیا کھول کے
اُن کے لیے گلوریاں بنائیں اور مجھ سے پوچھا: "کھاتا ہے؟" میں نے ہاتھ
بڑھا دیا۔ مدتوں بعد پان کھانے کو ملا۔ آخری پان بھی سات سال پہلے
امی نے کھلایا تھا۔ میرے ہونٹ لال ہو گئے۔ چچی نے دیکھ کے ہنستے
ہوئے کہا: "تم شربت کے لب کیسے سج گئے ہیں۔" اس جملے پر لڑکی نے
پہلو بدل کے میری طرف پیار بھری نظر کی اور خود لال ہو گئی جیسے اُسے
ہزار ہا پان کھلا دیے گئے ہوں۔ کلکتے تک آنے والے ہر اسٹیشن پر دونوں
خدام حاضری لگا جاتے اور مجھ پر نفرت برساتے ہوئے رخصت ہو جاتے۔
میں سارے وقت فرش پر بیٹھا رہا۔ اونگھ بھی نہیں آئی۔ چچی اور لڑکی کے
درمیان بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں نے چچی کی غفلت کا بہت انتظار کیا
کہ وہ اِدھر اُدھر ہو تو میں لڑکی سے کچھ بات کروں مگر کسی بھی لمحے چچی کی
آنکھ نہیں لگی اور نہ اُس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔

ہوڑا اسٹیشن پر گاڑی فاتحانہ انداز میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن پر اگر
شبعل کا کوئی آدمی ہوتا تو وہ مجھے پہچان سکتا تھا۔ جب میں یہاں سے
جا رہا تھا تو مجھے سائے مل گیا تھا۔ ان دنوں پتہ نہیں اسٹیشن کے علاقے
میں کس کی ڈیوٹی ہو گی۔ مجھے یہ خوف بھی تھا کہ بردوان اور آسنسول کی
طرح پولیس ہوڑا اسٹیشن پر ایک آخری کوشش کر ڈالنے کا ارادہ نہ کر

لے۔ اسی خوف کے باعث میں نے سامان چچی کے محافظوں اور قلی کو نہیں
اٹھانے دیا بلکہ بڑھ کے بستر بند، سوٹ کیس، کنڈیاں اور تھیلے خود اپنے ہاتھوں
اور کندھوں پر اٹھا لیے۔ کندھوں پر رکھے ہوئے سامان سے میرا چہرہ بڑی حد
تک چھپ گیا تھا۔ میں چچی کے پیچھے پیچھے اُن کے نقش قدم پر چلتا ہوا
اسٹیشن سے بہ حفاظت باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ خادموں نے جلد سے
جلد ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ ٹیکسی آ گئی تو وہ مجھے ٹیکسی سے اُتار کے خود
اُس میں بیٹھنا چاہتے تھے لیکن چچی نے انھیں دوسری گاڑی میں بیٹھنے کا
مشورہ دیا کیونکہ اُسے کلکتے میں میرے کھو جانے کا ڈر تھا۔ ٹیکسی روانہ
ہوئی اور خاصا سفر طے کر کے [illegible] کے ایک چھوٹے سے بنگلے کے
سامنے جا کے ٹھہری۔ اس علاقے میں ہر طرف چھوٹے بڑے بنگلے بنے
ہوئے تھے۔ ہم بنگلے میں پہنچے۔ میں چچی کی شان و شوکت دیکھ کے دنگ
رہ گیا۔ میں نے سامان کمرے میں رکھ دیا۔ بنگلے میں قیمتی فرنیچر موجود تھا۔ تمام
کمرے سجے ہوئے تھے۔ ایک بڑا سا ڈرائنگ روم تھا۔ اُس کی سجاوٹ پر خاص
توجہ دی گئی تھی۔ یہاں آ کے لڑکی کچھ اور نکھر گئی تھی۔ اُس کی نظریں کسی ایک
جگہ نہیں ٹک رہی تھیں۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر بنگالی ملازم تھا اور ایک بوڑھی
عورت تھی۔ چچی کی آمد پر اُن دونوں نے مسکرا کے ایک دوسرے کو دیکھا۔
چچی نے اُن سے میرا تعارف کرا کے فیصلہ کن اور حکمیہ لہجے میں کہا کہ یہ لڑکا
اب ہمارے ساتھ رہے گا۔ اس کے لیے کوٹھری کا بندوبست کر دیا جائے
اور یہ اوپر کے کام کیا کرے گا۔"

چچی لڑکی کو اپنے ساتھ اندر کے کمروں میں لے گئی۔ میں نے پہلی بار
اُس کی زبانی لڑکی کا نام سنا۔ اُس کا نام زرّیں تھا۔ دونوں خادم ڈرائنگ
روم میں جا کے بیٹھ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد چچی بھی لباس تبدیل کر کے اُن
کے پاس پہنچ گئی۔ چچی نے اب ایک کسی ہوئی ساڑھی پہن لی تھی اور ہلکا
سا میک اپ بھی کر لیا تھا۔ اُس کا رنگ بہت اجلا تھا اور اس عمر میں بھی
اُس میں ایک کھٹکنے والی جاذبیت تھی۔ میں نے سوچا کہ اس لڑکی کے
پاس جاؤں اور اُسے آگاہ کروں کہ وہ کن لوگوں کے درمیان آ پھنسی ہے
لیکن ابھی اس اقدام کا موقع نہیں آیا تھا۔ پورے سفر میں اُس نے مجھ سے ایک
بھی بات نہیں کی تھی۔ دونوں ملازم چچی سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد چلے
گئے۔ پھر چچی زرّیں کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ برقع میں تو اُس کے
رنگ روپ کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ اب غرارے، قمیص اور دوپٹے
میں وہ کچھ اور ہی لڑکی نکل کے آئی تھی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔
اُس کا ملائی جیسا بدن جیسے چاند سے تراش کر بنایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ "بھئی اب بولو
پھر بات چیت کرو۔ تم نے تو چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے۔ دیکھو یہ ریڈیو
ہے، یہ گراموفون ہے۔ اللہ کا شکر ہے اس گھر میں ہر قسم کا سامان موجود ہے۔
جو جی چاہے اٹھاؤ اور برتو۔" چچی نے ناز سے کہا۔ زرّیں بس مسکرا کے رہ گئی۔
"بالکل اپنا ہی گھر ہے۔ دل لگتے لگتے لگے گا۔ مجھے تمھاری چپ کھائے
ڈالتی ہے۔ کچھ ہنسو بولو تاکہ گاؤں کی ہر بات ذہن سے نکال دو۔" میں پاس
بیٹھا تھا۔ چچی نے مجھے ڈانٹ کے بھگا دیا۔

گھر میں کھانے کا ایک الگ کمرہ تھا۔ اُس کمرے میں ایک بڑی
سی میز رکھی ہوئی تھی۔ چچی سچ کہتی تھی کہ اس گھر میں آسائش کی ہر چیز
موجود ہے۔ بنگالی ملازم کا نام راجو تھا۔ اُس نے شام کو میرے کپڑے دھو
دیے۔ میں جب نہا دھو کے اور لباس تبدیل کر کے چچی کے سامنے خدمت
بجا لانے کے لیے پہنچا تو وہ حیران رہ گئی۔ زرّیں نے بھی بہت غور سے مجھے
دیکھا۔ پھر رات تک بنگلے میں کئی موٹریں آ کے رکیں۔ راجو نے مہمانوں کو
پورے احترام سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مشروبات سے اُن کی تواضع کی۔
میں ہر وقت وہاں گھسا ہوا نہیں رہ سکتا تھا مگر جیسے ہی میں ڈرائنگ روم
کے اندر باہر کی سُن گُن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرے میں ہنسی کی گھنٹیاں بج
رہی تھیں۔ چچی نے زرّیں کو کسی کے سامنے نہیں بلایا۔ ابھی وہ اُسے نئے
ماحول سے مانوس کرنا چاہتی ہو گی۔ پہلے ہی دن اجنبی لوگوں کے سامنے
اُسے بٹھا دینا اُس کے نزدیک مصلحت کے خلاف ہو گا۔ گو وہ کسی بھی دن
اُس کا سودا کر سکتی تھی۔ اُسے ہر قسم کے گاہک آسانی سے مل جاتے ہوں گے۔
کچھ ایسے ہوں گے جنھیں سدھی ہوئی لڑکیاں پسند ہوں گی اور کچھ ایسے ہوں
گے جو خود سدھانے کا فن جانتے ہوں گے۔ کورا کے معاملے میں اُس نے
عجلت دکھانے کی کوشش کی تھی لیکن زرّیں کورا سے کچھ زیادہ عمر کی تھی۔
اُس کی عمر اٹھارہ اُنیس برس ہو گی اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اچھے
گھر کی تھی۔ اس لیے چچی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ اُس کی زیادہ سے زیادہ
قیمت وصول کرنے کی فکر میں ہو گی۔ اس مدت میں اُس کا تجربہ خاصا وسیع
ہو گیا ہو گا۔ اُس نے نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ ہر سال
مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد زرّیں کی انواع و اقسام کھانوں سے
تواضع کی گئی۔ پھر کیرم بورڈ بچھا دیا گیا۔ زرّیں کی دل جوئی اور دل لگی کے
لیے ہر طرح ریاضت کی گئی۔ میں بہت چوکنا ہوا تھا لیکن درمیان میں زرّیں کی
بات آ گئی۔ ورنہ میں باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے پیالی گرم چائے پی کر چچی
سے اُس بدمعاش کا پتہ کہیں کا پوچھ چکا ہوتا جس سے اُس نے کورا کو فروخت
کرنے کا معاملہ کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ زرّیں جیسی سادہ اور معصوم لڑکی چچی
کی بے باکی، بے حجابی اور گھر کے آزادانہ ماحول سے جلد اکتا جائے گی، گھبرا
جائے گی۔ اگر میں ابھی سے اُس پر چچی کی بے حیائی اور درندگی کا راز فاش
کر دیتا تو اُسے یقین نہ آتا بلکہ وہ الٹا میری شکایت کر کے سارا کام بگاڑ سکتی
تھی۔ اس لیے پہلے چچی کے بارے میں اُس کا مشکوک ہو جانا ضروری تھا
اور ظاہر ہے کہ میں اُسے بوری میں چھپا کے کہیں لے جا نہیں سکتا تھا۔
ایک دفعہ ایسی کوشش کی تھی تو اُس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا تھا۔ اُس
وقت تو کورا کی مرضی شامل تھی اور وہ ہر طرح مجھ میں شامل تھی پھر بھی
راستے میں ہر جگہ کانٹے بو دیے گئے تھے۔ اُس وقت تو میری جیب بھری

ہوئی تھی اور لباس بھی ڈھنگ کا تھا مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں زریں
کی مرضی کے خلاف اُسے ساتھ لے کے گھر سے باہر ایک قدم بھی آگے
نہیں بڑھا سکتا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ میں بدمعاش کی مجھے تلاش
ہے۔ وہ چچی کے ہاں ایک نئی لڑکی کی آمد کا ذکر سن کر خود اس طرف آ جائے۔
سوتے وقت چچی نے مجھے اپنے پیر دبوانے کے لیے طلب کر لیا۔ یہ بات بڑی
اُلجھی تھی مگر چچی کے ہاں ہر چیز جائز تھی۔ مجھے بڑی جھجک ہوئی۔ پھر
بھی تھوڑی دیر پس و پیش کے بعد مجھے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ میرا جی چاہا کہ میں
اُس کے پیروں کی انگلیوں کے بجائے گلا کھینچ لوں مگر میں ضبط کیے ہوئے نہایت احتیاط
سے اُس کے پیر دباتا رہا۔ زریں اُس کے ساتھ ایک پلنگ پر نیم دراز تھی۔ چچی
نے مجھے ڈانٹا۔ "کم بخت ہاتھوں میں دم نہیں ہے کیا؟ ذرا زور سے
داب۔ سالے بدن کی جان نکلی ہوئی ہے۔" یہ سن کے زریں نے اُس
خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ "نانا!" چچی نے اٹھلا کے کہا۔ "یہ نازک ہاتھ
پیر دبانے کے لیے نہیں، چوڑیاں پہننے، مہندی لگانے اور پیار کرنے کے
لیے ہیں۔" میں نے زور زور سے اُس کے پیر دبانے شروع کر دیے۔ "ہاں
اب ٹھیک دبا رہا ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "ابھی اپنی نوکری کی مت
سمجھ۔ جب تک میں تجھے اچھی طرح دیکھ اور پرکھ نہ لوں گی، کوئی پکی بات
نہیں کروں گی۔"

دوسرے روز میں نے گھر کے کاموں میں زیادہ دلچسپی سے حصہ
لینا شروع کر دیا اور ہر چیز چمکا دی۔ کرسیاں، الماریاں اور شیشے
کے برتن۔ اس طرح میرے کام اور میری زبان سے چچی مطمئن ہونے لگی۔ شام
کو چار بجے وہ ٹیکسی منگوا کے اور زریں کو ساتھ لے کے گھر سے کہیں جانے لگی تو میں
اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ "بیگم صاحب! مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔ کلکتہ دیکھ لوں گا۔
موٹر میں بیٹھوں گا۔" میں نے بچوں کی طرح ضد کی۔ اُسے مجھ پر ترس آ گیا اور
اُس نے اپنے ساتھ مجھے بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔ ٹیکسی کلکتے کی سڑکوں پر گھومتی
رہی۔ چچی زریں کو وکٹوریا گارڈن لے گئی۔ وہ پہلے بھی اور کار کو کبھی اسی
جگہ لائی تھی۔ ہم خوب گھومے اور آخر تھکے ہارے گھر واپس ہوئے۔ دوسرے
دن زریں کچھ کھلنے لگی۔ میں بیشتر وقت اُس کے قریب گزارنے کی جستجو
میں رہا۔ رات کو بھی موٹریں آئیں اور مہمان چچی کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کے
چلے گئے۔ رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھ گئی۔ تین دن بعد صرف ایک بار چچی
اکیلی کہیں باہر گئی۔ میرے لیے یہی وقت مناسب تھا۔ میں زریں کے
پاس بیٹھا اُس سے مختلف باتیں کرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے کچھ
بات کرے گی، اپنے بارے میں مجھے کچھ بتائے گی لیکن وہ تو صرف سرد
آہیں بھرتی رہی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اتنا اعتماد تو مجھے ہو گیا کہ
زریں مجھے ایک بے ضرر، خدمت گزار اور وفا شعار شخص سمجھنے لگی ہے۔ تین
دن تک میں نے جی جان سے چچی کی خدمت کی تھی۔ "زریں بیگم! آپ
سے ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔" میں نے آخر جرأت کر ہی لی۔ میرا
لہجہ ادا ہوا تھا۔ اُس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "آپ ہی کے فائدے کی
ایک بات ہے۔" میں نے زور دے کے کہا۔

"کہو۔" وہ آہستگی اور سنجیدگی سے بولی۔

"پہلے ایک وعدہ کیجیے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"کیسا وعدہ؟"

"یہ وعدہ کریں جو کچھ کہوں گا اُسے آپ اپنے ہی تک محدود رکھیں
گی۔ میرے خلوص پر شبہ مت کیجیے۔ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں وعدہ کرتی ہوں۔" وہ تجسس سے بولی۔

"آپ کو اپنی سب سے عزیز چیز کی قسم! میں جو کچھ کہوں کسی سے
اُس کا ذکر کرنے سے پہلے تصدیق کر لیجیے گا کہ میں نے سچ کہا ہے یا نہیں۔"

"تم بات تو بتاؤ۔" وہ اُکتا کے بولی۔

"آپ۔ آپ مجھے کسی معزز اور شریف خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی
ہیں۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "لیکن آپ بُرے لوگوں میں پھنس گئی ہیں۔"
اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "کیا؟" وہ سٹ پٹا کے بولی۔ "تم کس کے
بارے میں کہہ رہے ہو؟"

"ان لوگوں کے بارے میں جو آپ کو یہاں تک لائے ہیں۔" میں نے
مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ بہت معصوم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے جو
آپ کو یہاں تک لانا چاہتا تھا۔ آپ بیگم صاحبہ کو کب سے جانتی ہیں؟"
جواب دینے میں گریز ہوا۔ میں نے کہا۔ "زیادہ دنوں سے نہیں۔ [illegible]
یقیناً یہی ہوگا۔"

"ہاں۔ زیادہ دنوں سے نہیں۔" وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"تم کیسے جانتے ہو؟" اُس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"میرے جاننے کی بات بعد میں پوچھیے گا۔ پہلے یہ بتائیے کہ
یہاں آنے پر تیار کیسے ہوئیں؟ دیکھیے آپ کو یہ بتانے میں [illegible]
لیکن بہرحال میرا مقصد آپ کے بھی حالات جاننا نہیں ہے۔ میں آپ کو
بروقت ایک خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ باقی آپ [illegible]
کا کام۔ آپ نے بہت بُرا کیا جو گھر سے چلی آئیں۔ چند ہی دنوں میں
کو پتہ چل جائے گا کہ آپ کن مصیبتوں میں گھر گئی ہیں۔ میں کہتا ہوں [illegible]
بھی واپس چلی جائیے۔"

"مگر میں کیسے جا سکتی ہوں؟ گھر کے دروازے تو [illegible]
مجھ پر بند ہو گئے ہیں۔" اُس نے کرب سے کہا۔ "میں تو کہیں بھی [illegible]
نہیں جا سکتی۔"

"آپ کے والدین آپ کو پھر گلے لگا لیں گے۔"

"میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ میں اپنے باپ کی [illegible]
اُن کا انتقال ہو گیا تو خالو مجھے اپنے گھر لے گئے لیکن پھر انھوں نے
کے بچوں نے میری زندگی عذاب کر دی۔ پھر ایک دن تمھاری
بیگم صاحبہ سے میری ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے ہمارے پڑوس میں گھر
لے رکھا تھا اس لیے اُن کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہو گیا اور جب انھوں
نے مجھ پر ٹوٹنے والے ظلم و ستم دیکھے تو پریشان ہو گئیں۔ وہ مجھ سے
بڑی ہمدردی کرنے لگیں۔ شاید خالو مجھے اس لیے برداشت نہیں کرتے
تھے کہ میں اپنے باپ کی تمام جائداد کی تنہا وارث تھی۔ بہرحال میں وہاں
بڑی تکلیف میں تھی۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بیگم صاحبہ کے ساتھ
چلی آئی۔ انھوں نے مجھے اس جہنم سے نکالا، میرے ساتھ بڑی مہربانی سے
پیش آئیں۔ اب تم اُن کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں، آپ ایک جہنم سے نکل کے دوسرے جہنم میں
آ گئی ہیں۔ پہلے والے جہنم میں کم سے کم آپ کی عزت تو محفوظ تھی مگر یہاں
تو کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ میں آپ سے اتنی بات ذکر نہ کرتا لیکن میں چونکہ
خود اس جہنم سے گزر چکا ہوں، اس لیے زبان بند نہ رکھ سکا۔"

"کیا تم بیگم صاحبہ کو پہلے سے جانتے ہو؟"

"چونکہ آپ اخفائے راز کا وعدہ کر چکی ہیں اس لیے بتانے
میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہاں میں انھیں پہلے سے جانتا ہوں اور اچھی طرح
جانتا ہوں۔"

"لیکن وہ تو تمھیں نہیں جانتیں؟"

"ہونہہ!" میں نے تلخی سے کہا۔ "نہیں، اگر چہرے یاد رہتے اور انسانوں
سے کوئی ہمدردی ہوتی تو وہ مجھے ضرور پہچان لیتیں۔ اب وہ مجھے بھول گئی ہیں۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا آپ نے اس ماحول پر غور نہیں کیا؟ بیگم صاحبہ نے آپ کی
آنکھوں پر غلاف ڈال رکھا ہے۔ آپ ذرا غلاف اٹھا کے دیکھنے کی
کوشش کیجیے۔ رات کو یہاں جو لوگ آتے ہیں، ذرا اُن کی اور بیگم صاحبہ کی
باتیں سننے کی کوشش کیجیے گا۔ پھر مجھ سے بات کیجیے گا۔"

اُس کی زبان گنگ ہو گئی۔ میں نے اُسے سمجھا کے خوف زدہ
اور سراسیمہ کر دیا تھا۔ "کیا تم..... وہ نہیں ہو.....؟" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "تم نے
تو اُن کی نوکری کی ہے اور تم.....؟"

"ہاں نوکری کی ہے اور یقین کیجیے کہ صرف آپ کی وجہ سے کی ہے۔"

"میری وجہ سے؟"

"جی ہاں آپ کی وجہ سے۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ آپ کو دیکھ کے
میرے سینے کے دکھ تازہ ہو گئے۔ اب آپ کو کیا کیا بتاؤں.....؟" میں
نے ایک لمبی سانس لے کے کہا۔

اچانک برآمدے میں کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں فوراً اُس
کے پاس سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے چلتے چلتے اُسے تاکید کی کہ اگر وہ اپنے وعدے
پر قائم رہی اور اس نے میری باتوں کی تصدیق کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں
اور کہاں کھڑے رکھے تو ممکن ہے اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

اس بات پر اُس کا اثر دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ گاڑی کی آواز لمحہ
بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے بھاگ کر باورچی خانے میں پناہ لی۔
زریں تو کورے کاغذ کی طرح سفید کاغذ تھی۔ وہ میری باتیں بڑے اطمینان سے سن رہی
تھی مگر چچی کا رنگ اتنا پکا نہیں ہوتا تھا کہ دھوپ سے اُڑ جائے۔ ویسے
بھی اُس کے لیے ایک بالکل نیا آدمی تھا۔ اُس کے نزدیک ابھی تک پہلے
ہی چچی کی حیثیت زیادہ مستند اور محترم تھی۔ بہرحال اُسے ایک خطرے
سے بچانے لائی تھی لیکن اگر میں کسی اور سے پہلے اُس کا اعتماد کا تو کہیں
اعتبار کرتا۔ چچی کا کیا بھروسا تھا۔ اگر زریں نے اُس سے میرے بارے میں
کچھ کہہ بھی دیا اور چچی نے مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکال باہر کا حکم دے
دیا تب بھی مجھے اُسے بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

چچی کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ اُس کا چہرہ اُس کے پیشے
کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ بھاری بھرکم جسم اور ڈھلکے پٹھے کی عورت تھی۔ چچی
نے اُسے بڑے کمرے میں بٹھایا اور زریں کو ساتھ لے کے اندر گئی۔ میں
ڈرائنگ روم کے دروازے پر منڈلانے لگا۔ آنے والی عورت کی گونج دار
آواز اچانک بلند ہوئی۔ "چشم بد دور..... یہ ہے وہ؟ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ!
اس بار تو نسترن خانم! تم نے ہم سب کو شکست دے دی۔ یہ چھوکری تو اب
ہماری ہو گئی۔"

"تمھاری ہی ہے۔" چچی فراخ دلی سے بولی۔ اُس کا نام پہلی بار معلوم
ہوا۔ "میں نے کب انکار کیا ہے؟" پھر وہ زریں سے مخاطب ہوئی۔ "ارے آداب
کرو، جانتی ہو تمھارے سامنے کون بیٹھا ہے؟ یہ کلکتے کی نامی گرامی بیگم ہیں۔
[illegible] بیگم۔" میں نے جھانک کر دیکھا۔ زریں نے اُسے آداب کیا۔ [illegible] بیگم
نے جواباً اُسے سینے سے لگا لیا۔

چچی نسترن خانم نے باورچی کو آواز دی تھی۔ باورچی اس وقت آیا تو مجھے
اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا۔ اس لیے میں باقی حال دیکھ اور سن نہیں سکا۔ [illegible] بیگم
دیر تک بیٹھی رہی۔ پھر نسترن زریں کو اُس کے کمرے میں بھیج کے [illegible] بیگم
کو بڑے دروازے تک رخصت کرنے گئی۔ [illegible] جان بوجھ
کر زریں کے کمرے میں نہیں گیا۔ پھر نسترن خود بھی کہیں باہر چلی گئی۔ اُس
کے جانے کے بعد مہمانوں کا آنا بند ہو گیا۔ ایک "آتا تھا" ایک "جاتا تھا"۔
دوسرے دن صبح تک خیریت رہی۔ زریں نے نسترن سے میرے متعلق
ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ میرے ساتھ نسترن کا رویہ دستور اور
اپنائیت کا تھا۔ البتہ زریں کچھ اداس ہو گئی تھی۔ جب بھی میرا اُس کا
سامنا ہوتا، میں اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ اُسی
دن شام کی چائے کے وقت نسترن نے ایک بار پھر زریں سے شفقت
بھرے لہجے میں کہا۔ "بی بی! یہ تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ مرجھائی جا رہی
ہے۔ کیا تجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟ کیا تجھے کسی سے کوئی شکایت ہے؟"

کیا کوئی ملازم تیرا کہنا نہیں مانتا؟ مجھے بتا کہ آخر کیا بات ہے؟ میں تیرے لیے دنیا بھر کی خوشیاں خرید لوں گی۔"

زریں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں! یہاں ہر چیز موجود ہے، مجھے تو کوئی غم نہیں ہے۔"

"اب اتنا تو بھولی بادشاہ بھول جائی بی! توبہ توبہ تیرے ساتھ کیسا برا سلوک کرتے تھے وہ لوگ۔ میں جب بھی خیال کرتی ہوں، میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"بھول ہی گئی ہوں۔" زریں نے شکستہ آواز میں کہا۔

"اور یہ تو اندر کیا چپکی بیٹھی رہتی ہے۔ کچھ باہر بھی آیا جایا کر پگلی! اس مکان میں صرف ایک کمرہ تھوڑی ہی ہے۔"

"جی۔" زریں اُس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"تو یہاں کا کرا دھرتا کیوں گُلتا رہتا ہے؟" اچانک نسترن میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "بچاری بی بی کا بھی خیال رکھا کر، اس کی خدمت کیا کر۔"

"میں تو بہت کرتا ہوں بیگم صاحب!" میں نے فدویانہ انداز میں کہا۔ "مگر زری بی کو تو کمرے میں بند پڑے رہنے کی عادت ہے۔"

"نہیں نہیں، بس بہت غم ہو چکا۔" نسترن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آج سے کرو بند۔ شام کو میرے دو منہ بولے بھائی آ رہے ہیں۔ ان کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، ان سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ آج شام اُن کے ساتھ بائیسکوپ چلیں گے۔ زریں! تم اپنے سب سے اچھے کپڑے پہن لینا۔ سمجھیں! میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"جی۔" زریں نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج آپ ہو آئیے۔ مجھے مردوں کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔" زریں نے جرأت کر کے کہا۔

"کون مرد؟" نسترن کچھ تلخی سے بولی۔ "بی بی! وہ اپنے بھائی ہیں، چاہے سگے نہ ہوں مگر کیا عزیزوں سے کم ہیں؟"

"پھر بھی میرے لیے تو اجنبی ہیں۔" زریں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اجنبیت تو ختم کرنے سے ختم ہوگی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا میری لاڈلی کہ یہ کلکتہ ہے، فیض آباد نہیں ہے، لکھنؤ نہیں ہے۔ پہلے تم وہاں کی باتیں کرنے لگیں تو بس کام ہو گیا۔ اری ننھی بی بی! میری جان! جب میں تمھاری عمر کی تھی، اس وقت میرا بھی یہی حال تھا۔ ابا کے گزرنے کے بعد پتہ چلا کہ سارا وقت کیسے ڈھکوسلوں، کیسے ڈھونگوں میں گزر گیا۔"

زریں کا یہ بدلا ہوا انداز نسترن کے لیے تازیانہ ثابت ہوا۔ اُس نے اتنی باتیں کیں، اتنی نرمی، گرمی، تلخی اور شفقت سے باتیں کیں کہ زریں کے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ پھر اُس دن نسترن غیر متوقع طور پر کہیں باہر گئی۔ میں اسی موقع کی تاک میں تھا، اس لیے جھٹ زریں کے کمرے میں پہنچا۔ وہ سسک سسک کے رو رہی تھی۔ "مت رونے سے کچھ نہیں ہوگا زریں!" میں نے پروا نہیں کی کہ میں اُسے کس لہجے میں مخاطب کر رہا ہوں۔ "اب تم نے زیادہ دیکھی، کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور کر لیا ہوگا۔ میں اس وقت صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تم اُن مردوں کے سامنے چلی جانا جنھیں بیگم صاحب نے اپنے منہ بولے بھائی بتایا ہے۔ تم ضرور چلی جانا تاکہ تمھیں میرے انکشاف پر مکمل یقین ہو جائے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہیں موجود ہوں اور ہاں یقیناً تم مجھ پر بھی شبہ کر سکتی ہو کیونکہ میری شکل، میرا حلیہ اور میرے کپڑے میری باتوں کی نفی کرتے ہیں لیکن یقین کرو، تم جس طرح خود پر اعتبار کر سکتی ہو، اسی طرح مجھ پر کر لینا اور باقی معاملہ اپنے خدا پر چھوڑ دینا۔ تمھیں تم نے، بیگم صاحب نے میرا شکر کر کے مجھ پر اور خود پر احسان کیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمھارے اعتماد پر پورا اُتروں۔ اب تمھیں کیا بتاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتا ہوں۔ بس اپنا خیال رکھو۔ میں یہی کہنے آیا تھا۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔

زریں نے لرزتی ہوئی پلکیں اٹھا کے مجھے دیکھا، پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگی۔ "رونا بالکل بند۔" میں نے اُس کے قریب ہو کے کہا۔ "رونے سے کام اور بگڑ جائے گا۔ تمھیں تو یہ تاثر دینا چاہیے کہ تم اس ماحول میں بہت تازگی محسوس کر رہی ہو۔"

"میں ان مردوں کے سامنے نہیں جاؤں گی۔" وہ دقت سے بولی۔

"آج کے بعد مت جانا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ میں قریب ہی کہیں موجود رہوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔ بیگم صاحب نے سارے نوکروں کو چوکنا رکھا ہوگا۔ اپنے رویّے سے کسی قسم کا اظہار مت کرنا۔"

میں اُس کے کمرے سے نکل آیا۔

نسترن خانم کا کوئی بھی وفادار ملازم اُسے میرے بارے میں مشکوک کر سکتا تھا۔ ویسے ابھی تک تو بات ٹھیک چل رہی تھی۔ چائے کے بعد نسترن کا اچانک گھر سے باہر جانا کسی خطرے کی علامت ضرور تھا۔ اُس کا زندگی میں بے شمار لڑکیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ لڑکیوں کے مختلف مزاجوں سے خوب آشنا ہو گئی ہوگی۔ آج اُس نے زریں کے لہجے کی ترشی محسوس کر لی ہوگی۔ نسترن کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آ گئی۔ وہ کچھ جھنجلائی ہوئی تھی۔ آج اُس نے مجھ پر بھی ملامت کی وہ نظر نہیں ڈالی جو اب تک ڈالتی رہی تھی۔ پھر جب اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو گیٹ پر کھڑے ہوئے بوڑھے جاٹ ملازم نے اُسے اُس کے دونوں بھائیوں کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ اُن کے استقبال کے لیے دوڑتی ہوئی دروازے تک پہنچی۔ ڈرائنگ روم کی تمام بتیاں روشن کر دی گئیں۔ باورچی کو پہلے حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ کچھ تفریحی کا انتظام کرے۔ میں بھی اُس کی مدد کی خاطر باورچی خانے میں مصروف تھا مگر ڈرائنگ روم میں جانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہاں کچھ دیر بعد ہی جانا مناسب تھا۔ باورچی نے چائے تیار کرائی تو اُس کے بجائے میں خود چائے کی ٹرے لے کے ڈرائنگ روم میں

پہنچ گیا۔ نسترن سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کے دونوں بھائیوں کی پشتیں میری جانب تھیں۔ نسترن کی رازدارانہ نگاہ پر ان کی آوازیں ایک دم ماند پڑ گئیں۔ دونوں نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئی اور پیالیوں میں ایک چھناکا ہوا۔ نسترن ہنس کر بولی۔ "بیا بیاہا ہے، ہر وقت ہوا میں اُڑتا رہتا ہے۔"

میرے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ میں پورے سات سال کے بعد اُس شخص کو دوبارہ دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی بدمعاش تھا جس نے ایک رات سینما میں نسترن سے کورا کی فروخت کے سلسلے میں بھاؤ تاؤ کیا تھا۔ کریم گل نے جیل میں مجھے کہا تھا کہ اُس کے غنڈوں نے جانے ہوٹل سے فرار ہونے کے بعد صرف اُس وقت تک ہمارا تعاقب کیا تھا جب تک ہماری ٹیکسی نظر آتی رہی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اُسے کوئی خبر نہیں تھی۔ جیل کے ساتھیوں نے صحیح بات اگلوانے کے لیے کریم گل کی چمڑی اُدھیڑ دی تھی مگر اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کام کریم گل کا نہیں، کسی اور کا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کام اس شخص کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا، جو اس وقت یہاں موجود ہے۔ اُس رات سینما میں اس نے اور اس کے ساتھ والی عورت نے جن ہوس ناک نظروں سے کورا کی پذیرائی کی تھی، وہ میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ ان کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کورا کو نسترن سے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے میرے اور کورا کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہو یا اُس نے مجھے اور کورا کو مولوی صاحب کے ساتھ کہیں بازار وغیرہ میں دیکھ کے ہمارا تعاقب کیا ہو۔ میں اندر سے چھلک رہا تھا، اس لیے مجھے میز تک پہنچنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ میرے پیر زمین میں گڑ کے رہ گئے تھے۔ دل کی حرکت اچانک بند سی ہو کے تیز ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں نے خود کو سنبھالا اور اعصاب پر قابو پاتے ہوئے اُن دونوں کو سلام کیا۔ وہ میری جھجک پر ہنسنے لگے۔ دونوں تنومند تھے۔ میرے مطلوب شخص کا رنگ روپ خاصا بدل گیا تھا۔ سر کے بال اور اُڑ گئے تھے۔ ہاتھ میں کڑا ابھی نہیں تھا۔ وہ بالکل معقول لباس پہنے ہوئے تھا۔ کیوں نہ پہنتا، ایسے نامعقول لوگوں کو معقول لباسوں کی کیا کمی؟ اُس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اُس کے ہونٹوں پر تلوار کے مانند کھنچی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں بہت تیز چمک تھی۔

دوسرا شخص سفید شیروانی میں ملبوس تھا اور وزن و توش کے اعتبار سے چھوٹے جسم کا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخی مائل تھا۔ انگریزی بال انھیں تراش خراش سے آراستہ کیے گئے تھے۔ وہ اگر خود کوئی نواب نہیں تو کسی نواب کا مصاحب ضرور معلوم ہوتا تھا۔ نسترن کو اپنے گاہکوں کی قسموں کا خوب اندازہ ہوگا کہ کون سی لڑکی کے لیے کس قسم کے گاہک سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔

"خانم! ہماری بے چینی کب دور ہوگی؟" نواب زادے نے کہا۔

"گھبرائیے نہیں مرزا صاحب!" خانم کے بجائے وہ بدمعاش بولا۔ "پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔"

"جیسے یقین ہے، چاہے میاں! اس بار بھی ہمیں تباہ کروا دو گے۔" نواب ہنس کر بولا۔

کم سے کم مجھے اُس بدمعاش کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ میں وہاں زیادہ دیر ٹھیرنے کی غرض سے خود چائے بنانے لگا تو نواب نے بے حیائی کی۔ "بس خانم! ہم تو آپ کے ہاتھ کی چائے پییں گے۔"

"ذرا دیکھیے تو سہی۔" خانم نے ایک ادا سے کہا۔ "فقیر کیسی اچھی چائے بناتا ہے۔ میں اندر جا رہی ہوں، ذرا تحمل سے بیٹھیے اور پہلے پیالی پر ہاتھ صاف کر لیجیے۔"

"سچ ہے۔" نواب اپنے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "ورنہ تو قسم آپ بھی کچھ کم نہیں ہیں، آپ کا ہم سے بڑا قدردان کون ہوگا؟"

"چلیے جانے بھی دیجیے۔ اب بہار چلی گئی ہے تو آپ کے رنگیلے شعر دیا ہو گئے۔" خانم نے اٹھتے ہوئے کہا مگر کچھ سوچ کے پھر بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے حکم دیا۔ "جا ذرا بانو سے جا کے کہہ کہ اندر کیا چھپی بیٹھی ہے، باہر آئے، میرے محسن بھائی آئے ہیں۔" خانم نے میرے ہاتھ سے پیالی چھین لی۔

میں دروازے سے باہر جا کے آگے بڑھنے لگا تھا کہ وہی اندر چاند میاں کہہ رہا تھا۔ "خانم! چھوکریوں کے انتخاب میں تو واقعی تمھارا کوئی ثانی نہیں۔ یہ چھوکریاں پر تمھاری نظر کیسے پڑنے لگی؟ یہ چاند کے لائی ہو؟ خیال رکھنا، اس کے چہرے سے بے حیائی صاف ظاہر ہے، سمجھ لو چھوکریاں باہر جانے سے انکار کر دیں گی۔"

"چلو چھوڑو، کچھ مرزا صاحب کا بھی خیال کرو۔" خانم کی آواز آئی۔ "تمھاری یہ عادت کبھی نہیں جائے گی۔ موقع بے موقع زبانی شعر گاتے رہتے ہو۔ بس اب وہ آنے ہی والی ہے۔ ذرا احتیاط سے بیٹھو اور خبردار اُس کے سامنے کوئی اول فول بات مت کرنا۔"

میں نے زریں کے کمرے میں جا کر اُسے خانم کا حکم سنایا۔ وہ حسبِ ہدایت بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔ شاید نسترن نے آج اس کی آرائش و زیبائش میں خاص طور پر دلچسپی لی تھی۔ وہ ایک دلہن کی طرح آراستہ تھی۔ وہی غرارہ تھا اور تنگ چسپ، سر پر دوپٹا تھا۔ دو چار لٹوں میں سے ایک آگے کی طرف پڑی ہوئی تھی۔ میں مبہوت رہ گیا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔" اُس نے منہ پھیر کر کہا۔

"چلی جاؤ زریں، چلی جاؤ۔ میری مانو، اس وقت یہی مناسب ہے۔ میں تمھیں کوئی غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ کبھی کبھی آدمی کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ ایک برا خواب دیکھا تھا جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"ایک طرف تو تم منع کرتے ہو، دوسری طرف مجھے وہاں بھیجنے کے لیے بھی مصر ہو۔" وہ اضطراب سے بولی۔ "میرا ابھی وہاں جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"کہ تو میرا بھی نہیں چاہتا مگر مجبوری ہے زریں!" میں نے نرمی سے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" اُس نے ایک غیر متعلق سوال کیا۔
"میں کوئی بھی ہوں، لیکن ہوں تمہارا غم خوار۔ تمہارا اس وقت میرے بارے میں یہ سوچنا تمہیں پہنچنے میں دیر ہو گی تو بیگم صاحب خود اندر آ جائیں گی۔"

وہ بہت مشکل سے آمادہ ہوئی۔ میں اُسے ساتھ لے کے چلا۔ اُس کا لباس خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ سن کے نسترن لپکی اور اُسے شانے سے پکڑ کے اس طرح آگے لے چلی جیسے دلہنیں لے جائی جاتی ہیں۔ نواب مرزا اور چاند میاں کے دیدے پھٹ گئے۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت سے ہو گئے۔ چاند میاں کی پتلیاں اُس کی آنکھوں میں پارے کی طرح حرکت کرنے لگیں۔ اُس نے مرزا کا ہاتھ پکڑ کے کوئی سرگوشی کی۔ تب کہیں مرزا ہوش میں آیا۔

"میں نے ان دونوں سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا دیا ہے۔" نسترن نے جھک کے زریں سے کہا۔ "انھیں تسلیمات کرو۔"
"آداب!" زریں کا سیدھا ہاتھ اُٹھتے ہوئے کپکپا گیا۔
"تسلیمات، تسلیمات۔" مرزا کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "ہم نے جب سے آپ کا تذکرہ سنا ہے آپ کو دیکھنے کے لیے طبیعت بے قرار تھی۔ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ گویا خانم نے آپ کی تعریف میں بخل سے کام لیا تھا۔"

زریں نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ نسترن اشتیاق سے اُن دونوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُن کے چہروں پر تو بس حیرت چھائی ہوئی تھی۔ زریں کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس نے شاید اُن دونوں کے چہرے تک نہیں دیکھے ہوں گے۔ "خانم باجی! آپ نے شاید انھیں بتایا نہیں کہ آپ سے ہمارا کیا رشتہ ہے؟" چاند میاں نے زبان کھولی۔ "یہ تو ہم سے اچھی خاصی اجنبیت برت رہی ہیں۔"

"میں نے بتا دیا ہے لیکن یہ تو فطری شرم ہے۔ اب تم ٹھیرے گھلنے کے آدمی۔ اس گڑیا کو تو ابھی یہاں کی آب و ہوا سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔"

"ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہم زریں بانو کے لیے تو کچھ بھی نہیں لائے۔" نواب مرزا بے قراری سے بولا۔ "خالی ہاتھ چلے آئے۔" اُس نے شیروانی کا بٹن کھول کے اندرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ "خانم! آپ ہماری طرف سے یہ پانچ ہزار روپے رکھیے اور زریں کے لیے ان کی پسند کے مطابق ایک بہت عمدہ سا تحفہ خرید لیجیے۔"

"ارے نہیں مرزا بھائی! زریں بھی بہیں ہے، آپ بھی یہیں ہیں، دسیوں موقع آئیں گے۔" نسترن نے گڈی واپس کرتے ہوئے کہا۔
"بھلا آپ کون ہوتی ہیں درمیان میں دخل دینے والی۔ یہ ہمارا اور زریں بانو کا معاملہ ہے۔" مرزا کو اپنی جگہ قرار نہیں تھا۔

"اچھا تو دیکھیے زریں سے پوچھ لیجیے۔ کیوں زریں؟" نسترن نے زریں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

زریں نے پہلی مرتبہ چہرہ اوپر کیا۔ میں سامنے کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کی نظر میری طرف اُٹھی۔ میں نے اشارے سے اُسے تحمل کی تلقین کی۔ اسی وقت نسترن کو جیسے پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اُس نے مجھے ڈانٹ کے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میں باہر آ گیا لیکن چائے کے برتن اُٹھانے، قیمتی اور نمکین نعمتوں کی پلیٹیں ہٹانے کے بہانے بار بار اندر جاتا آتا رہا۔ زریں خاموش بیٹھی تھی۔ وہ تینوں بات بات پر کھلے جا رہے تھے۔ نسترن کہہ رہی تھی۔
"آج ہمارا خیال آپ لوگوں کے ساتھ سیر کو جانے کا تھا۔"
"چشمِ ما روشن، دلِ ما شاد۔ ہم حاضر ہیں۔" مرزا چہک کے بولا۔
"لیکن زریں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، پھر کبھی۔"
"طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ پھر تو انھیں ضرور چلنا چاہیے۔ طبیعت بہل جائے گی۔ ہم انھیں دریا کے کنارے لے چلیں گے۔ رات کو کہیں ناچ گانا رکھیں گے، کہیں زریں! آپ کا کیا خیال ہے؟" نواب مرزا اب براہِ راست اُس سے مخاطب ہوا۔
زریں کے ہونٹوں پر ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ اُس کے کہنے سے پہلے نسترن نے جواب دیا۔ "آج نہیں۔ پہلے آپ سے زریں کا حجاب تو ٹوٹ جائے۔"
"تو گویا ہمیں روز یہاں حاضری دینی ہو گی؟"
"آپ کا گھر ہے، جب چاہیں تشریف لائیے۔"

خاصی دیر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ رات کو نو بجے وہاں سے ٹلے۔ نسترن نے زریں کو اُن کے جانے سے پہلے اُس کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ میں کشمکش میں مبتلا تھا کہ چاند میاں کے جانے کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ دل کھنچا جا رہا تھا۔ میں اکیلا تو نسترن کی فکر کر سکتا تھا، چاند میاں کی میں نے سوچا کہ خیر جہاں سات سال گزر گئے ہیں وہاں چند روز اور سہی مگر اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ بدمعاش کتنے میں موجود ہے اور اس کی ویسا ہی کام چاند میاں سے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اُسے کوئی پتہ معلوم ہو۔ کاش وہ انکار کرے کہ اُس کے خون سے کوئی آگہ کرے تا کہ ناکام ہو گئے تھے۔ زریں نے رات کا کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں ایک بار اندر گیا تو وہ تکیے میں منہ چھپائے پڑی تھی اور نسترن اُس کی کمر سہلاتے ہوئے اُسے سمجھا بجھا رہی تھی۔ میں نے بھی اُس رات کچھ نہیں کھایا۔ ویسے بھی میں محض زندگی برقرار رکھنے کے لیے چند لقموں سے صبح و شام پیٹ کا جہنم بھر لیتا تھا۔

اب مجھے ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ چاند میاں اور نواب مرزا کی باتیں سننے کے بعد زریں کا کیا حال ہو گا۔ کوئی اُس کا دل چھین لیتا ہو گا۔ میں اپنی کوٹھری کے فرش پر بیٹھا ہوا آنے والے لمحوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب زریں کو یہ بتانا آسان تھا کہ نسترن اُس کے لیے کیا سوچ رہی ہے۔ اُس سے آگے خوف کے راستے گم نظر آتے تھے۔ کوئی گھر نہیں تھا، کوئی سایہ نہیں تھا، وہی گلی تھی، وہی سڑکیں، وہی ویرانی اور وحشت تھی لیکن کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔ ابھی مجھے اپنے ذہن کے جالے صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی

تھی کہ ملازم نے اطلاع دی، بیگم صاحب طلب کر رہی ہیں۔ میں اُٹھ کے پہنچا۔ میں سمجھا زریں کا کمرہ بند تھا۔ برابر کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر سے نسترن کی آواز آئی۔ "ادھر آ جا۔"

میں کشمکش کے عالم میں اندر پہنچا۔ نسترن بستر پہ تنہا پڑی ہوئی تھی۔ آج ہوش ہی نہیں تھا کہ ساڑی کا پلو کدھر گرا ہوا ہے اور بلاؤز کا کون سا حصہ عریاں ہے۔ "دروازہ بھیڑ دے۔" اُس نے مجھے دوسرا حکم دیا۔ "آج مجھے پھر بڑی درد ہو رہا ہے۔" وہ کروٹ بدلتے ہوئے بولی۔ "تجھے بھی تیرے ہاتھوں میں کتنا آرام ہے اور تو نے بتایا نہیں، پائے تجھ کو ساں کیا کھلایا ہے۔"

میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا اُبلنے لگا اور کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ "جی!" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "آج تو خود میرے ہاتھوں میں بھی درد ہے۔"
"آج ہی تیرے ہاتھوں میں درد ہو رہا ہے۔ کیا تھا کم بخت! میں انکار سننے کی عادی نہیں ہوں۔ چل، ہاتھ چلانے کا، تیرے ہاتھ بھی دب جائیں گے۔"
"جی بہت درد ہے۔" میں نے گھگیا کے کہا۔
اُس نے مجھے گھور کے دیکھا۔ پھر اُس کے لبوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "آ، تیرا درد میں دور کرتی ہوں۔"
"آپ؟" میری آواز میں لرزش تھی۔
"ہاں کیوں، اکھڑا اکھڑا لگ رہا ہے۔ جا، دفان ہو جا اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جا۔ جا، دور ہو مردار کہیں کا۔" وہ درشتی سے بولی۔ میں نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اُس نے جیخ کر کہا "جاتا ہے یا بلاؤں دربان کو، اور اُس سے کہوں کہ اس کو دھکے دے کے گھر سے نکال دے۔ یہ تو نخرے کرتا ہے۔"
"میں کہیں نہیں جاؤں گا، آپ ہی کے پاس رہوں گا۔" میں نے تھوک نگل کے کہا۔ "آپ سمجھتی ہیں کہ نکال دیں گی تو دوبارہ واپس آ جاؤں گا۔"
"کہتا ہے۔" وہ ناگواری سے بولی۔

اُس سے بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے اسی وقت نکال باہر کرتی۔ میں آہستہ آہستہ اُس کی مسہری کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر میں نے پائنتی بیٹھ کے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کراہنے لگی۔ میرے ہاتھ تیز تیز حرکت کر رہے تھے۔ نسترن نے آنکھیں بند کیے کیے کہا "یہ نیچے کہیں دبانا چاہیے، یہ جگہ ہے، یہیں مرا جا رہا ہے۔" میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ "ارے تیرے ہاتھ ایک جگہ ٹھیرتے ہی نہیں ہیں۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔ "کہاں درد ہو رہا ہے تیرے؟"
"سارے ہاتھوں میں۔" یہ لفظ بمشکل تمام میرے منہ سے نکلے۔ اُس نے میری انگلیاں دبانی شروع کر دیں اور ایک بھرپور انگڑائی لی۔ زور پڑنے کی وجہ سے اُس کے بلاؤز کے بٹن ٹوٹنے کی آواز آئی۔ "کم بخت بڑی ہو گئی ہے۔"

میں نے خوف سے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔ ایک لمحہ ایک صدی کے مانند گزر رہا تھا۔ مجھ پر خوف کی بیکی کیفیت طاری تھی۔ میرا دل دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک دل یہ کہتا تھا کہ میں اُس کے بجائے اُس کی گردن دبا دوں اور وحشت سے پچھل جانے گا۔ دوسرا دل کہتا تھا، چند دن اور گزار لے۔ میں نے اس سے پہلے

کسی عورت کی آنکھوں میں ایسی چمک نہیں دیکھی تھی۔ میری مراد جو ایسی پڑی تھی، وہاں وہاں آگ سی لگنے لگتی تھی۔ "تو چھوکرا تھا، وہ بھی نازک خواب ناک آواز میں بولی۔ "تیری آرائش پر پیار آتا ہے۔ تیرے کیسے لڑکے کی بات تھی۔ اچھے اچھے کپڑے بنواؤں گی۔ چاندی کی بنی سونے بناؤں گی۔ مجھے کیا، تجھے یہ آنکھیں پھیر لینا ہیں، جوکر تو مجھے عورت سمجھ کے کہیں دیوانہ ہو جائے۔" اس نے کمر باندھ لی تھی اور مجھ پہ اپنی نوازشیں نچھاور کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے کچھ سکون ہوا۔

"اب میں یہاں آ گیا ہوں تو کہیں اور کھیل ہو جاؤں گا۔ ایسی جگہ کہاں ملے گی۔" میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا۔
"بس سمجھ لے، تو نے میرے تعلقات تو دیکھ ہی لیے ہیں۔ تجھ کا بڑے سے بڑا آدمی یہاں آتا ہے۔ تو نے اگر بھاگنے کی کوشش کی تو میں تجھے پاتال سے بھی نکال لاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گئی۔ اس نے لیٹ کے کہا۔ "ذرا میرے بازو تو دبا۔" میں نے اس بار کسی حیلے حوالے کے بغیر اس کے بازوؤں پہ ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ وہ کسمسائی، اور آہ بھرتی رہی۔ کبھی اس کروٹ، کبھی اس کروٹ۔ اس کا لباس بستر پہ بکھر گیا تھا۔ میں نظریں چرا رہا تھا کہ کسی نے نیچے سے دروازے پر کھٹ کھٹ کی۔ وہ یکے بعد دیگرے کھٹکے۔ اُس نے مجھے بستر پہ لیٹے رہنے کا حکم دیا اور کواڑ کا ذرا سا پٹ کھول کے باہر جھانکا۔
"کون؟ چاند میاں؟ ساتھ میں اور کون ہیں؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "اکیلے ہیں۔" نسترن نے بتایا اور ملازم کو ہدایت کی کہ وہ چاند میاں کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔

"جا آرام کر۔" اُس نے جلدی جلدی کے ساتھ مجھ سے کہا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں کمرے سے نکل کے باورچی خانے میں گھس گیا۔ وہ اپنا لباس درست کر کے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ مجھے اُن کی یہ گفتگو سننے کا موقع نہیں ملا۔ پھر باورچی خانے کے دروازے کی آڑ سے میں نے دیکھا کہ وہ چاند میاں کو اپنی خواب گاہ میں لے جا رہی ہے۔ گویا معاملہ گمبھیر تھا۔ اتنی رات گئے چاند میاں کا آنا اور دیر تک کمرے میں بند ہو جانا بے علت نہیں تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے کلبلانے لگے۔ جیسے کہیں اُس کا گلا دبا رہا ہے۔ میں نے باہر جا کے دیکھا۔ وہاں وہی بگھی کھڑی تھی جس میں تمام شام نواب مرزا اور چاند میاں آئے تھے لیکن بگھی خالی تھی۔ کیا زریں کو لینے آیا ہے؟ اندھیری رات ہے۔ سلسلے میں اُسے ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل کرنے میں کیا دشواری ہو گی۔ ساری کہانی پہ اٹھتی ہوئی ہو گی۔ زریں کا حال بڑا ہو گا۔ خود نسترن بھی جلد از جلد اُس سے پیچھا چھڑانے کا ارادہ رکھتی ہو گی۔ اسی لیے وہ رقم کے سودے پر بھی آمادہ ہو جائے گی۔ نواب مرزا کو کسی کل قرار نہیں آیا۔ ہو گا اُس سے پہلے کہ زریں اور دل نظر نسترن کو لالچ دیتا، اُس نے پہلی فرصت میں چاند میاں کو نسترن سے گفت و شنید کے لیے بھیج دیا ہے۔ میں نے رینگتے رینگتے زریں کے دروازے پہ ہاتھ سے دستک دی۔ مجھے کچھ انتظار کرنا پڑا، پھر اندر سے زریں کی نازک آواز آئی۔ میں نے سرگوشی میں اُسے اپنا نام بتانے کی کوشش کی لیکن اُس تک میری آواز نہیں پہنچی تھی۔ چنانچہ مجھے دوبارہ باورچی خانے میں جانا پڑا۔ وہاں میں نے ایک ساڑی کا ٹکڑا

کرنے سے رہا نام تھا اور وہ کلا نقد بھلاوے کے جھٹکے کے ذریعے دروازے کے نیچے سے
اس کے کمرے کے اندر ڈال دیا۔ زریں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ کمرہ روشن تھا مگر
زریں کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوج کر سرخ ہو گئی تھیں
"خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو۔" اس نے چیخنے کی کوشش کی۔
میں نے ایک دم اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں تو پہلے ہی تمھیں لے
چلتا لیکن تم سے یہ بات کہتا کس طرح؟ اب تو تم نے خود دیکھ لیا، معلوم چاند میاں
پھر آیا ہے۔ جاگتی رہنا اور ہوشیار بھی رہنا۔ میں یہیں کہیں رہوں گا۔ کوئی ایسی
ویسی بات ہو تو فوراً مجھے آواز دے لینا۔"
"میں اب ایک لمحے بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔
"میں خود ایک لمحے بھی تمھیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتا مگر باہر سوچ سمجھ
کے قدم اٹھانا ہوگا۔ یہ رات خیریت سے گزر جائے تو یہی بہت ہے۔"
"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" اس نے پوچھا۔ میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔
کو ابھی مجھ سے بار بار یہی سوال کرتی تھی۔
"دنیا بہت بڑی ہے۔ یہاں سے نکلیں تو یہی پھر دیکھا جائے گا کہ کہاں
جانا ہے۔ تم یہی حوصلہ قائم رکھنا۔ تم تو مسلسل رو رہی ہو۔"
"اور تم جو رو رہے ہو۔" اس نے میرے آنسو دیکھ لیے تھے۔
"مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی تھی۔" میں نے آستین سے آنسو پونچھتے
ہوئے کہا۔ "اچھا دروازہ بند کر لو۔"
اس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر میں نے نہیں سنا کیونکہ نسترن اور چاند میاں
کسی وقت بھی باہر آ سکتے تھے۔ میں باورچی خانے کی روشنی گل کر کے پھر چوکیداری
کرنے لگا۔ میں نے احتیاطاً پیاز کاٹنے کا چاقو سنبھال لیا تھا اور لوہے کی سنسی
ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ کچھ دیر تک کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میں نے دبے قدموں نسترن
کے کمرے کے دروازے پر جا کے کان لگا دیے۔ اندر دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی
میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ اب میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میں دعا
کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ رات گزر جائے۔ صرف ایک رات کی مہلت اور مل جائے۔
میں چوکنا ہو کے بیٹھ گیا۔ جسم کی تمام طاقت کانوں میں سمٹ آئی۔ پھر
چاند میاں بہت دیر بعد نسترن کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ دونوں خاموش تھے جب
ان کی چاپیں باورچی خانے کے قریب سنائی دیں تو میری رگیں تننے لگیں۔ چاقو اور
سنسی پر میرے ہاتھ تڑپنے لگے۔ وہ زریں کے کمرے کے آگے سے گزر گئے تھے
میں دم سادھے اندر بیٹھا رہا۔ گاڑی چلنے کی آواز آئی اور چند منٹ بعد نسترن
نے زریں کے دروازے پر تالے کے پاس سے شروع کر دیے۔ پھر گہری خاموشی چھا گئی۔
نسترن اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ دوبارہ وہ واپس نہیں آئی۔ میں ساری رات جاگتا
رہا۔ اگر نسترن نے چاند میاں کو ناشتہ وغیرہ واپس کر دیا تھا تو اُسے امید ہوگی کہ
کل نواب مرزا روانہ ہو کے اپنی پیشکش میں اضافہ کرے گا۔ اُسے اس
رقم کی ادائیگی میں زمانہ گزر گیا تھا۔
مگر میں زریں کو کہاں لے جاؤں گا؟ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں
تھی۔ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کے ساتھ بڑھی ہوئی داڑھی اور الجھے بالوں

والے ایک نوجوان کو دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟ اس لیے میں نے سوچا بہتر ہے کہ
اس بار پہلے سے سوچ لیا جائے ورنہ گزرے وقت کی طرح زریں کے موقع پر بھی
در بدر مارے مارے پھرنا ہوگا۔ مجھے سوشیل کا گھر یاد آیا۔ جنگل کے علاقے سے
اس بدقسمت گھر کے گزارے کے لیے ماہانہ رقم اب بھی پہنچتی ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ
میں زریں کو اپنی بہن بتا کے چند دنوں کے لیے وہاں ٹھہرا سکتا ہوں
مگر میں نے اس کا گھر بھی نہیں دیکھا تھا۔ معلوم کیا ماحول ہو اور وہ کیسے لوگ
بستے ہوں۔ ہندوؤں کے محلے میں ایک خوبصورت لڑکی کا ٹھہرنا سوشیل کے گھر
والوں کے لیے مصائب میں اضافے کا سبب بن جائے گا۔ سوشیل کے علاوہ میں اس
گھر کے کسی فرد سے واقف نہیں تھا۔ ان کے سامنے خود کو شناخت کرانا بھی مشکل ہو
گا کہ میں سوشیل کا وہی دوست ہوں جس کی ایما پر ایک شخص ہر ماہ ایک مقررہ رقم منی
ہے اور اب میں اس رقم کا حصول وصول کرنے آیا ہوں۔ پھر ایک ہی گھر رہ جاتا تھا
جنگل کا۔ زریں جیسی نازک اندام لڑکی کو کتنے خطرناک بدمعاش کے لڑکے
پیچھے جائیں؟ میں نے جنگل میں اس ماحول کے تیور دیکھے تھے خود اپنی آنکھوں سے
وہ جنگل بھی نہیں دیکھی تھی۔ سوچنے اور منصوبے بنانے کا وقت بھی نکل گیا تھا۔ نواب
مرزا زریں کے حسن و جمال کا اندازہ کر چکا تھا۔ اس کی بے تابیاں شباب پر تھیں
اب مجھے ہر طور جلد از جلد اُسے یہاں سے لے جانا تھا۔ چاہے بعد میں کچھ بھی واقعات
پیش آئیں۔ میری جیب میں مالا کی چھوٹی سی پوٹلی پڑی تھی۔ میں نے اُسے کھول کے
دیکھا اور آنکھوں سے لگا لیا۔ اس حسین مالا کا صرف ایک دانہ میری بہت سی مشکلیں حل
کر سکتا تھا مگر وہ اس کی ایک ہی یادگار رہ گئی تھی۔ اس یادگار کی میں نے کہاں کہاں
حفاظت کی تھی جسے دیکھتے سب سے پہلے اس کی نظر اسی پر پڑی تھی۔ یقیناً اس کے
موتیوں میں کوئی خاص بات ضرور ہوگی۔ اسی لیے وہ بھی گیا۔ میں اس کی مصنوعی رابطے
مجھے شناخت کر لیا تھا ورنہ ایسی مالائیں تو ہزاروں گھروں میں پڑی ہوں گی۔
خیال آیا تو میں بہتا چلا گیا۔ میرا چہرہ بھیگ گیا۔ اتنی یاد آئیں، ابا یاد آئے اور بہنوں
کی شکلیں باورچی خانے کی دھندلی دیواروں پر ابھر آئیں۔
"نہ معلوم ان کے [illegible] دیکھنا کبھی نصیب بھی ہو۔" "نہیں، اتی کی موت
کے بعد ابا جان کے چہرے [illegible] کتنی پریشان ہوں گی۔ مجھے یاد کر کے آنسو
بہاتی ہوں گی۔ بے چاری نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ میں مر گیا ہوں۔ ہاں میں مر ہی گیا تو ہوں
میں ان کا بھائی ہوتا تو ان کے پاس ہوتا۔ اس وقت وہ کہاں ہوں گی؟ کیا کر
رہی ہوں گی؟ کیسا مکان ہوگا؟ محلے والے کیسے ہوں گے؟ چھوٹے بچے ہو گئے
ہوں گے۔ کاش ابا جان کا سایہ ان کے سروں پر سلامت ہو مگر یہ ابا جان کو
بچانے گیا ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انھیں
لگا ہو۔ اُن کے پاس کوئی کاغذات ضرور تھا۔ جانگ قبیلے کے تحقیق کو نیست
نابود کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک انمول خزانہ ہے۔ ممکن ہے ابا جان نے
وہی خزانہ ٹھکانے لگانے کے لیے گاؤں سکونت ترک کر دینا مناسب سمجھا ہو اور
کاغذات وہ جنگل کا غذات جن کی جانگ قبیلے کے لوگوں کو ضرورت تھی۔ ابا جان
نے ضرور اُن کاغذات کا مطالعہ کیا ہوگا اور اُن کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی ہوگی
ہو سکتا ہے بعد میں سب جھوٹ ثابت ہوا ہو اور اُن کاغذات میں کوئی غیر معمولی رمز

پوشیدہ ہو۔ جانگ قبیلے کے لیے جہاں آباد کی وصیت پا کر ابی راستہ پا گیا اور وہ بھی تو
وہ اتنا پریشان تھا، جنگل کاغذات کی گم شدگی پر اس کا یہ اضطراب
خصوصاً اس کے لیے جس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی یہ بات حیرت کی
تھی کہ اُن کاغذات میں ضرور کوئی اہم نکتہ درج ہوگا۔ ابا جان نے اس نکتے کی
جستجو کی ہوگی تو اُن کی تشویش بڑھ گئی ہوگی۔ کیا میں اپنے سابق مکان کے قریب
جو ایک آدمی مجھے ملا تھا، اس کا بیان تھا کہ ابا جان کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے
اور کسی کا گھر میں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے وہ تنہائی میں انھی کاغذات
کا مطالعہ کرتے ہوں اور انھیں ڈر ہو کہ یہ راز کسی پر کھل نہ جائے اور جب اُن کی
تحقیق و جستجو میں رکاوٹ پڑ رہی ہو تو انھوں نے گاؤں سے کہیں اور منتقل ہونے کا
فیصلہ کر لیا ہو کہ ان آبائی مکان، زمین اور جائیداد چھوڑ کے اس طرح وہاں سے
ہو سکتا ہے کہ کسی ہمسائے کو بھی خبر نہ کی۔ چپ چپاتے مکان بیچ دیا۔ نہ کسی سے کہا
نہ سنا۔ کسی پر تو اعتبار کرتے۔ کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔
میں کوئی بے حد اہم بات ہوگی۔ ذہن کو کسی کل چین نہیں تھا۔ انھی قیاس
آرائیوں اور خیالوں کی [illegible] میں صبح ہو گئی اور مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں کہاں
اور کس گھر میں ہوں۔ میں تو زریں کی چوکیداری کر رہا تھا۔ اس غفلت پر مجھے جرم کا
احساس ہونے لگا۔
ناشتے کی میز پر نسترن کا چہرہ فکر میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ پر
بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ جیسے رات اس کے مجھے قریب بٹھا کے کوئی بات ہی نہ کی ہو۔
البتہ زریں ہو تو چاہے کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج گھر سے کم
رات تک تو امان ہے کیونکہ نسترن کے گھر سے کوئی مل جانے زریں کو لے جانے
کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ خود نسترن میرا غرض کے جانے
اُسے لے جا کے چھوڑ آئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ آج چاند میاں نواب مرزا اور بہت
دوسرے لوگوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔ نسترن نے زریں کے حسن کا چرچا دور دور کر دیا
ہوگا۔ گیٹ پہ دربان اور کئی ملازم مہمانوں کی مستقل آمد کا خطرہ اور نسترن کی گھر
میں موجودگی میں زریں کو ان سب بلاؤں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے
کیسے لے جا سکتا تھا۔
دو دن سے میں گھر کے ہر فرد کا جائزہ لے رہا تھا کہ کون کس وقت کہاں رہتا
ہے۔ دربان کی کوٹھری گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ عموماً
صرف ضروریات کے لیے وہاں سے ہٹتا تھا ورنہ وہیں بیٹھا ہوا حقہ
گڑگڑاتا رہتا تھا۔ میں نے ان چار دنوں میں اس سے خاصی دوستی کر لی
تھی۔ شروع شروع میں گھر کے تمام ملازموں نے مجھے خشونت کی نظروں
سے دیکھا مگر بعد میں وہ سب مجھ سے گھل مل گئے۔ باورچی روزانہ صبح
گوشت ترکاری لینے کے لیے جاتا تھا۔ غرض میں نے فرار کے طریقوں پر
بہت غور کیا لیکن عمل کے قابل کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آئی۔ اس روز
جب باورچی ترکاری لینے کے بازار روانہ ہو گیا تھا اور نسترن زریں کے کمرے
میں چلی گئی تھی تو ایک تدبیر میرا دماغ جھنجھوڑنے لگی۔ میں نے باہر جا کے
دیکھا دربان حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ میں بنگلے میں آ گیا۔ آیا ڈرائنگ روم کی

صفائی کر رہی تھی۔ دوسرے ملازم اپنی اپنی کوٹھریوں میں تھے۔ میں
ایک فیصلہ کر کے زریں کے کمرے میں گھس گیا۔ نسترن اس سے کہہ رہی تھی
کہ آج نواب مرزا شاید دو چار دوستوں کے لیے تمھیں اپنے گھر لے جائیں گے میں بھی
تمھارے ساتھ چلوں گی۔ میں جیسے ہی کمرے میں اچانک داخل ہوا، وہ
بات کرتے کرتے رک گئی۔ اس نے مجھے اچٹتی نظروں سے دیکھا۔ میرا بغیر
اجازت اندر پہنچنے سے اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔
میں ایک دم اس کے بہت قریب پہنچ گیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ سنبھلتی، میں نے پھرتی کے ساتھ
اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اُسے پوری طرح گرفت
میں لینے کے لیے مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ "زریں!" میری دبی آواز
ابھری۔ "کسی تاخیر کے بغیر دروازہ بند کر دو اور تیار ہو جاؤ۔" میرا لہجہ
تحکمانہ تھا۔ زریں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ "دیر مت کرو، وقت نہیں ہے۔"
اس کے تساہل پر مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ نسترن میری گرفت سے
آزاد ہونے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا وہ
کس کی گرفت میں ہے۔ زریں نے کمرہ بند کر دیا۔ نسترن چیخنے کی کوشش
بھی کر رہی تھی۔ لہٰذا میں نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ اگر
مجھے زریں کی موجودگی کا خیال نہ ہوتا تو میں اُسے اتنے طمانچے مارتا اتنے
طمانچے مارتا کہ وہ لہولہان ہو جاتی۔ پھر جب اس نے شور مچانے کا ارادہ
کیا تو میں نے باورچی خانے سے اٹھایا ہوا چاقو نکال لیا اور اپنے وجود
کی تمام نفرت سمیٹ کے اس سے کہا۔ "نسترن خانم! میں زریں کو لے کے
جا رہا ہوں۔ پہلی بار تم سے چوٹ کھایا گیا تھا مگر اب دوسری بار ایسا نہیں ہوگا۔
میں اس شریف اور معصوم لڑکی کو تم سے بہت دور لے جا رہا ہوں۔ روکنے
کی کوشش نہ کرنا۔ اس وقت مجھے صرف یہ بتا دو کہ چاند میاں کہاں
رہتا ہے؟"
"تم کون ہو؟" دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔
"میں تمھیں پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس وقت مجھے چاند میاں کا پتا چاہیے۔"
"وہ کیلا بگان میں رہتا ہے۔" نسترن لرز کے بولی۔ "کیا تم زریں کو
اُس کے پاس لے کے جا رہے ہو؟"
"تم نے کیا سب کو اپنے جیسا سمجھ لیا ہے۔ اس دنیا میں سبھی تم
جیسے کمین نہیں ہوتے نسترن خانم! وقت کم ہے۔ تم ذرا اس کرسی پر سیدھی
طرح بیٹھ جاؤ۔" میں نے اُسے گھسیٹ کے اٹھایا اور زریں سے [illegible]
مانگی۔ نسترن تڑپنے لگی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے منہ پر ایک اور ضرب لگائی
پڑی۔ وہ ہوشیار عورت تھی۔ سمجھ گئی کہ مزاحمت کرنا بے کار ہے۔ زریں نے
اسے کرسی سے باندھنے میں میری مدد کی۔ نسترن کو چاروں طرف سے باندھ
کے میں نے زریں سے پوچھا۔ "تمھارے پاس کچھ نقدی ہے؟"
"نہیں، وہ تو سب یہیں سے انھیں سے مل جاتی تھی۔" زریں نے
معصومیت سے کہا۔
میں نے نسترن سے کہا۔ "تمھارے روپے کہاں کے بیگ میں ہیں؟"

وہ روپے الگ رہا ہوں جو زریں نے مجھے دیے تھے۔ وہ پانچ ہزار روپے نہیں جو نواب مرزا نے زریں کی رونمائی کے لیے دیے تھے۔"

نسترن نے آنکھوں کی پتلیوں سے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے تیزی سے سنگھار میز کی دراز کھولی۔ دراز میں اس کا چھوٹا سا بٹوا موجود تھا جس میں چابی رکھی تھی۔ چابی سے میں نے الماری کھولی۔ الماری میں بہت قلیل رقم تھی۔ وہ میں نے گنے بغیر جیب میں ڈال لی اور زریں کو ہدایت کی کہ وہ دروازہ بند کرے اور میرا انتظار کرے اور جب تک اسے تصدیق نہ ہو جائے کہ خود میں آیا ہوں، اس وقت تک دروازہ نہ کھولے۔

باہر آ کے میں نے عمر رسیدہ جاٹ دربان سے کہا کہ بیگم صاحب کو ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ وہ کندھے اچکا کر گیٹ سے روانہ ہو گیا۔ میں بھاگتا ہوا اندر آیا۔ میری آواز سن کے زریں نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے سے نکلتے وقت میں نے آپا کی نقل و حرکت دیکھ لی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ زریں نے برقع پہن لیا تھا۔ وہ بالکل تیار تھی اور اپنا سوٹ کیس بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے منع کر دیا اور سوٹ کیس وہیں چھوڑ دیا۔ میں چلتے چلتے ایک دفعہ نسترن کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم نے اسے ایسا کس کے باندھا تھا کہ وہ جنبش بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے میرا تعارف ہو نہ پایا تھا۔ تعارف کے لیے اگر میں رک جاتا تو وہ اسی دیر میں معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ میرے سینے میں گھٹن سی ہوئی جیسے کوئی مجھ سے شکایت کر رہی ہو کہ بابر! تم نے اسے اتنی آسانی سے معاف کر دیا!

بہرحال میں نے نسترن سے کہا۔ "نسترن خانم! ہم جا رہے ہیں۔ تم نے زریں کے بارے میں غلط رائے قائم کی تھی۔ اگر میں یہاں نہ بھی ہوتا اور تم نواب مرزا جیسے کسی شخص کے ہاتھ اسے فروخت کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتیں تو زریں اپنی عصمت بچانے کے لیے چوڑیاں پیس کر پھانک لیتی۔ یہ اس کردار کی لڑکی ہے۔ ایک بار پہلے بھی تم نے ایک اور لڑکی کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ یاد ہے آج سے سات سال پہلے؟"

اس کی پتلیاں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے زریں کا ہاتھ تھاما۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ "چلو زریں!" میں نسترن پر آخری ایک نظر ڈالتا ہوا دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔ زریں میرے پیچھے پیچھے تھی۔ ہم ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ زریں کو بوڑھی آپا کی نگاہ سے اوجھل کرنے کے لیے میں ٹھہر گیا اور زریں کو تنہا آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ احتیاط سے نکل گئی۔ میں بھی چلا۔ اس طرح ہم گیٹ تک پہنچ گئے۔ دربان اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جب تک دربان ٹیکسی لے کے واپس آئے گا، اس وقت تک ہم اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کے ارد گرد کی گلیوں میں گم ہو جائیں گے مگر اس اقدام میں ایک خطرہ تھا۔ دربان ٹیکسی آنے کے بعد اندر اطلاع دینے جائے گا۔ ٹیکسی باہر کھڑی ہوئی ہو گی اور نسترن کو آزاد کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ وہ فوراً منتظر ٹیکسی میں بیٹھ کے ہمارا تعاقب شروع کر دے گی۔ اگر ہمیں کوئی سواری ملنے میں دیر ہو گئی تو وہ آسانی سے ہمارے سروں پر پہنچ جائے گی۔ میں نے گیٹ سے باہر گلی میں جھانک کے دیکھا۔ دربان ٹیکسی لے کے آ رہا تھا۔ گویا میں چند منٹ اور ٹھہر جاتا تو دربان اندر اطلاع دینے پہنچ جاتا یا ہمیں باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیتا۔ میں نے زریں کو ایک طرف کھڑا کر دیا اور خود گیٹ سے باہر آ گیا۔ زریں گیٹ کے اندر کھڑی رہی۔ دربان مجھے منتظر دیکھ کے بولا۔ "جاؤ فقیرے! بیگم صاحب کو خبر کر دو۔"

میں نے جواب دیا۔ "وہ تیار ہیں۔" یہ سنتے ہی زریں باہر نکل آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "بیگم صاحب کدھر ہیں؟"

"آ رہی ہیں۔ اٹھتے اٹھتے انھیں کچھ یاد آ گیا تھا۔" یہ کہتے کہتے زریں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ہم نے چند لمحے انتظار کیا۔ پھر میں نے دربان سے کہا۔ "بابا! ذرا دیکھو بیگم صاحب کہاں رک گئی ہیں؟" پھر جیسے ہی وہ اندر گیا، میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔ وہ نسبتاً سستی کر گیا۔ میں نے دوبارہ کہا۔ پھر مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کے اس کے حوالے کیا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ مست ہو کر اس نے ایک نعرہ لگایا اور پوچھا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"چلتے رہو۔" میں نے ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے وحشت سے کہا۔ اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اگلا موڑ مڑتے ہی مجھے نواب مرزا کی کار نظر آئی۔ میں نے زریں کو چپکے سے اشارہ کیا۔ چاند میاں اور نواب مرزا پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوری طرح دن ڈھل آنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ بہرحال وہ رکے ہوئے تھے اور ہماری ٹیکسی کلکتے کی سڑکوں پر دیوانوں کی طرح چکرا رہی تھی۔ ڈرائیور بار بار نشست سے اچھلتا تھا جیسے اسے ایڑ لگا رہا ہو۔ وہ نعرے بھی لگا رہا تھا جیسے ٹیکسی کو چابک رسید کر رہا ہو یا گالی دے رہا ہو۔ کدھر جاؤں؟ کہاں ٹھیروں؟ کس کے دروازے پر دستک دوں؟ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ نسترن کے بنگلے پر نواب مرزا کی گاڑی بروقت پہنچ گئی تھی۔ اس لیے یہ اندیشہ اب بھی لاحق تھا کہ نواب مرزا کی گاڑی ہمارے تعاقب کے لیے فوراً حرکت میں آ جائے گی۔ اگر ایسا ہوا اور انھوں نے راستہ کاٹ کے کسی جگہ ہمیں روک لیا تو کیا ہو گا؟ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟" زریں نے اس طرح سرگوشی میں مجھ سے پوچھا کہ ڈرائیور اس کی آواز نہ سن سکے۔

"تمھیں وہاں سے آنے پر کوئی دکھ تو نہیں ہو رہا ہے؟" اسے جواب دینے کے بجائے میں نے اس سے ایک عجیب سوال کیا۔

اس سے جواب نہ بن پڑا۔ وہ جز بز ہو کے رہ گئی۔ میں برقع میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ کچھ توقف کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔ "اب میں تمھارے ساتھ آ گئی ہوں۔"

میرے جسم میں بجلی کا ایک جھٹکا سا لگا۔ کاش اس بار واقعات مختلف انداز سے پیش آئیں۔ ٹیکسی بے منزل بھاگتی رہی بھاگتی رہی۔

ڈرائیور نے کئی بار پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ میری خاموشی سے تنگ آ گیا تھا اور منزل کا پتہ پوچھنا چاہتا تھا اور میری سمجھ میں کوئی منزل نہیں آ رہی تھی۔ جدھر نظر اٹھاتا تھا، دیواروں اور دروازوں پر بھوت کھڑے ہوئے ملتے تھے۔ آخر ڈرائیور نے ایک جگہ ٹیکسی روک دی اور تلخی سے پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے؟"

میں نے سراسیمہ ہو کے اسے دیکھا اور بلا تکلف کہا۔ "سیال ٹبے۔"

"سیال ٹبے؟" اس نے دہرایا۔ "ایسا بولو نا۔"

گاڑی نے پھر اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ اس مرتبہ اسے کچھ قرار آ گیا تھا۔ رفتار متوازن اور سبک تھی لیکن میری بے قراری بڑھ گئی تھی اور میرے ذہن کی گاڑی کی رفتار اتنی ہی منتشر اور تیز ہو گئی تھی۔ دماغ پھٹنے لگا تھا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے گاڑی روکی۔

"سیال ٹبے میں کدھر جانا ہے؟"

"استاد جھبل کے ہاں!"

"استاد جھبل۔" میرے لہجے کی سردی اسے لگ گئی تھی۔ اس نے مجھے انتہائی حیران نظروں سے دیکھا۔ "تم جھبل کے ہاں جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے گردن ہلا کے کہا۔

وہ سٹ پٹا گیا۔ "کیا تم اس کا اڈا جانتے ہو؟"

"نہیں۔ تم وہاں کسی جگہ بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"ہم اس علاقے میں نہیں جاتا۔ وہاں کی سواری ہوتی ہے تو منع کر دیتا ہے۔" وہ کچھ تنک کے بولا۔

"ہمیں وہیں چھوڑ دو۔" میری آواز میں حکم تھا۔

وہ کچھ جھجکا، پھر ایک تنگ لمبی گلی میں مڑ گیا۔ ایک ہوٹل کے قریب گاڑی روک کے اس نے پان والے سے کچھ پوچھا۔ میں نے دیکھا کہ پان والا اسے پتہ سمجھا رہا ہے۔ اس گلی میں بہت سے ہوٹل تھے اور ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ گاڑی ایک بڑی سی پیلی عمارت کے سامنے جا کے ٹھہر گئی۔ ڈرائیور نے ایک بار پھر اتر کے کسی راہ گیر سے پتہ پوچھا۔ اس نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ "سنو!" میں نے مرتعش آواز میں ڈرائیور سے کہا۔ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی تھی۔ "ادھر جا کے کہو استاد جھبل کا ایک مہمان آیا ہے۔ اسے ادھر بھیج دو۔"

"بابا!" وہ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ خود ادھر جاؤ اور جا کے بیسترا کرو۔"

"جاؤ۔" میں نے زور دے کے کہا۔ "جاؤ!"

وہ الجھتا، بڑبڑاتا، کسمساتا ہوا بائیں جانب کی عمارت میں گھس گیا۔ یہ عمارت بناوٹ میں دوسری عمارتوں سے مختلف تھی۔ حویلی نما اسے دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ باہر لوہے کا ایک گیٹ تھا۔ ڈرائیور جھجکتا ہوا جیسے ہی گیٹ تک پہنچا، گٹھے ہوئے جسم کا ایک شخص اس کے سامنے آ گیا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کی طرف اشارہ کر کے اسے کچھ بتایا۔ اس نے مجھے خشونت اور حقارت سے دیکھا اور سینہ تانے ہوا آہستہ قدموں سے میرے پاس آیا۔ "کس سے ملنا ہے؟" سوال اس نے مجھ سے کیا تھا مگر اس کی نظریں زریں پر لگی ہوئی تھیں۔

"استاد جھبل سے۔" میں نے تندی سے کہا۔

"کون ہو تم؟"

"بس تم استاد کو بتا دو کہ اس کا ایک مہمان آیا ہے۔"

"نام بتاؤ۔" اس نے سختی سے کہا۔

"تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔"

اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔ "استاد مصروف ہے۔"

میں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جاؤں۔ کیسوں کرائے کے ٹٹوؤں کے تیور ہی عجیب ہیں اور پتہ نہیں اس عرصے میں جھبل کے رویے میں کیا تبدیلی آ گئی ہو۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد میرے خیال میں اسے بہت طاقت حاصل ہو گئی ہوگی۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کے اگلے حصے پر کھڑا تھا۔ میں ٹیکسی سے اتر آیا اور میں نے آہستہ سے کہا۔ "جاؤ، اس سے کہو لاڈولا آیا ہے۔"

"لاڈولا؟" اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں لاڈولا!"

اس نے ایک آن میں کئی پہلو بدلے۔ اس کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ جیسے اس کی آنکھ میں تنکا پڑ گیا ہو۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر سرپٹ بھاگا۔ دروازے میں ایک لڑکا اس کی ٹکر سے گرتے گرتے بچا۔

میں اپنی زندگی کا سب سے ہولناک انتظار کر رہا تھا۔ میری نظریں گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ چند ثانیوں کے طویل عرصے کے بعد بلند آواز سے دروازہ کھلا اور اندر سے جھبل برآمد ہوا۔ ایک لمحے وہیں ٹھٹک کے اس نے متجسس نگاہ سے مجھے دیکھا اور وحشت میں لپک کے آیا۔ پھر وہ بے تحاشا میرے سینے سے لپٹ گیا۔ "لاڈو! پیارے لاڈولے!" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ "میری جان! تو نے اپنے جھبل کو کوئی خبر نہیں کی؟ کہاں چھپ گیا تھا؟"

گلی میں بھیڑ لگ گئی۔

جھبل کو یہ فکر نہیں تھی کہ گلی میں ہلڑ اور بھیڑ ہو گئی ہے۔ وہ مجھے دیوانگی میں گلے سے لپٹائے چوم رہا تھا اور میرے بازو، ماتھے اور گال پہ بے تحاشا چوم رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ لے کے والہانہ انداز سے کہا۔ "میرا چاند آ گیا۔ تجھے کیا معلوم ان ظالموں سے پوچھ پوچھ کے میں تیرے لیے کتنا فکرمند تھا۔ نطفہ حرام کہتے تھے، استاد وہ لاڈولا بے مروت نکل گیا۔ کتا ہے۔ میں نے اسے [illegible] دیا۔ اب دیکھنا ہے کہ تیرے پاس آئے گا۔ میں کیا

تھا دیکھ لینا، وہ ایک دن ضرور آئے گا میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ لاڈلے
بھائی! تو نے میری لاج رکھ لی۔" وہ سانس لیے بغیر کہتا گیا۔
گلی کا وہ حصہ لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ وہ سب حیرت زدہ
تھے۔ جو لوگ پیچھے کی جانب تھے وہ اچک اچک کے یہ منظر دیکھنے کی کوشش
کر رہے تھے۔ تجمل نے ایک ذرا سانس لی تو میں نے ترنم ساری سے اسے مخاطب
کیا: "تجمل بھائی! میرے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔" میں نے کوشش کی تھی کہ
یہ بات اس کے سوا کوئی نہ سن سکے۔
"کہاں ہے؟" اس نے بے تابی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بلند آواز
سے پوچھا۔ پھر اس کی نگاہ خود ہی ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی برقع پوش زرین پر ٹھہر گئی۔
ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر تجسس کے آثار ہویدا ہوئے لیکن اگلے
لمحے اس نے بڑھ کے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کو
للکار کے کہا: "یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ بھابی گھر آئی ہیں، ان کو
عزت سے گھر پہنچاؤ۔"
ٹیکسی ہر طرف سے لوگوں نے گھیر لی اور چاروں دروازے کھول دیے
جیسے زرین چاروں دروازوں سے ایک ساتھ برآمد ہوگی۔ انھوں نے تماش بینوں
کو دور ہٹنے کے لیے ڈانٹنا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ سیاہ برقع میں ملبوس وہ سرو قد
لڑکی ٹیکسی سے اتری تو سب کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ اس کے مرمریں سفید [illegible]
ریشمیں ہاتھ عریاں تھے اور جھل مل کر رہے تھے۔ تماش بینوں کے دیدے پھٹے
پھٹے تھے۔ تجمل کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے گلی کی
طرف دیکھا۔ سب کے کلیجے [illegible]۔ "چلیے یہاں سے۔" وہ بری طرح ڈانٹنے
لگا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا: "آ لاڈلے! چل — اپنے گھر چل۔ آ اب میں
تجھے خوب جی بھر کے دیکھوں گا، آنکھیں ترس گئی تھیں۔"
زرین تجمل کے آدمیوں کی جلو میں مکان کے اندر چلی گئی تھی۔ تجمل کو
قرار نہیں تھا۔ وہ کبھی میری گردن میں ہاتھ ڈالے بیٹھے دبوچتا تھا، کبھی پیار کرتا تھا۔
جب ہم دروازے میں داخل ہوئے تو ٹیکسی ڈرائیور نے خوف زدہ لہجے میں اسے
سلام کیا۔ تجمل کو اس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا
تو تجمل نے مجھے دھکا دے دیا اور اپنی جیب الٹ کر جتنے روپے سامنے آئے تھے
سب ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ پر دھر دیے۔ ڈرائیور نے خوف و دہشت میں کئی
سلام کیے۔ ابھی تجمل چند قدم ہی اندر گیا ہوگا کہ کسی نے باہر سے ہانک لگائی: "استاد!
یوں اندر نہ جاؤ۔ اب مٹھائی کا انتظام بھی کرو۔"
"ارے مٹھائی!" تجمل چیخ کے تڑپا۔ گیٹ پر ایک بوڑھا شخص مسکرا رہا تھا۔
"[illegible] تو نے خوب یاد دلایا۔ اس دن کی [illegible] سے جا کے کہہ
دے دکان میں جتنی مٹھائی ہو جھٹ پٹ اٹھا کے یہاں پہنچا دے۔"
"استاد فلاں کی مٹھائی؟" بوڑھے آدمی کے برابر کھڑے ہوئے ایک ادھیڑ
عمر آدمی نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔ "سادی مٹھائی کیا مزہ دے گی۔"
"ابے [illegible] بھی کر لیں گے، اس کو بھی لا، جا کے کہہ دے آج اٹھے ہم

گانا ہوگا اور رقص۔ امیر سے جا کے کہنا، پانچ بکرے کٹ جائیں۔ محلے میں سب
کو بتا دو آج رات سب تجمل کے مہمان ہیں۔ امیر سے کہہ دینا اگر کچھ خراب ہوا
تو اس کی انتڑیاں نکال لوں گا۔" وہ دروازے پر ہی احکام صادر کرتا رہا اور
لوگ اس سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے رہے۔ وہ سنتا رہا اور لوٹ لوٹ کے حکم
دیتا رہا۔ ایک آدمی نے یہ دیکھ کے گیٹ بند کر دیا۔ باہر شور مچنے لگا۔ تجمل نے
گرج کے ایک موٹی سی گالی دی۔ گالی کی آواز باہر پہنچنے کی دیر تھی، سب کو سانپ
سونگھ گیا۔ پھر تجمل کو مجھ پر توجہ دینے کی مہلت ملی۔ "تو نے داڑھی بھی نہیں بنائی
اور کپڑے کیسے گندے ہو رہے ہیں۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "رنگ بھی کیسا میلا
کر لیا ہے۔ یہ تو کہاں [illegible] ہو گیا تھا لاڈلے میاں؟" تجمل نے میری ٹھوڑی پکڑ
کے اشتیاق سے مجھے دیکھا اور بولا: "تو نے تجمل کا کڑا امتحان لیا ہے میرے بادشاہ!"
اس حویلی نما عمارت کے اندر کا نقشہ باہر سے مختلف تھا۔ معلوم ہوتا
تھا جیسے اسے باقاعدہ منصوبے کے تحت تعمیر کیا گیا ہے۔ اندر بھول بھلیاں
بنی ہوئی تھیں۔ چند کمروں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسے کمرے میں آ گئے
جہاں ایک دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تجمل نے دری ہٹا کے فرش
کا ایک پتھر کھسکایا، اندر لوہے کا ایک ہینڈل تھا۔ اسے گھماتے ہی کمرے کے
مشرقی حصے کی دیوار کھسکنے لگی اور پھر ایک روشن کمرہ نظر آیا۔ تجمل مجھے ادھر
لے گیا اور دیوار برابر کر دی۔ اس کمرے میں مختلف دروازے تھے۔ سفید چاندنی پر
گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کا ایک دروازہ کھول کے تجمل مجھے لیے لیے
دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ یہاں مسہری لگی ہوئی تھی اور دیواروں پر بندوقیں
لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ راستے بھر کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ عمارت کے اس پراسرار ماحول
سے مجھ پر ہیبت سی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے مسہری کے گدّے پر زور دے کے
مجھے مسہری پر بٹھا دیا اور تالی بجائی: "کہاں مر گئے کم بختو؟ ابے تمھیں خبر نہیں
ہوئی؟" وہ چیخ رہا تھا۔ "لاڈلے آ گیا ہے۔"
اس کی چیخ پکار پر کئی آدمی بھاگ کے اندر آئے۔ ان میں لالہ بھی تھا۔
وہ مجھے دیکھتے ہی چیخ کے لپکا اور مسہری سے اٹھا کے ناچنے لگا۔ اس پر [illegible]
پہلے ان میں کئی ایسے لوگ موجود تھے جو جیل میں میرے ساتھ رہے تھے اور
جیل سے سزائیں کاٹ کے رخصت ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں مسہری کے سامنے
انواع و اقسام کے پھلوں اور کھانوں کا انبار لگا دیا گیا۔ اس عالم میں مجھ سے
کچھ کھایا پیا نہیں گیا۔ وہ سب مجھ سے ایک سوال بار بار کرتے تھے کہ میں جیل
سے رہا ہونے کے بعد سیدھا استاد تجمل کے پاس کیوں نہیں آیا؟ وہ بار بار
تجمل کی بے تابیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ [illegible] نے آ کے بتا دیا تھا کہ میں
اسے [illegible] اسٹیشن پر ملا تھا۔ تجمل نے اشتعال میں اسے اتنا مارا تھا کہ وہ کئی
دن باہر نکلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے بڑھ چڑھ کے ساری روداد سناتے
رہے اور تجمل خاموشی سے حقہ گڑگڑاتا رہا۔ پھر اچانک غصے میں آ گیا: "ابے!
کیا یہیں بیٹھے رہو گے؟ کچھ انتظام و انصرام نہیں کرنا؟ محلے کے لوگ کیا کہیں
گے کہ لاڈلے کے آنے کے بعد تجمل اپنے وعدوں سے پھر گیا۔ مجھے بدنام کرنا

چاہتے ہو، سور کے بچو! اٹھو اٹھو۔" وہ تلخی سے بولا۔ "محلے والوں سے کہہ دو کہ آج
رات کسی کے گھر کھانا نہیں پکے گا۔ سب تجمل کے مہمان ہیں۔" تجمل کی گرج پر
وہ ہڑبڑا کے اٹھے۔ لالہ چلتے چلتے ناک پر انگلی رکھ کے مٹکنے اور چمکنے لگا۔ تجمل
نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ کمرے میں تجمل اور میں تنہا رہ گئے۔ چند لمحے ایک عجیب سا
سکوت طاری رہا۔ "کیا بات ہے، تو کچھ پریشان ہے؟" تجمل نے حیرانی سے پوچھا۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"جھوٹ۔" وہ میرے بال بکھیر کے بولا۔ "خیر تو ہے؟"
"ہاں سب خیر ہے۔" میں نے اداسی سے کہا۔
وہ حقہ گڑگڑاتے گڑگڑاتے رک گیا۔ "خیر نہیں ہے، خیر نہیں ہے لاڈلے!"
اس نے میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ "بتا کیا معاملہ ہے۔ کس نے
تجھ پر نگاہ ٹیڑھی کی ہے، میں اس کی آنکھیں نکال لوں گا۔"
"کسی نے نہیں۔ وقت اور زمانے کی آنکھیں نکال سکتے ہو تو نکال لو۔"
میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔
"ہاں یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے لاڈلے!" وہ افسردگی سے بولا
"لیکن وقت اور زمانہ کچھ نہیں کہتے، انھیں لوگ کسی کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔
میں انھی لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"
"چھوڑو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "یہاں کی سناؤ، سب لوگ خیریت
سے ہیں؟ [illegible] نصیب میاں، [illegible] یہ سب کیسے ہیں؟"
"یہ تو سب حرام کی کھاتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔ تو اپنی بتا، بات کہیں
ٹالتا ہے۔ مجھ سے چھپا رہا ہے میاں جی؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ پھر کچھ سوچ
کے کہنے لگا: "میں تو بھول ہی گیا۔ تیرے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟"
"ایک لڑکی ہے لیکن [illegible] آفت زدہ۔"
"صاف صاف بات کر۔" وہ الجھ کے بولا۔
"میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
میں سمجھتا تھا کہ وہ اس اطلاع پر ششدر رہ جائے گا مگر اس کے چہرے پر
کوئی تاثر نہیں ابھرا البتہ وہ کچھ سوچنے ضرور لگا۔ "تو کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟"
اس نے بے نیازی سے پوچھا۔
"دیکھا تو نہیں ہے لیکن....." میں کہتے کہتے جھجکنے لگا۔
"لیکن کیا...؟" وہ برہمی سے بولا۔ "لاڈلے! کھل کے بات کر۔"
"بعد میں بتاؤں گا، اس وقت مت پوچھو۔"
"تیری مرضی۔ تو تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے، اچھا ہر اندیشہ ذہن سے نکال کے
کچھ دیر آرام کر لے۔ تو اب تجمل کے ہاں ہے۔ اس سے محفوظ جگہ جیل بھی
نہیں سمجھ اور یہ اپنا حلیہ تو ٹھیک کر۔ تجمل کے یار آئیں گے تو کیا کہیں گے۔
[illegible] او حرام کے جنے!" وہ چیخ کر بولا۔ "[illegible] حجام کو اور لاڈلے کے لیے
سفید کرتا لا۔"
تجمل کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ حجام نے آ کے میری داڑھی مونچھیں

صاف کر دیں۔ غسل کے لیے گرم پانی تیار کیا گیا اور ایک سفید کرتا پاجامہ اور دوپٹا
فراہم کر دیا۔ جب میں نہا دھو کے اور کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو تجمل ایک
ٹک کھڑا ہو گیا اور میری صورت تکتا رہ گیا۔ اس نے آوازیں دے دے کے اپنے
لوگوں کو بلایا اور مستانہ انداز میں کہنے لگا: "دیکھو لاڈلے کا حسن دیکھو۔ یہ ہے
لاڈلا۔ دیکھا تم نے کیا چمک کے آیا ہے، ابے کیا گھور گھور کے دیکھتے ہو، نظر
لگ جائے گی سالو! ہے کوئی کلکتے شہر میں ایسا جوان؟ اگر کوئی ہو تو اسے
ڈھونڈ کے میرے سامنے لاؤ، میں اسے [illegible] دوں گا۔"
اس اثنا میں نصیب میاں بھی آ گیا تھا۔ اس کے بالوں میں مہندی لگی
ہوئی تھی۔ وہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے بالکل نواب لگ رہا تھا۔ وہ
آتے ہی میری بلائیں لینے لگا۔ "سبحان اللہ استاد! سبحان اللہ! [illegible]
پہچانا نہیں جاتا۔ ستم ڈھا رہا ہے۔ رخسار پر لال نشان لگا دو استاد۔
ہم پر بھی جوانی آئی تھی پر ایسی ٹوٹ کے نہیں آئی تھی۔"
پہلے ایسے میں ان کے تبصرے سن کے مجھے جھینپ آنے لگی اور بڑا
دل چاہا کہ میں آئینے میں اپنا چہرہ جا کے دیکھوں اور یہ بھی جی چاہا کہ زرین کے
پاس جاؤں۔ اب تک مجھے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی کہ اسے انھوں نے کہاں
ٹھہرایا ہے۔ یہاں عورت کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ اکیلے میں گھبرا گئی ہوگی۔ یہ جگہ
اس کے لیے اسرار بھری تھی کہ وہ کیا سوچ رہی ہوگی لیکن میں ان سب کی موجودگی میں زرین
کے پاس جانے کے ارادے کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔ [illegible]
تھا۔ تجمل دوسرے کمرے میں گیا تھا جہاں چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے
لگے ہوئے تھے۔ [illegible]
[illegible]
ٹیک لگا کے ایک شان سے بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ [illegible] برابر موجود تھا۔ جو بھی
آتا تجمل میرے بارے میں اس سے چار پانچ جملے ضرور بولتا۔ آنے والوں کا تانتا
بندھ گیا۔ سب میرے نام سے واقف تھے لیکن اس طرح لگ رہے تھے جیسے میری ان
کی پرانی شناسائی ہو۔ سب کو ایک ہی شکایت تھی کہ میں نے جیل سے آزاد ہو کے
تجمل کے اڈے کا رخ کیوں نہیں کیا۔ صاف ظاہر تھا کہ تجمل نے ان سے میرا اس
قدر تذکرہ کیا تھا کہ اب درمیان میں کوئی اجنبیت نہیں رہ گئی تھی۔ اتنی جلدی
اتنی بڑی تبدیلی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے حواس بحال کرنے میں دیر لگی۔ صبح تک میں
نسرین بیگم کا ملازم تھا اور اس وقت کلکتے کے نامی گرامی بدمعاشوں کے درمیان
بیٹھا تھا۔ وہ سب مجھ پر فدا ہو رہے تھے۔ دوپہر کا کھانا سب نے اسی کمرے میں
کھایا۔ کھانے کے بعد جیل کے واقعات دہرائے جانے لگے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے
انھیں دنیا کا کوئی کام نہ ہو۔ وہ مجھے [illegible] جیل کے واقعات یاد دلا رہے
تھے اور مجھے زرین کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ پھر میں نے ہمت کر کے تجمل کے
کان میں کہا کہ میں لڑکی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔
"بیٹھ لاڈلے!" اس نے میرا کاندھا پکڑ کے زبردستی بٹھا لیا۔ "دیکھ میاں،
تیرے لیے کون لوگ آئے ہیں۔ وہ خیریت سے ہے، اپنی بیٹی سے بہن سے ہے۔"

سب کی آزادانہ کھینچ لی ہو۔ ابھی یہ محفل شباب پر تھی کہ سامنے سے دو رفتہ
چہروں کے کئی قوی ہیکل اشخاص اس طرف آتے نظر آئے۔ ہر ایک کی نگاہ اُن
کی طرف اٹھ گئی۔ مجمع میں بھنبھناہٹ سی ہوئی اور زہرہ کی نغمہ سرائی پر بے دلی
سرگوشیاں غالب آ گئیں۔ تجمل کے چہرے پہ جیسے تلواریں کھنچ گئیں۔ اس نے
کانٹے کو اشارہ کیا۔ کانٹے تیزی سے اٹھ کے آنے والے اشخاص کی طرف دوڑا
اور اس نے آگے جا کے ہاتھ پھیلا کے تجمل کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔
سب سے آگے ایک گرانڈیل شخص تھا وہ قد میں لمبا اور جسم میں بھاری تھا۔
اُس نے کانٹے کا ہاتھ جھٹک دیا اور سینہ پھیلائے ہوئے آگے بڑھا۔ زہرہ نے گانا
روک دیا۔ ہارمونیم کی آواز سسکنے لگی اور طبلچی کے ہاتھ طبلے پر ٹھٹھر گئے۔ تجمل
اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور سب سے آگے آنے والے شخص کے کاندھے
پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ "آؤ آؤ صوبیدار! بیٹھو بیٹھو۔" اس نے اپنی نشست پہ بیٹھے
لڑکوں کو جگہ دینے کا اشارہ کیا۔ "تم نے آ کے جی خوش کر دیا۔" تجمل نے خندہ پیشانی سے کہا۔
میں بھی تجمل کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ اسی لمحے میری نظر صوبیدار کے ساتھ آنے والے
لوگوں میں سب سے پیچھے کھڑے ہوئے چاند میاں پر پڑی۔ میرا دماغ سنسنا گیا۔ بھڑکتے
ہوئے غصے سے میرا جسم بھر گیا۔ "ہم یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئے ہیں استاد تجمل!"
صوبیدار نے سخت لہجے میں کہا۔ "لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔"
"کون سی لڑکی؟" تجمل کے تیور بھی بدل گئے۔
"وہ لڑکی جو آج تمہارے اڈے پہ آئی ہے۔" اس نے تندی سے کہا۔
"صوبیدار!" تجمل گرج کے بولا۔ "جو آدمی تجمل کی پناہ میں آتا ہے
اُسے واپس نہیں کیا جاتا۔ اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔"
"دیکھو تجمل! ہم تمہارے معاملے میں کبھی نہیں بولتے۔ وہ چھلاوہ آدمی چاند
میاں کی امانت ہے اُسے واپس کر دو اور بات مت بگاڑو۔ ایک لڑکی کے لیے
ہمیں آپس میں بگاڑ نہیں کرنا چاہیے۔"
"بگاڑ؟ بگاڑ تو تم کر رہے ہو صوبیدار! تم دیکھ رہے ہو کہ میں اپنے
لاڈلے کی واپسی کا جشن منا رہا ہوں۔ تمہیں آنے سے پہلے اس بات کی
احتیاط رکھنی چاہیے تھی۔ ہم کبھی تمہاری خوشیوں میں اس طرح مخل نہیں ہوتے۔
آؤ یہاں بیٹھو کے گانا سنو۔"
"میں گانا سننے نہیں لڑکی لینے آیا ہوں۔" صوبیدار کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔
"میں تمہیں کوئی لڑکی نہیں دے سکتا۔"
"میں تمہیں سوچنے کا وقت دیتا ہوں۔"
"میں تمہیں آخری جواب دے رہا ہوں۔"
"بہت خون خرابہ ہو سکتا ہے استاد تجمل!" صوبیدار تھرائے لہجے میں بولا۔
"میری بات مان لو۔ تمہارا آدمی لڑکی کو بھگا کے لے آیا ہے۔ نمٹنا تو ہمیں اُس
سے چاہیے تھا مگر ہم سیدھے تمہارے پاس چلے آئے کیونکہ وہ تمہارا آدمی ہے۔"
"وہ میرا لاڈلا ہے۔" تجمل میری گردن میں بانہیں ڈال کے فخر سے بولا۔
"یہ ہے وہ؟" صوبیدار نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں بے چاند میاں؟"

وہ پیچھے ہٹ کے بولا۔ "پہچانتا ہے اسے؟" چاند میاں جھجکتا ہوا آگے آیا اور
مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ میرا حلیہ بدل چکا تھا اس لیے اُسے پہچاننے میں تامل ہوا۔
"حلیہ کیا خوب بدل رکھا ہے۔" صوبیدار نے اُس کی گردن پکڑ کے کہا۔ "یہی تھا وہ؟"
"ہاں استاد یہی تھا۔ پہلے تو نسرین کے ہاں گھر کے کام کاج کا ملازم
تھا مگر وہ یہی تھا۔ تو یہ کسی چال سے وہاں نوکر بنا ہوا رہا تھا۔"
"ہاں۔" میں نے آگے بڑھ کے کہا۔ "حرام کی اولاد! وہ میں ہی تھا اور
ابھی تو نے صرف مجھے لڑکی لے جاتے دیکھا ہے۔ جب میں تجھے لے جاؤں گا
اُس وقت دیکھنا۔ ابھی میرا قرض ادا نہیں ہوا۔ میں تیری تلاش میں تھا۔ تجھ سے
بعد میں نمٹوں گا۔" تجمل نے میرا کاندھا دبایا۔ میری درشتی پر سب کی آنکھیں
چمکنے لگی تھیں۔ دور کھڑی ہوئی زہرہ کانپنے لگی تھی۔
"اپنے آدمی کی زبان بند کرو تجمل؟" صوبیدار غضب ناک ہو کے بولا۔
"اس سے پوچھو کہ کیا یہ لڑکی اس کے باپ کی تھی؟" میں نے اشتعال
میں کہا۔ "یہ کہاں کا صوبیدار بن کے آ گیا۔ اس سے کہو خاموشی سے چلا جائے۔"
"چلا جائے گا، چلا جائے گا لاڈلے! تو خاموش رہ۔ میں صوبیدار اور اس
کے باقی حواریوں کو دیکھ لوں گا۔ تو نے میری موجودگی میں بولنا شروع کر دیا!"
تجمل نے مجھے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "چل اُدھر بیٹھ۔ گانا شروع کر دو بھئی زہرہ!
کیوں بند کر دیا؟ ارے مولا جو کچہری لگی ہے؟ گانا شروع کرو۔"
"گانا بعد میں شروع کرنا تجمل! گانے کے لیے رات پڑی ہے۔ ہماری
بات کا جواب دو۔ لڑکی واپس کرتے ہو کہ نہیں؟"
"صوبیدار تم جانتے ہو کہ تجمل کو اس انداز میں بات کرنا پسند نہیں ہے
اور جب تجمل کا لاڈلا درمیان میں ہو تو تمہیں سوچ سمجھ کے بولنا چاہیے۔ یہ سب
جشن لاڈلے کی خاطر منایا جا رہا ہے اور اسے کم نہ سمجھنا۔ سات سال تک اسے
میرے آدمیوں نے ہر قسم کے داؤ پیچ سکھائے ہیں۔ اسے نیلامت سمجھنا۔ کوئی اور آدمی
ہوتا تو میں تمہاری بات پر ضرور غور کرتا مگر یہ تو لاڈلے کی بات ہے۔ میرا لاڈلا
کسی کنجری کو بھگا کے نہیں لایا۔ وہ ایک بڑے خاندان کی ایک شریف لڑکی ہے
لاڈلا اُسے بچا کے لایا ہے۔ مجھے صوبیدار! تم اس دیکھے چاند میاں کی بات
میں آ کر آپس میں بیکار کی تناتنی پیدا کر رہے ہو۔" تجمل نے کبھی نرم کبھی گرم
لہجے میں کہا۔ "اس سے پوچھو کیا وہ لڑکی اس کی بہن تھی یا وہ اس کی ماں تھی؟"
"تو تمہارا جواب نہیں ہے؟" صوبیدار نے سرد آواز میں کہا۔
"جواب صاف ہے۔ کیا تمہیں لکھ کر دیا جائے؟"
صوبیدار نے زمین پر پیر پٹخا۔ "ٹھیک ہے تجمل! اب ہمارا بھی جواب
سن لو۔ ہم سے اب کوئی امید مت رکھنا۔ میں تمہیں کل شام تک کا وقت
اور دیتا ہوں۔ سوچ سمجھ لینا۔ لڑکی شام تک نہ آئی تو پھر تمہارے علاقے کی کسی
لڑکی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ہم آزاد ہوں گے۔"
"جاؤ۔ جاؤ۔ تم تجمل سے بات کر رہے ہو قسم ہے لاڈلے کی علاقے
کی ہر لڑکی میری بیٹی ہے تم نے اگر ایسی کوئی نادانی کی تو کلکتے میں تو بلت

آ جائے گی۔ بس صوبیدار! تم نے بہت کہہ لیا اور ہم نے بہت سن لیا۔ گانا
شروع کرو زہرہ! صوبیدار! تمہاری دوستی کا خیال ہے ورنہ میرے علاقے میں
مجھ سے اس طرح کی باتیں کرنے والا واپس نہیں جاتا۔"
تجمل کی آواز فضا میں گرجی تو طبلے والے نے سہم کے بقیہ تھپ
کی اور ہارمونیم والے نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ زہرہ کے گھنگرو
حرکت میں آ گئے۔ صوبیدار چند لمحے کھڑا پھر سارے مجمع کو نفرت سے گھورتا ہوا
واپس جانے لگا۔ جاتے جاتے وہ دوبارہ ٹھہرا اور بلند آواز میں بولا۔ "کل شام تک
تجمل! ہم کل شام تک انتظار کریں گے۔"
کانٹے، تھوڑی، پیلا اور سارے وغیرہ ہاتھوں میں کھلے چاقو لیے تجمل
کے ارد گرد کھڑے تھے۔ اُن کے جسم اکڑے ہوئے تھے۔ کانٹے نے ہاتھ اٹھایا تو
تجمل نے اس کا بازو پکڑ کے مروڑ دیا۔ کانٹے کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا
اور وہ زمین پر تین چار لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک طرف کھسکنے لگا۔ "واپس جاتے
ہوئے آدمی پر ہاتھ اٹھاتا ہے بے غیرت!" تجمل نے نفرت سے کہا اور
خاموشی سے اپنی نشست پر آ کے بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔
محفل میں بہت کشیدگی پائی جاتی تھی۔ تجمل کو اس کا احساس شاید سب سے زیادہ
تھا۔ اس نے چٹکلے سنانے شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ محفل پہ
پھر بہار آ گئی۔ جیسے ابھی یہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ طوائفوں نے بھی
چٹکلے، ناچ اور گانوں سے کشیدگی دور کرنے کا کام کیا۔ پھر ہر طرف سے ٹھپے
کی آوازیں بجنے لگیں۔ یہ دھومیں آدھی رات تک مچتی رہیں۔ طوائفیں ناچتے
ناچتے تھک گئیں۔ نصیب میاں میرے پاس ہی بیٹھا تبصرے کر رہا تھا۔
خاص طور پر زہرہ کا پیار بار بار چھڑک رہا تھا۔ "لے میاں لاڈلے! دیکھتے ہو
ایک لمحے ٹھک کرنے کو جی چاہتا ہے آہا ہا۔ کیا ستار لگایا ہے ...بنا تو دیکھو
قنبیلا اٹھا رہا ہے شراب کا پیالہ ہے رنگ آ رہا دیکھو ہاتھ لگا تو میلا ہو
جائے۔ اے جانی! دیکھتے ہو وہ تمہاری طرف آ رہی ہے۔ ذرا اپنے آپ کو
سنبھال کے رکھنا۔ یہ آنکھیں جلا کے راکھ کر دیتی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہو سارا جسم
جھلسا ہوا ہے۔" نصیب میاں کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ میدان میں کود کے
زہرہ کے ساتھ ناچنے لگے۔
باقی رات کو روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔ سازندوں نے ساز غلاف
میں لپیٹے اور طوائفوں نے پیروں سے گھنگرو کھولے۔ پھر تجمل کو آداب کرتی
ہوئی اپنے اپنے ٹھکانے چلی گئیں۔ کسی نے اب تک صوبیدار
کے متعلق تجمل سے بات کرنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ سب لوگ دوبارہ رنگ
رلیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ صرف میں ایک ایسا شخص تھا جو یہاں نہیں بیٹھا
تھا۔ میں تو چاند میاں کا تعاقب کر رہا تھا۔ بار بار میرا ہاتھ اس کے گریبان تک
جاتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے زہرہ کا روپ نہیں تھا، میری تپتی نگاہوں میں خون
کھول رہا تھا۔ وہ کوئی اور شخص تھا جو نصیب میاں کے تبصرے سن رہا تھا
اور زہرہ کا ناچ دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھا آدمی نہیں تھا، آدھا آدمی تھا۔

اڈے پہ واپس آ کے تجمل اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ میں حسب معمول
کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ "کیا تو آج جا کے سوئے گا؟" تجمل نے
معنی خیز انداز میں پوچھا۔
"تم کیا سمجھتے ہو؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔
"تو کالے کو منہ لگائے بیٹھا ہے پہلے سے۔ اب آرام کر دن بھر
تھک گیا ہو گا۔" وہ انگڑائی لے کے بولا۔
"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔
"کیا صوبیدار کا خیال آ گیا ہے؟" تجمل بے پروائی سے بولا۔
"میں نے یہاں آ کے برا کیا۔" میں نے مایوسیت سے کہا۔ "میں اگر اُسے
لے کے کہیں اور نکل جاتا تو یہ نوبت نہ پہنچتی۔"
وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "ادھر آ لاڈلے! تو کیا کہنا چاہتا ہے اور کس قسم کی
سے کہتا ہے۔ تیرے واپس آنے تک تو ادھر آ ماں میں نے تیرا برسوں
انتظار کیا ہے۔ اب تو آیا ہے تو ایسی باتیں کرنے لگا۔ اُترا دل دکھا دیا ہے۔
تیرے لیے تو میں نے نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ تو سب کچھ خاک میں ملائے
دے رہا ہے۔"
"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ تم غلط سمجھے۔" میں نے بات کے کہا۔ "میرا
مطلب ہے کہ ایک لڑکی کسی بہت بڑے ہنگامے کا سبب بن سکتی ہے اور یہ
سب میری وجہ سے ہو گا۔"
"ہو گا تو کیا ہو گا۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "لے کیا دنیا کو ہم نے ان کی سلامتی
کا ٹھیکہ لیا ہے؟ یہ کتے کی دم ہے۔ تو نے تو میرا جی خوش کیا ہے لاڈلے!
اگر تیری پروا میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ تیری یہی بات بری لگتی ہے۔
بس چپ رہ اور زیادہ بات نہ کر۔"
"تم نہیں سمجھتے۔ وہ لڑکی مجھے راستے میں مل گئی تھی۔"
"ہر شخص کسی نہ کسی کو کسی نہ کسی راستے ہی میں ملتا ہے۔ یہ راستے اسی
لیے بنائے گئے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے سے ملا کریں۔ وہ لڑکی کہیں بھی ملی ہو
اب تو ہماری عزت ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر..." میں کہتے کہتے رک گیا۔
"وہ تو ٹھیک ہے مگر؟" وہ چڑ کے بولا۔ "لاڈلے میاں! تو جو بات کہنا
چاہتا ہے وہ مجھے معلوم ہے۔ یہ جو تو گھٹا گھٹا سا لگتا ہے۔ اپنے آپ میں گم ہے
صرف اس وجہ سے ہے کہ تو دل کھول کے بات نہیں کرتا۔ میں نے یہ بات
جیل ہی میں محسوس کر لی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی وہی تھی یا وہ جس کے لیے
تو نے اُس اُچکے کریم کو مارا تھا؟ جسے یاد کرتا رہتا تھا؟"
"نہیں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "یہ لڑکی وہ نہیں ہے۔ تم نے غلط سمجھ رکھا
ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ لڑکی تو مجھے راستے میں مل گئی۔"
تجمل چونک کے مجھے گھورنے لگا۔ "اپنے تو بات صاف صاف کر۔"
میں نے سوچا تجمل کو ساری بات بتا دوں کہ وہ لڑکی کون تھی لیکن

یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے اپنی زبان کی لگام تھامی اور کہا: "میں اُسے تلاش کر رہا ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟ مجھے بتا۔ وہ ہندوستان ایران توران کے کسی کونے میں ہو، میں تیرے لیے اُسے لا دوں گا۔"

"یہی تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"کوئی اتا پتا؟ کوئی نشانی؟" اس نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ "کیا وہ بہت خوب صورت تھی؟ تیری پسند ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔"

"وہ بہت خوب صورت تھی۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تُو نے اُسے کب سے نہیں دیکھا؟"

"جب سے میں جیل گیا ہوں، سات سال سے زیادہ ہوگئے۔" میری آواز بھیگ گئی۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا۔

"اے لاڈلے! اے لاڈلے! ابے تو تو بہت خطرے والا ہے۔ باتیں کرتا ہے جا مرد بچے کے، روتا ہے ایسے جیسے بیاں نہ جانے کیا کیا کرے گا۔ جیسے آنکھوں کو بات سے دی جب ہی آنکھوں نے کمزوری دکھائی، کسی دوسری طرف دیکھنے لگے۔ آنکھوں کو دھوکا دے دیا میری جان۔ مجھے بتا وہ کون تھی؟ کہاں تھی اور کیسے تجھ سے دور ہو گئی؟ مجھے تُو نے بتایا، پھکر کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ تیرے ساتھ ایک بہت خوب صورت لڑکی تھی جس پہ اس نے بُری نظر ڈالی تھی۔ جیل میں آنے کا واقعہ تُو نے دو سطر سنایا۔ میرا خیال ہے تُو مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ بتا اسی لڑکی کا چکر تھا نا؟ کسی کا نام بھی جانتا ہے اُسے کون لے گیا۔"

"نہیں نہیں! کچھ نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" اگر چاند میاں موجیدار کے ساتھ یہاں نہ آتا تو شاید میں جھمل کو چاند میاں کا نام بتا دیتا یا شاید پھر بھی نہ بتاتا۔

جھمل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "لاڈلے! مگر ایک بات تو بتا تو چاند میاں کو دیکھ کے اتنا کیوں بھڑک گیا تھا؟ سبھی کو اس پہ حیرت ہوئی تھی۔ اس پہ تیرا کون سا قرضہ ہے جو تجھے ادا کرنا ہے؟ اشارہ تو کر، اُسے ابھی اُٹھوا لوں۔"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ "وہ تو — وہ تو زریں کا معاملہ تھا۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "زریں کے ساتھ اس نے زیادتی کی تھی۔"

"نہیں کچھ اور بات بھی ہے۔ تو چھپا رہا ہے۔"

"میں کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ میری تلخی دیکھ کے جھمل چپ ہو گیا۔ اگر میں اس سے یہ کہہ دیتا کہ چاند میاں ہی وہ شخص ہے جس نے نسرین سے کرن کا سودا کرنا چاہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اسی نے ہمارے پیچھے بدمعاش لگائے تھے تو جھمل اپنے قول کے مطابق صرف چند ساعتوں میں چاند میاں کو یہاں میرے قدموں میں ڈال سکتا تھا، چاہے بعد میں اُسے موجیدار کے آدمیوں سے کتنا ہی بڑا فساد مول لینا پڑتا مگر مجھے یہ بتاتے

مجھے کچھ کمزوری محسوس ہوتی تھی۔ جرم کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے میں نے کرن کو رسوا کر دیا ہے۔ میں ایک کمزور آدمی ثابت ہوا۔ کرن کا بوجھ نہیں اُٹھا سکا۔ جیسے میں ہار گیا اور میری آگ بجھنے لگی اور مجھ سے کچھ نہ بن سکا تو میں نے اپنی مدد کے لیے لوگوں کو بلا لیا۔ ابھی کچھ پتہ نہیں کرن کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ اگر اس کا نام طشت از بام ہو جائے گا تو وہ کیا کہے گی۔ مجھے ایک عجیب کا پن محسوس ہوتا تھا اور اگر خدا نہ کرے کرن کا حال کچھ انھیں معلوم ہوا تو ایک آپ جیسے۔ پھر اس رات انھوں نے مولوی صاحب کو ختم کر دیا تھا۔ اس الجھے ہوئے معاملے میں جھمل اور اس کا گروہ پڑ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ میں تو صرف دیکھتا رہ جاؤں گا اور لوگ تماشا دیکھیں گے۔ میں نے جھمل کو کچھ نہیں بتایا لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اس سے کچھ چھپا رہا ہوں۔

"تم میرے جلوے!" جھمل فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "اب یہ بات کھل کے سامنے آگئی ہے کہ تو جھمل کے جنگل کا جانور ہے۔ اب تو اپنے آپ کوئی قدم اُٹھانے کی نادانی مت کر، نا موجیدار کے لوگ پتلا نہیں سکتے۔ کرن کی جیسی بات کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لینا۔ اپنے پاس بھی لوگوں کی کمی نہیں ہے۔"

"اور زریں کے متعلق تم نے کیا سوچا ہے؟" میں نے اُس کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا۔ "فرض کرو موجیدار کے آدمی پاگل پا کرنے لگیں؟"

"ہم وقت پہ سوچتے ہیں جانو! پہلے سوچتے تو یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔ تمہارا بھی اوجھل میں ہوتا۔ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔" وہ جماہی لیتے ہوئے بولا۔ "اب سو جا۔ تو تو آتے ہی پریشان ہونے لگا۔ ابھی کچھ دن آرام کر لے۔ تیرے پیر جیل کے گھٹے، میں نے دیکھ لیے، یہ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا ہو رہا ہے۔" وہ چادر تان کے لیٹ گیا۔ میں کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کے برابر کے کمرے میں آگیا۔ جھمل نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ جا، جی بھر کے سونا، اور کہنا اتنا آسان ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ جاگا جیسے تیسے زہر مار کر لیا تھا۔ جیل سے آنے کے بعد بھوک اور نیند تو جیسے ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی مالا کے دانے پھیرنے شروع کر دیے اور آدھی رات اُسے اپنے چہرے پہ رکھ کے کھیلتا رہا۔ صبح سویرے پرندوں کی آواز سے کسمساتا ہوا اُٹھا۔ جھمل سو رہا تھا۔ میری ایک ذرا سی آہٹ پہ وہ بیدار ہو گیا۔

"کون ہے؟" اُس نے ہڑبڑا کے پوچھا۔

"میں ہوں اور کون؟" میں نے مختصر جواب دیا۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ "نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"صبح ہو گئی ہے۔" میں نے تندی سے کہا۔

"ابے یہ کیسی جوانی ہے۔ جا سو جا۔" وہ کروٹ لے کے بولا۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا اُس چاقو کے نزدیک پہنچا جو جھمل کا رکھا ہوا تھا۔ جب جھمل کی گہری سانسیں تواتر کے ساتھ شروع ہو گئیں تو یقین ہو گیا کہ وہ سو گیا ہے۔ میں جھمل کے پلنگ کے پاس اُس کے سرہانے کے ارادے

ہو گیا پھر میں نے دھیرے دھیرے پلنگ کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کیا۔ میں تنا ہوا تھا کہ جھمل کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا تو میں ایک لمحے میں چار ہاتھ چھلانگ کے اس سے دور جا پہنچتا۔ اب میرا ہاتھ چاقو پھیرنے لگا تھا اور میں نے اپنی سانس روکی ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے چاقو اُٹھایا، جھمل نے کروٹ بدلی۔ میرا دل اچھل کے حلق میں آگیا لیکن میں ایک جست میں اس کے پلنگ سے چند قدم کے فاصلے پر آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں اور خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا۔ نیم تاریک کمرے میں اس کی سُرخ سُرخ آنکھیں دو چراغوں کے مانند جل رہی تھیں۔

"تیری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے کیا؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"نہیں میں ذرا سویرے اُٹھنے کا عادی ہوں۔"

"ہاں جیسے میں تو تیری عادتیں جانتا نہیں۔ ایک ایک بات کی خبر رکھتا تھا جب تیرے ساتھ جیل میں تھا تو لوگوں سے پوچھا کرتا تھا۔"

"میں باہر جا رہا ہوں کچھ دیر ٹہل کے آ جاؤں گا۔"

"اکیلے مت جانا۔ تھوڑی دیر میں کوئی جاگ جائے گا۔"

"تم مجھے بالکل بچہ سمجھتے ہو۔"

"تو میرے لیے ابھی تک بچہ ہے۔ مجھے یاد ہے جب تیری مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اور تو ڈرا ڈرا سہما سہما سلاخوں کے اندر بیٹھا تھا۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں یاد ہے مگر میں ڈرا ہوا تو نہیں تھا۔"

"ہاں! تو شیر کا بچہ ہے۔ تو نے کالے خان کو پچھاڑ کر جنگل کو جیت کیا، سلاخوں کو بے بس کیا اور رات بھی تیری زور دم زور دار دیکھ لی۔" وہ نیند سے اُٹھ سکتا جوں باتیں کر رہا تھا۔ اگر سویا ہی نہ ہو۔ میں نے اپنی پشت پہ چاقو چھپایا ہوا تھا۔ جھمل پھر اُونگھنے لگا تو میں موقع دیکھ کے چپکے سے باہر نکل آیا۔ دروازہ بند تھا۔ نصیب میاں برآمدے میں سو رہا تھا اور دوسرے لوگ ادھر اُدھر رنگ برنگ ٹہلے پڑے تھے۔ میں نے کنڈی کا جائزہ لیا تو اندازہ ہو گیا کہ اُسے کھولنا آسان نہیں ہے۔ سب جاگ جائیں گے اور شور سن کے جھمل بھی اُٹھ کے آ جائے گا۔ باہر دروازے پہ چوکی دار بھی ہوگا۔ جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں دوبارہ جھمل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ جاگ گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرا کے مجھے دیکھنے لگا اور اُٹھ کے باتھ روم کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کا چاقو تکیے کے نیچے رکھ دیا اور دوسرے کمرے میں آ کے بستر پہ لیٹ گیا۔ جب باہر آوازیں آنے لگیں تو میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ جھمل برآمدے میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا اور ایک لڑکا اس کے جسم کی مالش کر رہا تھا۔ نصیب میاں اُس کے لیے کھانے کو یہاں گھیرے ہوئے بیٹھا تھا۔ نہانے کی تیاریاں اُس کے ہٹنے کی تھیں۔ مجھے دیکھ کے نصیب میاں نے آواز لگائی۔ "لے لاڈلے جلدی کر، ہاتھ منہ دھو، ناشتہ تیار ہو گیا ہے۔"

ناشتے کے بعد جھمل نہانے چلا گیا اور میں نے نصیب میاں کو بہلا کے کسی طرح ایک چاقو حاصل کر لیا۔ نصیب میاں نے مجھے پانچ روپے دیے ... کی بکری کر کے پیچھے جانے والے راستے سے

نکل کے بھاگا۔ یہ مکان دو طرف کھلتا تھا۔ کچھ اور دروازے بھی تھے جو میرے علم میں نہیں آئے تھے۔ جس دروازے سے میں باہر نکلا وہاں ایک تنگ گلی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ گلی سے دوسری گلیوں میں جانے کے لیے مختصر راستے بھی بنے ہوئے تھے۔ وہاں سے کچھ فاصلے تک میں آہستہ آہستہ چلا۔ رات کے تماش بینوں کی تھکی ہاری آنکھوں نے جگہ جگہ مجھے سلام کیا لیکن اگلے چند قدموں میں ہی میں دوسری پھر تیسری اور پھر بڑی سڑک پہ تھا۔ میں نے سوچا پہلے جا کے نسرین کا حال کیوں نہ پوچھوں لیکن ٹیکسی میں بیٹھتے ہی میں نے کیلا بگان کا - ٹیکسی والے نے اداری سے دیا اور تیز دھار والا لمبا چاقو مجھے چبھ رہا تھا۔ میں نے اسے پتلون میں اُڑس لیا تھا۔ جھمل کے گھر سے کیلا بگان کا فاصلہ خاصا تھا۔ ٹیکسی پُرانے راستوں سے گزرتی ہوئی آخر کیلا بگان کے علاقے میں پہنچ گئی۔ چاند میاں جیسے لوگوں کا پتہ چلانے خانزی پان فروشوں یا حجام کی دکانوں سے آسانی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ تین چار دکانوں پر گفتگو کے بعد مجھے اُس کے مکان تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ متوسط درجے کے لوگوں کا علاقہ تھا۔ کوئی عمارت بڑی تھی کوئی چھوٹی۔ ایک ایک منزل کی عمارتیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ چاند میاں کا گھر نسبتاً پُرسکون جگہ واقع تھا۔ اچھا خاصا صاف ستھرا علاقہ تھا۔ گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔ یہ اگرچہ خاک نشیں اور بے نیاز عمارت تھی، مجھے احساس تھا کہ چاند میاں اپنے پیشے کے لحاظ سے عام مکانوں سے مختلف مکان میں رہتا ہوگا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ گیٹ کے ساتھ چار دیواری بھی کھنچی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے عمارت کے گرد ایک چکر لگایا۔ پیچھے گلی میں بھی ایک راستہ تھا۔ میری دستک پہ صبح سویرے گھر کی ایک عورت نے دروازہ کھولا اور منہ بنا کے پوچھا: "کس کو مانگتا ہے؟"

"چاند میاں کو۔" میں نے تحمل سے جواب دیا۔

"چاند میاں کو؟" اُس نے پھر مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور بولی: "وہ تو آج کل فاران بیٹھا ہے۔ اُس کے پاس کیا رکھا ہے؟"

"مجھے اُس سے ملنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"کیا آپ باہر سے آیا؟" میرا لباس دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی: "بیٹھے کر رکھا کو ہے۔"

میں نے تنگ آ کے جواب دیا: "کلکتے سے۔"

"کب آیا؟" وہ پُرشوق لہجے میں بولی۔

"کل رات آیا۔" میں نے تلملا کے کہا۔

اُس نے آنکھ ماری۔ "اندر آؤ۔" میں نے اُس سے صرف چاند میاں کی موجودگی کے بارے میں پوچھا۔ وہ مجھے اندر لے گئی اور ایک آراستہ کمرے میں بٹھا کے چند لمحوں بعد ایک گداز بدن کی ادھیڑ عمر عورت کو ساتھ لائی جو اپنی تیز تیز نظریں ٹکاتی ہوئی آہستہ قدموں سے آگے بڑھی اور معنی خیز انداز میں بولی:

"چاند میاں بھی اپنا عزیز ہے، ہم بھی تمہاری خاطر تواضع میں کمی نہیں کریں گے۔ جو کام تم کو چاند میاں سے لینا ہے وہ ہم سے کہہ کے دیکھو۔"

نے بڑے جاذب کے عشری میں تجمل کو پیش کیے۔ ایک بیڑا اُس نے بھی کھایا
چر عشری میں عطر کھل گیا۔ ہر چلنے والے نے اصرار کیا کہ تجمل اُس کی دکان پر ایک پان کھائے۔ کچھ لوگ تختوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اُٹھ کے تجمل کے گرد جمع ہو گئے۔

گل فروشوں نے ہر سمت کے ہاتھوں میں ہار دے دیے اور ایک ایک پڑا ہمارے حوالے کر دیا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ تجمل اُس کی دکان پر ایک لمحے کے لیے ہی رکے مگر وہ تجمل ایک خفیف تبسم سے اُن کے سلام کا جواب دیتا اور اُن کی صداؤں پر سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ جب ہم گلی کے نکڑ سے گزرتے ہوئے دوسری گلی میں داخل ہوئے تو بے داغ سفید کرتے اور دوپلی ٹوپی والے ایک ٹھگنے سے بڈھے نے ہمارا راستہ روک لیا۔ تین فرشی سلام کیے اور کہنے لگا۔ "ایسے نہیں جانے دوں گا۔ راستہ ہم نے بند کر دیا ہے۔ ہماری لاش سے گزر کے آگے جایئے گا۔"

تجمل نے اُسے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "ارے گھل کے میاں! چھنن میاں! یہاں سلام کیے بغیر کون آگے جانے کی ہمت کر سکتا ہے۔ ہم تو تمھی کو دیکھنے کے لیے اِدھر آئے تھے۔ تمھارے ہاتھ کا پان کھائے ہوئے دن ہو گئے۔"

چھنن میاں کی دعا چک گیا۔ "ابھی پیش کرتا ہوں۔ حضور کرم فرمایئے۔ قدم رنجہ تو فرمایا۔ گلی ویران ویران ہو گئی تھی۔ اتنے دنوں عاشقوں کو کیوں ترسایا اور وہ بڑے نواب صاحب کہاں ہیں؟ نواب نصیب میاں؟"

"نصیب میاں کو آج ہم نے سزا دے دی۔"

"کیسی سزا؟" وہ پریشان ہو گیا۔ "اللہ خادم کو یقین نہیں آتا۔"

"چھنن صاحب ہمیں آگے بھی جانا ہے۔" تجمل نے مسکرا کے کہا۔

"یہ لیجیے دوا ابھی جاتا ہے۔" چھنن نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا۔ لڑکا سنہرا تھال دونوں ہاتھوں سے پکڑے ادب سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ چھنن نے خاص پان اُس کے ہاتھ سے لے کے دھکا دیا، لڑکے نے طشتری آگے کر دی۔ چھنن کو شاید پہلے ہی ہماری آمد کی خبر ہو گئی تھی، اس لیے خاص قسم کے بیڑے بنائے تھے۔ چھنن نے سب کو اپنے ہاتھ سے بیڑے کھلائے۔ موتی نے اُس کی انگلی کاٹ لی۔ چھنن کھل کھلانے لگا۔ "واللہ کیا مذاق پایا ہے۔" اُس نے خوش دلی سے کہا۔ پان کھلانے کے بعد اُس نے عطر کی شیشی کھولی اور ہمارے لباسوں پر خوشبو مل دی۔ پھر ایک ایک پھیلی شیشی میں ڈال کے ہمارے کانوں میں اٹکا دی اور کہنے لگا۔ "اب اگر اتنے دنوں میں آیئے گا تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ وعدہ کیجیے کہ جلد آئیں گے؟"

"آئیں گے جلدی آئیں گے چھنن صاحب۔" تجمل نے آگے بڑھنا چاہا۔ چھنن نے دوڑ کر جھک کے اُس کا کرتا کھینچ لیا۔

"بس ایک منٹ اور۔ جلالا ڈسٹے میاں پہلی بار اِدھر آئے ہیں اور صرف گلوری سے شوق کر کے آگے بڑھ جائیں؟" اُس نے مجھے سلام کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ اُسے میرا نام کس طرح معلوم ہوا اور نام معلوم تھا تو اُس نے مجھے پہچان کیسے لیا! میں تو پہلی بار یہاں آیا تھا اور تجمل کے ساتھ آنے سے مجھے ابھی ایک ہی دن ہوا تھا۔ چھنن نے عطر کی ایک شیشی مجھے پیش کی۔ تجمل نے مجھے اُس کا شکریہ ادا کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ مجھے کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ راستے میں جانے کتنے لوگوں نے تجمل سے اصرار کیا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ چلے۔ اُن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ تجمل نے سب کے اصرار مسترد کر دیے۔ میری نظریں کسی ایک جگہ نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ جھروکوں پر، چوکیوں پر، بالکونیوں پر لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ انھوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے جیسے آج گلی میں کوئی بہت بڑی شادی ہو رہی ہو۔ کچھ آگے جا کے موتی نے تجمل کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور منہ بگاڑ کے بولا۔ "کیا یہاں صرف بیڑے کھانے اور ہار پہننے آیا ہے؟ اب چل کے کہیں بیٹھ۔ وقت گزرا جا رہا ہے۔"

"ذرا دیر ٹھہر۔" تجمل نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"کیا بات ہے تجمل؟ تیرا دل آج کچھ خراب معلوم ہوتا ہے؟" موتی حیرت سے بولا۔ "تو تو آج کچھ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ اچھا کر موتی تو چل کے کہیں بیٹھ۔ میں تھوڑی دیر میں اُدھر آتا ہوں۔" تجمل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"کس دن کا بدلہ لے رہا ہے یار؟" موتی نے ہونٹ سکیڑ لیے۔

"کیا بکواس کرتا ہے موتی! اکیلا جو بیٹا ہے ابھی تو۔ چل آج میں ہٹ جا آگے بڑھ۔" تجمل نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"تف ہے موتی پر جو تیرے بغیر جائے۔" موتی گرج کے بولا۔ "تجھے معلوم ہے تجمل! میں یہاں کے راستوں سے خوب واقف ہوں۔ یہاں کی ہر ایک ملاں مجھ کو جانتی ہے۔ تیری سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"میں جانتا ہوں کہ پہلے بھی نہیں جاتا تھا۔" تجمل نے اُس کے بال پکڑ لیے۔ "ذرا ذرا سی بات پر جل جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تو مستقل ہی اُلٹا چلتا ہے یا گھاس کھا گیا ہے۔ لگتا ہے ابھی تیرے دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ سیدھی بات سمجھتا نہیں ایک دم بکنے لگتا ہے۔"

"ہاں ہاں میرے تو دودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔ تیری ہی بات کر رہا ہے لگتا ہے تیرے تو دانت ہی نہیں ہیں۔ تو تو بوڑھا ہو گیا ہے۔ تو اپنا دل بدل لے ہم سے صاف صاف بات کیا کر۔ ہیر پھیر نہ کر۔"

"اس استاد! اتنا ہے کہ کریمن بیگا آباد سے بڑا مال دولت لے کے واپس آئی ہے اور اپنے ساتھ ایک پری بھی لائی ہے۔ ہر جگہ اُس کی دھوم ہے۔" موتی نے خوشامد کی۔ "دیکھ لے گا تو تڑپ جائے گا۔ جب سے آئی ہے سیٹھوں اور ساہوکاروں نے اُدھر ہی ڈیرا ڈال دیا ہے۔"

تجمل بادل ناخواستہ ایک تنگ سی گلی میں مڑنے کے لیے تیار ہوا۔ بڑا دل اچاٹ تھا۔ ایک خیال سے ڈرنے لگا۔ چلتے چلتے مجھے جھرجھری آ گئی اور میرے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ تجمل اپنے خیال میں گم ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ میرا ہاتھ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ میرے ٹھہرنے کی وجہ سے اُس کے ہاتھ کو دو کا جھٹکا لگا۔ اُس نے پلٹ کے میری جانب دیکھا۔ میں گم کھڑا تھا۔ "آ لاڈلے آ۔" اُس نے مجھے کھینچ لیا۔

"دل کیوں گھبرا گیا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے بات ٹال کے کہا۔

"کیا کچھ تکلیف ہو رہی ہے؟ زخم کیسا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔" میں نے ہنسی دکھانے کی کوشش کی۔

"اس محلے میں سر جھکا کے نہیں چلتے۔ ذرا گردن تو ٹھیک طرح جسم پر ٹکاؤ۔ لوگ کیا کہیں گے تجمل کا لاڈلا خوش نہیں ہے۔"

"میں بہت خوش ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"اور آگے تیرے دل کی کلیاں کھل جائیں گی۔" کلنتے نے شیلی آواز میں کہا۔
"استاد لاڈلے کے سامنے تو ہم سب کی ایسی کی تیسی ہو جائے گی۔"

"جانی!" موتی نے مجھے تجمل کے ہاتھ سے چھین لیا۔ "تو ابھی مجھ سے پوری طرح ملا بھی نہیں۔" وہ مجھے سڑک ہی پر چپکانے لگے بولا۔ "تیرے علاقے میں سنسار رہتا تھا۔ تجمل نے عمر میں ایک ہی کام کیا ہے اور وہ تیرا لانا ہے۔ میں تجھے اپنے ساتھ مستقل لے جاؤں گا۔" وہ اشتیاق سے کہتا رہا۔ "اور پھر تجمل کو ٹھینگا دکھا دوں گا۔ کچھ لوگ میرے پاس ایسے ہیں کہ تجمل کو بھی نہیں معلوم۔ ایمان سے شہر تو وہ چھوڑا ہے پھر کھلے لوگ رہتے ہیں۔"

تجمل نے کچھ نہیں کہا۔ کلنتے اور گھوشی موتی کی باتوں پر بری طرح ہنسنے لگے۔ ہم ایک سرائے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ جھریوں سے روشنی چھن رہی تھی۔ دروازوں سے رنگین ٹپک رہی تھی۔ ایک سازی کی آواز روشنی کے ساتھ پھوٹ رہی تھی۔ گھوشی نے آگے بڑھ کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک ادھیڑ عورت کا چہرہ برآمد ہوا۔ گھوشی نے کہا۔ "دروازہ کھولو۔"

ہم سب اندھیرے میں کھڑے تھے۔ عورت نے گھوشی سے پکار کر کہا۔
"اندر کچھ معزز مہمان بیٹھے ہیں۔ ذرا کچھ دیر بعد زحمت کرنا۔"

گھوشی نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ عورت احتجاج کرتی رہی۔ "آؤ استاد۔" اندر سے گھوشی کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا تو روشنی ہمارے چہروں پر پڑی۔ عورت چند لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر وارفتگی کے جوش سے لپٹ گئی اور اُس نے تجمل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب تم اس طرح آیا کرو گے؟ زہے نصیب جب سے آئی ہوں خبر بھی نہیں لی کہ کریمن کو کیا ہوا۔ پردیس میں کٹ گئی یا برباد ہو گئی۔ کہلایا بھی کہ آ کے شکل دکھا جاؤ۔ غلام کے بچوں نے پرانا مکان کرایہ پر نہیں دیا۔ اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں روز ہی بھول کے بستر بچھ گئے ابھی تک نہیں دی۔"

"یہیں کھڑے کھڑے باتیں کرتی رہو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی۔ ساتھ میں جانے دے۔" تجمل نے ناراضی سے کہا۔ "حیدرآباد میں رہ کے کریمن تم نے کھٹائی بہت کھائی ہوگی اخلاق بھی کھٹا ہو گیا۔"

"وہی بالکل وہی۔ تم نہیں بدلے۔" کریمن نے شگفتگی سے کہا۔

"اور تم بھی نہیں بدلیں۔ وہی لٹک وہی تڑپ ہے۔"

"جاؤ بھی اجڑا ہوا دیار ہوں۔" وہ تجمل کا ہاتھ تھامے ہوئے اندر لے گئی۔ کمرے میں چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ تجمل کا چہرہ جیسے ہی نمودار ہوا نقش ٹھہر گیا۔ پہلے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے [illegible] نے بڑھ کے [illegible] کریمن کو دیکھا جیسے انھیں ہماری آمد نہایت ناگوار گزری ہو۔ کریمن نے اُن کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ ایک کونے میں لگے ہوئے گاؤ تکیے پر تجمل کے ساتھ بیٹھ گئی اور تعارف کرانے لگی۔ کریمن نے تجمل کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ [illegible] کے مشہور سیٹھ کشن داس ہیں اور ان کے مزاج سے آپ واقف ہوں گے۔ ان سیٹھ صاحب کا حسن اور انداز دیکھنے کی چیز ہے لیکن جو وہ میں نے اپنی ساری زندگی میں کسی اور شخص میں نہیں دیکھی۔" کریمن نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ سیٹھ [illegible] گھٹنوں سے اوپر کی سفید شیروانی پہنے ہوئے تھا۔ لیکن دھوتی [illegible] پیشانی تنگ تھی۔ قد موزوں، عمر چالیس سے اوپر۔ [illegible] اور انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ کریمن نے اُس کے لیے [illegible] کیا کہتے تھے۔ وضع دار آدمی ہیں غریبوں کے [illegible] چہرے پر سیٹھ لکشمی داس جی سے آنکھ ملاتے ہیں [illegible] تعریف سے کہ ہم [illegible] ابھرا البتہ پیشانی پر کچھ شکنیں ابھریں اور آنکھیں چڑھ گئیں۔ [illegible] استاد تجمل۔ ان کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔" کریمن نے سیٹھ کو مخاطب کیا۔

سیٹھ نے جواب دینے کے بجائے سر کو ایک خفیف جنبش سے اُدھر کیا اور کہنے لگا۔ "کریمن بائی معاف کرنا۔ ہمیں بھیڑ میں گانا سننے میں مزہ نہیں آتا۔ جب ہم آئیں تو دروازے پر تالا لگا دیا کریں۔"

"کوٹھے پر بیٹھنے آئے ہو سیٹھ!" کریمن کے جواب دینے سے پہلے تجمل کی کرخت آواز اُبھری۔ "کریمن تم نے ہمارا تعارف نہیں کرایا۔" تجمل کا [illegible] سیٹھ نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول لیں اور سر اُٹھا کے گھورنے لگا۔ اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مہمان مضطرب ہونے لگے۔

"ہاں استاد! سیٹھ کا بڑا کاروبار احمد آباد میں ہے۔ حال ہی میں انھوں نے یہاں جوٹ کا نیا کارخانہ لگایا ہے۔ یہ یہاں بستے ضرور تھے [illegible] کا اجنبی پن ہے۔ تم بھی انھیں نہیں جانتے یہ بھی تمھیں نہیں جانتے۔ [illegible] جان پہچان کا اس سے اچھا موقع اور کب آئے گا۔ سیٹھ صاحب! تجمل میں خبریں کون ہے جو استاد تجمل سے واقف نہ ہو۔ ہر جگہ ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ ان کے ساتھی ہیں ایک تو یہ کلنتے ہے اور [illegible] کئی سال بعد ملنے آئی ہوں۔" اُس نے گھوشی کی طرف اشارہ کیا اور [illegible] "یہ میری سرکار بیٹھے ہیں، یہ کیسے ہیں میں آنکھیں بھول گئی۔ یہ کون ہیں؟"

موتی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ہائے کریمن! خوب یاد آئی۔ میں تو سمجھا تھا سب کی طرح تم نے مجھے بھی بھلا دیا ہو گا۔"

"موتی میاں! یہ تو نظر نظر کی بات ہے۔" وہ مسکرا کے میری طرف متوجہ ہو گئی۔ "ماشاءاللہ چشم بد دور۔ چشم بد دور۔ البتہ انھیں میں نے نہیں پہچانا۔"

"یہ لاڈلا ہے۔" کلنتے نے سرگوشی میں کہا۔ "استاد کا لاڈلا۔"

کریمن کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں جیسے میری صورت دیکھ کے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ "آپ نے سُنا سیٹھ، یہ سب تمام وہ لوگ ہیں جو [illegible]

اُس کی دل جوئی کی کوشش کرتا مگر جمیل کی زندگی ہر لمحے خطروں کی زد پر رہتی تھی ایک جیتا جاگتا آدمی دو دن سے میرے ساتھ تھا اور یہ تو صرف میرا فیصلہ تھا۔ زین کو بھی اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے تھا اس کی اپنی بھی تو ایک شخصیت تھی وہ بھی تو کچھ سوچتی ہوگی۔ کچھ خواب اُس نے بھی تو دیکھ رکھے ہوں گے۔ زین کے خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں نے سوچا ابھی اٹھ کر جاؤں اُس کے فلیٹ کی کنڈی کھٹکھٹاؤں اور کہوں اب تم آزاد ہو جہاں جانا ہو جا سکتی ہو میں تمہارا اتنا خیال نہیں رکھ سکتا کیونکہ مجھے ایک شخص کی تلاش ہے جو دو زمانے دُنیا کے کس کونے میں گم ہو گیا ہے۔

میری آہوں اور کروٹوں کی آہٹیں جمیل کے کانوں میں بھی پہنچ گئیں اُس کے کان اُس کی آنکھیں میری ہی جانب لگی ہوئی تھیں وہ کھانستا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ تقی میاں! تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس آکے رک گیا۔ "جاگ رہا ہے لاڈلے!" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "زخم میں تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"تو پھر سوتا کیوں نہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نیند تو کل رات بھی تیری آنکھوں میں نہیں تھی اب سو جا لاڈلے سو جا۔"

وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"تمہیں بھی تو نیند نہیں آ رہی۔" میں نے تیکھے انداز سے کہا۔

"ہاں! وہ گردن ہلا کے بولا۔ "میری نیند بھی اڑ گئی ہے۔"

"کیوں تمہیں کیا ہو گیا؟" میں نے تنک کے پوچھا۔

"پتہ نہیں لاڈلے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا ہو گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کیا بات ہے میں آ گیا جمیل۔"

اُس نے اضطراب سے پہلو بدلا گھور کے مجھے دیکھا پھر تلخی سے کہنے لگا "ہاں شاید یہی بات ہے۔ تو آ گیا ہے۔" اُس کی تلخی کچھ اور گہری ہو گئی۔ "تو جو آ گیا ہے لاڈلے۔"

اُس کا لہجہ ہی ایسا تھا کہ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں نے یہاں آ کے تمہیں سکون دینے کے بجائے اور پریشان کر دیا! تم مجھ سے بہت ناراض ہو گئے!"

"ہاں! میں تجھ سے بہت ناراض ہوں لاڈلے۔" وہ مضطرب ہو کے بولا۔

"تُو ایسی باتیں کرتا ہے کہ تو میں تجھ سے بالکل روٹھ جاؤں گا۔"

"تم بھی روٹھ جاؤ۔ مجھ سے سب روٹھ گئے ہیں۔"

اُس نے میرا سر اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ "یہی تو آفت ہے کہ تجھ سے روٹھا نہیں جاتا۔ میں تجھ سے روٹھ نہیں سکتا۔"

"میں۔ میں۔" میری آواز گلو گیر ہو گئی۔ "میں چلا جاؤں گا۔"

"چلا جائے گا۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "مجھے چھوڑ کے چلا جائے گا؟ مجھے معلوم ہے کہ تو اتنا بزدل نہیں ہے۔"

"جب تک میں یہاں ہوں کوئی نہ کوئی مصیبت آتی رہے گی۔"

"مصیبت یہ نہیں لاڈلے جو تو سمجھتا ہے مصیبت تو یہ ہے کہ تو کچھ سمجھتا نہیں" وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تجھے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔"

"مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے اور اسی لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے میرے جانے سے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"کون سے حالات! یہ تو کیا بک رہا ہے؟" وہ کڑوے لہجے میں بولا۔

"حالات تمہارے سامنے ہیں جو کچھ ہوا وہ اچانک ہو گیا۔"

"کیا تو میرے سامنے صفائی پیش کر رہا ہے؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں۔"

"لاڈلے جھوٹ مت بول تو نے حقیقت ہی تو نہیں بتائی دکھ حالات کا نہیں کوئی اور دکھ تڑپا رہا ہے کہ تو نے حقیقت نہیں بتائی یہ حالات اپنا اوڑھنا بچھونا ہیں کبھی دھوپ کبھی چھاؤں کبھی اچھا وقت کبھی برا وقت آتا رہتا ہے کبھی ٹھیک ہو جاتا ہے تو مجھے حالات سمجھانے چلا ہے۔"

"لیکن اس بار تم جھوٹ بول رہے ہو تم مجھ سے نہیں تو خود سے جھوٹ بول رہے ہو تم جانتے ہو اپنے لوگوں کا منہ بند کرنا کتنا مشکل کام ہے اور پھر لوگ بھی جب ایسے ہوں تمہیں طاقت کی جنگ کا پورا احساس ہے جس کا اظہار تم میرے سامنے کرنا نہیں چاہتے تمہارا چہرہ بتا رہا ہے تمہاری آواز بتا رہی ہے۔"

"میری آواز میرا چہرہ!" وہ منہ چڑا کے بولا۔ "تو نے ابھی میرا کمال ہی نہیں دیکھا لاڈلے یہ حالات تو میں کسی طرح سنبھال ہی لوں گا ان حرام زادوں سے نمٹنے کا کام مجھے آتا ہے میں تجھے آج اس بدنام جگہ جان بوجھ کے لے گیا تھا تاکہ تجھے پتہ چل جائے کہ جمیل کے سینے میں کتنی طاقت ہے۔ اس کی ٹکر کے یہاں بہت کم ہیں جو تیرے بجائے خود جیل جانے کو تیار ہو جائیں گے۔ پولیس جیل والوں کو تو انھیں دیکھنے کو ہی چلے گئے جیل تو ہماری ڈیوڑھی ہے لاڈلے۔ چھٹیوں میں ہم گھر آتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے میاں مجھ سے سارا شہر سنبھالا جا سکتا ہے مجھے سنبھالنا اور تجھ سے نمٹنا مشکل نظر آتا ہے تو مجھ میں نہیں آتا۔ تم تو میرے نگاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ لاڈلے لاڈلے!" وہ بے چینی سے بولا۔ "مجھے رگ رگ کے اس لیے نہیں بتائے تھے کہ تو آزاد ہو کے انھیں کھونا شروع کر دے۔ اس دنیا کی آدمی کو دوسروں کی دلکشی رنگین نہ معلوم ہوں تو اس کا جینا حرام ہو جاتا ہے کھانے سے نکل پڑا تو تے ہی ہاتھ دھو کے کھانے شروع کر دیے کچھ تو تسلی کی ہوتی اور یہاں بھی میری بات سن تیرے سر کی قسم چاقو تیرے ہاتھ میں اچھا نہیں لگتا۔ میں نے تجھے" وہ بے قرار ہو گیا۔ "مجھے تیری چاقو بازی دیکھنے کا شوق نہیں ہے جب تو جیل میں کتابیں پڑھتا تھا اور قلم سے لکھتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا۔"

"مجھے کیا خود پسند ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کے ناگواری سے کہا۔ "میں چاند میاں اور چھرا کے پاس اپنی چاقو زنی کے جوہر دکھانے نہیں گیا تھا تو وہاں کسی اور کام سے گیا تھا۔"

"اور اکیلا چلا گیا تھا۔" میری آنکھیں جیسے بند ہو گئی تھیں۔

"میں اُسے اتنا مشکل کام نہیں سمجھتا تھا۔ اسی لیے تمہیں نہیں بتایا ورنہ بات بڑھ جاتی اور پھر مجھ سے اپنے سوا کسی کو بتایا بھی نہیں جاتا۔"

"کسی کو تو بتا دے لاڈلے اتنا مت خوف کر تو۔"

"کیا بتاؤں؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"کون ہے وہ کہاں سے کدھر ہے؟"

"کون؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہی جس سے تجھے جیل سے گئی تھی کون ہے وہ کدھر رہتی ہے؟"

"کاش میں اس کا پتہ جانتا! میں نے تمہیں کل ہی یہ بتا دیا تھا۔"

"چاند میاں کو اس کا پتہ معلوم تھا؟"

"میں اسی خیال سے اس کے پاس گیا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن اس کا پتہ نہیں چلا۔" وہ تیزی سے بولا۔ "یہاں کمال اتنا دماغ کام کرتا ہے لاڈلے اگر بچھڑا ہوا ہے سات سال کا پھیر پڑ گیا ہے۔ سات سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ نہ جانے اب وہ کہاں بڑھ رہی ہو یا مر ہو۔"

"ایسا مت کہو!" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہو گی۔"

"مجھے بتا دے تجھے کہاں اور کب ملی تھی؟"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اُس نے میرے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تو نادم ہونے لگا۔ "ہائیں بھیڑیوں سے سالا جمیل کا لاڈلا جمیل کے سامنے آنکھوں میں پانی لاتا ہے۔"

"مجھے جانے دو میں اُسے تمام دنیا میں ڈھونڈوں گا۔"

"کوئی کسی کو اس طرح سے ڈھونڈتا ہے میاں لاڈلے۔ سات سال تو نے جیل میں ہی بتائے وہ ذرا سا وقت ملا تو اتنا تیز چلنے لگا۔ آنکھ میں پانی آ جائے زنجیریں صاف نظر نہیں آتیں اتنا تیز چلو گے میں سانس پھول جاتا ہے۔ تو نے کتابیں بھی کیا پڑھ لیں تو اپنے آپ کو اور الجھا رہا ہے وحشی۔ کام خراب کر رہا ہے۔ اس طرح ڈھونڈے گا تو تھوڑی مل جائے گی۔ دیکھا بدحواسی میں بات اور خراب ہو گئی۔ ٹھکانے طریقے سے بھی ہو سکتا تھا میری مان جاتی۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کر۔ میں اس لیے تجھ پر زور دیتا ہوں کہ جو میں نے نہیں کیا تھا۔ لاڈلے تیرے پاس وقت ہے۔ لیکن جب سمجھنے کی قوت آئی تو وقت نکل چکا تھا تو بھی وہی کر رہا ہے۔ تو جیل میں چلا جائے گا تو اسے کیسے تلاش کرے گا۔ ایک جگہ سے بچ گیا ہے دوسری جگہ پھنس جائے گا اور مان ٹھیک رکھ سے پہلے اپنے آپ کو تلاش کر۔"

"جو تم کہتے ہو وہ میں بھی سوچتا ہوں مگر شاید مجھے بہت یاد آتی ہے تمہیں کیا پتہ ہے میں نے اس کے لیے کن کن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔"

"اور کیا حاصل ہوا؟"

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا میں جمیل کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں سلمان کی خاطر اپنے ابا امی اور بہن بھائیوں کو چھوڑ دیا میرے ابا اس گھر تک لے آئے لوگ بچے ہیں میری امی مر گئی ہیں میری کوئی کار لوگوں نے پیچھے کی کوشش کی تھی اور امی لوگوں نے مجھے میرے ساتھ دیتے نہیں یا جمیل کو کیا اندازہ تھا کہ میرا سینہ کیسا ہے جس میں بار بار آگ لگتی ہے میں اپنی جلن سے کس کو چھوڑتا کو چاہتا ہے میری آگ ہے کہ اپنے جسم پر باز کے لگتے شعلوں کو کھول کر باتیں نہ سے جمیل مجھے کھاتا رہا اور اس کی باتیں سمجھنے کا میرے پاس بھی کیا تھا میرے سامنے جمیل بیٹھا تھا میرے جیسے باپ میرے جو سچ کی ایسی حالت میں کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ میں نے حسب عادت "تو آج ان کے پاس بھی نہیں گیا۔" جمیل ناراضی سے بولا۔

"وقت ہی نہیں ملا۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"وہ کیا سوچتی ہوگی اُسے لاکھ تسلی کرو صبح اٹھ کے ان کے پاس جانا اور دیکھ لیں صبح تیری یہ حالت دیکھیں سمجھ لو لاڈلے وقت ایسا اُداس رہے گا کہ مجھے پریشان کرے گا۔ اس وقت تیرا سنبھلنے سے بڑا اس ہے۔ میری خاطر کچھ دیر تو اندر گزار لے۔ اب تو سو جا یا لیٹ جا۔" اُس نے مجھے کندھے سے زور دے کے کہا۔ میں خاموشی سے لیٹ گیا۔ اس نے ایک سگریٹ سر کے پاس رکھا اور میرے کپڑے کو سے میں بکھرا رہا۔ پھر ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا اندر گیا اور گہری سانسیں لیتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اُس کے جانے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آئی۔ یہاں تک کہ اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ منہ ہاتھ دھو کے میں باہر گیا۔ نصیب میاں اور دوسرے لوگ ورزش کر رہے تھے کوئی دیوار سے لگ کے اپنے ہی اوقات دیکھ رہا تھا کوئی گھونسے اوپر اٹھا رہا تھا۔ نصیب میاں بنیان پہنے ہاتھ اور ٹانگیں کھولنے کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ورزش ختم کر دی اور بلند آواز میں بولا۔ "آہا آفتاب عالم تاب طلوع ہو گیا۔" پھر اُس نے اسی انداز میں آنکھیں میچیں اور کہنے لگا۔ "از راہ خدا اس ناچیز کو بھی آزمائیں یہ نہ ڈالیے کہ جو کچھ دن رہ گئے ہیں وہ رسوائی میں گزریں گے۔ غلاموں کا کام دکانوں کے نیچے رہ جانے کا تقاضا ہے سرکار کی سواری دھوم دھام سے نکالی جائے۔"

میں نے توجہ نہیں دی وہ اپنے ساتھیوں کی ایک بلند بہتی ہنسی کی آوازیں لگاتا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد میں زین کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا تیزی کی وجہ سے میری سانس اکھڑ گئی تھی کہ اس نے نہایت عجلت میں دروازہ کھولا۔ وہ نہا رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے وہ تولیہ لپیٹے ہوئے تھی۔ آنکھیں حیران تھیں شاید اسے یہ یقین کرنے میں مشکل پیش آئی کہ میں ہی اس کے سامنے موجود ہوں پھر اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں اور وہ مجھے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گئی۔ "تم نے کل میرا انتظار کیا ہو گا۔" میں نے کہا "تمہارے لیے ہی کل وقت نہ ملا کل رات بھی مصروفیت رہی۔" وہ کچھ نہیں بولی ہونٹ بھینچ کے رہ گئی۔ "کیا حال ہے؟ جی تو نہیں گھبرایا ہو گا؟" اُسے چپ دیکھ کے میں نے جھک کے پوچھا۔ "کوئی پریشانی تو نہیں ہے!"

"نہیں۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "کوئی پریشانی نہیں۔"

"ناشتہ کر لیا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں اور تم نے؟" اُس نے قطعی لہجے کے پوچھا۔

"مجھے بہت دکھ ہے اُستاد پر وہ مجھے پسند بہت ہے۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔
"کرمین سے بات کرو لیکن ہے وہ مان جائے مگر وہ تیچے سے نہیں مانے گی"
تیر اُٹھانے سے پہلے یہ خیال کر لینا کہ اُس کی پہنچ کتنی دور ہے۔"
"رات کی بات جانے دو۔ میں نے کہہ دیا مجھے دکھ ہے۔ میں نشے میں تھا۔"
سیٹھ نے تنک کے کہا۔ "اب اُس کا ذکر مت کرو۔"
"جانے دو" مجل نے پریشانی سے بولا۔ "سیٹھ ایک بات کی اگر زیادہ نشہ
ہر چیز کا بُرا ہوتا ہے۔ طاقت کا، دولت کا، حسن کا، شراب کا۔"
"میں سمجھتا ہوں اُستاد۔" سیٹھ نے لفظوں پہ جھک کے کہا۔ "یہ خوان نذر کے لیے
لایا ہوں۔ اسے قبول کر لو۔"
"اس کی ضرورت نہیں سیٹھ۔ لے واپس لے جاؤ۔ تمہارا آنا ہی بہت ہے۔"
"نہیں اُستاد یہ تو تمہیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔" مجل کے انکار پہ اُس
کا اصرار بڑھ گیا اور اُس نے خوان قبول کیے بغیر رخصت ہونے سے انکار کر دیا۔ مجل
نے اُسے قبول کر لیا۔ نصیب میاں نے فوراً چائے کا اہتمام کیا۔ جب خوانوں سے سرپوش
اُٹھائے گئے تو سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ چاندی کے روپوں سے بھرے ہوئے تھے۔
مجل نے خوان پوش ڈھک دیا اور سیٹھ سے اُس کے کاروبار کی جگہ اور کام کے
متعلق پوچھنے لگا۔ سیٹھ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ سب سے ہاتھ ملایا۔ جب وہ میری طرف
آیا تو اُس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ "لاڈلا۔" وہ زیرِ لب مسکرا کے بولا۔
"میری خواہش ہے تم میرے ساتھ کام کرو اور اگر کبھی تمہیں میری ضرورت پڑے تو
بے جھجک چلے آنا۔"
"شکریہ۔" میں نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔
"اُستاد کبھی آپ لوگ اُس طرف آئیں کہیں تو ایک مجرے کا انتظام کرایا جائے۔"
وہ مہذب انداز میں بولا۔ "موتی ابھی تو آپ یہاں ہیں۔"
"ہاں۔ مگر دیکھو سیٹھ شرابہ نہیں لگنے گی۔"
موتی کی بات پہ کانٹے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سیٹھ اور مجل نے بھی اُس کا
ساتھ دیا۔ سیٹھ کے جانے کے بعد مجل نے دونوں خوان نصیب میاں کے حوالے کیے
کہ وہ انھیں اپنے اور چھلاکے آدمیوں میں تقسیم کر دے۔ پچھلی رات کا واقعہ تھا۔ سیٹھ
کی اچانک آمد میرے لیے حیرت کی بات تھی مگر مجل کے تاثر سے ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے اُسے سیٹھ کی آمد کا پہلے سے یقین تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے سیٹھ کی آمد سے
زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سیٹھ آج رات پھر شربانو کے پاس جائے گا
اور شربانو اُس کے سامنے ناچے گی اور سیٹھ للچائی نظروں سے اسے دیکھتا رہے گا۔ اُس کا
ہاتھ پکڑے گا۔ وہ تھک جائے گی اور کرینی روپوں کے لالچ میں اسے سیٹھ کے حوالے
کر دے گی۔ مگر مجھے یہ سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔
مجھے حسبِ معمول زرّیں کے پاس میٹھے چاول کھانے کے لیے جاتے ہوئے جھجک
ہو رہی تھی۔ میں سہ پہر تک نہیں گیا۔ پھر زرّیں نے مجھے ماما کے ہاتھ خود ہی بلوا لیا۔
اُس نے مجھ سے اور میں نے اُس سے کوئی اور بات نہیں کی۔ چاول کیسے ہیں نہ مجھے
یاد ہیں کسی اور کی بات ہوئی۔ اُس نے بہت لذیذ چاول پکائے تھے۔ مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔
اسکول سے واپسی پر آتی بطورِ خاص میرے لیے میٹھے چاول چھپا کے رکھ دیتی تھیں
کہ انھیں کوئی اور نہ کھا جائے۔ رات کو مجل پھر مجھے اپنے ساتھ شہر کے مختلف علاقوں
میں گھومنے نکل گیا۔ تنگ و تاریک گلیوں سے جھینپٹ ہوئی مجل کی گاڑی پہنچی اور کئی
گلیاں تھیں وہ کئی بوتلوں جتنے خانوں اور شراب کے اڈوں پر گیا اور اس کی
ہر جگہ گرمجوشی والی تواضع کا مظاہرہ کیا۔ ایک بڑے علاقے کا چکر کاٹتا ہوا مجل
آدھی رات کو اڈے پہ واپس آیا۔ میں اسی موقع کا منتظر تھا۔ رات کو جب ذرا خاموشی چھا
گئی تو میں نے اس کے کمرے میں جا کے زرّیں کا ذکر کیا کہ وہ مجھے کہاں اور کیسے ملی
اور کہاں سے آئی ہے۔ میں نے اسے زرّیں کے متعلق ساری بات بتا دی اور اس سے
اصرار کیا کہ زرّیں کی بہتری اسی میں ہے کہ اُسے اس کے گھر فیض آباد پہنچا دیا جائے۔
اُس نے میری باتیں درمیان میں کوئی دخل دیے بغیر اطمینان سے سنیں۔ "زرّیں
کی منشا کیا ہے؟" اُس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔
"اس کی منشا نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔
"پھر تو اُسے اس جہنم میں دوبارہ کیوں رسید کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو کوئی
اچھی بات نہیں ہوئی۔ میں نے اُس لڑکی کو بیٹی کہا ہے۔ وہ کیا کہے گی کہ باپ نے
بیٹی بنایا۔ بنا کے چھوڑ دیا۔ جا سو جا اور کبھی کبھی بالکل بچہ بن جاتا ہے۔"
میں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی اور جن باتوں سے زرّیں کو قائل کر لیا
تھا وہ اُس کے سامنے دہرا دیں۔
"میں نے تو کچھ اور سوچا تھا لاڈلے۔ زرّیں بہت ہی خوب صورت لڑکی ہے
بہت بھولی بھالی۔ تو کیا کھٹور بن گیا ہے؟"
"تم میری باتوں پہ دھیان ہی نہیں دیتے۔ اُس کی ایک بڑی جاگیر فیض آباد
میں ہے۔ وہ اُسے مل جائے تو وہ اطمینان سے رہ سکتی ہے۔"
"وہ لڑکی ہے اور جوان ہے لاڈلے۔ لڑکی کے لیے جاگیر اُس وقت تک
بے کار ہوتی ہے جب تک کوئی اُسے سنبھالنے والا نہ ہو۔ تجھے نہیں۔" میری ضد
سے وہ جھنجھلا گیا اور ناراض ہو کے کہنے لگا۔ "لاڈلے وہ اس
چار دیواری سے تبھی باہر نکل سکتی ہے جب خود اس کی منشا ہو۔ میں تجھے اس کی
اجازت نہیں دوں گا۔"
اس کے بعد مجل سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ میں خفا ہو کے اپنے کمرے میں چلا
آیا۔ میں نے دوسرے دن اُس سے بات بھی کم کی۔ دوسرے دن رات کو وہ پھر مجھے
گھمانے لے گیا۔ میں بچوں کی طرح اس کے ساتھ چلتا رہا۔ دوسرے دن دو مرتبہ زرّیں کے
پاس بھی گیا اور چند لمحے ٹھہر کے واپس آ گیا۔ میرا ستر بند تھا۔ دو دن یونہی اسی طرح
گزر گئے۔ اس دوران میں مجل نے شاید جمعدار کے اڈے کا کچھ بندوبست کر لیا تھا
کیونکہ مجل کے انداز میں اب اُتنا اکھڑا پن نہیں رہا تھا۔ شاید جمعدار کا معاملہ مجل کی
مرضی کے مطابق دب گیا تھا۔ گھر پر کوئی مستقل طور پر جمعدار کے اڈے پر تعینات کر دیا
گیا تھا۔ ساتھ میں مجل کے آدمی بھی تھے۔ پہلی بار میں نے اُن لوگوں کو یہاں کا جو حال
سُنا تھا وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔ دن بھر یہاں لوگوں کی بھیڑ رہتی۔ صبح وہ لوگ
جو مجل کے ساتھ تھے اڈے سے نکل جاتے پھر وہ لوگ آتے رہتے جو یہاں

رہتے تھے کہ اُسے سلام کرنے آتا۔ کوئی اپنے حبیب کٹ جانے کا کوئی مرنے کٹنے سے
بات کرتا۔ کسی کا تعلق صرف تحویل سے تھا۔ کوئی اپنے کے پاس آ کے پیسے جمع کرا دیتا
تھا۔ یہ سب مال اکٹھا کر کے نصیب میاں کے حوالے کر دیا جاتا جو ایک رجسٹر میں درج
کرتے ہیں اس کا اندراج کرتے۔ زیادہ بات زبانی ہوتی تھی۔ مجل بیٹھا حقہ پیتا رہتا
یا خفا ہوتا یا خوش ہوتا یا گالیاں دیتا یا آنے والے لوگوں سے اُن کی خیریت دریافت
کرتا۔ میں نے محسوس کیا جب میں سامنے آتا ہوں تو موضوع بدل سا جاتا ہے۔ پیچھے
پیچھے بیٹ لیے جاتے ہیں۔ پھر مجل مجھے ساتھ لے کے دوسرے کمرے میں چلا آتا ہے۔
مجھے یہاں آئے ہوئے دس دن سے زیادہ گزر چکے تھے۔ میرے پاس کوئی کام نہیں
تھا۔ کمرے میں تنہا خاموش بیٹھا رہوں یا اُن لوگوں کی باتیں سنتا رہوں۔ موتی
مستقل واپس چلا گیا تھا۔ جب طبیعت بہت گھبراتی تو میں زرّیں کے پاس چلا جاتا۔
لیکن وہاں کوئی بات ہی نہ ہوتی۔ اُسے دیکھ کے مجھے گھر یاد آنے لگتی اور میں گھبرا
کے پھر پیچھے آ جاتا۔ اور پھر اُس کے پاس چلا جاتا۔ زرّیں کے لمبے بال اور بڑی بڑی
آنکھیں مجھے بہت بھلی لگتی تھیں۔ اب وہ گم سم سوچتی ہوئی رہتی تھیں۔ جب میں
واپس پیچھے آتا تو خود کو ملامت کرتا کہ اس کے سامنے مجھ سے بات کیوں نہیں کی جاتی۔
[illegible] کے جاتا ہوں۔ وہ بھول کیوں جاتا ہوں اور یاد آتا ہے تو وہاں جانے کی ہمت
کیوں نہیں پڑتی۔ سو ایک دن میں ارادہ کر کے گیا کہ آج اس سے ضرور بات کروں گا۔
اُس نے حسبِ معمول مجھے چائے پیش کی اور میرے سامنے خاموش بیٹھ گئی۔ میں نے
لب کھولنے کی جرأت کی جیسے آج میں پہلی بار اس سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ میں نے
آہستہ سے کہا۔ "زرّیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"
"کیا بات ہے؟" وہ سٹپٹا گئی۔ "طبیعت تو خراب نہیں ہے؟"
"زرّیں۔" میں نے اضطراب سے کہا۔ "میں مر جاؤں گا۔"
"نہیں۔" وہ سراسیمگی سے مجھے دیکھنے لگی۔ "آخر تمھیں کیا غم ہے؟"
"میرا غم یہ ہے کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ کاش یہ ایک گاؤں یا ایک شہر کے
برابر ہوتی۔"
"تو پھر کیا ہوتا؟" وہ معصومیت سے بولی۔
"پھر شاید مجھے قرار آ جاتا۔"
"مجھے بتاؤ تمھیں کس طرح قرار آ سکتا ہے؟" زرّیں بے چینی سے بولی۔ "میں تمھارے
کسی کام آ سکتی ہوں۔ میں تمھارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"
"کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔
"معاف کرنا میں پریشان ہوں۔ تمھیں میری پریشانی بھی لاحق ہو گئی۔"
"ہاں۔ تم میری بات مان لیتیں تو اچھا ہوتا۔ اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ
میں تمھیں بوجھ سمجھتا ہوں۔ میں نے تم سے پوچھا پھر ایسا ہوا کہ تم نے اپنی تمھاری اور
[illegible] نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ میں تم سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔"
"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔
"کیا... کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"
"یہی کہ تم جہاں کہتے ہو میں وہاں چلی جاؤں گی۔ چاہے بعد کچھ ہو۔ میں تمھیں
اور پریشان نہیں کروں گی۔ تم مجھے جہاں چاہے پہنچا سکتے ہو۔" [illegible]
"زرّیں زرّیں۔" میں نے جلدی سے اُسے دیکھا۔ "میں تمھارا گھر دیکھنا
چاہتا ہوں۔ تمھارا گھر۔ تمھارے ماں اور باپ کا گھر۔"
"تم جیسے چاہو۔ میں تیار ہوں۔"
"زرّیں! میں تمھیں وہاں پہنچا کے نہیں لوٹوں گا۔ میں تمھارے لیے
لڑوں گا۔ تمھیں اپنے گھر میں عزت سے بٹھا کے اُن کا اصرار تمھارے یہاں
کوئی آدمی چھوڑ کے آؤں گا۔ میں مجل سے کہہ کے ماما اصغری کو بھی تمھارے
ہمراہ کر سکتا ہوں۔ مجل کے دوست دور دور شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کچھ بھی
نہیں ہوا۔ تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک بار اماں جی کو مڑ کے حال تو
دیکھنی چاہیے۔"
"ٹھیک ہے۔ تم جو چاہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اُس نے
بمشکل اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے کچھ دیر اُس کی واپسی کا انتظار
کیا۔ پھر کچھ سوچ کے نیچے اُتر آیا۔

مجھے مجل کو آمادہ کرنے میں تین چار دن لگ گئے۔ اس کے باوجود
اس نے خود میرے ساتھ اوپر جا کے زرّیں سے بات کی۔ زرّیں نے اپنی
آمادگی ظاہر کر دی۔ مجل نے اس سے کہا کہ فیض آباد جا کے اگر وہ کسی قسم
کی پریشانی سے دوچار ہو تو اسے فوراً اطلاع کر دے۔ مجل نے اس سے
یہاں تک پوچھا کہ کہیں اُس نے میرے دباؤ میں آ کے تو فیصلہ نہیں
کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ فیصلہ اُس نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔
مجل اسے سمجھاتا رہا۔ زرّیں نے اپنے فیصلے میں تبدیلی نہیں کی۔ "تم جب
چاہو یہاں آ سکتی ہو۔ اس کے لیے لاڈلے کی سفارش کی ضرورت نہیں۔
تم میری بیٹی ہو۔" یہ کہتے ہوئے مجل کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے
جانے کیا ہوا۔ وہ مجھے زرّیں کے پاس چھوڑ کے تیزی سے نیچے اُتر گیا۔
فیض آباد میں مجل کا کوئی دوست نہیں تھا لیکن لکھنؤ میں موتی
جیسا ایک دوست کلن خاں موجود تھا۔ لکھنؤ اور فیض آباد کا فاصلہ بہت
کم ہے۔ مجل نے نصیب میاں سے کلن خاں کے نام ایک لمبا خط
لکھوایا کہ وہ فیض آباد جا کے اس لاوارث ہو چکی لڑکی کی جاگیر واپس لانے
کے لیے ضروری قدم اُٹھائے۔ ایسا ہی ایک خط اُس نے میرے حوالے
کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجل مجھے تنہا جانے نہیں دے گا۔ اس نے شوکی
اور سالے کو میری ہمراہی کے لیے منتخب کیا۔ اُنہیں حکم دیا کہ اگر
زرّیں ضروری سمجھے تو وہ وہاں کچھ دنوں تک قیام کر سکتا ہے۔ دو دن
کے اندر اندر زرّیں کے بیس جوڑے سل گئے اور کئی زیور۔ مجل نے
اُسے کچھ نقدی بھی دی۔ رات کے وقت گہرے اندھیرے میں جب
سارا محلہ سویا ہوا تھا۔ مجل نے زرّیں کے سر پہ ہاتھ رکھ کے اُسے رخصت
کیا۔ ماما پچھلے دروازے سے زرّیں کو لے کے نیچے اتری اور تانگے میں

بیٹھ گئی۔ احتیاطاً یا رازداری کی گئی تھی۔ اسٹیشن پر ہمیں دیر تک گاڑی کا انتظار
کرنا پڑا۔ زریں کو فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ
فرسٹ کلاس میں آئی تھی، فرسٹ کلاس میں واپس جا رہی تھی۔ ہم
سب اُس کے برابر کے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے دن شام کو گاڑی
لکھنؤ اسٹیشن پہنچی۔ طویل قامت گرانڈیل، سرخ و سپید کپتن خاں اپنے
ساتھیوں سمیت اسٹیشن پر موجود تھا۔ اُس نے ہم سب کو گلے لگایا
جیسے ہماری پرانی جان پہچان ہو۔ کپتن خاں کا اصرار تھا کہ ہم ایک رات
لکھنؤ ہی میں گزاریں مگر ہم اُسی رات فیض آباد روانہ ہو گئے۔ فیض آباد کے
اسٹیشن پر جامو ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں ایک بڑے مکان میں ٹھہرا دیا گیا۔
میں نے سفر میں دانستہ زریں کے پاس بار بار جانے سے گریز کیا تھا۔
اب بھی میں اس سے دُور دُور رہا۔ صبح تک ہم ایک دوسرے سے مشورے
کرتے رہے۔ میں نے کپتن خاں اور جامو کو زریں کی ساری کہانی سُنائی۔
انھوں نے اُس کے خالو کو کسی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ صلاح
ٹھہری کہ اُس سے کوئی مفاہمت نہ کی جائے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ہم پندرہ آدمی، کپتن خاں، جامو، اُن کے
ساتھی اور ہم چار، زریں کی وسیع و عریض حویلی میں پہنچے تو اُس کا خالو
ہمیں دیکھ کے بوکھلا گیا۔ اُس سے کوئی بات ہی نہیں کی گئی۔ اُسے یہ یقین
دلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ہم کس مقصد سے آئے ہیں۔ جامو نے
اُسے حکم دیا کہ وہ شام تک حویلی خالی کر دے اور حویلی کے علاوہ دوسری تمام
جائداد اور زمینوں کی دستاویزیں بھی زریں کے حوالے کر دے۔ اس سلسلے
میں کوئی چھل فریب یا کوئی قانونی اُلجھن ڈالی گئی تو انجام تباہ کن ہو گا۔ جیسا
کہ میرا خیال تھا، اُس سے کہیں زیادہ آسانی سے بات نمٹ گئی۔ وہ ہم
سے اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اُس نے زریں کے قدموں پر سر رکھ کے معافی مانگنے
کی خواہش ظاہر کی۔ اُس کی ساری حسرتیں، خوشامدیں ضائع ہو گئیں۔ چار
آدمی وہاں تعینات کر کے باقی واپس آ گئے۔ حویلی میں سامان کا بیشتر
حصہ زریں کی ملکیت تھا۔ جامو نے ایک وکیل بھی ساتھ لے لیا تھا۔
اُس نے ضروری کاغذات تیار کیے۔ شام کو میں زریں کو ساتھ لے کے
اُس کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ لرز رہی تھی اور مجھے اُسے سنبھالنے میں
مشکل پیش آ رہی تھی۔ اپنے آدمی پھیلا کے جامو نے اس بات کا بھی
انتظام کر دیا کہ محلے والے کوئی رخنہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کر سکیں۔ جامو
کے وکیل نے کاغذات کا معائنہ کرنے کے بعد زریں کے خالو اور اُس
کے خاندان کو حویلی سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔ زریں کو اپنی خالہ زاد
بہن بھائیوں سے نہیں ملنے دیا گیا۔ اُن کا سامان جامو کے آدمیوں کی
نگرانی میں دن بھر ڈھلتا رہا۔

شام تک حویلی پر زریں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اپنے مکان میں دوبارہ آ کے اُس
کی عجیب حالت ہو گئی تھی، جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چیزیں
دیکھتی تھی۔ پوری حویلی میں دوڑتی پھرتی تھی۔ حویلی کے آبائی ملازم وہیں رہ گئے
تھے۔ وہ زریں کی واپسی پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ زریں ملازموں سے گلے مل مل
کے روتی تھی اور ایک ایک چیز آنکھوں سے لگاتی تھی۔ رات گئے اُس نے مجھے پوری حویلی کی
سیر کرائی۔ امّی، ابّی اور بابا کی تھوڑی تصویریں دکھائیں۔ بیٹھک کھول دی گئی تھی۔
کپتن خاں، جامو اور اُن کے ساتھی وہاں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کے
کھانے کا انتظام جامو نے کیا تھا۔ حویلی ہی میں کھانا آ گیا تھا۔ حویلی میں کھانے پینے
کا فوری انتظام ممکن نہیں تھا۔ سب کچھ ایک دن میں ہو گیا۔ مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا۔
سفر کرتے ہوئے میرا دل بہت پریشان رہا تھا۔ نہ معلوم فیض آباد میں کیا حالات
پیش آئیں۔

کھانے کے بعد جامو نے ہم سب کو گانا سُننے کی دعوت دی۔ میں نے زریں
کی وجہ سے انکار کیا مگر وہ نہیں مانا۔ حویلی کے اندر اور باہر جامو کے آدمی موجود ہی تھے
اس لیے کسی خطرے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے زریں سے اجازت لی کہ میں جامو کے
ساتھ کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں، شاید رات کو دیر ہو جائے۔

فیض آباد کا بازار مختصر تھا مگر یہاں لکھنؤ سے زیادہ نفاست نظر آتی تھی۔
لکھنؤ کی طرح زرق برق نہیں مگر جامو کی عزت بھی فیض آباد میں کچھ کم نہیں تھی۔ اُس کا ڈیل
ڈول مرتی جیسا تھا۔ بہت منہ پھٹ تھا۔ بات بات پر گالی بکتا تھا۔ "میں تمہیں
ایک خاص جگہ لے جا رہا ہوں۔ میں نے پہلے ہی وہاں کہلا بھیجا تھا کہ آج دن ڈھلے
بعد کسی وقت میں اپنے مہمانوں کے ساتھ آؤں گا۔ وہاں ایک چیز دیکھنے کی ہے۔ ظالم
زیادہ بات نہیں کرتی، کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ اُس کی بیوی اماں اپنا خانہ خراب کر
دیتی ہے۔ گاتی کیا ہے، دل پر چھریاں چلاتی ہے۔" پورے راستے جامو اُس کی تعریف
کرتا رہا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر پہنچے۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے کسی کی سُریلی
آواز آ رہی تھی۔ میرا دل بے تاب ہو گیا۔ جامو سچ کہتا تھا۔ اُس کی آواز میں جادو
تھا۔ جامو کی ایک ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے بڑھ کر
ادب سے ہمارا استقبال کیا۔ اُس لڑکی نے ہماری آمد کی وجہ سے گانا بند کر دیا تھا۔
سر جھکائے اپنے ناخن کُرید رہی تھی۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو جامو نے آواز لگائی۔
"نیلم جان! آج ہمارا دل بہلاؤ۔ مہمان دل پھینک کے جائیں تو بات ہے۔" جامو کی
آواز پر اُس نے سر اُٹھایا اور زیر لب مسکرا کے دیکھا۔ جیسے ہی اُس نے سر اُٹھایا، میری آنکھیں
دھندلا گئیں۔ دل کی دھڑکن مفقود ہو گئی۔ سینہ کسی نے چاقو سے چیر دیا ہو۔

میں دنگ رہ گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے یہ دُھند ہٹانے کی کوشش
کی۔ نیلم جان نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اُس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ پھر وہ بجلی
کی سی تیزی سے اُٹھی۔ اُس نے بڑھ کے مجھ پہ چھلانگ لگا دی۔

میں چیخا اور چلّاتا ہوا ایک ہی جست میں سیڑھیاں عبور کر گیا۔ میری
بہن نفیسہ متحرک، بے حال پڑی تھی۔ خون سے اُس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ میں
نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔

گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔

پہلے تو مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور میں یہاں
کیا کر رہا ہوں۔ دل کسی نے مٹھی میں بند کر لیا تھا۔ پھر جب خون میں نہائی ہوئی
نفیسہ میرے سینے سے لگی تو میرا رہا سہا ہوش بھی رخصت ہو گیا۔ نفیسہ
کی سانس اُکھڑ گئی تھی اور اُس کی ہر کراہ میرا کلیجا کاٹ رہی تھی۔ جب گلی میں
چیخ پکار شروع ہوئی اور کسی نے میرے بال پکڑ کے زور زور سے میرا سر جھٹکا
تب کہیں مجھے اردگرد کا ہوش آیا۔ میں نے وحشت سے اپنے بازوؤں میں
بکھری ہوئی نفیسہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے کیا۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں
اور خون ہونٹوں سے نکل کے گردن پہ آ رہا تھا۔ میں نے اُس کا لہولہان چہرہ
آستین سے صاف کیا۔ اُس کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ، [illegible]۔"
جب اُس نے نظریں پھیر کے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا تو میں نے چیخ کر کہا۔ لوگ
ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، میری چیخوں کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔
شمّن اور رفیقے نے چاقو نکال لیے اور تماش بینوں کی طرف دوڑ پڑے۔ چند لمحوں
میں جامو، کپتن اور ساتھیوں کے سوا سب مجھ سے دُور ہو گئے۔ میں نے انھیں گھور
کے دیکھا تو وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے نفیسہ کا چہرہ اپنے دامن سے چھپا لیا تھا
لیکن اس طرح وہ میری نظروں سے چھپ گیا۔ مجھے شُبہ ہوا کہ وہ نفیسہ نہیں کوئی اور
لڑکی ہے۔ اپنے شُبہے کی تصدیق کے لیے میں نے چہرہ دامن سے کھینچ لیا۔ وہ نفیسہ ہی
تھی۔ میری بہن نفیسہ ہی تھی، میری بہن، میری نفی، میری عصمت۔ وہی اُس کی کالی کالی
روشن بھی ہوئی آنکھیں تھیں۔ وہی اُس کے منہ میں دائیں جانب اُبھرا ہوا دانت۔
وہ نفیسہ ہی تھی۔ "تم کہاں چلی گئی تھیں؟" میری آواز پر لرزہ طاری تھا اور میں اپنا سر اُس
کے سینے پر ٹیکے رہا تھا۔ "مجھے بتاؤ نفی! تمھیں کون یہاں لایا؟" میری بکتی ہوئی
الفت سے اُس کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مسکرا
کے رہ گئی اور اُس کی گردن جھٹکے سے شانے پر ڈھلکنے لگی۔ "نہیں نفی! نہیں۔
مجھے بتاؤ۔ بتاؤ تم کیسے آئیں اور وہ سب کہاں ہیں؟" میں نے اُس کا
چہرہ تھام کے کہا۔

"بابر! ... بابر!" بمشکل تمام اُس کے منہ سے میرا نام نکلا۔
"بولو نفی! بولو۔ میں بابر ہوں، تمھارا کمینہ بھائی، تمھارا ذلیل بھائی۔
بے غیرت، بے حس۔" میں نے اُس کے ماتھے کے خون سے اپنی تھوتھنی رنگتے
ہوئے کہا۔

اُس کی مُردہ آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے روشنی اُبھری اور معدوم ہو گئی۔
"بابر!" اُس نے سسکتے ہوئے پھر میرا نام لینے کی کوشش کی۔ "تم ... تم ...!"
"ہاں میں ... میں۔" میں نے دیوانگی کے انداز میں کہا۔
"تم ... تم!" اُس نے ایک گہری سانس لی اور اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔
میں نے چیخ چیخ کے آوازیں دیں، اُسے جھنجوڑا۔ صرف ایک بار اُس نے آنکھیں
کھولیں، میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور میری گود میں لڑھک گئی۔ اس کے بعد نہ وہ بولی اور
نہ اُس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ وہ مر گئی اور میں اُس کا لاشہ لیے دوبارہ زندہ

کرنے کے لیے شعبدے بازی کرتا رہا۔ اُسے گلی میں لٹاتا رہا۔ پھر سارے خلقت کے
بیچ بچاؤ۔ کپتن خاں نے میری بہن کو مجھ سے جدا کرنے کے لیے اُس کے جسم پر ہاتھ
لگایا تو میں نے اُس کے پیٹ میں لات مار دی۔ پھر جامو اور بہت سے لوگوں
نے مجھے پچھاڑ لیا۔ پولیس آ گئی تھی اور اس نے نفیسہ کو مجھ سے چھیننے کی خاطر مجھ پر حملہ
کر کے مجھے بے قابو کر دیا۔ نفیسہ کے جسم پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ میں اُس کے
پاس جانے کے لیے پچھاڑیں کھا رہا تھا مگر وہ لوگ مجھے کھینچتے ہوئے ہجوم سے باہر
لے آئے۔ سارے نے بے تحاشا میرے گالوں پر طمانچے مارنے شروع کر دیے۔
"ہوش میں آ لاڈلے! ہوش میں آ لاڈلے! کیوں اپنا تماشا بنا رہا ہے۔
بتا وہ تیری کون تھی؟"

"وہ نفی تھی۔" میں اپنے بال نوچتا ہوا اُس کے جسم پر گر گیا اور میری ہچکیاں
بندھ گئیں۔ سارے نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میں نے اُس کے کپڑے بھگو دیے۔
میرا ایک بازو کپتن خاں نے اپنے کندھے پر ڈالا، دوسرا سارے نے سنبھالے رکھا۔ پھر
وہ مجھے ایک چبوترے پر لے آئے۔ "کپتن! تم اسے سنبھالو۔ میں پولیس سے
نمٹ کے آتا ہوں۔" جامو نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اُسے لے جا رہے ہیں۔"
"کہاں لے جا رہے ہیں؟" میں نے تڑپ کے کہا۔
"چھوڑ لاڈلے! ہمت رکھ۔" کپتن خاں مجھے چمکارتے ہوئے بولا۔
"لاڈلے! تجھے اپنی ماں کی قسم، خاموش ہو جا۔ لوگ کیا کہیں گے، اتنا
بڑا آدمی رو رہا ہے۔" سارے نے میری کمر سہلاتے ہوئے کہا۔
"سارے! مجھے اُس کے پاس جانے دو۔" میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔
"وہ کہیں نہیں جائے گی۔ سالے مرتے مرتے وہ کہیں جا سکتی ہے؟"
کپتن خاں نے بلند آواز میں کہا۔ "پولیس کو اپنی کارروائی کر لینے دو۔"
"پولیس!" میں نے اپنا چہرہ چھپا کے کہا۔ "پولیس کیا کرے گی؟"
"پولیس خانہ پُری تو ضرور کرے گی لاڈلے! ذرا سی دیر صبر کر لے۔"
سالے نے آہستگی سے بولا۔ "دیکھ کتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ذرا خیال کر یہ کون
سی جگہ ہے۔"

گلی میں ہر طرف سروں کا سمندر نظر آ رہا تھا۔ پولیس والے چیخ چیخ کر مجمع
منتشر کر رہے تھے۔ سیٹیاں بج رہی تھیں اور ہر طرف شور ہو رہا تھا۔ میں جس چبوترے
پر بیٹھا ہوا تھا، وہاں بھی لوگ آ گئے اور انگلیوں سے میری جانب اشارہ کرنے
لگے۔ کپتن خاں اور سالے نے انھیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔ میرے کانوں میں سیسہ
اُنڈیل رہے تھے۔ ہر طرف نیلم جان، نیلم جان کی آوازیں تھیں۔ نیلم جان اس جگہ
بہت مقبول معلوم ہوتی تھی۔ نیلم جان اپنے گھر میں بھی اتنی ہی مقبول تھی۔ محلے کی
لڑکیاں ہر وقت اُسے گھیرے رکھتی تھیں۔ وہ ہر وقت مسکراتی اور شرارتیں کرتی تھی۔
تیز تیز باتیں کرتی تھی۔ اُس کی ہنسی دُور سے بھی سنائی دیتی تھی۔ یہاں بھی اُس کی آواز
کا چرچا تھا جس کے جوہر میں اندازہ کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کے سارے نے مجھے کپتن
خاں کے حوالے کر کے اپنا چاقو لہراتا ہوا اُن کی جانب جھپٹا اور گرجنے لگا۔
کپتن خاں اسے روکتا رہ گیا۔ اُس سب کو [illegible] دیکھتے دیکھتے ہی میں نے

دھاڑیں مارتے ہوئے کہا۔ "کپتن خان ان کے ہاتھوں میں پتھر دے دو وہ اپنی
حلیم جان کا بدلہ مجھ سے لیں گے میں نے حلیم جان کو مار دیا ہے۔" میں نے
"حلیم جان کو مار دیا ہے" میں نے چلا چلا کے کہا۔ "میں حلیم جان کا قاتل ہوں۔"
میں نے کپتن خان کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوئے صدا لگائی اور مجمع کی جانب
بھاگنے لگا۔ سارنگے نے درمیان میں مجھے دھکا دے دیا اور میرا ماتھا فرش کی
اینٹوں سے ٹکرا گیا۔ کپتن خان نے خود ترسی کے ہیں مجھے پکڑ لیا۔ اچانک ایک طرف
سے ہجوم کا ریلا "اللہ اکبر" کا نعرہ لگاتا ہوا آیا۔ کپتن خان مجھے لیے ہوئے زمین پر لیٹ گیا۔ میں نے مجمع کے
سے فہیدہ نے چلا کر کہا لگائی تھی اس میں آگ لگ گئی تھی اور لوگ ایک دوسرے پر
گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے کپتن خان مجھے سینے سے چمٹائے زمین پر پڑا رہا۔ اس تنگ
جگہ بیان گنت آدمی اس کا جسم روندتے ہوئے گزر گئے۔ ایک سارنگے پیچ ہی کپتن
میری طرف بڑھنے سے روک رہا تھا۔ لیکن کپتن خان اندھا دھند بھاگتے ہوئے لوگوں
کی ٹانگوں اور ٹھوکروں سے خود "لا اس کو بیٹیا اور مجھے اس کی گرفت سے نکلنے کا
موقع مل گیا۔ فہیدہ کی لاش جہاں جا پڑی تھی اور جہاں وہ گری تھی وہاں سپاہی دائرہ
بنائے ہوئے کھڑے تھے فہیدہ کا خون فرش پر جم گیا تھا۔ میں اتنی تیزی سے آیا
تھا کہ سپاہی دیکھتے رہ گئے۔ میں نے ان کے دائرے میں داخل ہو کے فہیدہ کا خون
فرش سے کھرچ کے اپنے چہرے پر مل لیا۔ سپاہیوں نے میرے جسم پر ڈنڈوں کی
برسات شروع کر دی۔ مجھے خبر نہیں پھر کیا ہوا۔ میں وہاں اس جلتے ہوئے مکان میں
داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ میرے سر پر کسی سپاہی نے لاٹھی مار دی۔ میری آنکھوں
میں اندھیرا گھس آیا اور کانوں پر سناٹا چھا گیا۔ میں وہیں لڑکھڑا کے گر گیا۔

*

جب میری آنکھ کھلی تو سارا منظر بدل گیا تھا۔ میں ایک پلنگ پر پڑا ہوا تھا
اور میرے اطراف سفید دیواریں کھڑی تھیں۔ میں نے سر ہلا کے اٹھنا چاہا تو دماغ
میں دھماکا سا ہوا اور میری بے ہوشی کی طرح ایک بھیانک خواب سے دوچار تھا۔
ایک ٹانگ میں چکنا چور ہو گئی جیسے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور جسم
اتنا بوجھل تھا کہ مجھ سے اٹھا یا نہ جا سکا۔ زرین میرے پاس بیٹھی تھی اور سارنگے
کی دیوار سے ٹیک لگائے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے وحشت سے ان دونوں کو دیکھا۔
وہ دونوں آنسو بہا رہے تھے۔ "سب ٹھیک ہے لاڈلے!" مجھے اٹھتا دیکھ کے
سارنگے میرے قریب آ کے بولا۔
"وہ کہاں ہے؟ فہی کہاں ہے؟" میں اپنی تمام طاقت سمیٹ کے
بستر پر بیٹھ گیا اور میں نے سارنگے کا گریبان پکڑ کے پوچھا۔ "تم نے کہاں چھوڑ آئے!"
"وہ ... میں ہے پولیس نے اسے ہمارے حوالے کر دیا ہے۔" سارنگے
نے دردبھرے لہجے میں کہا۔ "تیرا انتظار تھا پر تو اب کیسے اٹھے گا تیرے تو
بہت چوٹیں آئی ہیں۔"
"مجھے کیا ہوا ہے؟ میں ہر حال میں زندہ رہوں گا سارنگے! مجھے موت
نہیں آئے گی۔"
میں نے پلنگ سے جست لگانے کی کوشش کی تو زرین نے میرا شانہ
پکڑ لیا۔ "تم نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں اس کی صورت دکھا دیتی ہوں۔" وہ سسکتے
ہوئے بولی۔ "تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔"
"سنبھالو اپنے آپ کو قابو میں رکھ لاڈلے! جو قسمت کو منظور تھا وہ ہو گیا۔ تو
اس قابل نہیں ہے کہ باہر جا سکے۔ ہم نے تمام انتظام کر دیا ہے۔ تو اس کی صورت
دیکھ کے اسے ہمارے سپرد کر دے۔" سارنگے نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اپنا
خیال نہیں ہے تو اسی کا خیال کر۔"
"مجھے بھی مار ڈالو سارنگے! میں اب اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گا۔" میں نے
اس کی گود میں گرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی اس کے ساتھ ہی دفن کر دو۔"
"لاڈلے!" سارنگے نے تحمل سے کہا۔ "تجھے کیا ہو گیا ہے تو تو بڑے
ہی کام کا آدمی ہے۔ استاد تو تیرے جیسے ہی مرتا ہے کیا تو اسی طرح مر جائے گا۔
وہ حرامزادی مرتے وقت پلک کے فرار ہو گئی ہے۔ پولیس نے اسے بہت تلاش کیا۔ جب وہ
کہیں نہ ملی تو مکان میں آگ لگا دی۔ میں اٹھ کر برابر کے کمرے میں وہ دونوں چیختے چلاتے
باہر نکلے۔ ایک دن تو اسے گھر سے ہی مار دیا تھا۔ میرا سینہ چھلنے لگا۔ زرین مجھو کو ٹوک
لگا کے میرے بائیں جانب کھڑی تھی۔ وہ اپنا چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ "بہنا
بی! ابھی جی!" سارنگے نے اضطراب سے کہا۔ "تم بھی اسے رلانے لگیں۔ اسے دکھ
لے لینے دو۔ چلو تو اپنا لالہ اسٹیر کا بچہ ہے۔ شیر کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال
کے دنیا کا مقابلہ کرے گا۔"
زرین کو اپنے دوپٹے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ اس نے لپک کے بالی سے مجھے سہارا
دے کے اٹھایا۔ میں نے اس پر اپنا بوجھ نہیں ڈالنے دیا۔ پھر بھی زرین نے میرا
ہاتھ تھامے رکھا۔ میں اپنے پیروں سے چلا۔ زرین میرے پہلو سے لگی ہوئی تھی
اور اپنی پلکیں اٹھا کے بار بار میرا چہرہ دیکھتی تھی۔ دوسرے کمرے میں
سہری پر کفن میں لپٹی ہوئی فہیدہ کا جنازہ رکھا تھا۔ اس کے ارد گرد حویلی کی عورتیں
قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے سارنگے کے اشارے پر فہیدہ
کے چہرے سے کفن ہٹا لیا۔ اس کے چہرے پر زرد چمک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو جیسے اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہ رہا ہو۔
ابھی گھڑی کی طرح چھپاتی ہوئی اٹھے گی اور باورچی خانے میں جا کے سب
کے لیے ناشتہ تیار کرے گی پھر آ کے کہے گی "میں بھاگی بھاگی جا کے انہیں ایک
پیالی چائے دے گی اور پوچھے گی کہ ابا آج کیا پکایا جائے! پھر آ کے کہے گی
یا تمہیں ٹال کے کہے گی ابا آج میں آپ کے لیے قیمتی پکاؤں گی "مجھے
جیوتی نیچے سے چاندی کے ورق منگوا دیجیے۔" میری محبوب سفید دل
پسند تھا۔ کفن میں وہ کیسی مقدس لگ رہی تھی جیسے آسمان سے اتری ہوئی کوئی
پری ہو۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا جیسے
اس کی آنکھیں کھل رہی ہوں اور اس کی نظریں میرے جسم پر پیوست ہو گئی ہوں
رہی ہوں۔ میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ سارنگے نے آ کے میرے کان میں سرگوشی
کی۔ "لاڈلے! اب چل۔"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں فہیدہ کے پائنتی اسی طرح کھڑا

رہا۔ بوڑھی عورت نے اس کا چہرہ کفن سے ڈھانپنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی
تھا کہ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ میں نے فہیدہ کے بال چومے۔ اس کی پیشانی
چومی اور اس کی آنکھیں چومیں۔ میرا دل کھنچا جا رہا تھا۔ میں اس کے سرہانے بیٹھا ہوا
اپنے آنسوؤں سے اس کا چہرہ میلا کرتا رہا۔ پھر زرین نے مجھے اس کے پاس سے
ہٹایا اور سارنگے مجھے دوسرے کمرے میں لے جانے لگا۔ میں نے انکار کر دیا اور
اس کمرے میں چلا آیا جہاں دبی دبی سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ میرے پہنچتے
ہی وہاں خاموشی چھا گئی۔ نقشے شرل اور کپتن خان نے مجھے درمیان میں بٹھا دیا
جہاں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے گرد لوگوں سے بھرا
ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں اب آنسو بھی نہیں رہے تھے کہ میں ان کا ساتھ دے
سکتا۔ میں گردن جھکا کے بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے جھجکتے جھجکتے مجھ سے فہیدہ
کا جنازہ اٹھانے کی اجازت چاہی۔ حامو اور سارنگے نے اصرار کیا کہ میں حویلی
ہی میں ٹھہر جاؤں۔ وہ فہیدہ کو دفنا کے آ جائیں گے لیکن میں نے ان کی بات
نہیں مانی۔ میں راستے بھر فہیدہ کی ڈولی کو کندھا دیتا ہوا قبرستان تک لے
گیا۔ کسی نے کندھا دینے کی کوشش کی تو میں نے اسے اپنی جگہ نہیں لینے دی۔
قبرستان حویلی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں
اتارا۔ اس کی قبر پھولوں سے ڈھانپ دی گئی۔ میں نے کوئی آہ
نہ کی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب شبو مجھے اس کی قبر سے
اٹھا کے حویلی میں لے آیا اور کب انہوں نے مجھے بستر پر لٹا دیا۔ مجھے جب ہر
طرف زرین اپنے سامنے نظر آتی تو پتہ چلا میں کہاں آ گیا ہوں۔ میرا جسم ٹھنڈا پڑا
تھا۔ زرین نے اسے حرارت پہنچانے کے لیے چادر ڈال دی۔

★

پھر ایسی حرارت چڑھی کہ سارا جسم بھٹی کے مانند دہکنے لگا۔ زرین کبھی
سر کو بھی پیٹ سے لگا کے رکھتی اور کبھی آیتیں پڑھ کے پھونکتی۔ جب بھی میری
آنکھ کھلتی میں اسے اپنے پاس بیٹھی ہوئی دیکھتا اور گرد و پیش میں مجھے کوئی
تبدیلی نظر نہ آتی۔ میری ایک جیسی روشنی ایک جیسا اندھیرا گھٹن اور حبس۔ جب
تک آنکھیں اور کان بند رہتے مجھے کچھ خبر ہی نہ رہتی لیکن جیسے ہی آنکھیں
دیکھنے اور سننے کی تمیز آتی ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی میری بوٹیاں نوچ رہا ہو اور
جلتے ہوئے گوشت کاٹ رہا ہو اور کوڑے مار رہا ہو۔ میں چیختا چلاتا رہتا۔ پھر
میرے کراہنے معطل ہو جاتے اور میں نڈھال ہو کے جیسے اپنے آپ میں گر پڑتا۔
اسی عالم میں جب مجھے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی ایسا محسوس ہوا
کہ کوئی بہت دور سے مجھے آوازیں دے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ آواز اتنی قریب
ہوئی کہ میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔
کوئی میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ میں اٹھنے کی کوشش میں ہے کروٹ بدلی دیکھا
کہ سامنے جھکو بیٹھا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ میں
نے اس پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ "میں آ گیا ہوں لاڈلے!" اس کی
آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

یکایک میرے ہونٹوں اور میری پلکوں پر رعشہ طاری ہو گیا۔ اس نے
میرا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا اور میرے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "اچھا
ہو جا لاڈلے! بس اب اچھا ہو جا۔" اس نے میرے کانوں کی لویں کھینچنا
شروع کر دیں۔ "اٹھ کے بیٹھ۔" اس نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کے اپنے
سینے پر لٹکا لیا۔ "کیا پاگل ہو گیا ہے؟" وہ ناراضی سے بولا۔ "دنیا میں صرف تو ہی
تو نہیں رہتا اور لوگ بھی بستے ہیں۔ سلاؤ زرین! اسے دوا دو۔" زرین دوا کا
پیالہ لیے کھڑی تھی۔ میں نے تذبذب سے اسے دیکھا۔ جھکو نے زرین سے بڑھے
ہوئے ہاتھ سے دوا کا پیالہ چھین کے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے منہ
پھیرا تو جھکو نے ایک ہاتھ سے میری گردن پکڑ لی اور میرا سر ہلاتے ہوئے پیالہ
میرے حلق میں لوٹ دیا۔ دوا میرے سینے پر گر گئی تھی۔ جھکو نے اپنے کرتے
سے میرا چہرہ اور کپڑے صاف کیے۔ "اب بس ٹھیک ہو جا پہلوان!" وہ زور زور
سے میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔
"ان کا جسم دکھ رہا ہے۔" زرین نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔
"ہاں جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ میں سے دوا پلانے نہیں غیرت دلانے
آیا ہوں۔ سات سال جیل میں گزارنے سے ہو جاتا ہے جیسے مزدوری کر بارا، چاند میاں
جیسے جوان کے ہاتھ کو ٹھکانے لگا دیا۔ "اب" ہاتھ پیر ٹھیلا، بیٹھا مرنا چاہتا ہے۔" جھکو
نے تلخی سے کہا۔ "بہن کے پاس کس منہ سے جائے گا۔ جا مر جا۔" جھکو مجھے بستر پر
دھکا دیتا ہوا بولا۔
"اب ان سے ان سے ایسی......" زرین جھکو کی آنکھیں دیکھ کے چپ ہو گئی۔
"تم اب جاؤ زرین! جا کے سو جاؤ۔" جھکو نے کسی قدر نرمی سے کہا۔
"اب میں آ گیا ہوں۔ لاڈلا میرے سامنے بیمار نہیں رہ سکتا۔" زرین وہاں سے
نہیں ہٹی۔ جھکو نے اسے دوبارہ آرام کرنے کا حکم دیا۔ وہ سر جھکائے خاموشی
سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ "اچھا! اچھا!" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "تم لاڈلے کی اجازت
مانگتی ہو؟ لاڈلے! آ" اس نے میری ٹھوڑی اوپر اٹھا کے کہا۔ "اپنا نہیں تو اس
کا حال دیکھ۔ زرین نے دو دن سے منہ بند نہیں کی ہے۔ میرا حکم اس پر نہیں
چلتا۔ اب تو اپنی زبان سے اسے کر نکلنے کا حکم دے۔ بتا دے کہ اب تو اچھا
ہو گیا ہے۔ بتا دے کہ اب جھکو آ گیا ہے۔"
جھکو کی باتوں سے میری رگوں میں کھولن ہونے لگی تھی۔ میں نے پہلی بار
زرین کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ غم نے میلا دیا
تھا۔ اس نے کپڑے بھی ایسی ہی پہنے تھے جو میں نے اس کی پیاسی بھری
نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ جھکو نے ٹہوکا مار کے پھر مجھے اکسایا کہ میں اپنی
زبان سے زرین کو آرام کرنے کی اجازت دوں۔ میں نے نقاہت سے اسے
مخاطب کیا۔ ابھی میری زبان سے اس کا نام ہی ادا ہوا تھا کہ اس کے کملائے
ہوئے چہرے پر مسرت کی ایک لہر ابھری اور وہ بے قرار ہو کے میرے قریب
آ گئی۔ "اب تم کیسے ہو؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"مجھے موت نہیں آئے گی زرین!" میں نے نحیف آواز میں کہا۔

واپسی پر میری جیب میں پیسے نہیں تھے اور میں زرین تک سا پہنچ گیا تھا۔ اگر میں اس کے ڈبے میں داخل نہ ہوتا تو زرین کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ کبھی کبھار گھر دیکھنے پہنچنے کا یہ حال معلوم ہوگا تو وہ بہت خوش ہو گی۔

میری خاموشی سے تجمل کی الجھن میں اور اضافہ ہو گیا۔ دھوپ صحن میں پھیل چکی تھی مگر تجمل کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ چھوان کی تال زمین پر پڑی تھی اور تجمل دہشت سے اپنا چہرہ نوچنے لگتا تھا مجھے اس کی اس کیفیت سے خوشی سی ہوئی۔ ملازمہ نے آ کے اسے جھنجھوڑ کر بتایا کہ باہر بیٹھک میں جاموس اس کا منتظر ہے۔ تجمل کی چال میں پہلے جیسی تیزی نہیں تھی، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بیٹھک کے دروازے پر تجمل نے مجھے روک دیا۔ میں نے درشتی اور ناراضی سے اسے دیکھا مگر اس نے مجھے جاموس کی بات سننے کا موقع نہیں دیا۔ شہر سے جاموس نے شاید اور چمپا بائی کے متعلق کوئی خبر لایا ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ سے یہ باتیں کیوں چھپانا چاہتے تھے۔ اب پرسوں ہی کیا رہ گیا تھا۔ وہ نہ جانے اندر بیٹھے کیا کھسر پھسر کر رہے تھے۔ میں دروازے کے قریب منڈلاتا رہا۔ تجمل نے صبح ناشتے کے دوران میں کلیمن خاں اور جاموس کو حکم دیا تھا کہ وہ چمپا بائی کو ایک ہفتے کے اندر میرے قدموں میں ڈال دیں مگر اس طرح بھلا فہمیدہ واپس آ سکتی تھی۔ فہمیدہ تو منوں مٹی تلے دبی ہوئی تھی۔ ان کا خیال ہو گا کہ چمپا سے اپنی بہن کا بدلہ لے کے مجھے کوئی تسکین حاصل ہو جائے گی۔ چمپا کے نام سے میرے خون کی گردش ضرور تیز ہو جاتی تھی لیکن چمپا کا کیا قصور تھا؟ یہ تو چمپا کا کاروبار تھا۔ سزا تو مجھے خود کو دینی چاہیے تھی یا ان کو جو کہتے تھے جس گھر کی دیواریں نیچی ہوں وہاں چور گھس آتا ہے۔

ایسا چمپا بائی ہی کیا، ہزاروں چمپا بائیوں کے جھمیلوں میں پھنسا گھومتے، کے بعد بھی مجھے قرار نہ آتا۔ میں نے اپنی بہن کے پیروں میں گھنگرو بندھے دیکھے تھے۔ ان گھنگروؤں کی بازگشت اب تک میرے دماغ میں گونج رہی تھی۔ تجمل نے تک کے مجھے درہم برہم کر دیا۔ میں بستر پہ پڑا تھا تو ان لوگوں کی آنکھوں سے دور تھا جو یہ جان گئے تھے کہ فہمیدہ سے میرا کیا رشتہ تھا۔ کلکتے میں تجمل نے میرے گرد جو پہرا لگایا تھا، وہ یہاں بھی موجود تھا۔ شہر کے کتنے ہی لوگوں نے میرا چہرہ دیکھا تھا۔ جاموس کے کتنے ہی ساتھی ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ شہر میں جاموس کے لڑکوں نے کاشت کر چکا تھا۔ مجھے بھی چمپا بائی کی تلاش تھی لیکن میں اس سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے فہمیدہ کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟ ابا اسے کہاں ملے تھے؟ تجمل سمجھتا تھا کہ فہمیدہ کی موت کے بعد میری بدحواسی، بے ہوشی اور گم شدگی بے حسی کی بات ہے۔ تجمل کو تمام حالات معلوم کب تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ فہمیدہ کا چہرہ دیکھ کے میرے ذہن نے کیسے کیسے بھیانک خواب دیکھے تھے۔ میں بکار میں چپ رہا تھا اور آج میرے لبوں پر مہر تھی۔ ابا مجھے بے سر جانے کو کہتے تھے مجھے ان سے نظر ملانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اور میں غش کھا کے گر پڑتا تھا۔

تجمل نے ایک کشمکش سے نجات دلا کے دوسری سے دوچار کر دیا تھا۔ ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری میں منتقل کر دیا تھا۔ اس نے مجھے زنجیروں کے بجائے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ باہر جانے کا راستہ بند تھا۔ ممکن ہے وہ چمپا بائی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو ورنہ چمپا بائی انھیں تمام ماجرا سنا دیتی کہ فہمیدہ کس گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ کا نام کیا تھا۔ اس کے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ کیا گزری۔ مجھے چمپا بائی سے صرف اپنے طور پر ملنا چاہیے تھا یا ان کے پہنچنے سے پہلے اس کی زبان کاٹ لینی چاہیے تھی۔ اگر تجمل نہ آتا تو شاید میں حویلی کی بڑی دیواریں پھاندنے میں کامیاب ہو جاتا بشرطیکہ مجھے اپنا ہوش بھی رہتا۔

تجمل جلد ہی واپس آ گیا اور اس نے مجھے بتایا کہ نیلم جان سے شہر کا ایک نواب خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ نیلم جان اس نواب سراج علی کی حویلی پر خاص طور پہ بلائی جاتی تھی اور بند کمرے میں نواب کے سامنے ناچتی گاتی تھی۔ چمپا کے سازندوں نے اب تک جاموس کو یہ بات اس لیے نہیں بتائی تھی کہ وہ نواب سے خوف زدہ تھے۔ جب جاموس نے انھیں مجبور کیا تو انھیں نواب کا نام بتانا پڑا مگر وہ کوئی خاص بات نہیں بتا سکے۔ صرف اس قدر بتا سکے کہ نواب نے چمپا سے کئی بار نیلم جان کا سودا کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور چمپا نے خوش اسلوبی سے اسے ٹال دیا تھا۔ اس نے نواب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی نیلم جان کو بیچے گی تو اس کا گاہک بننے کی فرمائش کرے گا وہ اسے اس کی حویلی لے آئے گی۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔ سازندوں کا خیال تھا کہ خود نیلم جان بھی نواب سے متاثر تھی۔ نواب چمپا اور اس کے سازندوں کو ہمیشہ انعام و اکرام سے نوازتا۔ جب جاموس اور کلیمن خاں نواب سے ملنے کے لیے اس کی حویلی پہنچے تو انھیں بتایا گیا کہ نواب ان دنوں سخت بیمار ہے اور ایسی حالت میں ملاقات کرنے سے معذور ہے۔

تجمل کی زبانی یہ باتیں سن کے میرا جسم سن ہو گیا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ وہ یہ واقعات سپاٹ انداز میں سنا رہا تھا اور اس نے میری طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ اس کا ایک ایک لفظ میرے دل کو کاٹ رہا ہے۔ وہ نیلم جان کی زندگی کے پرزے تھے جو ملا کر وہ اپنے ہاتھوں سے جوڑ چکے تھے۔ میں تجمل کی چال سمجھ گیا تھا۔ وہ یہ سب سنا کے مجھے یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ کلیمن خاں اور جاموس میرے بارے میں کتنے فکرمند ہیں اور مجھ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں تھی کہ بس کرو، اپنا کام کرو، مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔ مجھ سے اتنی ہمدردی کا اظہار مت کرو۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے زرین بائی اتنی آہستگی سے میرے پاس آئی کہ مجھے اس کی آہٹ کا احساس بھی نہیں ہوا۔ "انھیں تبدیل کر لو۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں اجلے کپڑے لیے کھڑی تھی۔

مجھے گھر یاد آ گیا۔ جمعے کی نماز سے پہلے امی یا فہمیدہ اسی طرح میرے کپڑے نکال کے دیتی تھیں۔ میں کتاب پڑھتے یا کچھ لکھنے کے دوران اپنا اتنا کھویا رہتا تھا کہ امی یا فہمیدہ کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے برگشتگی سے اسے دیکھا اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ "آج جمعہ ہے؟"

"نہیں۔" وہ اداسی سے بولی۔ "آج پیر ہے۔" میں نے اس کے ہاتھوں سے کپڑے چھین لیے۔ "پانی گرم ہو گیا ہے مگر نہانے میں کوئی حرج نہ ہو گا۔" وہ ہچکچاہٹ سے بولی۔ "اگر طبیعت خراب ہو تو مت نہانا۔"

"مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میرا کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ "میں جانتی ہوں تم کتنے اداس ہو۔ گزرنے والے تو مر ہی جاتے ہیں البتہ ان کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہاں آنے کے بعد تم اس صدمے سے دوچار ہو گے۔ میں یہاں آنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تو آج یہ بات نہ ہوتی۔"

"اس کی موت اسی طرح لکھی تھی تو تم کیا کر سکتی تھیں۔ مجھے یاد ہے تم یہاں آنے پر کتنی خوش ہوئی تھیں۔ میں سوچتا تھا کہ تم اپنے تمام دکھ بھول جاؤ گی اور نئے سرے سے زندگی بسر کرو گی لیکن تمہیں ایک دن بھی سکون نہ ملا۔"

"میری ایک بات مانو گے؟" وہ افسردگی اور عاجزی سے بولی۔ "مجھے کہتے ہوئے جھجک ہوتی ہے لیکن تمہارا حال دیکھا نہیں جاتا۔ تم ٹھیک کہتے ہو، ہونے والی بات کو کون روک سکتا ہے۔ تم نہیں تو کوئی اور تمہیں لگے بہت سے کام کرتے ہیں۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ تم...... میں نہیں...... نہیں......" وہ گھبرانے لگی اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ٹھٹک کے بولی۔ "جاؤ، غسل کر لو۔ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ اس کے لہجے میں ایسا سوز تھا کہ میں نے ایک معمول کی طرح اس کی ہدایت پہ عمل کیا۔ وہ غسل خانے تک رہنمائی کرتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ابھی میں نے کرتا اتارا ہی تھا کہ مجھے بجلی کا لپکا سا لگا۔ کسی چیز کی کمی کا احساس ہوا اور میرے دل کی حرکت جیسے بند ہونے لگی۔ تیزی سے اپنا سینہ ٹٹولا۔ مالا میرے گلے سے غائب تھی۔ میں بوکھلاہٹ میں چیختا ہوا غسل خانے سے باہر نکلا۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ فہمیدہ کی ایک ہی چیز میرے پاس رہ گئی تھی۔ اس کی بھی میں حفاظت نہیں کر سکا۔ میری چیخ پکار سے حویلی کے ملازمین ادھر ادھر دوڑنے لگے اور اضطراب نے گھیر لیا۔ تجمل کے باہر آنے سے پہلے میں خود بیٹھک میں پہنچ گیا۔ "میری مالا کہاں ہے؟" میں نے دہشت زدہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ "میری مالا واپس کر دو۔"

"کون سی مالا؟" تجمل نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ مالا جو تم نے میرے پاس دیکھی ہو گی۔ وہ کسی کی امانت تھی۔ وہ بیٹھک میں نہیں ہے۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"لاڈلے ایک مالا کے لیے اتنی واویلا؟ میں کھیلنے کے لیے تجھے بہت لا دوں گا۔" تجمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں، مجھے وہی مالا چاہیے۔ آہ کسی نے میری مالا چھین لی۔" میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے جو چاہو لے لو مگر میری مالا مجھے واپس کر دو۔"

"لاڈلے! میں تجھے ویسی بہت سی مالائیں لا دوں گا۔" تجمل نے چمکار کر کہا۔ "اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"تم نہیں جانتے، تم اس کی قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے تجمل بھائی! خدا کے لیے جاموس، کلیمن خاں اور دوسرے لوگوں سے پوچھو کہ انھوں نے میری مالا تو نہیں دیکھی؟" میں نے اس کی منت کی۔

"تو دیکھ رہا ہے لاڈلے! سب باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ آئیں گے تو پوچھ لوں گا۔ مالا انھوں نے دیکھی ہو گی تو جائے گی کہاں۔ تجھے واپس مل جائے گی۔" تجمل ناگواری سے بولا۔

"مجھے ان کے پاس لے چلو۔ باہر چلو۔ ہم انھیں کہیں نہ کہیں تلاش کر لیں گے۔" میں نے تجمل کا دامن کھینچتے ہوئے کہا۔

"لاڈلے! اپنے اوسان ٹھیک کر۔ بالکل پاگل ہو گیا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ کچھ تو خیال کر کہ ہم ان کے یہاں ہیں۔ ذرا تسلی رکھ۔ انھیں واپس آنے دے۔" تجمل کے لہجے میں ناراضی اور تنگی شامل تھی۔ "چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جا اور ان کا انتظار کر۔" اس نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"آہ آہ۔" میں اپنا ماتھا پکڑ کے بیٹھ گیا۔ "میں کتنا کم بخت ہوں، کتنا کم ظرف ہوں تجمل بھائی! تم ٹھیک کہتے تھے مجھے ہوش میں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے فہمیدہ سے بات بھی نہیں کی۔ کسی حکیم، ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بجائے میں اس کے پاس بیٹھا اسے موت کے منہ میں دھکیلتا رہا اور میں نے اپنی مالا بھی کھو دی۔" میں گریہ کرنے لگا کیونکہ مجھے اپنی حالت پہ کوئی اختیار نہیں تھا۔ تجمل حیرت زدہ تھا اور مجھے خاموش کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے پھر کوئی میرا عزیز مر گیا ہو۔ آہ! وہ مالا جو کبھی نہ کبھی کورا تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی تھی، جس کے لیے میں نے بدھ گیا میں ایک شخص کا خون کر دیا تھا، جو کورا کی غیر حاضری میں اس کی حاضری کی حیثیت رکھتی تھی، جو میرے دکھ سکھ میں شریک تھی، جس سے میں راتوں کو کھیلا کرتا تھا اور جس کے دانوں پہ میں کورا کے نام کا ورد کیا کرتا تھا۔ جیل سے واپسی کے بعد وہ میرے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کورا کی تلاش میں ناکامی کا احساس جتنا شدید ہوتا جاتا تھا اتنی ہی شدت سے مجھے عزیز ہو گئی تھی۔ فہمیدہ خود تو گئی، مجھ سے میری مالا بھی چھین لے گئی۔ مجھے اپنا وجود حقیر محسوس ہونے لگا جیسے میں غریب ہو گیا ہوں، جیسے میں مفلوج ہو گیا ہوں، جیسے ہجوم میں کورا کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔

نہ جانے کیا ہوتا اگر اسی لمحے ملازمہ آ کے تجمل کو یہ اطلاع نہ دیتی کہ بی بی جی اسے اندر بلا رہی ہیں۔ بیٹھک میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس لیے تجمل نے خود جانے کے بجائے زرین کو وہیں بلا لیا۔ وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میں نے اسے حسرت و یاس کی نگاہ سے دیکھا اور بے تابی سے کہا۔ "زرین! میری مالا کھو گئی۔"

"کیسی مالا؟" وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی۔

"تم نے وہ میری گردن میں دیکھا ہو گا۔ میں اسے کرتے کے نیچے چھپا کے رکھتا تھا۔" میں نے رقت بھری آواز میں کہا۔

"اس مالا میں ایسی کیا خصوصیت تھی جو تم اتنے پریشان ہو؟"

"تم نہیں جانتیں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "وہ امانت تھی، وہ ایک تحفہ تھی۔ وہ میرے لیے سب کچھ تھی۔"

"کیا بہت قیمتی تھی؟ بھلا کتنی قیمت ہوگی اس کی؟"

"اس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔"

"تمہیں کس نے دی تھی وہ؟" زریں نے سادگی سے پوچھا۔

"وہ — وہ بس دی تھی ایک شخص نے۔ اس سے تم واقف نہیں ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ پھر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ مجھے زریں کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ "کیا؟ — کیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھا۔ "کیا تم نے وہ دیکھی ہے؟"

"ہاں دیکھی تو ہے۔" زریں سرگوشی میں بولی۔

"کہاں؟ مجھے جلدی بتاؤ۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"پہلے انعام کا وعدہ کرو۔" زریں مسکرا کے بولی۔

"انعام؟" میں نے اضطراب میں کہا۔ "جو تم کہو گی۔ جو تم کہو گی زریں! کیا واقعی وہ تمہارے پاس محفوظ ہے؟"

"بابا! آپ گواہ رہیے۔ یہ انعام کا وعدہ کر رہے ہیں۔ منہ مانگا انعام۔" زریں تجمل کے قریب جا کے بولی۔

"میں نے سن لیا ہے بٹیا! لاڈلے! زبان سے مت پھرنا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ میرے امکان میں جو کچھ بھی ہوگا، میں زریں کو دے دوں گا۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"بابا! دیکھیے، انھوں نے وعدے میں یہ شرط بھی رکھ دی۔"

"شرط نہیں زریں!" میں نے اداسی سے کہا۔ "میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ مگر میں تمہیں مالا نہیں لوٹا سکتا۔"

"میں اسے نہیں مانگوں گی۔" وہ شوخی سے بولی۔

"تو پھر جو جی چاہے مانگ لینا۔"

"وعدہ ہے؟" زریں نے تکرار کی۔

"ہاں اب مجھے مالا دکھا دو۔ تمہارے پاس محفوظ ہے نا؟"

زریں نے اپنی اوڑھنی ذرا سی سرکائی۔ مالا اس کے گلے میں چمک رہی تھی۔ بےاختیار جی چاہا، میں اسے اس کی گردن سے کھینچ لوں لیکن چند قدم چل کے رک گیا۔ زریں نے مالا اتار کے ایک بار غور سے دیکھی، پھر میری طرف بڑھا دی۔ مالا جب میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے اسے دیوانہ وار آنکھوں سے لگایا اور چومنا شروع کر دیا۔ زریں اور تجمل حیرت سے میری بے قراری دیکھتے رہے۔ پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے تشکر بھری آواز میں زریں کو انعام طلب کرنے کی پیشکش کی۔ زریں کچھ تذبذب میں پڑ گئی اور شرمیلے لہجے میں بولی۔ "میں سوچ کے بتاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ دنیا کی سرخی آ گئی۔ ایک دم قہقہہ ابھرا، تجمل کا قہقہہ بلند ہوا ہی تھا کہ وہ تیز قدموں کے ساتھ بیٹھک سے چلی گئی۔ میں اپنی مالا کے ملنے کی خوشی میں مصروف تھا اس لیے میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔

مالا کی گمشدگی اور بازیابی سے مجھے اپنی حالت میں خاصی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ گوکل کی یاد سے دل و دماغ میں ایک تازگی اور توانائی محسوس ہوئی۔ میں اپنے آپ سے پشیمان ہونے لگا کہ میں تین چار دن گوکل کے پاس حاضری نہیں دے سکا، جہاں حاضری کا سلسلہ اس سے پہلی ملاقات کے وقت سے جاری تھا۔ مگر یہ کیفیت عارضی ثابت ہوئی۔ جامو اور کبھن لال کے آنے کے بعد میرے خواب پھر بکھر گئے۔ وہ آتے ہی فہمیدہ کا تذکرہ کرنے لگے۔ ان کی دن بھر کی بھاگ دوڑ کا حال سن کے میرا سر ندامت سے بوجھل ہونے لگا۔ ابھی تک انھیں جیا بائی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ جامو نے اپنے آشناؤں میں یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ ظلم جان آج کل میں جیا بائی کے کسی […] سے ناراض ہو کے دل برداشتہ ہو گئی تھی اور نتیجے میں اس نے چھلانگ لگا کے خودکشی کر لی۔ جامو نے آج بھی پولیس والوں کو […] باز پرس کرتے سے روکے رکھا تھا۔ لوگ میرے سامنے فہمیدہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔ رات گئے تک یہی گفتگو ہوتی رہی۔ لوگ آتے جاتے رہے اور جامو بار بار اس کی […] کی تکرار کرتا رہا۔ میں اٹھ کے وہاں سے چلا آیا۔ تجمل بھی […]

رات کو میں نے موقع پا کے حویلی کے گرد ایک چکر لگایا۔ ادھر ملازمین کے مکانات تھے۔ اُدھر ویرانی، باغ کے بعد حویلی کی عمارت تھی۔ حویلی کی چار دیواری خاصی اونچی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں سے فرار مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ ابھی میں نے پورا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کچھ سائے رینگتے ہوئے نظر آئے۔ میں ٹھٹک کے ایک جگہ رک گیا۔ وہ جامو کے ساتھی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تجمل میرے ارادوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ اُدھر حویلی کے ملازم ہیں تو ادھر جامو کے ساتھی۔ تجمل کی نگاہ ہر جگہ موجود ہے۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ تیسرا دن گزر گیا۔ میرا خیال تھا کہ تجمل آخر کب تک فیض آباد میں مقیم رہے گا۔ کلکتے میں تھانیدار کے قتل کا واقعہ […] تھا اور تجمل کی طویل غیر حاضری کو جامو کے ساتھی کتنے ہی دن […]۔ تجمل کو جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہیے تھا مگر وہ حیرت انگیز طور پر ٹھہرا رہا۔ آتے ہوئے پانچ دن گزر گئے تھے۔ جامو بہ تدریج بدل […] اور بیزاری چھاتی گئی۔ میں نے اس دوران […] راتوں کے وقت کئی بار اٹھ کے حویلی سے باہر نکلنے کی تدبیر کی لیکن مجھے ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جتنا وقت گزر رہا تھا مجھ پر مایوسی کا غلبہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے زیادہ وقت حویلی کے اندر ہی گزارنا شروع کر دیا تھا اور لوگوں سے بات چیت کم کر دی تھی۔ زریں سے اب رسمی گفتگو ہوتی تھی۔ وہ […] سنجیدہ ہو گئی تھی۔ […] کھانا لے کے چلا جاتا۔ […] کرنے کو آتی۔ […] قریب مجھ سے ادھر ادھر کی بات کرتی، […] میری طرف سے کوئی […] تو وہ بھی خاموش رہنے لگا۔ زریں کی آنکھوں میں اب ہمیشہ […] تھے اس لیے میں نے اس کی جانب نظر اٹھانے کی بھی احتیاط شروع کر دی تھی۔

پانچویں دن شام کے وقت میں باغ کے بستر پہ لیٹا ہوا تھا کہ ایک بوڑھے ملازم کے ذریعے تجمل نے مجھے بلایا۔ زریں نے تجمل کے بیٹھنے کا انتظام حویلی کے اس خاص حصے میں کیا تھا جو ایک زمانے میں اس کے باپ کے استعمال میں رہتا تھا۔ میں آہستہ قدموں سے جب اس کمرے میں داخل ہوا تو تجمل وہاں تنہا تھا اور ایک پلنگ پر فکرمند سا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے ایک کاغذ رکھا تھا۔ "لاڈلے!" اس نے گمبھیر آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "اب تو تُو سب سے خفا معلوم ہوتا ہے۔"

"میں بات کیا کروں؟" میں نے چڑچڑے پن سے کہا۔

"تجھے مرچیں کھلانی پڑیں گی شہزادے! بات کرتا رہا کر، آدمی […] کسے تو سارا معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔ لے تو یہ کاغذ پڑھ۔" اس نے کاغذ مجھے تھما دیا۔

"کیسا کاغذ؟" میں نے کسمساتے ہوئے اسے ہاتھ میں لیا۔

"دیکھ اس میں کیا لکھا ہے؟" تجمل سنجیدہ لہجے میں بولا۔

میں نے اسے کھول کے دیکھا۔ وہ کوئی قانونی دستاویز تھی۔ تازہ تازہ۔ میری آنکھیں تیز ہو گئیں۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ زریں نے اپنی تمام جائیداد، حویلی، زمینیں سب کچھ میرے نام کر دیا تھا۔ جیسے جیسے میں کاغذ پڑھتا جا رہا تھا میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ زریں نے غیر مشروط طور پہ اپنی تمام جائیداد سے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ میری عقل خبط ہو گئی اور میرے ہاتھوں میں کاغذ تھرتھرانے لگا۔

"کیا ہو گیا لاڈلے؟" تجمل نے میرا شانہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" میرا منہ کھلا ہوا تھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ مذاق نہیں ہے لاڈلے!" تجمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر — مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بکواس نہیں بھائی! ان چیزوں کی ضرورت سب کو ہوتی ہے۔"

"میں یہ کاغذ پھاڑ دیتا ہوں۔ میں اسے جلا دوں گا۔"

"وہ کہتی ہے کہ اس کی نقلیں اس کے پاس موجود ہیں۔" تجمل ہنستے ہنستے […] "اس نے شہر کا بڑا وکیل بلایا تھا۔ اس نے مجھے بھی خبر نہیں ہونے دی۔ […] یہ کاغذ […] میں کچھ کچھ سمجھ گیا تھا کہ […] مگر لاڈلے! اس نے اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں رکھا۔"

"سب اس کا ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے کاغذ پلنگ کی طرف اچھال دیا۔ "وہ کیا چاہتی ہے؟"

"[…] تماشا کیا ہے۔ بٹیا نے ہم دونوں کا امتحان لیا ہے […] سوچ سمجھ کے۔"

"[…] کیا زریں ہمیں لالچی سمجھتی ہے؟"

"[…] میں تو بٹیا کا منہ چوم لوں گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا، اس نے یہ کیوں کیا ہے؟"

"بٹیا کی نیت پر شبہ مت کر۔ وہ تجھے لالچی نہیں سمجھتی ہے۔ […] یہ کاغذ بٹیا کے آنسوؤں میں لاڈلے! یہ بٹیا کی زبان ہیں۔ تو نے پڑھا نہیں؟ اس نے کوئی شرط نہیں رکھی ہے۔ آج سے یہ سب تیرا ہے۔ تو بڑا مالدار ہو گیا ہے۔ مگر یار لاڈلے! یہ مت سمجھنا کہ بٹیا نے تجھے تیری خدمت کا معاوضہ دیا ہے۔ اس کے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔ اس نے خود کو ہماری عدالت میں پیش کر دیا ہے۔"

"میں اس سے بات کروں گا۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "لاؤ یہ کاغذ مجھے واپس کر دو۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔"

"لے۔" تجمل شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "ذرا احتیاط سے بات کرنا۔ […] غصہ آ سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میرے قدم رک گئے۔

"بٹیا کا تو نے اندازہ کر لیا؟ وہ کم عمر ہے مگر بڑی سوجھ والی ہے۔ اُسے غصہ آ جائے گا تو وہ عمر بھر رلاتی رہے گی۔ پھر فہمیدہ کی طرح تو اس کا سوگ کرتا رہے گا اور اس لڑکی کی طرح بھی، جس نے تجھے غصے میں مبتلا کر رکھا ہے، جس کی مالا تیری گردن میں پڑی ہوئی ہے۔" میں نے خشمگیں نظروں سے اُسے گھورا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ "اب […] خراب نہ کر لاڈلے! اب جا جلدی جا۔"

زریں کے پاس جاتے وقت میری چال میں پھرتی نہیں تھی۔ میں نے طے کیا میں آج اُسے سب بتا دوں گا۔ اُس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں یہاں کیوں نہیں ٹھہر سکتا۔ میں نے بارہا اشارتاً اُسے یہ بتانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کیوں نہیں سمجھتی تھی۔ زریں شاید میری آمد کی منتظر تھی۔ میں جو سوچ کے گیا تھا، وہ دروازے پہ قدم رکھتے ہی بھول گیا۔ اس نے غرارہ پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے پہ اطمینان اور سکون چھایا ہوا تھا۔ ہونٹوں اور رخساروں سے گلابی رنگ چھلکا پڑتا تھا۔ آج اس کے بال بھی سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔

میری آمد پہ جب وہ کھڑی ہوئی تو مجھے خوف آنے لگا۔ وہ ایک مکمل لڑکی […] تھی۔ اس کا قد نکلا ہوا تھا جیسے ابھی اور بڑی ہو گی۔ آنکھیں غزالی، چہرہ کتابی، رنگ گلابی تھا۔ وہ سانچے میں ترشی ہوئی تھی اور اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ صرف یہ کہ اس کے قد اور جسم کے مطابق اس کی آنکھوں میں پختگی نہیں تھی۔ وہ کچی کچی تھیں اور یہ کچا پن اس کے چہرے پر بھی نمایاں تھا۔ جیسے اس کے چہرے پہ ابھی ابھی تازہ گلابی رنگ چڑھایا گیا ہو۔ دیکھنے کے لیے اکثر رنگ کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ […] تازہ اور معصوم نظر آتی تھی۔ "زریں!" میں نے اسے مخاطب کرنے کی ہمت کی۔ "تم نے یہ کیا کیا ہے؟"

اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ "زریں! میرے لیے یہ سب […] میں ان کا کیا کروں گا؟" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا، مجھے دور جانا ہے۔ نہ معلوم کتنی دور جانا پڑے۔ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ میں کہیں نہیں رک سکتا اور اسی لیے میں نے تم سے فیض آباد آنے کے لیے اصرار کیا تھا اور تم نے

میری بات قبول کرلی تھی اب تم نے یہ کیا کردیا؟"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اس بہانے سے میں یہاں رُک جاؤں گا؟ زرین! میں نہیں رُک سکتا۔ میں نہیں رُک سکتا، چاہے تجمل بھائی کتنے ہی بے چینی کے رنگ لگائیں مجھے ایک دن یہاں سے جانا ہے زرین! میں نے تم سے کہا تھا کہ فیض آباد سے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو میں ضرور تمہیں لینے آؤں گا۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ تجمل بھائی جانو کپتن خان کوئی نہیں جانتا تھا۔ تم اُن سب سے علیحدہ ہو کم از کم تمہیں تو میری بات سمجھنی چاہیے۔"

"تم نے یہ کیسے جانا کہ میں کچھ نہیں سمجھتی؟" اس نے اپنی زبان کھولی۔

"پھر تم نے یہ حویلی سے گٹھڑی کیوں لا دی۔"

"اس لیے کہ میں اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ خدا کے لیے تم اس سے کچھ اور مطلب نہ لینا۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"مگر میں .... مجھے آگے جانا ہے۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"تمہیں کوئی نہیں روک سکتا۔" اس نے یاسیت سے کہا۔ "تم جانا چاہو گے تو ضرور جاؤ گے میں تمہیں روک کیا نہیں رہی ہوں تم جاؤ۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"زرین! زرین! میری اچھی زرین! مجھے اتنا بُرا مت سمجھو میں مجبور ہوں ورنہ رُک جاتا۔ تم یہ گٹھڑی واپس لے لو۔"

"دی ہوئی چیزیں واپس نہیں لی جاتیں۔"

"میں اس کا کیا کروں گا؟" میں نے پیچ و تاب کھا کے کہا۔

"تم یہ سب جلا دو، گاڑ دو جو چاہے کرو۔ اسے بیچ دو اور فقیروں میں خیرات کردو مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"تو تمہیں میرا کوئی خیال نہیں ہے؟"

"میں تم سے منت کرتی ہوں۔" اس نے عاجزی سے کہا۔ "تم جہاں بھی جاؤ مجھے اپنے ساتھ لیتے جاؤ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی بس تمہارے ساتھ سفر کرتی رہوں گی۔ میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔"

"لیکن ... لیکن میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"کیوں نہیں لے جا سکتے؟" وہ ناراضی سے بولی۔

"اس لیے کہ مجھے خود پتہ نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"زرین! تم نے ایک بار پہلے بھی میری بات مان لی تھی۔ یہ حویلی تم اپنے نام پر لکھو جب میں واپس آؤں گا تو پہلے تم مجھے دے دینا" میں نے ترشی سے کہا "میں تو تم سے یہ کہنے والا تھا کہ تم مجھے کسی بہانے سے یہاں سے باہر نکلنے میں مدد دو جتنی دیر ہو رہی ہے میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے میرے ساتھ ایک احسان کرو۔ میں تمہیں ضرور ساتھ لے جاتا زرین لیکن میں تمہیں اُن مشکلوں سے دوچار کرنا نہیں چاہتا جو مجھے پیش آسکتی ہیں۔ تم میرے لیے اس جائداد سے دست بردار ہو سکتی ہو مگر میری خوشی کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔"

اس نے نظر اٹھا کے دیکھا اس کے نتھنے ابھر گئے تھے اور ہونٹ بُری طرح پھڑک رہے تھے۔ "جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔" اس کی آواز پھٹ گئی۔ "جاؤ، میں تمہیں رات کو حویلی سے نکال دوں گی۔"

"زرین!" میں نے اس کی جانب لپک کے کہا۔ "اس طرح مت خفا ہو، اگر تم یہ دوری گوارا کرتی ہو تو پھر خوشی خوشی مجھے رخصت کرو۔" میں نے اس کی خوشامد کی۔ "کیا تم کم از کم مجھے باہر نکال سکتی ہو؟ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تم نے مجھے باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ زرین! پھر تم میرے لیے دعا کرتی رہنا، تمہاری دعائیں ضرور قبول ہوں گی۔ امی کہتی تھیں کہ لڑکیوں کی دعائیں جلد ہی قبول ہوتی ہیں۔"

"میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔" وہ ٹھیک طرح کہہ نہیں سکی۔

"زرین! میں ضرور رُک جاتا مگر کیا کروں؟ اگر رُک گیا تو میرا بُرا حال ہوگا جو تم دیکھ رہی ہو میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔"

"تم ضرور جاؤ۔" اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں زیادہ دیر وہاں ٹھہرا تو زرین کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔ میں چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔

* * * * *

شام کو حسبِ معمول فیض آباد کے تمام پتنگ باز، مرغ باز، عجیب تراش، داؤگیر اور پہلوان استاد تجمل کے رنگ بیٹھک میں جمع ہو گئے۔ روز بروز ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ کلکتے سے کپتن خان کے کئی ساتھی بھی یہاں آنے لگے تھے جن سے یہ معلوم ہوا کہ استاد تجمل کلکتے سے فیض آباد آیا ہوا ہے اور ایک طوائف چمپا بائی کی تلاش میں ہے۔ وہ آتے ہی بیٹھک میں آ بیٹھے اور سلام کرنے والوں سے ملتے رہے۔ پانچ دن گزر گئے تھے اور ابھی تک جاسوس چمپا بائی کو تلاش نہ کر سکا تھا۔ نہ نواب سراج علی سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ تجمل کی خدمت میں ہر وقت جاسوس کے ساتھی موجود رہتے تھے۔ کوئی اس کے جسم کی مالش کرتا تھا کوئی پیر دباتا تھا اور کوئی اصرار کرتا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کلکتے لے چلے۔ تجمل ہاں ہاں کرتا رہتا تھا۔ وہ شام میں نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔ رات کا کھانا بیٹھک میں کھایا گیا۔ رات گئے تک بیٹھک میں لوگ موجود تھے۔ میں زرین کی بات ٹٹولنے کے لیے کئی بار اندر گیا تھا اور مجھے سراسر مایوسی ہوئی تھی۔ وہ دکھائی نہیں دی کیونکہ کوئی بھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ رات کو بارہ بجے بعض ساتھی بیٹھک کی فرشی نشست پر لیٹ گئے اور باقی رخصت ہو گئے۔ تجمل اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے کمرے کا دروازہ تجمل کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ تجمل کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ رات کو زرین ماما کے ساتھ دودھ لے کر آئی۔ سب سے پہلے تجمل کے کمرے میں گئی پھر میرے پاس آئی۔ ماما دروازے کے قریب کھڑی تھی جیسے ہی اس نے دودھ کا گلاس میری مسہری کے قریب رکھا میں نے سرگوشی کی "یہ کیا ہے زرین؟"

اس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں اور آہستگی سے کہا: "میں جاگ رہی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں بعد میں میرا آنا مشکل ہوگا۔"

میں دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے کمرے کی روشنی مدھم کر کے اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ تجمل نے بھی مجھے اس کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا اور خود کروٹ بدل لی۔ گھڑی میں بارہ بج چکے تھے۔ زرین کے کمرے میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ ملازمائیں دوسری طرف چلی گئی تھیں۔ میرا دل قابو میں نہیں تھا۔ زرین نے راستے میں ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا۔ میں کشمکش میں مبتلا تھا کہ کہیں اس نے فیصلہ تو نہیں بدل لیا ہے۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے کس طرح حویلی سے باہر نکال سکتی ہے کہیں وہ تجمل سے خوف زدہ تو نہیں ہو گئی۔ کہیں اس نے شام کو ہی بتا تو نہیں دیا تھا۔ وہ الماری سے کپڑے نکال رہی تھی۔ یہ کپڑے اس نے ایک بڑے تھیلے میں رکھے۔ میری آنکھیں حیرانی سے پھٹنے لگیں۔ سامان کی کیا کمی تھی۔ ایک چھوٹا آئینہ، کنگھی، تیل کی شیشی، مسواک، کسی دوا کی گولیاں یہ سب رکھ کے اس نے تھیلا بند کر دیا پھر وہ ایک نفیس کمبل اٹھا لائی۔ جب وہ یہ سب کام کر چکی تو اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر گٹھڑی پر ڈالی اور کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ میں نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے خوف آتا تھا۔ کسی دلیل اور حجت بازی کے لیے میں خاموش ہی رہا۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا میں نے کہہ دیا تھا۔ اب اسے بھی کچھ سننے کی خواہش نہیں ہوگی۔ گٹھڑی رکھ کے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ دروازے سے باہر جھانک کے دیکھا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی چال میں توازن نہیں ہے۔ "بہکی بہکی سی ہو زرین!" میں نے اندر کمرے ہی میں اسے آہستہ سے مخاطب کیا۔ "کیا ذرا دیر کے لیے رُک جاؤ۔"

مسکنے کی سی کیفیت سے وہ دوچار تھی۔ اس نے جسم جھٹکا کے ٹھہر گئی اور میری جانب بھیگی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ "زرین! تم نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ نہ معلوم کیا حالات پیش آئیں، میری واپسی ہو سکے یا نہیں لیکن اگر زندہ رہا تو بہرحال اِدھر آؤں گا۔ تم مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں نے سب کچھ سچ کہا ہے۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ زرین! میں چاہتا ہوں جب آؤں تو تمہارے چہرے پر فکر کی کوئی لکیر نہ دیکھوں۔ بہت یاد آؤ گی! اپنی صحت کا خیال رکھنا اور یہیں اس حویلی میں مجھے ملنا۔ مجھے بھول مت جانا۔ تجمل بھائی یقیناً کوئی اچھا انتظام کر دیں گے۔"

"کیا تم مجھے یاد کرو گی؟" میں نے اس کے بہت قریب جا کے کہا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ کسی بات کا جواب نہیں دیا نہ ہاں نہ نہیں۔ "زرین!" میں نے ایک بار لفظوں سے کہا۔ "تم میری غیر حاضری میں خوش رہو گی۔ میرے لیے ضرور دعا کرو گی۔ تم تم مجھے یاد رکھو گی۔" بار بار میں نے اس کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن میرے ہاتھ اٹھ کے رہ گئے۔ اس نے کمبل اپنے شانوں پر ڈالا اور گٹھڑی اٹھا لی۔ میرے دل میں آیا کہ یہ موقع نکل جاتا تو نہ جانے کب ہاتھ آتا۔ میں آہستہ سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس نے دالان میں آ کے ایک نظر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ حویلی میں سناٹا طاری تھا۔ زرین چند قدم آگے چل کے بائیں جانب مڑ گئی۔ ایک تنگ جگہ سے گزر کے اس نے ایک دروازے کو دھکا دیا۔ میں نے اس کی پیروی کی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ زرین نے دیا سلائی جلا کے ایک لالٹین جلائی۔ روشنی کی تو کمرے کا منظر آنکھوں پر کھلا۔ وہ قالین پر ٹیڑھے ٹیڑھے قدموں سے چلتی ہوئی ایک دوسرے دروازے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ دوسرے کمرے میں قدیم کتابیں الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں اور فضا میں ایک عجیب بُو پھیلی ہوئی تھی۔ کتب خانے کا دوسرا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ باغ میں جھینگروں کا شور غالب تھا اور جگنو چمک رہے تھے۔ ایک مختصر راستہ طے کر کے زرین باغ کے شمالی حصے میں آ گئی اور اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ میں نے بھی پیچھے مڑ کے دیکھا کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

زرین نے ایک بار پھر گرد و پیش کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ پھر وہ گھاس کی باڑھ میں گھس گئی۔ یہ جگہ سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ باڑھ کے اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کے آگے ایک کوٹھری تھی۔ زرین نے نہایت احتیاط سے کنڈی کھولی۔ سکوت میں کنڈی گرنے کی ہلکی سی آواز سے ایک لمحے کے لیے خلل پیدا ہوا اور دروازہ ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ زرین نے دروازہ بھیڑ دیا اور دیا سلائی روشن کر کے موم بتی جلا دی۔ اس کوٹھری کے اندر ایک اور مختصر کوٹھری تھی۔ جہاں کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ مکڑیوں کے جالے دروازے اور دیواروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ زرین نے اس تنگ جگہ کے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے کی لکڑی کالی اور مضبوط تھی اور درمیان میں ایک بڑی کنڈی کے ذریعے اسے جکڑا گیا تھا۔ اور اس میں ایک موٹی کنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹا دروازہ پتھر کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ زرین یہ دروازہ بھی خود ہی کھولنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے ایک طرف ہٹایا اور کنڈی اٹھانے کے لیے زور کرنے لگا۔ کنڈی شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی تاہم میری قوت کی جد و جہد سے ہٹ گئی۔ میں نے کنڈی کھولی اور آہستہ آہستہ دروازہ اندر کی طرف کھینچا۔ دروازے کی چولیں چٹخنے کی آواز کوٹھری میں ابھری تو کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ زرین کی چیخ نکل گئی۔ دروازے کا پٹ کھلنے کی امید پیدا ہوئی تو میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور زرین کی طرف دیکھنے لگا۔ زرین نے تھیلا آگے بڑھا دیا اور کمبل اپنے شانے سے اتار لیا۔ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ سوچا کہ واپس ہو جاؤں۔ اس اندھیری رات میں زرین اکیلی کیسے اپنے کمرے میں واپس جائے گی۔ اُسے نیند بھی نہیں آئے گی اور پھر خدا جانے بعد میں اس کا کیا حال ہو۔ میں نے تھیلا اور کمبل زمین پر رکھ دیا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ کبھی سرخ ہوتا تھا کبھی زرد۔ اس کی آنکھیں کبھی روشن ہو رہی تھیں کبھی بجھ جاتی تھیں۔ میں نے تھیلا اٹھایا۔ "میں جا رہا ہوں زرین!" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا حافظ!" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

"میں واپس آؤں گا زریں!" میرا دل چاہا بڑھ کے اُسے گلے لگا لوں۔ میرا سینہ جلنے لگا اور میری آنکھوں میں لرزش ہونے لگی۔ "تم کچھ اور نہیں کہو گی؟" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔ میرے لیے تو خط لکھ دینا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ رکھ لو۔" اُس نے ایک بندھا ہوا رومال میرے آگے کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے اُسے جلدی جلدی کھولنا چاہا۔ اُس کے اندر نوٹوں کی کچھ گڈیاں تھیں اور ایک چاقو تھا۔ بڑا نام لو پوری چاقو۔

"زریں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بہت ہے کہ تم نے مجھے باہر آنے دیا۔ مجھے تو پیسوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں انہیں کہاں رکھوں گا کیونکہ میری کوئی منزل نہیں ہے۔"

"اسے کو ڈھونڈتے رہنا۔" اُس نے رقت سے کہا۔

"زریں!" میں آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ "زریں! خوصورت … تم سے ہی اچھا ہے میں خود ہی واپس آؤں گا۔" زریں کا … سامان اُٹھا لیا اور زریں کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ پھر میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔

حویلی کے باہر ایک چوڑی گلی تھی۔ میں احتیاط سے گلی عبور کر کے دوسری جانب رینگ گیا۔ ہر سُو اندھیرا تھا اور میرے دماغ میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ زریں کی حویلی سے نکل تو آیا مگر ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دل پریشان ہونے لگا۔ زریں کا چہرہ اس اندھیرے میں بھی اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ باہر کی کھلی فضا بڑی حبس زدہ تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ کدھر جاؤں؟ کون سا راستہ اختیار کروں؟ کون سا راستہ کدھر کی طرف جاتا ہے اور کس طرف چلتے ہوئے بابا جان نے ڈیرا جمایا ہوا ہے۔ میں ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا اور وہاں سے مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا کھلی سڑک پر آ گیا۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنیاں اونگھ رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے چلتے چلتے مجھے ایک چوراہا نظر آیا۔ وہ چھوٹے سے جھونپڑی نما ہوٹل کے بیچوں بیچ میں سے روشنی کی کرنیں نکل رہی تھیں اور زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہاں دو تین تانگے بھی کھڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل میں جانے کے بجائے میں ایک تانگے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں تانگے والا آ گیا اور دزدیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کدھر جانا ہے بابو جی؟"

"کیا تم شہر کے تمام گلی کوچوں سے واقف ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی! ان سڑکوں پہ تانگا چلاتے ہوئے عمر بیت گئی ہے۔ کہو کہاں جانا ہے بابو؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجھے نواب سراج علی کی حویلی جانا ہے۔" میں نے لمبی سانس کھینچ کے کہا۔

وہ نواب کے نام پہ چونک پڑا … لگا اور مجھ سے محلّے کا نام پوچھنے لگا۔ محلّے کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ہوٹل میں جا کر پوچھنے کے لیے گیا۔ "چلو جناب تشریف رکھو۔ پردیسی معلوم ہوتے ہو؟" اُس نے چابک اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ "کون سی گاڑی سے آئے ہو جناب؟"

"کسی گاڑی سے نہیں۔" میں نے چبا چبا کے کہا۔ "باتیں کم کرو اور تانگا زیادہ چلاؤ۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔"

اُس نے پلٹ کے ترشی سے دیکھا اور کہا۔ "آپ جانیے جناب! ہم تو پیٹ کی سواری بٹھاتے ہیں، میٹھے بول کے عاشق ہیں۔"

"میں نے کون سی کڑوی بات کہی ہے؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "ہر وقت آدمی میٹھے بول نہیں بول سکتا۔ میری طبیعت خراب ہے۔"

"تو پھر کہیے تو پہلے کسی حکیم کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔"

"نہیں شکریہ، مجھے پہلے وہیں جانا ہے۔" میں نے اُکتا کے کہا۔

"دولت خانہ کہاں ہے جناب کا؟" وہ گھوڑے پہ چابک لہراتے ہوئے بولا۔

"رنگ پور۔"

"یہ کہاں ہے جناب؟"

"بنگال میں … راستہ کتنی دور ہے؟"

"اطمینان سے بیٹھیے، پہنچا دوں گا بابو جی۔ … کا شکار ہے۔ یہ لفظ بھی بڑی بُری چیز ہوتی ہے۔"

اُس نے سارے سفر ایک لمحے کے لیے زبان بند نہیں کی۔ … تیور دیکھ چکا تھا اس لیے ہوں ہاں کر کے اس کی باتوں کے جواب دیتا رہا۔ شاید ہر تانگے والا اتنا ہی بولتا ہے۔ … گھنٹے بعد تانگا ایک عمارت کے سامنے رک گیا۔ یہ عمارت زریں کی حویلی سے بڑی نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا اور پہرے دار موجود نہیں تھا۔ میں نے جیب سے … نکال کے تانگے والے کو دیے تو وہ مجھے دعائیں دینے لگا اور کھڑا رہا۔

"تم اب جاؤ۔" میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔

"نہیں جناب! پہلے دروازہ تو کھل جائے۔ تسلی کر کے جاؤں گا۔ اگر دروازہ نہیں کھلا تو آپ رات کو کہاں ٹھہریں گے؟"

"دروازہ کھل جائے گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ … میں حویلی کی چار دیواری کا چکر نہیں لگا سکتا تھا … ناچار میں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ تانگے والا بھی میری مدد کو آ گیا۔ … سونے والے پہرے دار کو گالیاں دینے لگا۔ خاصی دیر کی چیخ پکار کے بعد کسی نے آواز لگائی۔ جواب میں میں نے اپنا نام فتح علی بتایا اور خود کو نواب سراج کا عزیز ظاہر کیا۔ تانگے والے نے میری حمایت میں جواب دیا۔ "بابو جی … سے آئے ہیں۔ بے خبر میاں! دروازہ کھولو ورنہ نواب صاحب کی … دروازے کے … کھڑکی کھل گئی۔ اندر سے ایک … چہرے پہ بڑی بڑی مونچھوں کے سوا کچھ نہیں تھا، برآمد ہوا اور میرا سر سے پیر تک جائزہ لینے لگا۔ "رنگ پور سے؟" اُس نے منہ بنا کے پوچھا۔ "بھلا آپ کون ہیں نواب صاحب کے؟"

"میں اُن کے لیے اپنے چچا کا خصوصی پیغام لے کے کلکتے سے آیا ہوں۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "نواب صاحب کو جگا دیجیے۔ پیغام نہایت ضروری ہے۔"

"نواب بہادر بیمار ہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔ "صبح آئیے۔"

"ارے گھر آئے مہمانوں سے ایسی باتیں کرتے ہو؟" تانگے والا ناراض ہو گیا۔ "نواب صاحب کو پتہ چلے گا تو کھڑے کھڑے حساب کر دیں گے۔"

"میں آپ کو مہمان خانے میں ٹھہرا سکتا ہوں مگر نواب بہادر سے ملاقات صبح ہی ہو سکتی ہے اگر اُن کی طبیعت ٹھیک ہوئی۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جائیے جناب آرام کیجیے۔ … گاڑی لیٹ ہو گئی … دربان میاں کی … بھلا … نواب سراج علی کی حویلی کے پہرے دار ان کے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں۔ واہ میاں … بابو جی کا چہرہ نہیں دیکھتے … سے کم نہیں۔ ان کی طبیعت بھی خراب ہے۔ جا جا۔" تانگے والے اور پہرے دار میں تُو تُو میں میں ہونے لگی تو میں نے دخل دے کے معاملہ رفع کر دیا۔ تانگے والا مجھ سے سلام دعا کر کے بڑی مشکل سے رخصت ہوا۔ پہرے دار دروازہ بند کر کے بڑبڑاتا ہوا مجھے عمارت میں لے گیا۔ … نچلی ہی منزل پر ایک علیحدہ حصے میں اُس نے مجھے ایک آراستہ کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے اُس کی خوشامد کی کہ وہ نواب صاحب کو … اور ان سے درخواست کرے … میرا نام سن کے وہ خود دروازہ کھول دیں گے۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے توبہ کرنے لگا۔ میں نے اُسے لالچ دیا تو وہ کچھ مشکوک ہو گیا۔ زریں نے مجھے … دیا تھا۔ میں نے سوچا … ظاہر ہے میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے … ہی نکل جانا چاہیے تھا … اگر … پتہ چلے کہ میں ابھی تک غائب ہوں۔ پہرے دار کے انکار پر مجھے غصہ آنے لگا۔ اتنی بڑی حویلی میں کسی کی مدد کے بغیر میں نواب کا کمرہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ وہی میری مدد کرے۔ میں نے اُسے مختلف انداز میں نواب سے تعلقات کی اہمیت جتائی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ مجبوراً مجھے اُس سے سخت لہجے میں بات کرنی پڑی۔ اس کا الٹا اثر ہوا۔ اس نے مجھے حویلی سے باہر نکالنے کی دھمکی دی تو میں نے اُس کا کندھا پکڑ لیا۔ "چلو۔" میں نے اپنی جیب سے چاقو نکال کے کہا۔ "مجھے نواب کے کمرے میں لے چلو۔" اُسے مجھ سے ایسی … کی توقع نہیں تھی۔ پہلے تو وہ اپنی بات پر جما رہا لیکن جب میں نے اُس کے گال پہ ایک ہاتھ رسید کیا تو گھگھیا کے آمادہ ہو گیا۔ "خاموشی سے چلے چلو۔" میں نے اُسے دھکا دیتے ہوئے حکم دیا۔

"جناب ہماری عمر بھر کی بنی بنائی خاک ہو جائے گی۔" وہ گڑگڑایا۔ پھر … منزل کی سیڑھیوں پر ٹھہر کے بولا۔ "مجھے جان سے مار دیجیے مگر مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔"

"تم کسی بات کی فکر مت کرو، میں نواب صاحب سے تمہاری سفارش کروں گا۔ میں کسی بُرے ارادے سے نہیں آیا بڑے صاحب! مجھے یہاں ڈاکا نہیں ڈالنا۔ ڈاکا ڈالنا ہوتا تو میں تمہیں پہلے ہی ختم کر چکا۔ مجھے نواب سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے نواب صاحب جب دیکھیں گے تو تم سے خوش ہوں گے کہ تم نے فوراً مجھے اُن کے پاس پہنچا دیا۔"

"جناب ایسی کیا بات ہے جو آپ صبح تک نہیں ٹال سکتے؟"

"مجھے جواب لے کے فوراً واپس جانا ہے۔"

وہ ٹھٹکا اور جھجکتا رہا اور زینے پر چڑھنے کے لیے چلنے لگا۔ حویلی اندر سے سجی ہوئی تھی۔ جھاڑ فانوس سے آراستہ، دیواریں صاف و شفاف تھیں۔ ان تمام چیزوں سے نواب کے حسنِ ذوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ اوپر کی منزل کے ایک کونے میں دوسرا پہرے دار لٹھ اور لٹکائی ہوئی لالٹین سرہانے رکھے چارپائی پر سو رہا تھا۔ میں نہیں سمجھا تھا کہ اوپر کے حصے میں بھی کوئی پہرے دار موجود ہو گا۔ ہماری آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے پھرتی سے لٹھ اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا سنتا میں نے اُس کا لٹھ والا ہاتھ پکڑ کے دوسرے ہاتھ سے گردن کی پشت پر اتنی تیزی سے بھرپور وار کیا کہ وہ فرش پہ بے سدھ گر گیا۔ اپنے ساتھی پہرے دار کا یہ انجام دیکھ کے نچلے حصے کا پہرے دار کانپنے لگا۔ میں نے اُسے دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ اوپر کے حصے کے تمام کمروں کا راستہ غالباً اسی دروازے سے گزرتا تھا۔ بوڑھے پہرے دار نے چابیوں کا گچھا اٹھا کے تالا کھولا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ نواب سراج علی باہر سے تالا لگوا کے کیا … یقیناً اوپر کی عمارت سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہو گا مگر مجھے ان باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ پچاس پچاس قدم تک رہنمائی کرتا ہوا بوڑھا پہرے دار ایک محراب دار دروازے کے سامنے رک گیا اور لرزتی ہوئی انگلی سے اشارہ کرنے لگا۔ میں نے دستک سے پہلے چند لمحوں تک غور کیا۔ کمرے کے دروازے … سے پتہ چلتا تھا کہ پہرے دار دھوکا نہیں دے رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے بھی فرش پہ گرا دیا۔ بجلی نے یہ بے ضرر واؤ مجھے خاص طور پر سکھایا تھا۔

میری معمولی دستک پر آنکھیں ملتے ہوئے سفید پاجامے اور کرتے میں ملبوس گندمی رنگ کے ایک پُر وقار، تنومند، بارعب ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولا۔ میرے ہاتھ میں بند چاقو چھپا ہوا تھا۔ میرا چہرہ دیکھ کے وہ ٹھٹک گیا۔ "نواب سراج علی!" میری آواز بھرانے لگی۔

اُس نے تذبذب سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ "آ۔ آپ؟" وہ … ہکلاتے ہوئے بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

"مجھے آپ سے ایک کام ہے۔" میں نے اپنی آواز پر قابو پا لیا۔

"مگر مگر اس وقت؟" اُس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"ہاں نواب صاحب! کام کی نوعیت ہی ایسی ہے۔"

"مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے لیکن میرے پاس یہی وقت تھا۔" میں نے انتظار کیا کہ وہ اندر آنے کو کہے گا جب اُس نے راستے سے ہٹ کر … گفتگو کرنا

چاہیے تو میں اسے بتا کے خود اندر چلا گیا۔ نواب سراج علی کو دیکھ کے چاقو پر میری انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے آپ کو بہت سنبھالے رکھا تھا کہ اکبر خان نے فیضی کے نام کے ساتھ جس کا نام لیا تھا تو مجھ سے اُن کے سامنے سر نہیں اٹھایا گیا تھا۔ اب نواب سراج علی میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاش میں اُس کی آنکھیں نکال سکتا اُن آنکھوں نے فیضی کو کن نظروں سے دیکھا ہوگا۔ وہ بظاہر ایک معقول اور سنجیدہ آدمی نظر آتا تھا۔ میری جسارت پر وہ حیرت اور برہمی سے میرا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور ایک ہاتھ سے چاقو اچھال کے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ بے ساختہ عمل یقیناً نواب کی سمجھ میں اور عمل نہیں رہا ہوگا۔ نواب گھبرا گیا تھا۔ پھر اُس نے اندر چلنے کے لیے ہاتھ پھیلا کے اشارہ کیا۔ "نواب صاحب! ایسے آپ سے زیادہ بات نہیں کروں گا۔ پہلے میں یہ واضح کر دوں کہ میں آپ کا مال و اسباب لوٹنے نہیں آیا ہوں۔ میں ڈاکو نہیں ہوں۔"

"بیٹھیے بیٹھیے۔" اُس نے اضطراب سے کہا۔

"نواب صاحب! میں نیلم جان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"نیلم جان!" اُس نے چونک کر کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ہاں نیلم جان! مجھے معلوم ہے کہ آپ کے اُس سے خصوصی مراسم تھے۔" میں نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے۔ "میں اسی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

"نیلم جان؟" اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ "وہ تو مر گئی۔"

"ہاں وہ وداع ہو گئی۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا اور کہتے کہتے کہیں کھو گیا۔ نواب کی مسکراہٹ پر مجھے ہوش آیا اور میں نے سنبھل کے کہا۔ "وہ مر گئی۔"

"آپ اُس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"نواب صاحب مجھ سے کچھ مت چھپائیے جو کچھ آپ نیلم جان کے بارے میں جانتے ہیں سچ سچ کہہ دیجیے۔" میں نے بدلے ہوئے انداز میں کہا۔

"آپ کون ہیں کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام پوچھ کے کیا کیجیے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "مجھے جلدی واپس جانا ہے مجھے نیلم جان کے بارے میں بتائیے آپ اسے کب سے جانتے تھے آپ اُس کے بارے میں کیا کیا جانتے ہیں؟"

"یقیناً آپ کا تعلق پولیس سے نہیں۔" نواب قابو یافتہ لہجے میں بولا۔ "ذرا اطمینان سکون سے بیٹھیے اور مجھے یہ بتائیے کہ آپ اس کے بارے میں اتنے متجسس کیوں ہیں؟"

"نواب صاحب! وقت ضائع مت کیجیے۔ میں جس طرح آپ کی حویلی میں داخل ہوا ہوں کچھ اس کا خیال کیجیے۔ بہتر ہے آپ ہر بات بتا دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سب میرے اور آپ کے درمیان رہے گا۔ میں آپ کی رسوائی کے لیے یہاں نہیں آیا۔ میرا کچھ اور مقصد نہیں ہے۔ بتائیے آپ اس سے کب ملے؟" میں نے بے قراری سے کہا۔

"میری اس سے کچھ زیادہ شناسائی نہیں تھی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ نے چمپا بائی سے متعدد بار اُس کا سودا کرنے کی پیش کش کی تھی۔"

"معاف کیجیے۔" نواب نے بے چینی سے کہا۔ "یہ صحیح ہے کہ میں نے چمپا بائی کو اس قسم کی پیش کش کی تھی مگر میں اُسے عزت کی زندگی دینا چاہتا تھا۔"

"نواب صاحب للہ کچھ مت چھپائیے آپ کی غلط بیانی سے کسی کا کام بگڑ سکتا ہے۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ آپ بتائیں گے وہ میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔ آپ نیلم جان کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں؟"

"برادرم!" نواب گہری سانسیں لینے لگا۔ اُس نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا اور دل شکستہ لہجے میں بولا۔ "میں آپ کو کیا بتاؤں مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔ نیلم جان ایک سربستہ راز تھی جسے دیکھا تھا کسی اور طوائف سے رابطہ قائم کرنے کو جی نہیں چاہا۔ وہ سب سے جدا تھی خوب گاتی تھی اور میٹھی میٹھی سوز باتیں کرتی تھی۔"

"کیا آپ کیا آپ اس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ آپ نے اُس سے کبھی پوچھا تو ہوگا۔"

"پوچھا تھا۔ اَن گنت بار پوچھا تھا لیکن وہ مسکرا کے ٹال جاتی تھی مگر جناب!" وہ جھجک کے بولا۔ "سوال یہ ہے کہ آپ کیوں اُس کے سلسلے میں کرید رہے ہیں آپ کون ہیں صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔ وہ ایک پاکیزہ لڑکی تھی نہایت حسین نہایت نفیس عورت اُس کی روح مجھ سے شاکی ہوگی پہلے آپ اپنے بارے میں بتائیے۔"

"جناب! آپ فضول کی بحث کر رہے ہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں میں آپ کو اپنے متعلق کچھ نہیں بتا سکوں گا لیکن مجھے آپ نیلم جان کے سلسلے میں سب کچھ بتا دیجیے کسی طرح بھی۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے سہمے کے کہا۔ "میں نیلم جان کا ایک ہمدرد ہوں۔"

نواب کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "میں سمجھ گیا! مولا آپ ضرور اُس کے کوئی ... مرنے کے بعد لوگوں کو کون پوچھتا ہے کہیں آپ وہ شخص تو نہیں جس کی خوشی میں نیلم جان نے دم توڑا تھا۔ آپ کا چہرہ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ کا چہرہ" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کا چہرہ نیلم جان سے مشابہ ہے آپ کی آنکھیں آپ کی پیشانی۔ میں دعوا تو نہیں کر سکتا مگر کچھ مشابہت ہے۔ مجھے معاف کیجیے۔ مجھے معاف کر دیجیے شاید میں نے دوران گفتگو نیلم جان کے متعلق کوئی ناروا بات نہیں کی ہے پھر بھی آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔"

"نواب سراج علی!" میں نے بلند آواز سے کہا۔ "میری بات کا جواب دیجیے نیلم جان ایک طوائف تھی وہ کوٹھے پر بیٹھ کے اپنے طلب گاروں کا دل بہلاتی تھی۔ وہ آپ کے عشرت کدے میں آتی تھی اُس سے متعلق پر کیا گیا۔ وہ ایک طوائف ہی تھی۔"

"وہ طوائف نہیں تھی وہ طوائف نہیں تھی۔ یہ اُس پر ایک تہمت ہے۔ ایک گالی ہے میں نے زندگی کے پچاس سال گزارے ہیں میں نے ایسی طوائف نہیں دیکھی تھی۔ اُس کی ادائیں اُس کی نیک نفسی اُس کی اچھی خوبیوں کی وجہ سے میں اُسے اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ میری ایک بیوی تھی وہ عرصہ ہوا اولاد کے بغیر مر گئی۔ اُس کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ نیلم جان سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اُس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت لگا دی تھی۔ وہ یہاں آ کے کسی طور پر گھاٹ تھی۔ چمپا بائی کی وجہ سے وہ آ رہا ہے وقت میری باتیں سنتی اور مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی وہ میری صحت کے بارے میں فکر مند رہتی تھی۔ اُس نے مجھ سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے اُس کے لیے بے شمار تحفہ کسی فرمائش کے لیے کہا مگر اُس نے جواب میں ایک لفظ ادا نہیں کیا بلکہ وہ اس بات پر ناراض ہو جاتی تھی چنانچہ میں نے اُس سے اس قسم کی باتیں کرنی ہی ترک کر دی تھیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ مجھ سے متاثر تھی اور اس کی موت کا واقعہ میرے ذہن سے جدا نہیں جاتا۔ مجھ سے بات نہیں کی جاتی اُس کا چہرہ ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا ہے۔" نواب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ لگتا تھا جیسے کوئی چیز پھنس گئی۔ "اب میرا دل باہر نکلنے کو نہیں چاہتا۔ وہ کیا گئی ہے کہ سب چین و قرار لے گئی۔ مجھ میں اُس کے کفن دفن میں شریک ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ میں اُس کی قبر پر مٹی بھی نہیں ڈال سکا۔ وہ میرے لیے کھانا پکاتی تھی میرا لباس منتخب کرتی تھی وہ اس حویلی کی آرائش میں دلچسپی لیتی تھی۔" نواب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

مجھ پر سناٹا چھا گیا۔ چاقو میرے ہاتھ سے زمین پر گر گیا اور مجھے اسے اٹھانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ میری آنکھیں بہہ رہی تھیں دیر تک ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہو سکی۔ پھر نواب نے اپنی کرسی میرے قریب کھینچ لی۔ "آپ اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" وہ کرب سے بولا۔

"آپ کو اُس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ کس گھر سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس کا گھر کہاں تھا؟ اُس نے کچھ تو بتایا ہوگا؟"

"نہیں کچھ نہیں بتایا۔ میں نے اُس کا ماضی کریدنے کی بہت کوشش کی اس ذکر سے وہ اداس ہو جاتی تھی اور مجھے اُس کی اداسی گوارا نہیں تھی۔ اتنا تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ قسمت نے اُس کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ اُس کا لہجہ وہ نہیں تھا جو بازاری خواتین میں ہوتا ہے۔ وہ تو بڑی سادہ اور معصوم تھی۔ لیکن بس ایک بار کسی تقریب پر شاید عید کے موقع پر وہ جانے کیسے اُس کی زبان سے نکل گیا تھا کہ اُس کا بھی ایک گھر تھا جو اجڑ گیا۔ البتہ وہ اپنے ایک بھائی کو بہت یاد کرتی تھی جو گھر سے ناراض ہو کے چلا گیا تھا۔"

"اور کیا کہتی تھی وہ؟" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نواب نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "کچھ نہیں عزیزم!" وہ افسردگی سے بولا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔ کچھ بھی نہیں معلوم۔"

میرا جی چاہا کہ اپنے گالوں پر طمانچے لگاؤں۔ نواب کو شاید میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ "آپ۔ آپ کچھ کھائیں۔ بیٹھیں۔ مگر میں تو بھول ہی گیا۔ اللہ اللہ آپ ......"

"شکریہ نواب صاحب! مجھے جانا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔ ایک بات اور بتائیے۔ کیا چمپا بائی نے آپ کو کبھی اشارۃً یہ بتایا کہ اُس نے نیلم جان کو کہاں سے حاصل کیا؟"

"نہیں! نائیکائیں ایسی باتیں نہیں بتایا کرتیں۔"

"آپ کے خیال میں چمپا اسے کہاں سے لائی ہوگی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چمپا ایک مشاق نائیکہ ہے۔ ممکن ہے نیلم جان براہِ راست اُس کے ہاتھ آ گئی ہو یا اُسے اُس نے کسی اور ذریعے سے حاصل کیا ہو۔ بات یہ ہے کہ شہر میں طوائفوں اور اُن کے طلب گاروں کے درمیان ایک غیر تحریری معاہدہ ہوتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے ذاتی معاملات سے دلچسپی نہیں لیں گے۔ فیض آباد میں اپنی تھوڑی بہت عزت ہے۔ چمپا بائی نیلم جان کو چمپا کے یہاں بھیجتی تھی ورنہ شہر میں بڑی رسوائی ہوتی۔ بالا خانے پر بھی رفت و رفت جانے سے شرفا گریز کرتے ہیں۔ میں اگر زیادہ تفتیش میں پڑتا تو چمپا بائی مجھ سے محتاط ہو جاتی اور اس طرح نیلم جان مجھ سے دور ہو سکتی تھی۔"

"چمپا بائی شہر سے فرار ہو گئی ہے اور مجھے اُس کی تلاش ہے۔ نواب صاحب! کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ مجھے کہاں دستیاب ہو سکتی ہے؟"

"آپ اُس سے مل کے کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں میں اُس سے عاجزی سے درخواست کروں گا کہ مجھے وہ جگہ بتا دے جہاں سے اُس نے نیلم جان کو حاصل کیا تھا۔"

"مگر کیوں؟ اُس کی موت کے بعد اب آپ کو کیا حاصل ہوگا؟"

"آپ نہیں سمجھ سکیں گے اور آپ پوچھیے بھی نہیں۔"

"میں نے آپ کو اپنی ہر بات بتا دی ہے کیا آپ مجھ پر اعتماد نہیں کریں گے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہم دونوں کا غم مشترک ہے۔ مجھے بتائیے اور میری طرح یقین کیجیے کہ میں نیلم جان کو اُس کی موت کے بعد رسوا کرنے کی ذلالت نہیں کروں گا۔"

"نواب! مجھ سے آپ کچھ مت پوچھیے۔" میں نے جھلا کے کہا۔

"عزیزم! خیر آپ نہ بتائیے لیکن ایک بات تو طے ہے کہ کوئی اس بات سے پہلا آپ نیلم جان کے سامنے موجود تھے۔ آپ کو دیکھ کے اُس کی حیرت کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور جب آپ پاگلوں کے مانند چیخے تو اُس کی سانس اکھڑنے لگی اور مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اُس کا جنازہ کس گھر سے اٹھا اور آپ کن لوگوں کے ساتھ بالا خانے تشریف لائے تھے۔ میں نیلم جان کا چہرہ نہیں بھول سکتا۔ آپ کی آنکھیں آپ کا چہرہ ساری کہانی خود بیان کر رہے ہیں۔ تیر چلانے دیجیے۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "میری نظر میں نیلم جان کوئی طوائف نہیں تھی اُس سے میرے بہت سے جذبات وابستہ تھے۔ اُس کا کوئی عزیز تحقیر کرے تو مجھ پہ اُس کی پردہ پوشی لازم ہے۔ وہ میرا جان عزیز ہے۔ آپ یہاں قیام کر لیجیے۔ پیر کر لیں ایسے ہم دونوں مل کے چمپا بائی کو تلاش کریں گے۔"

"مہربانی نواب صاحب! خدا کے لیے اب کچھ اور مت کہیے۔ مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ چمپا بائی کہاں جا سکتی ہے؟"

"وہ کہاں نہیں جا سکتی؟" نواب بری طرح مسکرا دیا۔ "بڑی بات ہے بھلا ہندوستان میں کسی جگہ بھی جا سکتی ہے۔ ہر جگہ اس کا گھر موجود ہے۔"

"پھر بھی وہ اپنے شناساؤں کے سوا اور کہاں جائے گی؟"

"میں سمجھتا ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "آگرے میں اس کی ایک خالہ رہتی ہے وہاں جا سکتی ہے لیکن زیادہ دور جانے کا امکان نہیں ہے۔ وہ قریب کے شہروں میں کسی جگہ گئی ہوگی۔ ہاں وہ رام پور بھی جا سکتی ہے وہاں کے نوابوں سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے لکھنؤ تو وہ نہیں گئی ہوگی۔ ریاستوں میں اس کے چھپنے کا زیادہ امکان ہے پھر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"مجھے اجازت دیجیے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔"

"جناب! میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا۔ آپ یہاں قیام کریں گے۔ آپ میرے مہمان رہیں گے اور میں آپ کے ساتھ شہروں شہروں خود چلوں گا۔"

"میں معذرت خواہ ہوں میرے لیے ایک لمحہ گزارنا مشکل ہے میں چپا بائی کو ڈھونڈ کر کے آپ کے پاس آیا ہوں، صبح ہونے سے پہلے مجھے شہر سے نکل جانا ہے ورنہ میں پھر کبھی نہ جا سکوں گا۔ اللہ کو عنایت میرا راستہ نہ روکیے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" نواب ناراضی سے بولا۔ "آپ کے آنے سے تو میری طبیعت سنبھل گئی ہے۔ جمعرات کے وقت کسی دن یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ایک آدھ دن تو سفر کی تیاری ہی میں لگ جائے گا۔ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔"

"نواب صاحب! ابھی آپ مجھے جانے دیجیے میں پھر فیض آباد آؤں گا اور آپ کے ہاں کئی دن قیام کروں گا۔ مجھے جانے دیجیے۔"

"دیکھیے جناب! چپا بائی جن علاقوں میں ہوگی وہاں کچھ اچھے لوگ نہیں بستے آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں ہے اور پھر ایسے عالم میں جب آپ کے ذہن پر غم کا بوجھ بھی ہو۔"

"نواب صاحب! میں جانتا ہوں مجھے اپنے آپ پر کتنا جبر کرنا ہوگا۔"

"تو آپ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے۔" نواب شکایتی انداز میں بولا۔

"اجازت دیجیے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" نواب رنجیدہ ہو کے بولا۔ "اچھا ایک بات ہماری ضرور مان لیجیے میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کسی قدر تنگی میں سفر کر رہے ہیں۔ آپ کو اپنا بھائی اپنا عزیز سمجھ کر کچھ خدمت کرنا چاہوں گا۔ آپ انکار نہیں کر سکتے کہ میں اُسے تسلیم نہیں کروں گا۔"

"دیکھیے میرے پاس کافی روپے ہیں۔" میں نے جیب سے ریشمی رومال نکال کے اُسے دکھایا۔ "اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر بھی آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔" اس نے اصرار کیا۔

میں نے مزید انکار نہیں کیا کہ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور نواب آسانی سے ہار ماننا نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے دیوار میں نصب ایک تجوری کھول کے رومال میں نوٹ رکھے اور میری جیب میں ٹھونس دیے اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔ میں نے معذرت کے ساتھ اس کے دونوں پہرے داروں کے ساتھ یہیں آنے والا واقعہ بتایا۔ دونوں پہرے دار ابھی کم ساز زمین پر پڑے تھے۔ نواب نے انھیں بلایا۔ بوڑھا پہرے دار کچھ ہوشیار ہوا اور نواب کو میرے ساتھ دیکھ کے پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور میرے پیروں پر گر گیا۔ نواب نے فی الفور بگھی تیار کرنے کا حکم دیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ آخر بیٹھ گئے۔ نواب سراج علی کی بگھی سڑکوں سے گزرتی تو کئی نگاہیں انھیں بیٹھے دیکھتیں۔ نواب خود مجھے رخصت کرنے آیا۔ پہرے دار مہمان خانے سے میرا سامان لے آیا تھا۔ نواب نے رخصت کرتے وقت میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بے شمار لکیریں کھنچ گئیں اور وہ فوراً پلٹ گیا۔ گلی میں آنے کے بعد دالان کے کھڑکی بند کرنے کی آواز نے دور تک میرا تعاقب کیا۔

*

میں اندازے سے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رفتار تیز تھی، راستے میں ایک تانگہ مل گیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، گاڑی چھوٹ چکی تھی اور میں صبح تک رک کر دوسری گاڑی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ تانگے والے نے مجھے لاری کے اڈے پر پہنچا دیا۔ صبح چھ بجے تک میں لاری کے اڈے سے قریب سنسان جگہ ٹھہرا رہا۔ ٹھیک چھ بجے لاری روانہ ہوئی تب مجھے سکون ہوا۔ لاری رکتی ٹھہرتی دن بجے لکھنؤ پہنچی۔ اس وقت لکھنؤ سے کوئی گاڑی آگرے کی طرف روانہ نہیں ہوتی تھی۔ میں پھر آگرے کی سمت جانے والی لاریوں میں بیٹھتا اترتا رہا اور اس طرح فیض آباد اور لکھنؤ سے دور ہوتا گیا۔ بریلی اسٹیشن پر گاڑی میں بیٹھے رہنے کے بجائے میں شہر میں اتر گیا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ایک ہوٹل میں سامان رکھ کے میں نے لباس تبدیل کیا اور تانگے کے ذریعے طوائفوں کے بازار پہنچ گیا۔ اس جگہ کا نام اعظم نگر تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اعظم نگر میں سونا گاچھی اور فیض آباد کے بازار کی طرح رونق تھی۔ پہلے تو میں چوڑی سڑک اور اس سے ملحق گلیوں میں بنے ہوئے مکانات میں جھانکتا رہا۔ پھر مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس طرح تو چپا بائی کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ کچھ دروازے بند تھے اور گانے کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ کھلے ہوئے تھے اور وہاں خوب صورت لڑکیاں انتظار میں بیٹھی تھیں۔ نچلی منزلوں پر میں کھلے ہوئے دروازوں میں جھانک سکتا تھا۔ میں دیر تک گھومتا رہا۔ چپا بائی کے بارے میں کسی سے براہ راست پوچھنے میں اندیشہ تھا۔ جب میں دو تین بار ادھر سے اُدھر منڈلاتا رہا تو میں نے محسوس کیا کچھ آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ گردن میں شوخ رنگ کا رومال ڈالے ہوئے ایک شخص نے میرے قریب آ کے چپکے سے کہا۔ "میرے ساتھ آ جائیے۔"

"کہاں؟" میں نے چونک کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"نزدیک ہی ہے۔" وہ آنکھیں جھپکاتا ہوا بولا۔

میں نے چند لمحے سوچا، پھر اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے ایک گلی میں لے گیا اور ہم تنگ و تاریک سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرہ روشن تھا اور ایک خوب صورت نوخیز لڑکی سازندوں سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے آتا دیکھ کے اس نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں

نے جھک کے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس کے پاس ہی ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی تھی۔ اس نے اٹھ کے مجھے قالین پر بٹھایا۔ میراثی ستار ملانے لگا۔ میں یہاں گانا سننے نہیں آیا تھا لیکن اب یوں ہی واپس جاتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ عورت نے مجھے پان کی گلوری پیش کی، لڑکی نے گانا شروع کیا۔ وہ گاتی رہی اور میں اپنے ہی غم میں بیٹھا رہا۔ غزل ختم ہوئی۔ میں نے داد دی نہ اپنے پاس بلایا۔ [illegible] اس نے جلد ہی غزل ختم کر دی اور حیرانی سے مجھے گھورنے لگی۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اب گا نہیں رہی ہے۔ ادھیڑ عمر عورت نے میرے نزدیک آ کے پوچھا۔ "کیا سرکار کو غزل پسند نہیں آئی؟ نصیب دشمناں مزاج کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔" میں نے کسمساہٹ سے کہا اور اٹھ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے میں نے دس روپے کا نوٹ لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ وہ شخص اب بھی میرے ساتھ تھا اور میری ناپسندیدگی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ "مجھے کہیں اور لے چلو لیکن ضروری نہیں کہ میں گانا ہی سنوں۔ کسی کو میں قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"جی۔" وہ تعجب سے بولا اور مسکرانے لگا۔ "اچھا میں سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھے؟"

"آپ صاحب! آئیے میں آپ کو چہرے دکھاتا ہوں۔ یہ ایک دشوار کام ہے مگر مجھے آپ کی خاطر کوئی نہ کوئی حیلہ بہانہ کرنا ہی ہوگا۔" وہ مجھے مختلف بالا خانوں پر لے گیا۔ کہیں محفل جمی ہوئی تھی، کہیں بار سنگھار کیے لڑکیاں گنگنا رہی تھیں۔ مجھے چپا بائی کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ میرا رہبر زینوں پر چڑھتے اترتے [illegible] ہلکان ہو گیا۔ [illegible] میں کہیں [illegible] "آپ کو کسی خاص لڑکی کی تلاش ہے؟"

"ہاں کچھ یہاں وہ لڑکی نظر نہیں آئی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام۔" میں نے سوچ کے جواب دیا۔ "اس کا نام چپا ہے۔"

"چپا! اس نام کی تو کوئی لڑکی اس بازار میں ہے نہیں۔"

"سوچ کے بتاؤ۔"

"نہیں جناب! اس بازار میں کون آتا ہے کون جاتا ہے مجھے سب علم رہتا ہے آپ نے خود دیکھ لیا، آپ کو اپنی ہی بات سچ لگتی ہے۔"

"کبھی تم نے چپا نام کی کسی طوائف کا نام نہیں سنا؟"

اس نے چند لمحے سوچ کے جواب دیا۔ "نام تو سنا ہے مگر مجھے یقین ہے یہاں بہت دنوں سے اس نام کی کوئی لڑکی نہیں آئی۔"

"جو نام تم نے سنا ہے اس کا چہرہ یاد ہے۔"

"مجھے چہرہ یاد نہیں آتا۔"

میں نے دس روپے کے نوٹوں کی گڈی میں سے بیس روپے نکال کے دیے تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ کہنے لگا۔ "ٹھہریے میں یاد کر لیتا ہوں۔"

"اس طرح مت پوچھیے کیوں کر پہلے چند مہینوں کے اندر نئی طوائفیں اور ان کی نائکائیں یہاں آتی رہی ہیں۔ ان کے ابا جلو چپا بائی ہوگی تو خود پتا چل جائے گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے پھر بیٹھیے میں ابھی ابھی آ کے [illegible] مگر یہ آپ کی تسلی کے لیے ہے۔" وہ مجھے ایک جگہ ٹھہرا کے چلا گیا اور پندرہ منٹ بعد منہ لٹکائے واپس آ گیا۔ "چپا بائی نامی ایک طوائف فیض آباد میں رہتی ہے مگر وہ تو نائکہ ہے اور صرف ایک ہی دفعہ بریلی آئی ہے۔"

وہ شخص اسٹیشن تک میرے ساتھ رہا۔ اتنی مختصر سی ملاقات میں وہ مجھے بے حد پسند کرنے لگا تھا۔ اظہار کر رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ پھر وہ مجھے نینی تال لے جائے گا اور رام نگر کے جنگلات کے مناظر دکھائے گا۔ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر وہ مجھے چائے پلانے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل معمولی تھا۔ گیس کی لالٹین بھڑک رہی تھی۔ سیاہ دیگچیاں چولھوں پہ سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اور تین چار تپائیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ ہوٹل خالی تھا صرف ایک نوجوان بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ چائے پلانے کے بعد [illegible] ڈیل ڈول میں [illegible] لیکن میرے رہبر سے [illegible] ہوٹل کے گرد کے آدمی لگتے تھے سنتے ہی انھوں نے ایک تپائی اٹھا کے [illegible] دیا اور ہوٹل والے کو گالی دیتے ہوئے برابر تپائی پر بیٹھ گئے۔

میں نے چائے کی پیالی اٹھائی ہی تھی کہ ایک نے [illegible] کے ساتھ میری جیب پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لا سکا، تپائی سمیت زمین پر جا پڑا۔ دوسرے نے میرا تھیلا اپنے قبضے میں کر لیا اور کمبل دور پھینک [illegible] میں نے ایک قلابازی لی۔ اس طرح میری جیب اس کی دست برد سے محفوظ ہو گئی۔ میرا رہبر جس کا نام مرلی تھا، تیزی سے مجھے سہارا دینے آیا لیکن اٹھانے کے بجائے اس نے میرے بازو اس انداز سے پکڑ لیے کہ مجھے ہاتھ چلانے میں دشواری ہوئی۔ اسی اثنا میں ان بدمعاشوں میں سے ایک نے میرے گال پر زور سے تھپڑ مارا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے تڑپ کے اپنے بازو چھڑانے کے لیے جد و جہد کی مگر مرلی نے انھیں اور زور سے جکڑ لیا۔ تھپڑ والے نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رسید کیا اور چاقو کھول کے مجھ پہ تان لیا۔ مرلی اس کی خوشامد کرنے لگا کہ وہ ایک مسافر پر کیوں ظلم کر رہے ہیں لیکن اب مرلی کی چال بازی میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ میں نے ایک نگاہ میں چاقو کی پوزیشن کا اور چاقو بردار کے تیور دیکھے۔ [illegible] میرے تھیلے سے رقم نکلنے پر بڑھتی ہی جا رہی تھی اور اس نے تھیلا خالی [illegible] ایک طرف پھینک دیا تاہم وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح چاقو تان کے کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں تیسرا حملہ [illegible] مرلی کو اپنے آگے کر [illegible] مرلی نے میرے بازو چھوڑ دیے۔ "رقم نکالو!" انھوں نے چاقو کچھ آگے کر کے مجھے حکم دیا۔

"میرے پاس کچھ نہیں صرف سفر کا خرچ ہے۔" میں نے منت سے کہا۔

"خبردار جو ایسی ویسی حرکت کی، میں تم سب کو گاڑ دوں گا۔" میں نے سوچ سمجھ کے

یہ چلا دیا گیا تھا۔ وہ تعداد میں دو تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے۔ تیسرا
بھی اُن کا ساتھی تھا۔ اُن پر یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ میں نے ساوتھ میں اُن کے
چاقوؤں کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ چاقو مجھ سے دُور رکھیں
گے۔ اُن کا مقصد مجھے خوف زدہ کر کے رقم حاصل کرنا ہے۔ وہ رقم حاصل کیے بغیر نہیں
ٹلیں گے۔ رقم میں انھیں دے دیتا اگر مجھے ایک نامعلوم منزل پر پہنچنا نہ ہوتا اور چونکہ
مجھے آگے جانا تھا اس لیے میں اُن سے کوئی بڑا جھگڑا مول لینا بھی نہیں چاہتا
تھا۔ ہوٹل کی جگہ تنگ تھی یہ موجوں کی عادت نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر تپائیاں بھی
راستہ روکے ہوئے تھیں۔ میری نظر بظاہر اُن پر مرکوز تھی لیکن تمام اطراف کا جائزہ
لے رہی تھی۔ خون خرابے کا موقع نہیں تھا۔ مجھے جلدی سے آگے بڑھنا تھا۔
"نکالو رقم" میرے تساہل پر ایک بار پھر انھوں نے گرج کر دھمکی دی۔
"جیب لوٹ دو ورنہ یہ چاقو تمھارے پیٹ میں اُتر جائے گا۔"
میں نے اپنا جسم سیکڑ لیا "میں تمھیں نکالوں گا" میں نے فقد کی اور
کسی قدر خوف زدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔ میرے سارے حواس جاگے ہوئے
تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنی گردن پیچھے کی طرف کرلی جیسے میں گھبرا کے پیچھے
ہٹنا چاہتا ہوں۔ میں انھیں یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ مزید خوف زدہ کرنے
کے لیے چاقو والا ہاتھ کچھ اور آگے بڑھائیں، جیسے ہی انھوں نے میرے اندازے
کے مطابق میرے پیٹ میں چاقو گھونپنے کا خوف پیدا کرنے کے لیے ہاتھ آگے
بڑھایا میں نے دائیں ہاتھ والے چاقو بردار کا پہنچا پکڑ کے بجلی کی رفتار سے
بائیں طرف کھینچ لیا۔ میری تدبیر یہی تھی کہ اس کا ہاتھ میری پہنچ، میری دسترس
میں آجائے۔ جیسے ہی دائیں ہاتھ والے شخص کا پہنچا میری گرفت میں آیا میں نے
اُسے بائیں جانب کھینچا۔ گھبراہٹ میں بائیں جانب والے شخص کا چاقو اپنے ساتھی
کے گلے میں پیوست ہو گیا کیونکہ وہ پہلے ہی چاقو بڑھا چکا تھا۔ میری تیزی سے
نشانے پر خود اُس کا ساتھی آ گیا۔ پہلا ساتھی چیخ مار کے زمین پر لڑھک گیا۔ پھر دوسرے
کے ہاتھ پر قبضہ جمانے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے اُس کے پیٹ میں
لات ماری اور چاقو اپنے قبضے میں کر لیا۔ دونوں زمین پر بلبلا رہے تھے۔ تیسرا
بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میں نے اس کی گردن پکڑ لی اور اُسے اُس کے ساتھیوں کی
طرف دھکیل دیا۔ وہ تینوں اُٹھ کے بیٹھ گئے تھے حالانکہ پہلے والا شخص تکلیف سے بلبلا
رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ "استاد! استاد!" وہ تینوں بیک وقت
خوشامد کرنے لگے۔ "ہمیں دھوکا ہو گیا استاد!"
میں نے اپنا کمبل اور تھیلا اُٹھایا۔ ترتیب سے سامان درست کیا۔ بزدلوں نے
صورت دیکھتے ہی بھاگ گیا تھا۔ ہوٹل والا کھڑا لرز رہا تھا۔ زخمی بدمعاش
کو اٹھا کے تپائی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے گلے سے خون بہہ رہا تھا۔ زخم گہرا
نہیں تھا۔ میں نے اس کا خاص خیال رکھا تھا اگر میں بائیں طرف زور سے
کھینچنے کے بجائے اُسے اُس کے ساتھی کے سامنے کر دیتا تو چاقو چھیدتا ہوا دل تک بلکہ
کمر میں اندر تک گھس جاتا۔ اپنے زخمی ساتھی کو چھوڑ کے وہ دونوں اُن کے تھامے
پھر میری طرف لپکے۔ "استاد! معاف کر دو" وہ میرا دامن پکڑ کے بولے۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ انھیں حقارت سے دیکھتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔
ٹرک دُور تک میرے پیچھے آیا۔ میں اسٹیشن کی بنچ پر بیٹھ کے گاڑی کا انتظار
کرنے لگا۔ بریلی میں پچیا نہیں ملی اور میری بے خبری کا نتیجہ اس واقعے کی صورت
میں نکلا۔ دل جلاتے ہوئے درمیان میں مُرادآباد کا اسٹیشن پڑا۔ دل نہیں مانا۔ سوچا شاید
مولوی صاحب اِس عرصے میں واپس آ گئے ہوں۔ ایک گھڑی کے لیے ٹھہر جاؤں کے
دیکھ آؤں۔ ارجمند بیگم اور اس کی بچی کو بھی دیکھ آؤں گا۔ کوئی فیصلہ کرنے میں دیر لگ
گئی۔ گاڑی مُرادآباد اسٹیشن پر صرف تین منٹ ٹھہری اور دلی کے لیے روانہ ہو گئی۔
دلی اُتر کے میں نے وہاں کے بازار میں پچیا کو تلاش کرنا شروع کیا۔ پچیا وہاں بھی
نہیں ملی۔ پچیا کا ملنا آسان نہیں تھا۔ مجھے اُن لوگوں کی تلاش ہوتی ہے جو میری
نظروں کو فریب دے جاتے ہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں میں نے یہ سفر کس طرح گزارا۔ میں
مسافروں کی بھیڑ میں الگ تھلگ بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا تا کہ وہ مجھ سے باتیں
نہ کر سکیں۔ مجھے کسی کی بات اچھی نہیں لگتی تھی، سب بھیڑ معلوم ہوتا تھا۔ ایک
آدمی خاموش رہتا ہے تو دوسرا اُسے بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ مسافر، مسافروں
کا اتنا خیال کیوں نہیں رکھتے۔ میں گٹھڑوں میں پڑے لیٹے اپنے آپ میں گم بیٹھا رہتا
تھا مگر وہ مجھے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ کہاں سے آئے ہو، کیا کرتے ہو، کیا
حال ہے؟ میں اُن سے کیا کہتا کہ تم میں حال سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔ تم کیوں
سُننا چاہتے ہو۔ جب کوئی اسٹیشن آتا تھا میں اُترنے والے مسافروں کے چہرے دیکھا
کرتا تھا۔ اور دیوانہ وار اسٹیشن کے چکر لگایا کرتا تھا کہ شاید کورا یا مولوی صاحب نظر
آجائیں۔ مسافر مجھ پر ہنسا کرتے تھے۔
دن کے گیارہ بجے گاڑی آگرہ اسٹیشن پر پہنچی۔ پلیٹ فارم پر قدم رکھتے
ہوئے میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ پچیا اگر ابھی یہاں ہوتی کے مل بھی نہ ملی تو پھر میں آگے
کہاں کہاں ڈھونڈوں گا؟ میں کس کس کو ڈھونڈتا پھروں گا؟ مجھے مُونیا بائی
کے بالاخانے پر جا کے پہنچنا چاہیے تھا اور اس کے لیے موزوں وقت رات ہی کا
تھا۔ دن میں وہ کسی اور جگہ کسی اور کمرے میں بھی ہو سکتی تھی لیکن رات کو اُس
کے دیوان اُس کی موجودگی کا امکان زیادہ تھا۔ اس وقت تو صرف بالاخانے پر جا کے
اپنے کاروبار میں مصروف ہوں گے۔ دن کے وقت سب کی توجہ میری طرف مبذول ہو
سکتی تھی مگر مجھے ایک لمحے کے لیے قرار نہیں تھا لیکن میں نے رات تک خود کو کسی
نہ کسی طرح یہ وقت گزارنے پر آمادہ کر لیا۔ بریلی میں بدمعاشوں نے جس انداز سے مجھ
پر حملہ کیا تھا، وہ یہاں بھی دہرایا جا سکتا تھا۔ مجھے اپنے گرد و پیش سے بہت ہوشیار
رہنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی ضرورت اب نفیسہ کی موت کے بعد زیادہ محسوس ہوئی
تھی۔ اس ضرورت کا احساس مجھے جمیل نے دلایا تھا۔ دل میں آ آ جاتی کہ کوئی سوال
جواب کروں بس گلا دبا دوں کے پھیلیں اور جو سامنے آئے اُسے کاٹتا ہوا آگے
بڑھتا چلوں۔ نفیسہ میرا دل سوختی رہتی تھی کہ دل نے مجھے حوصلہ دیا تھا تو نفیسہ نے
وہ حوصلہ چھین لیا تھا۔
میں اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا اور دوپہر تک کمرے کا
دروازہ بند کیے بستر پر لیٹا رہا۔ سہ پہر کو طبیعت بہت گھبرانے لگی۔ ایک ایک
پل کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ میں ہوٹل سے باہر نکل آیا اور آگرے کی سڑکوں پر بے مقصد

مارا مارا گھومتا رہا۔ جامع مسجد، تاج محل، فتح پور سیکری، اکبر کا قلعہ۔ آگرے میں بہت سی
دیکھنے کی چیزیں تھیں۔ ہوٹل کا بیرا بہت اشتیاق سے اُن کا تذکرہ کرتا تھا۔ ہوٹل
میں داخل ہوتے ہی گائڈوں نے مجھے گھیر لیا تھا مگر اُن میں کوئی گائڈ ایسا نہیں تھا
جو مجھے کوئی ایسی جگہ بتا سکے جو میرے آجان کا پتہ بتا سکے۔
رات آگے نہیں ہو رہی تھی۔ ریلوے لائن عبور کر کے میں سیدھی سڑک پر ہو لیا۔
چلتے چلتے شہری حدود سے لمحہ بہ لمحہ دور ہو رہا تھا۔ باغات شروع ہو گئے تھے۔
ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے میں نے گہری گہری سانسیں لیں مگر اس طرح میری
حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ آدھے گھنٹے تک میں اسی جگہ بیٹھا رہا۔
پھر جب سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا، اُس وقت میں نے چلنے کا
ارادہ کیا اور شہر کی طرف واپس ہو گیا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ایک جگہ
ٹھٹک کے رک گیا۔ سامنے سے اپنے مخصوص لباس میں بدھ راہبوں کا ایک گروہ آہستہ
روی سے میری طرف آ رہا تھا۔ انھیں دیکھ کے میرا دل مچلنے لگا اور میری عقل
میں نہیں آیا کہ میں انھیں کس طرح مخاطب کروں۔ میں نے کھلے عام انداز میں ہی
کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ وہ میرے قریب آ گئے۔ انھوں نے شاید میری بے چینی محسوس
کر لی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رُکے، مسکرائے اور ہاتھ ہلا کے مجھے سکون کی تلقین کی
اور آگے بڑھ گئے۔ بُدھ گیا میں جانگ قبیلے کا ایک شخص میرے ہاتھوں زندگی سے
ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مجھے انھیں دیکھتے ہوئے بہت سے خوف محسوس ہوئے۔ جب وہ
دُور چلے گئے تو مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اُن کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ آگے
آگے تھے میں فاصلے فاصلے سے اُن کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ وہ تین راہب تھے اور ایک
دوسرے سے بے نیاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ایک موڑ پہ جا کے وہ میری
نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے رفتار تیز کر دی لیکن میں انھیں دوبارہ نہیں دیکھ
سکا۔ اس جگہ جمنا ندی قریب تھی اور علاقہ سنسان تھا۔ فاصلے فاصلے پر سبزے سے ڈھکے
چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے۔ وہ موڑ کے قریب ہی کسی مکان میں
چلے گئے ہوں گے مگر مجھے نظر نہیں آئے۔ جمنا ندی پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی شفق
پھیلی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارا پانی سُرخ ہو گیا ہو اور خون کا دریا
بہہ رہا ہو۔ میں راہبوں کا ٹھکانا ڈھونڈ کے جانگ قبیلے کی گم شدہ کورا کے متعلق
کچھ معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ شاید وہ مجھے کوئی ایسی بات بتا سکیں جس کا تعلق
کورا سے ہو اور مجھے اُمید کا کوئی سراغ مل جائے؟ اُن سے مل کے میرے دل کو تسلی
ہو جاتی۔ مگر نہ معلوم وہاں کورا ہے؟ ایک بات آنے میں کتنی دیر لگ جاتی اس لیے
وہ جگہ ذہن میں رکھ کے واپس آ گیا۔

ہوٹل پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ میں ضروری تیاری کر کے جلد از جلد ہوٹل
سے نکلا۔ میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی ہر ممکن تلقین کی۔ ہوٹل سے میں
بالاخانوں کی جانب روانہ ہوا۔ آگرے کی اس گلی میں بریلی کے بازار سے زیادہ رونق تھی۔ یہاں
بالاخانے کچھ زیادہ پختہ اور صاف تھے۔ پھر بھی بریلی سے زیادہ بھیڑ تھی۔ بہت سے بالاخانوں کے
دروازے کھلے ہوئے تھے اور بالکونیوں سے لدی پھندی رنگ برنگے کپڑوں میں
ملبوس دلفریب بنی ہوئی نوجوان لڑکیاں اور عورتیں سڑک ہی سے نظر آجاتی
تھیں۔ اُوپر کے بالاخانوں کی طرف تھیں جھروکوں، کھڑکیوں یا کھڑکی ہوئی تھیں۔
میلے کا سا منظر تھا۔ پان والوں اور گل فروشوں کی دکانوں پہ لوگوں کے گروہ موجود
تھے۔ جہاں گانا ہو رہا تھا اُس بالاخانے کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے پان کا بیڑا خرید کے
منہ میں چبایا۔ کلائی میں ہار لپیٹا تا کہ میری بدحواسی اور اجنبیت کا کسی کو احساس نہ
ہو سکے۔ چپا بائی اگر یہاں موجود ہوگی تو اس نے اپنی آمد کی خبر مشہور نہیں کی ہوگی
لیکن یہ ممکن ہے مُونیا بائی نے احتیاطاً یہاں اپنے شناساؤں کو باخبر کر دیا ہو کہ
کوئی اجنبی شخص اُسے پوچھتا ہوا آئے تو اُسے فوراً اطلاع دی جائے۔ میں چاروں
طرف نظریں ڈالتا ہوا گلی میں اس انداز سے گھومتا رہا جیسے یہاں کے تمام
گھروں سے واقف ہوں۔ چپا بائی کی آنکھوں میں میری شکل محفوظ ہوگی، میری آنکھوں
میں بھی اُس کی شبیہ نقش ہو گئی تھی۔ چپا کی بہن مُونیا بائی کا بالاخانہ بھی یہیں
کہیں ہو گا۔ کسی سے پوچھنے کے بجائے میں خود ہی اُسے تلاش کرنے کی ناکام
کوشش کرتا رہا۔ اس مشکل کام کا تجربہ مجھے بریلی اور دلی میں ہو چکا تھا۔ گلی
میں بار بار پھیرے لگانا بھی مشکل تھا مگر تمام احتیاط کے باوجود دلالوں کی طرح
ایک شخص میرے پاس آیا اور دلدارانہ انداز میں بولا "کوئی خدمت ہو تو بتائیے؟"
یہاں آکے میرے پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ مجھے بڑے بڑے
دشمنوں نے گھیر رکھا تھا۔ چپا بائی سے ملاقات ہوتی اور اس نے آجان اور گھر
والوں کے متعلق کوئی اچھی خبر نہ سنائی تو مجھ سے اٹھا کیسے جا سکے گا؟ بہتر ہے کچھ
دشمنوں اور یہیں سے واپس کیوں نہ بھاگ جاؤں۔ مجھے تذبذب میں دیکھ
کے اس شخص نے دوبارہ مجھے پیش کش کی۔ میں نے خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ وہ
مجھے مختلف بالاخانوں پہ لے گیا مگر چپا بائی کہیں نظر نہیں آئی۔ جب ہم پانچویں
بالاخانے سے اُتر رہے تھے تو میں نے تنگ آکے اُس سے صاف صاف مُونیا بائی
کے بالاخانے پر چلنے کی فرمائش کر دی۔ "شوخی جان!" اُس کی مسکراہٹ مجھے زہر لگی
"میں حضور کو وہیں لے جانے والا تھا" شوخی جان ہے تو ابھی پوری طرح جوان
بھی نہیں ہوئی مگر دُور دُور تک اُس کی خوشبو پھیل گئی ہے مگر صاحب! ابھی نتھ اُترنی
رہتی ہے اس لیے میں کترا رہا تھا۔ آپ پہلے ہی کہہ دیتے۔" اس نے آنکھ
مار کے کہا۔ "آگرے کا میرا بیٹا، ایک تاج محل یہاں پہلے سے موجود ہے، دوسرا
شوخی جان کا بدن ہے۔"
وہ مجھے ایک صاف ستھری کشادہ عمارت میں لے گیا۔ رنگ و روغن
تازہ تازہ تھا۔ "یہ مُونیا بائی کا ڈیرا ہے۔" جب اُس نے یہ بتایا تو میرے دل
کی حرکت معدوم ہونے لگی۔ میں اُس سے کہنا چاہتا تھا "ذرا ٹھہرو" مجھے سانس لینے
دو۔ میں اپنے حواس درست کر لوں" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ زینے پہ
ہمارا کئی آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا۔ شوخی جان گا رہی تھی اور دروازہ بند تھا۔ لوگ
مایوس واپس آ رہے تھے۔ میرے ساتھ موجود شخص نے مجھے رُکنے کے لیے منہ بنایا۔
میں نے اُس کا بازو پکڑ کے اُسے اُوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ اب اندازہ نہیں
کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ کنڈی لگی ہوئی تھی۔

جلدی اندر سے بھرے بھرے جسم اور گندمی رنگت کی ایک عورت برآمد ہوئی۔
اس کی عمر بھی کوئی چالیس سال ہوگی۔ "موتیا بائی! نواب صاحب بہت دور سے
شوقی جان کا چرچا سن کے آئے ہیں۔" میرے رہبر نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔
میں نے اپنی جیب ٹٹولی، پیا تو موجود تھا۔ عورت نے انکار میں گردن
ہلائی ہی تھی کہ میں آگے بڑھ گیا اور اُسے دروازے سے ہٹا کے اندر داخل ہو گیا۔
درمیان میں چھریرے بدن کی ایک خوب صورت لڑکی دل کش آواز میں گا
رہی تھی۔

اور ایک کونے میں پان دان کھولے چمپا بائی بیٹھی تھی۔
فرش پر نوٹ اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔
محفل شباب پر تھی۔ چھریرے بدن اور گندمی رنگ
کی ایک خوب صورت لڑکی تماش بینوں کے درمیان بیٹھی ہوئی گانا گا رہی تھی۔
اس کی عمر بہت کم معلوم ہوتی تھی۔ میں دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو ایک
طرف ہٹا کے اندر داخل ہوا تو لڑکی نے اپنی پلکیں اٹھا کے ایک نظر مجھے
دیکھا اور شرما کے اس پستہ قد اور تنومند شخص کی جانب متوجہ ہو گئی جو وہاں سب
لوگوں سے نمایاں تھا۔ اس نے میری آمد پر بُرا سا منہ بنایا اور کھنکھار کے اپنے
ساتھیوں سے ناگواری کا اظہار کیا۔ دروازہ کھولنے والی عورت نے ناچار مجھے
ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں اس کی بات پر عمل کرنے کے بجائے چند
لمحوں تک وہیں کھڑا رہا۔ میں نے پہلے سرسری نظر سے محفل کا جائزہ لیا تھا، پھر
میری نگاہ چمپا بائی پر جم گئی۔ چمپا بائی پان دان کھولے گلوریاں بنانے میں مصروف
تھی۔ اس نے شاید مجھے دیکھا نہیں یا دیکھا ہوگا تو پہچانا نہیں تھا لیکن میں نے
اُسے خوب پہچان لیا تھا۔ اُسے دیکھ کے میرے تن بدن میں چنگاریاں اُٹھنے
لگی تھیں۔ جی میں آیا بڑھ کے اس کا گلا گھونٹ دوں اور جب تک اس کی
آنکھیں حلقوں سے باہر نہ اُبل پڑیں اُسے نہ چھوڑوں لیکن اس طرح آپا جان تک
پہنچنے کی یہ آخری اُمید بھی ختم ہو جاتی۔ مجھے یہاں تک لانے والا شخص میری پشت
پر موجود تھا۔ اس نے ٹہوکا دے کے مجھے آگے بڑھنے اور بیٹھ جانے کی درخواست
کی اور سرگوشی میں کہا: "یہی تو ہے شوقی جان۔ ذرا قریب جا کے دیکھیے، پٹاخا
کیسا دِکھ رہا ہے۔"
چمپا بائی کے ساتھ ایک اور عورت بھی بیٹھی تھی۔ وہ شاید اُس کی
چھوٹی بہن موتیا بائی تھی۔ دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں۔ موتیا نے مجھے دیکھ
لیا تھا لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ شوقی جان کے بجائے میری نگاہیں مسلسل
اس کی بہن چمپا بائی پر مرکوز ہیں تو اس نے سہمے ہوئے انداز میں چمپا کے کان
میں کچھ کہا۔ چمپا نے ہڑبڑا کے دروازے کی جانب دیکھا، گلوری اس کے ہاتھ میں
جیسے جم گئی۔ اس نے بدحواسی میں موتیا سے کچھ کہا۔ دونوں بے چین ہو گئیں۔
موتیا نے پان دان جلدی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چمپا اُچھل کے اُٹھ کھڑی
ہوئی اور تیزی سے دائیں جانب کے کمرے کی طرف بڑھی لیکن اس سے پہلے
کہ وہ دروازہ بند کرتی، میں محفل عبور کرتا ہوا سیدھا اس کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں ایک دوسرا دروازہ بھی تھا۔ چمپا بائی بھاگ کے باہر جانا چاہتی تھی
لیکن مجھے سر پہ دیکھ کے ایک کونے میں دبک گئی۔ وہ بُری طرح لرز رہی تھی۔
اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پہ رکھ لیے تھے۔ "تم کون ہو؟" اس نے
گھگھیائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"تم اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو؟" میری آواز بھی کانپ سی رہی تھی۔ "میں
تمھاری تلاش میں بہت دُور سے آ رہا ہوں۔"
"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔
"گھبراؤ نہیں، میں تمھیں مارنے نہیں آیا ہوں۔" میں نے نفرت سے کہا۔
"مجھے صرف ایک بات بتا دو کہ تم نے فہیدہ کو کہاں سے حاصل کیا تھا؟"
"کون فہیدہ؟ میں کسی فہیدہ کو نہیں جانتی۔"
"تم فہیدہ کو نہیں جانتیں؟" میں نے چیخ کے کہا۔ "تم نیلم جان کو
نہیں جانتیں چمپا بائی؟ میں تمھارا خون پی لوں گا۔"
"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے مڑ کے دیکھا، موتیا دروازے
میں کھڑی بڑی شائستگی سے کہہ رہی تھی۔ "بیٹھیے، تشریف رکھیے۔ آپ شاید
کسی غلط جگہ آ گئے ہیں۔ یہ تو بالا خانہ ہے جناب اور یہ میری بڑی بہن ہیں۔
بے شک ان کا نام چمپا ضرور ہے مگر کسی نیلم جان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔
آپ کس نیلم جان کی بات کر رہے ہیں؟"
"موتیا بائی، چپ رہو، بیچ میں مت بولو اور درمیان میں مت دخل دو۔" میں نے
مشتعل ہو کے کہا۔ "مجھے چمپا سے بات کرنے دو۔"
"اے میاں، واہ۔" موتیا بائی ہاتھ نچا کے بولی۔ "منہ اُٹھائے گھر میں گھس
آئے، پھر اس پہ دیدے دکھاتے ہو۔ ہم بھی شرفا میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ میاں!
یہ کیا ادھم مچا رکھا ہے، نہ محفل کا خیال، نہ کچھ عورت ذات کا پاس۔ چہرے مہرے سے
تو خاندانی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کہہ جو دیا آپ سے کہ ہم نیلم جان کو نہیں جانتے۔"
وہ بگڑ کے بولی۔
"نہیں جانتیں!"
"ہاں نہیں جانتے۔" موتیا نے غصے سے کہا۔
"موتیا بائی! تم بات بڑھا رہی ہو۔" میں نے ضبط سے کام لیا۔ "میں یہاں
جھگڑا فساد کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے تمھاری بہن چمپا بائی سے صرف یہ معلوم کرنا
ہے کہ اس نے نیلم جان کو کہاں سے اور کن حالات میں اُٹھایا تھا۔ مجھے بس اتنا
صحیح صحیح بتا دو۔ میں چلا جاؤں گا۔"
"یہاں کوئی نیلم جان ویلم جان کو نہیں جانتا، اپنا رستہ لو۔" موتیا کا لہجہ
گرم ہو گیا۔ "باہر محفل جمی ہوئی ہے، عزت دار لوگ بیٹھے ہیں۔"
"چمپا بائی! میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" میں نے گرج کے کہا۔
"چمپا سے کیا بات کرتے ہو۔" موتیا نے پھر دخل دیا۔ "چمپا بائی اللہ رکھے
اندر بیٹھیں اور لے میاں! جاؤ کسی اور بالا خانے پہ جا کے دھکے دو، تمھاری
نیلم جان کو کہیں نہ کہیں ضرور پتہ چل جائے گا۔"

"چپ رہو۔" میں نے اُلٹے ہاتھ سے موتیا کے رخسار پہ ایک طمانچہ رسید
کیا۔ وہ پلنگ پہ جا کے گری۔ سازندوں کے سازوں، شوقی جان کے گھنگروؤں اور
شور شرابے میں موتیا کی آواز باہر نہ جا سکی۔ اس نے آتے ہی احتیاطاً دروازہ بھی
بند کر لیا تھا۔ مجھے شہر پناہ کے بالا خانے پہ اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ
محفل کے وقت کوئی بھی یہ دنگا فساد پسند نہیں کرتا لیکن موتیا بائی نے خود ہی
پہل کر دی تھی۔ "چمپا بائی!" میں نے چند قدم آگے بڑھ کے کہا۔ "تم شیخن آباد سے
بھاگ کے یہاں چلی آئیں۔ تم کہیں بھی جاؤ مجھے اس سے سروکار نہیں۔ بے چاری فہیدہ
کی قسمت ہی خراب تھی۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ
وہ بدقسمت لڑکی تمھیں کہاں سے ملی تھی؟"
چمپا بائی کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ موتیا بھی طمانچہ کھا
کے خاموش ہو گئی تھی۔ میں جب چمپا کے قریب پہنچا تو موتیا تیزی سے اُٹھ
کے باہر نکل گئی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو چمپا نے دوسرے دروازے سے
بھاگنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔" وہ درد سے
بلبلا کے چیختی ہوئی بولی۔ "میں نے نیلم جان کو میسور سے خریدا تھا۔"
"میسور سے؟"
"ہاں میسور سے۔ میں نے اُسے پانچ ہزار روپے میں خریدا تھا۔ میں اس کا
گھر نہیں جانتی۔ میں اس کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتی۔ میں تم سے سچ کہہ
رہی ہوں۔" وہ عاجزی سے بولی۔
میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "میسور میں تم نے کس سے اُسے خریدا
تھا اور کب خریدا تھا؟ وہ تمھیں کس حالت میں ملی تھی؟"
"میں ایک ہوٹل میں ٹھیری ہوئی تھی کہ چند اجنبی لوگوں نے سودا کر کے
اُسے میرے حوالے کر دیا۔" وہ بتانے لگی۔ "لڑکی بہکی ہوئی تھی۔ میں نے مول تول نہیں کیا
اور زیادہ کرید نہیں کی۔ پھر میں نے اسی وقت میسور چھوڑ دیا تھا۔"
"یعنی تمھیں یہ نہیں معلوم کہ تم نے پانچ ہزار روپے کن لوگوں کو دیے
اور ان کے نام کیا تھے؟ تمھیں کچھ نہیں معلوم تھا؟ چمپا بائی! سچ سچ بتاؤ۔" میں
نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ نام تو ان کے ضرور پوچھے تھے۔ مجھے یاد نہیں رہے۔
انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ ان کا ایک آدمی
میرے ساتھ آگرے تک آیا تھا۔ آدھی رقم میں نے اُسے یہیں دی تھی۔"
"جو شخص تمھارے ساتھ آیا تھا کیا تم اُسے بھی نہیں پہچانتیں؟" میں
نے ہاتھ اُٹھا کے چمپا کے گال پہ تھپڑ مارنا چاہا۔
"اس کا نام بکرم تھا۔" چمپا جلدی سے بولی۔
"تم اس کا ٹھکانا جانتی ہو؟"
"نہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ پیچھے ہٹ کے بولی۔ "پانچ سال گزر گئے۔
اس کے بعد میں میسور نہیں گئی۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔
"ٹھیک ہے چمپا بائی! تمھیں میرے ساتھ میسور چلنا ہوگا۔"

"میں۔ میں۔ نہیں۔" وہ ہکلانے لگی۔
"ہاں تم۔ تم۔ اور ابھی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تیاری کر لو۔"
"کیسی تیاری؟" پیچھے سے اچانک کسی مرد کی آواز آئی۔ میرے پیچھے
دو آدمی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ موتیا بائی بھی تھی۔ یہ پیشہ ور لوگ جانے
پہچانے ہوئے تھے۔ ان چہروں پہ چھچھل اور ہلاکت کی چھاپ تھی۔
پچھلے ساڑھے سات برسوں سے میں انھی چہروں کے درمیان رہ رہا تھا۔
میرے تمام حواس انھیں پہچان چکے تھے۔ "کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" ان میں
سے ایک نے میرے سینے پہ ہاتھ رکھ کے بڑے چیلنج بھرے لہجے میں کہا۔
میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "دیکھو، یہ میرا اور چمپا بائی کا معاملہ ہے۔
بہتر ہے تم لوگ درمیان میں نہ پڑو۔"
"موتیا بائی!" دوسرا شخص اب تک خاموش کھڑا تھا، اس نے زبان کھولی۔
"اسے بتا دو کہ اس علاقے میں نوشے کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔"
موتیا بائی نے اشتعال میں کہا۔ "محسن یا جو بھی ہو میاں! اب سیدھے
سیدھے یہاں سے بھاگ جاؤ اور آیندہ اس طرف کا رخ مت کرنا۔ اکیلی عورتیں
سمجھ کے ہاتھ اٹھایا تھا۔ ابھی نوشہ زندہ ہے۔"
"موتیا بائی! میں نے تم سے کہا تھا کہ بات مت خراب کرو۔ یہ نوشہ اور
شرہ بالا الگ ہی رکھو۔ چمپا بائی میرے ساتھ جا رہی ہے۔"
"چمپا بائی کہیں نہیں جائے گی۔" نوشے کی بھاری آواز گونجی۔ "نوشے کے
بغیر یہاں سے کوئی سواری نہیں جاتی۔ یہ معاملہ بھلے نوشے سے نمٹانا پڑتا ہے۔"
"ان گلیوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ نوشے کے حکم کے بغیر نہیں ہوتا۔ نوشہ
کو مت جگاؤ۔ اجنبی ہو، بچے ہو، تو ٹھنڈے ٹھنڈے تماشا دیکھو۔" نوشے
کے ساتھی نے استہزا سے کہا۔
"دفع ہوتے ہو یا نہیں؟" نوشہ گرج کے بولا۔
"چمپا بائی! چلو۔" میں نے نوشے کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔
"چمپا بائی نہیں جائے گی۔"
"چمپا بائی کو کوئی روک نہیں سکتا۔"
"تھو۔" نوشے کے ساتھی نے منہ آگے کر کے فرش پہ تھوک دیا۔ "کیا بکواس
کیے جا رہا ہے سالے! اتنی دیر سے نوشے کے سامنے بیان سے نکلا ہے
یا اٹھا کے پھینکنا پڑے گا؟" وہ گالیاں دیتا ہوا طیش میں میری طرف آیا اور میرے
جبڑے پہ اس نے مکا مارنا چاہا۔ میں ان کے ساتھ کوئی جھگڑا مول لینے سے
گھبرا رہا تھا اس لیے جیسے ہی اس نے ہاتھ اُٹھایا، میں نے پھرتی سے اپنا
منہ ایک طرف کر لیا۔ نوشے کے ساتھی کا جھپٹتا ہوا ہاتھ میرے بازو پہ پڑا۔
وہ جھونک میں کچھ جھکا اور سنبھل گیا۔ میں نے اس لمحے سے فائدہ اُٹھا کے
اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کسی تاخیر کے بغیر اس کے پیٹ میں پوری قوت سے
گھٹنا مارا۔ گھٹنا معدے کے منہ پہ لگا تھا۔ نوشے کا ساتھی بلبلایا اور پیٹ پکڑ کے
نیچے فرش پہ لوٹنے لگا۔ میں نے اس کے ساتھ احتیاطاً ایسا نہیں برتا تھا کہ

نوشہ کے تیور اچھے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ایک کو ناکارہ کر دیا جائے۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کے نوشہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے ایک بار پھر اُسے درمیان میں دخل نہ دینے اور اس معاملے سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا لیکن نوشہ نے اپنے نیفے سے اُسترا نکال کے کھول لیا تھا۔ میرا ہاتھ خالی تھا اور چاقو نکالنے کا وقت نکل گیا تھا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرنیچر کی وجہ سے جگہ بھی تنگ تھی۔ نوشے نے آزما لیا تھا کہ میں کوئی اناڑی آدمی نہیں ہوں۔ غنڈے ہتھیار اسی وقت نکالتے ہیں جب زبانی تنبیہ اور دوسرے حربے ناکام ہونے کا اندیشہ ہو۔ دونوں عورتیں باہر جانے والے دروازے کے پاس ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی کھڑی تھیں۔ موتیا کچھ دیر پہلے شستہ لہجے میں بات کر رہی تھی، شراب کا بیان بکنے لگی تھی۔ چمپا بائی کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں چمپا بائی فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ دوسری طرف نوشہ اُسترا لیے پینترے بدل رہا تھا۔ اُسترے کی تیز دھار روشنی سے چمک رہی تھی۔ یکایک اس نے حملہ کرنے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں تیزی سے بائیں جانب ہٹ گیا لیکن اس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اس نے چشم زدن میں اُسترا دائیں ہاتھ سے اچھال کے بائیں ہاتھ میں پکڑا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ بچتے بچتے بھی میرے ہاتھ پر اُسترے نے ایک لکیر کھینچ دی۔ اگر میں چند قدم پیچھے ہٹ کے اس کے اچانک حملے سے نہ بچتا تو اُسترا میری بائیں پسلی کا تار ہوا گزر جاتا۔ پیچھے ایک بڑا صندوق رکھا تھا۔ میں اس سے ٹکرا گیا۔ نوشہ نے ایک غلیظ گالی دی اور اُسترا تانے ہوئے دھمکیاں دیتا ہوا مجھ پر دوبارہ جھپٹنے کے لیے پر تولنے لگا۔ نوشہ کو توقع نہیں ہوگی کہ میں اتنی جلدی زمین پر بیٹھ جاؤں گا۔ اُدھر وہ بڑھا اِدھر میں بیٹھا۔ نتیجے میں نوشہ خود صندوق پر گرتے گرتے رہ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح اس کا دوسرا حملہ میرے سر پر ہوگا لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ میرے پاس صندوق سے ٹکرانے کے بعد اپنے بچاؤ کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی۔ میں اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کے اتنی تیزی سے آگے کی طرف اچھالا کہ اس کا سر صندوق پر جا پڑا۔ اس طرح اُس کی تھوڑی شکستہ ہو گئی ہوگی اور نیچے کے کئی دانت ٹوٹ گئے ہوں گے۔ نوشہ اپنی چیخ نہیں روک سکا اور بوکھلاہٹ میں اُسترے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اس نے خود اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ میں نے اس کی ٹانگیں نہیں چھوڑیں۔ وہ صندوق سے اچھلتا ہوا فرش پر آ گیا اور زمین سے اس کا منہ ٹکرایا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ نوشہ کا پورا منہ چکنا چور ہو گیا۔ اس نے اپنی ٹانگیں آزاد کرانے کی تھوڑی سی جدوجہد کی۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ مروڑ دی۔ وہ بھیانک کراہیں بلند کرنے لگا۔ میں اس سے نمٹنے میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے موتیا اور چمپا بائی کے بھاگنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ وہ دونوں کمرے میں نہیں تھیں۔ نوشہ کا دوسرا ساتھی پیٹ پکڑے ہوئے فرش پر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کی آوازوں میں نوشہ کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں اور دہشت پھیلا رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ نوشہ کچھ دیر ضرور مزاحمت کرے گا مگر وہ بہت جلد اوسان کھو بیٹھا۔

صرف چند منٹوں میں کمرے کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ موتیا اور چمپا ابھی دور نہیں پہنچی ہوں گی۔ میں نوشہ اور اس کے ساتھی کو چھوڑ کے باہر کی طرف لپکا۔ اندر صحن کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک اور سجا ہوا کمرہ کھلا تھا۔ چھوٹا زینے والے مکانوں میں ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔ مجھے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چمپا اور موتیا اگر دیوار پھلانگ کے دوسرے مکان میں نہیں گئی ہیں تو اسی مکان میں ہوں گی۔ باورچی خانے کے قریب مجھے کوٹھری جیسا ایک کمرہ بند نظر آیا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے کچھ سننے اور جھریوں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آیا، نہ کوئی آہٹ محسوس ہوئی۔ ان سے یہ بعید نہیں تھا کہ وہ دوسرے مکان میں جا کے پولیس کو بلا لیں۔ اندر دو آدمی کراہ رہے تھے۔ ایک کا چہرہ لہولہان تھا۔ پھر کوئی گواہ نہیں تھا۔ یا تو مجھے فوراً یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا یا پھر پولیس کے خطرے سے بے پروا ہو کے موتیا اور چمپا بائی کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اگر ابھی دیر نہ ہوتی تو گلی میں اُنھیں پیچھے راستے میں پکڑ سکتا تھا لیکن راستے میں اُنھیں پکڑنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ پوری سڑک پر ہنگامہ ہو جاتا۔ میں سنسان میں کسی دیوانے کی طرح اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہا تھا۔ میرے قدم بار بار باورچی خانے سے ملحق کوٹھری کی طرف اٹھتے تھے۔ اگر وہ دیوار پھلانگ گئی ہیں تو اس کے لیے انھوں نے کسی چیز کی مدد ضرور لی ہوگی۔ میں نے غور سے جائزہ لیا۔ دیوار کے ساتھ کوئی کرسی یا میز لگی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے لپک کے کوٹھری کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ لکڑی کا دروازہ ہلنے لگا۔ "باہر آ جاؤ چمپا بائی! باہر آ جاؤ۔" میں نے چیخ چیخ کر کہا۔

کوٹھری کے اندر ضرور کوئی موجود تھا۔ کوئی چیز گرنے کی آواز آئی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اور زور زور سے دروازہ دھڑدھڑانا شروع کر دیا۔ "چمپا بائی! اگر تم باہر نہ نکلیں تو میں اس کوٹھری کو آگ لگا دوں گا۔ باہر آ جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اگر تمھیں ابھی یہاں ختم کر دوں تو نیلم جان واپس نہیں آ جائے گی۔ میں تم سے صرف اس کے گھر کا پتہ جاننا چاہتا ہوں۔" میں چیختا چلاتا رہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے چمپا بائی! اب تم ہمیشہ کے لیے اندر رہو۔ میں باہر سے کنڈی لگا کے آگ لگا رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں ٹھہرو۔" چمپا بائی نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ "میں باہر آ رہی ہوں۔" ساتھ ہی کوٹھری کا دروازہ کھل گیا اور اندر سے لرزتا ہوا، کانپتا ہوا چمپا اور موتیا برآمد ہوئیں۔ اُن کے چہرے سفید ہو رہے تھے۔

"موتیا بائی! تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔ وہ دونوں اندر تڑپ رہے ہیں۔ چمپا کو معلوم تھا کہ میں فیض آباد میں اس کے بالاخانے پر کن لوگوں کے ساتھ پہنچا تھا۔ پھر بھی اس نے خیال نہیں کیا۔"

"نیلم جان تمھاری کون تھی؟" موتیا نے سہم کے پوچھا۔

"کیا کرو گی پوچھ کے؟" میری آواز بھرا گئی۔ "میں اس کا کچھ بھی نہیں تھا۔ چلو چمپا بائی! دیر نہ کرو۔ میرا سینہ جل رہا ہے۔"

"ابھی؟ اسی وقت؟" چمپا بائی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"ہاں ابھی اور اسی وقت۔"

"مگر آپ سوچیے تو میاں! اس بات کو برسوں گزر چکے ہیں۔ معلوم اب وہ لوگ وہاں موجود بھی ہوں یا نہ ہوں۔" موتیا نے نرمی سے کہا۔

"تم پھر فضول باتیں کرنے لگیں موتیا بائی! مجھے چمپا بائی کے ساتھ چاہے دُنیا کے آخری سرے تک جانا پڑے مگر میں نیلم جان کے گھر کا پتہ ضرور چلاؤں گا۔"

"مگر چمپا باجی کو نیلم جان کے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔" موتیا بولی۔ "خیال! عجلت میں نہ آئیے۔ ہم توبہ کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کو پہچاننے میں غلطی کی۔ ذرا ایک دو دن ٹھہر لیجیے۔ ہم یہ اطمینان کر کے کیوں نہ چلیں کہ وہاں تک جائیں اور کچھ بات بھی بنے۔ خواہ مخواہ طویل سفر کرنا پڑے اور حاصل وصول کچھ نہ ہو تو فائدہ؟ آپ چاہیں تو یہاں ٹھہریں مگر یہ جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ یقیناً ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہوں گے۔ میں باجی کی طرف سے وعدہ کرتی ہوں کہ ہم کسی اور طرف نہیں نکلیں گے۔ آپ کے ساتھ ہی چلیں گے جہاں تک بھی آپ لے جائیں۔ البتہ بالاخانے کا کچھ نہ کچھ انتظام کرنے میں ایک دو دن کی دیر لگے گی۔"

"موتیا بائی! تم نے پھر حیل حجت شروع کر دی۔" میں نے غصے سے کہا۔ "تمھارے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف چمپا بائی کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا میں باجی کو تنہا آپ کے ساتھ بھیج دوں گی میاں! آپ اتنا تنگ نہ کیجیے۔ ایک بار رنڈی کی بات کا بھی اعتبار کر کے دیکھیے۔"

"بس کرو۔" میں نے چمپا بائی کی کلائی تھام لی۔ "چلو۔"

موتیا بائی رونے لگی۔ چمپا کی حالت تو پہلے ہی ابتر تھی۔ "ہم نے نیلم جان کو اپنی بیٹی بنا کے رکھا تھا۔" موتیا سسکیاں بھرتی ہوئی بولی۔ "اس کی موت کا جتنا دکھ تمھیں ہے اتنا ہی ہمیں بھی ہے۔"

"چمپا بائی تو اپنی بیٹی کے کفن دفن میں بھی شریک نہیں ہوئی۔ کیسی ماں تھی جو اپنی بیٹی کی لاش سڑک پر چھوڑ کے چلی آئی۔ موتیا بائی! اپنی زبان بند رکھو۔ اگر اب تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو....." میں نے دوسرے ہاتھ سے چاقو نکال لیا۔

چاقو دیکھ کے موتیا کی زبان پر جیسے فالج گر گیا۔ وہ اپنے بال کھسوٹنے لگی۔ چمپا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے جانے دو موتیا!" چمپا نے اداسی سے کہا۔ "جلدی میرا سامان نکالو۔"

موتیا دہاڑیں مار کے اپنی بہن سے لپٹ گئی۔ "میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔" وہ بلکتی ہوئی بولی۔ "میں تمھیں اکیلی نہیں جانے دوں گی۔"

"میں چمپا بائی کے سوا کسی کو نہیں لے جاؤں گا۔" میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ "اور کان کھول کے سن لو موتیا! اگر تم نے میرے جانے کے بعد کوئی بے وقوفی کی تو تمھاری بہن کبھی واپس نہیں آ سکے گی۔ سمجھیں؟ تمھارے دربانوں کو ٹھکانے لگانے کا حشر دیکھ چکی ہو۔ جلدی کرو۔ چمپا بائی کا سامان نکالو۔ اندر ان دونوں کو تمھاری ضرورت ہے۔ اگر تم نے ان کی طرف توجہ نہ دی تو بالاخانے پر پولیس آ جائے گی اور تمھارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔"

موتیا نے ٹین کے ایک چھوٹے صندوق میں چمپا کا سامان بھر دیا۔ ایک مختصر بستر بھی جلد از جلد تیار کر دیا گیا۔ بستر میں چادر، تکیے اور کمبل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موتیا چمپا کے کپڑوں کے لیے اندر گئی تو سسکتے کراہتے نوشہ اور اس کے ساتھی کی درگت بھی دیکھ آئی ہوگی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت بوکھلائی ہوئی تھی۔ قدم رکھتی کہیں تھی، پڑتے کہیں تھے۔

باہر نکلتے وقت جب ہم اس کمرے سے گزرے تو نوشہ کا چہرہ خون میں نہایا ہوا تھا اور اس کا ساتھی ایک طرف بے ہوش پڑا تھا یا مر گیا تھا۔ نوشہ ابھی تک کلبلا رہا تھا۔ چمپا بائی کی سسکی نکل گئی۔ میں نے چمپا اور موتیا کو آگے کیا اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ دروازہ کھولا تو ثریا جان کے سازندے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ثریا جان کسی شخص کے پاس بیٹھی ہوئی ٹھمری گا رہی تھی۔ ہم دائیں جانب کے کمرے سے نکلے۔ موتیا نے صندوق اور چمپا نے بستر سنبھال رکھا تھا۔ اصل میں کمرے کے دروازے سے جانے کے بجائے سازندوں کی نشست عبور کر کے ہم دوسرے دروازے سے بائیں جانب کے کمرے میں آ گئے۔ یہاں آ کے پہلے نے مجھ سے.... اس کمرے سے بھی ایک دروازہ زینے تک کھلتا تھا۔ اس طرح ہم تماش بینوں کی نظروں میں آنے سے بچ گئے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے موتیا کو یہ مہلت نہیں دی کہ وہ چمپا سے کوئی بات کر سکے۔ رونے لگی تو میں نے اُسے ایک ٹہوکا دیا اور دونوں ایک بار پھر گلے مل کے رونے لگیں۔ "موتیا بائی! اپنی بہن کی زندگی پیاری ہے تو اس کی واپسی کا انتظار خاموشی سے کرنا۔" میں نے زینے سے اترتے ہوئے موتیا کے کان میں دوبارہ یہ بات ڈالنی مناسب سمجھی۔

گلی میں کچھ دور تک میں پیدل چلا۔ بڑی سڑک کے نکڑ پر مجھے ایک تانگا مل گیا۔ وہ شخص جو مجھے موتیا کے بالاخانے پر لے گیا تھا، پھر کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے تانگے والے کو اپنے ہوٹل کا پتہ بتایا۔ چمپا کو تنہا تانگے میں چھوڑ کے ہوٹل جانا مناسب نہیں تھا، میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ ہوٹل کے لوگوں نے جب میرے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی عورت دیکھی تو ان کی آنکھیں کھلنے لگیں لیکن میں نے اپنے کمرے میں آ کے بیرے کو فوراً بل لانے کی ہدایت کی۔ چمپا اس دوران میں خاموش بیٹھی رہی۔ بل ادا کرنے کے بعد سامان اٹھا کے میں نے اسٹیشن کا رخ کیا۔ لکھنؤ اسٹیشن پر جب میں چمپا کو ساتھ لیے ٹکٹ گھر کی طرف جا رہا تھا تو چمپا نے مجھے مخاطب کیا۔ "میرا ٹکٹ مت لینا۔ بمبئی تک کا ٹکٹ لینا۔" میں ٹھٹک کے رک گیا۔

"چمپا بائی! صحیح صحیح بتاؤ کہاں جانا ہے؟" میں نے تیزی سے کہا۔ "اور یہ بات جان لو کہ فرار کی کسی کوشش کا تجربہ بہت مہنگا ہوگا۔ فیض آباد

میں سب کو معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ جاؤ گی تو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تجربات میں تو یہاں کے کہے کرایا ہوں، وہی تم سے کہتا ہوں، ورنہ ابھی جان سے جائے گی۔"

"میں نے تمہیں غلط بتایا تھا۔ فہمیدہ مجھے بمبئی میں ملی تھی۔" چمپا کے لہجے میں اب پہلے جیسی لرزش نہیں تھی۔

"اچھا تو بمبئی چلتے ہیں۔ تم جہاں جہاں کہو گی میں وہاں وہاں جاؤں گا۔" میں اس پر نظر رکھے ہوئے ٹکٹ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کھڑکی سے معلوم ہوا کہ دلی سے بمبئی جانے والی گاڑی ڈیڑھ بجے آئے گی۔ آگرہ سٹی اسٹیشن پر انتظار کا یہ ڈیڑھ گھنٹہ بہت مشکل سے کٹا۔ مگر وہاں میری خواہش کے بموجب کب آتی جاتی تھیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ بہت ہوتا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں دنیا اپنی رائے بدل سکتی تھی۔ وہ کچھ اور غنڈے اپنی مدد کے لیے طلب کر سکتی تھی یا پولیس بلا سکتی تھی۔ چمپا کی وجہ سے میں نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے تاکہ وہ میری نظر میں زیادہ سے زیادہ رہے۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ میں نے چاقو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ ویٹنگ روم میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کوئی درمیان میں آیا تو اُسے علم ہے کہ چمپا بائی زندہ نہیں ملے گی۔ میری بہن فہمیدہ کی رسوائی اور موت کا یہ بہت کم خراج تھا مگر اس کا بے غیرت مجبور بھائی یہی کچھ کر سکتا تھا۔ چمپا بائی نے نقاب اپنے چہرے سے ہٹا لی تھی اور سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے فہمیدہ کے بارے میں اس سے بہت سی باتیں معلوم کرنے اور اُسے اُسانے کی حسرت جبراً دبا رکھی تھی۔ گاڑی آنے میں پندرہ منٹ کی اور تاخیر ہو گئی۔ یہ پندرہ منٹ بھی کسی نہ کسی طرح گزر گئے۔ کاش میرے پاس پٹا ہوتا جو میں چمپا کی گردن میں ڈال کے اس کی زنجیر ہاتھ میں پکڑے رہتا۔ گاڑی آتے ہی اسٹیشن پر بڑی افراتفری مچ گئی۔ میں نے چمپا بائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ قُلی اُس کا صندوق اور بستر اٹھائے ہوئے تھا۔ کمپارٹمنٹ میں صرف ایک مدراسی مسافر موجود تھا۔ پڑھا لکھا شخص معلوم ہوتا تھا۔ اُردو بہت کم جانتا تھا۔ اس نے خندہ پیشانی سے ہمیں سامنے والی سیٹ دے دی اور خود اوپر کی برتھ پر سونے کے لیے چلا گیا۔ میں نے چمپا بائی کو اشارہ کیا کہ وہ بستر بچھا کے آرام کرے۔ چمپا بائی دیر تک سیٹ پر بیٹھی رہی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ "تم بھی سو جاؤ۔ میری طرف سے اطمینان رکھو۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے، سفر لمبا ہے، چمپا بائی! سو جاؤ۔"

وہ ایک دو گھنٹے تک کھڑکی کی طرف منہ کیے ایک پہلو سے بیٹھی رہی پھر تھک کے برتھ پر لیٹ گئی۔ گاڑی مختصر وقفوں کے لیے مختلف اسٹیشنوں پر رکتی رہی۔ میں تمام رات جاگتا رہا۔ چمپا بائی مل گئی تھی۔ وہ میرے اُجڑے ہوئے گھر کی طرف جانے والا راستہ تھی۔ میری آنکھوں میں ابا اتی کے چہرے گھبرے ہوئے تھے۔ کفن میں لپٹا ہوا فہمیدہ کا چہرہ بار بار سامنے آ جاتا تھا۔ چمپا بائی کی آنکھیں بند تھیں۔ میرے ہاتھ بار بار اس کی گردن کی طرف اٹھتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ نہ معلوم ابا جان کیسے ہوں؟ اتی کی موت اور فہمیدہ کی جدائی نے اُن کی کمر جھکا دی ہوگی۔ بس میں ایک بار وہاں پہنچ جاؤں، اُن کے پیروں پہ گر جاؤں گا اور سب بہن بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ جب تک میرے منہ پہ نہیں تھوکیں گے مجھے سکون نہیں آئے گا۔

گاڑی آگرے سے بہت دور آ چکی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے بھاپ سے دھندلے ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں صاف کر کے باہر دیکھا۔ سورج نکلنے کو تھا۔ چمپا بائی بھی اٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔ نیند اُسے بھی نہیں آئی تھی۔ اوپر مدراسی مسافر گہری نیند سو رہا تھا۔ صبح بھوپال کے اسٹیشن پہ پوری ترکاری لے کے میں نے چمپا کے آگے رکھ دی۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے جھجکی۔ "تم نہیں کرو گے؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں، مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"مجھے بھی نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا کھا لو، چائے پیو گی؟"

"ہاں، ضرور چائے پلوا دو۔" اس نے اُجلی آواز میں کہا۔

میں نے چائے والے کو آواز دی۔ گاڑی کے ساتھ چلنے والا بیرا بھی سامنے آ گیا۔ میں نے اس سے ایک ٹرے لے کے چمپا کے آگے رکھ دی۔ "میرے ہاتھ کی چائے پیو گے؟" اس نے کیتلی میں چینی کا ایک چمچہ ڈالتے ہوئے کہا۔

میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ جی میں آیا کہ منہ ہی نہیں پیالی لگا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سرزنش کی۔ "میں ابھی چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے مختصر جواب دیا اور کھڑکی میں گردن ڈال کے پلیٹ فارم پر منتشر مسافر دیکھنے لگا۔ اچانک میں اپنی سیٹ پر اچھل گیا۔ کچھ دور ایک فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر مولوی صاحب جیسی صورت کا ایک شخص بک اسٹال پہ کھڑا تھا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ میں بے چین ہو گیا۔ چمپا بائی کی طرف دیکھا۔ وہ چائے پی رہی تھی۔ دروازہ کھول کے میں نے پلیٹ فارم پہ بھاگنا شروع کر دیا۔ کئی مسافر میری ٹکر کھا کے گرتے گرتے بچے لیکن میرے قدم کچھ فاصلے پہ جا کے منجمد ہو گئے۔ دور سے وہ مولوی صاحب کی شکل و صورت کا کوئی شخص نظر آتا تھا مگر قریب سے اُن سے اتنا مختلف تھا کہ مجھے اپنے آپ سے ندامت ہوئی۔ بھلا مجھے مولوی صاحب ہر کسی کی صورت کیوں نظر آتے ہیں۔ تھکے ہوئے قدموں سے واپس آنے لگا۔ ڈبے تک پہنچنے کی کچھ دیر کچھ سیٹی بج گئی تھی مگر گاڑی جانے کہاں کس سمت میں رہتی تھی۔ مجھے ہر سمت اس کی آہٹ اس کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ آگرے میں بدھ بخشش ان کو دیکھ کے ایک موہوم سی امید پیدا ہوئی تھی شاید انہیں معافی مانگنے سے فائدہ ہو۔ بکنے والی لڑکی کو اس کا علم ہو مگر موتیا کے بالا خانے پر پیش آنے والے حالات کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ کوئی فکر کرتا تو چمپا بائی پھر ہاتھ نہ آتی۔ پہلے کتنی تھی کہ اس نے فہمیدہ کو کیسے حاصل کیا ہے۔ اب بمبئی کی طرف لیے جا رہی تھی۔ چمپا کی بات اور ارادے کا کیا بھروسا تھا۔ ایک بار گی مجھے گمان ہوا کہیں اُس نے میری غیر حاضری سے فائدہ نہ اُٹھا لیا ہو۔ میں دوڑ کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ میری سانس قابو میں آئی۔ چمپا بائی اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی۔ گاڑی بھوپال اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو چمپا بائی اپنی سیٹ سے اُٹھ کے میرے برابر آ گئی۔ پہلیوں کی کبھی کھڑکی میں جھانکتی، کبھی میری صورت تکتی رہی، پھر آہستگی سے اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اگر تمہیں یہ ڈر ہے کہ میں کہیں بھاگ جاؤں گی تو یہ بات دل سے نکال دو۔ میں تمہارے ساتھ ہی چل رہی ہوں۔"

"تم اپنے حق میں بہتری کر رہی ہو۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "تمہیں یا تمہاری بد زبان بہن کو ڈھونڈنا میرے لیے اتنا مشکل نہیں ہو گا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ گاڑی چلتی رہی۔ پھر وہ کچھ دیر بعد مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "فہمیدہ تمہاری کون ہوتی تھی؟ وہ تمہیں دیکھ کے کیوں کر دو گئی تھی؟"

"میری شکل ہی ایسی ہے۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔ ماشاء اللہ تم لاکھوں میں ایک ہو، نوجوان ہو، وجیہہ ہو۔ اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو مجھے بتا دو۔ کم از کم یہ خیال کر کے کہ فہمیدہ سے میرا بھی کچھ تعلق رہا ہے۔"

"یہی تو دکھ ہے کہ فہمیدہ سے تمہارا تعلق کیوں رہا ہے چمپا بائی! تمہاری زبان پر اس کا نام کیوں آتا ہے؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"میاں! ہم بھی تو آخر انسان ہیں۔ قسمت قسمت کی بات ہے، کون چاہتا ہے کہ وہ شخص بھلے لوگوں کی نگاہوں میں آتا ہے، ہم سے اتنی نفرت مت کرو۔ ہمارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔"

"مجھے شبہ ہے، مجھے شبہ ہے چمپا بائی کہ تمہارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ تم فہمیدہ جیسی لڑکی کو لے آئیں۔ فہمیدہ جس نے اپنے گھر کے مردوں کے سوا کسی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" وہ یاسیت سے بولی۔ "وہ اتنی ہی اچھی لڑکی تھی۔ مجھے بھی یہ دنیا دیکھتے اور یہ کاروبار کرتے ہوئے ایک عمر گزر گئی ہے۔ میں نے اس جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔ میں تم سے قسم کھا کے کہتی ہوں کہ فہمیدہ کو مجھ پر لگے بھی آنچ نہ آئی۔ وہ ایسی پاک باز تھی جتنی اپنے گھر میں ہو گی۔ بڑے بڑے رئیس زمیںوں نے بہت کوشش کی لیکن اس نے سب کو ٹھکرا دیا۔ وہ بس ناچتی گاتی تھی۔ میں نے بھی اُسے نہیں چھیڑا۔ بہت دنوں بعد تو وہ ناچنے گانے پہ آمادہ ہوئی تھی۔ میاں! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تمہاری خوشامد کے لیے فہمیدہ کی اچھائیاں نہیں کر رہی ہوں۔"

"تم مجھے کیا یقین دلانا چاہتی ہو؟" میں نے اداسی سے کہا۔ "یہ کیا کم ہے کہ وہ کوٹھے پر بیٹھتی تھی۔ یہ کیا کم ہے چمپا بائی؟"

"میاں! میں آگرے نہ لے آتی تو مجھ جیسی کوئی اور لے جاتی۔ وہ محلہ لوگوں کے پنجے میں پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔ وہاں سے لڑکیاں اپنے گھر واپس جانے کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ انہیں یاد بھی رہتا ہے تو غیرت اُن کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتی ہے۔ فہمیدہ واپس نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے تو اُسے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا۔"

"بس چمپا بائی! بس کرو۔ مجھ پہ یہ احسان اور کرو کہ مجھے فہمیدہ کے گھر کا پتہ بتا دو۔ تم نہیں جانتیں تو مجھے اُن لوگوں کے بارے میں بتا دو جن سے تم نے فہمیدہ کو حاصل کیا تھا۔ مجھے کچھ اور غرض نہیں، میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔"

"میاں! میں تمہارا درد محسوس کر رہی ہوں مگر مجھے تم نے بتایا نہیں کہ تم فہمیدہ کے کون ہوتے ہو؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"یہ ذکر چھوڑو چمپا بائی۔" میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ میں چپ رہا۔ مجھے غصہ کی طرح پلک جھپکتا رہا۔ کے اوپر سے مدراسی بابا اُٹھ کے آ گیا اور انگریزی میں پوچھنے لگا۔ بھوپال گزر گیا یا نہیں؟ میں نے چمپا کے سامنے انگریزی اسی لیے گریز کیا۔ آگے نہ معلوم کیسے واقعات پیش آئیں۔ میں نے مدراسی کو اردو میں جواب دیا کہ بھوپال گزرے دیر ہو گئی ہے۔ اب گاڑی وندھیاچل کے پہاڑی سلسلے سے گزر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے حیرانی جھلکنے لگی۔ وہ سوچ رہا ہو گا کیسے لوگ ہیں جن کا سامان تھرڈ کلاس کے مسافروں کا سا ہے۔ انگریزی کی ایک بات کا بھی جواب نہیں دیتے۔ منہ ہاتھ دھو کے وہ فارغ ہوا تو مسافر کی شستہ اردو میں سمجھ گیا اور تھوڑی بہت ہندوستانی میں ہماری منزل کا پتہ پوچھنے لگا۔ وہ بھی بمبئی جا رہا تھا۔ کہنے لگا یہ عورت تمہاری رشتے دار ہے؟ چمپا بائی گھبرا گئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے جواب دیتے میں جھجکاہٹ ہوئی۔ وہ بہت جھکی آدمی تھا۔ سمجھا کہ میں اس کا سوال نہیں سمجھا ہوں۔ میں نے کہا یہ میری عزیزہ ہے۔ میں نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔ وہ فہمیدہ کے رشتے سے میری بھی عزیزہ ہوتی تھی۔ فہمیدہ کو اس نے اپنی بیٹی بنایا تھا اور میں کبھی فہمیدہ کا بھائی کہلاتا تھا۔

⁂

آگرے کے اسٹیشن پر قریب سے کسی جگہ آ جانے والا ایک اور مسافر ڈبے میں سوار ہو گیا اور تھوڑی دیر میں مدراسی شخص سے گھل مل گیا۔ وہ دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میرا خیال درست تھا۔ مدراسی شخص نو وارد مسافر سے اپنے شک کا اظہار کر رہا تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے۔ باتیں ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ مدراسی شخص مدراس کی پولیس کا کوئی بہت بڑا افسر ہے۔ آنے والا شخص بھی حکومت کے محکمہ جنگلات کا بڑا افسر تھا۔ وہ دونوں جو کچھ ہمارے بارے میں سمجھنے لگے تھے اس لیے بار بار ہماری جانب ان کی نگاہیں اٹھ جاتی تھیں۔ چمپا بائی اداس بیٹھی تھی۔ شاید مدراسی افسر نے میرے اور چمپا کے درمیان ہونے والی گفتگو کی کچھ بھنک لے لی تھی۔ وہ پولیس افسر تھا۔ ان کو ہم پر شک ہوگا۔ گاڑی کے شور میں اُدھر آواز پہنچنا حیرت کی بات تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ نئے مسافر کے آنے سے پہلے مدراسی مجھ سے کیسی نرمی کی باتیں کر رہا تھا۔ جیل میں ایک ہی جیسے لوگ رہتے ہیں مگر جیل کے باہر کی دنیا کے لوگ ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ نو وارد

شخص نے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ اگلے اسٹیشن پر اُتر کے متعلقہ ٹکٹ چیکر کو ڈبے میں بھیج دے گا۔ پھر اصل بات خود بخود سامنے آجائے گی میرے کان کھڑے ہوئے اگر چمپا کو کہیں یہ معلوم ہو جائے کہ پولیس کا ایک افسر اُس کے ساتھ سفر کر رہا ہے تو وہ کسی بھی لمحے بدل سکتی ہے۔ مدراسی افسر عورت کی بات سُنے گا۔ چمپا اُسے بہت بہکا سکتی ہے اور میرے بارے میں مبالغوں کا پٹارا کھول سکتی ہے اور کچھ نہیں ہو گا تو میرے تیرہ اور اُلجھ جائیں گے اور اگر کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے کلکتے کی جیل میں سات سال گزارے ہیں تو کسی کو بھی میری بات کی صداقت پر یقین نہیں آئے گا اور میں بات بھی کہاں کر سکوں گا۔ کیا میں پولیس کو یہ بیان دوں گا کہ میں چمپا کو اس لیے ساتھ لیے جا رہا تھا کہ وہ میرے گھر کا پتہ جانتی ہے جو میں خود نہیں جانتا۔ بہتر یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح جلد سے جلد یہ ڈبا چھوڑ دیا جائے مگر اس طرح مدراسی شخص کو مجھ پر اور شبہ ہو جاتا۔ اب تک وہ مسافرت کی مروت کر رہا تھا۔

فوراً مجھ میں اگلے اسٹیشن پر اُتر کے ٹکٹ چیکر کو بھیجنا نہیں بھولا ہوں نے بھی یہی سوچا تھا کہ ٹکٹ چیکر کے آنے کے بعد مدراسی افسر مجھ سے کسی قدر مطمئن ہو جائے گا۔ پھر میں کوئی بہانہ کر کے دوسرے ڈبے میں چلا جاؤں گا یا پھر کوئی بھی بات نہ بنی تو زنجیر کا دیا ہوا چاقو تو میرے پاس موجود ہی ہے۔ بات ختم کر کے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گا اور دور دھیا چل کی جھاڑیوں میں گم ہو جاؤں گا۔ میں نے بہت سے منصوبے ذہن میں باندھ لیے۔

ٹکٹ چیکر نے استہزائی انداز میں ہم سے ٹکٹ دکھانے کا مطالبہ کیا۔ میں نے جان بوجھ کے بے نیازی اختیار کی ٹکٹ جیب سے نکالتے ہیں میں مدراسی افسر مسکرانے لگا۔ جی میں آیا تھا تو اُس کے موٹے سیاہ ہونٹ تراش لوں ٹکٹ دیکھنے کے بعد ٹکٹ چیکر اور مدراسی دونوں کو مایوسی ہوئی۔ "کیا آپ ہی کے پاس سے نکلوائی گئے ہیں؟" ٹکٹ چیکر نے انگریزی میں پوچھا۔

"وہ جنگلات کے افسر ہیں" مدراسی نے کہا۔

"ہاں وہی! آپ کو ان مسافروں سے کچھ پریشانی ہوئی جناب؟"

"نہیں" مدراسی نے تیزی سے کہا "اصل میں ہم دونوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ لوگ ٹکٹ کے بغیر سفر کر رہے ہیں۔"

"یقیناً جناب" ٹکٹ چیکر نے ہمیں سر تا پا گھورتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہا "آپ کا شبہ درست تھا مگر صاحب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو دیکھتے چلا دیجیے کہ ہر شخص کے پاس چار پیسے ہیں، اُس کا بول بالا ہے سب بھگوان کی لیلا ہے۔ جناب کدھر جا رہے ہیں؟" مدراسی نے اُسے بتایا کہ وہ بمبئی جا رہا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ٹکٹ چیکر سے باتیں کرتے کرتے وہ ہماری طرف دیکھ کے کچھ متجسس سا ہو جاتا ہے۔ شاید اُس نے میری اور چمپا کی باتیں سُن لی تھیں۔ اُس نے اچانک اپنی اندرونی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور اُسے جھکتے ٹکٹ چیکر کو دکھایا۔ ٹکٹ چیکر کے چہرے پر عاجزی اور گھبراہٹ ہو گئی۔

"جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" اُس نے گردن جھکا کے کہا۔

"کیا تم ان کے سامان کی تلاشی لے سکتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

ٹکٹ چیکر ہچکچاہٹ کرنے لگا کہ یہ اُس کا کام نہیں ہے یہ تو ریلوے پولیس ہی کر سکتی ہے۔

"آپ کو ان پر کس قسم کا شبہ ہے صاحب؟" اُس نے تشویش سے پوچھا۔

"میری پوری زندگی پولیس میں گزری ہے" مدراسی نے غرور سے کہا۔

"ضرور جناب! آپ تو اُڑتی چڑیا پہچان لیتے ہوں گے" ٹکٹ چیکر نے خوشی ہو کے بولا۔ "اب تو مجھے بھی یہ معاملہ خاصا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔"

"بہرحال ابھی سفر طویل ہے دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"کاش میں آپ کے ساتھ بمبئی تک سفر کر رہا ہوتا" ٹکٹ چیکر حسرت سے بولا "میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ان کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے؟"

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک پولیس افسر کو پہلے پوری تفتیش کرنی چاہیے اس کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔"

"بے شک جناب! کیا اچھی بات کہی ہے لیکن آپ نے کس بنیاد پر ہی تفتیش شروع کی ہوگی" ٹکٹ چیکر دبے لہجے میں بولا۔

"تمہیں پولیس میں ہونا چاہیے تھا" مدراسی ادھیڑ عمر ٹکٹ چیکر کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا "شک کی بہت سی وجوہ ہیں۔ لڑکا صورت شکل سے خاندانی معلوم ہوتا ہے لیکن بے حد اکھڑ ہے۔ عورت کی آنکھ عام عورتوں کی سی نہیں دونوں میں کوئی تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے ہیں۔ عورت کا لباس بھڑکیلا ہے۔ لڑکے کا بے حد سادہ۔ لڑکا بہت پریشان پریشان ہے بیٹھے بیٹھے چونک پڑتا ہے حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے۔ عورت بھی کھوئی ہوئی ہے مگر کچھ خوف زدہ سی ہے۔ لڑکے کے پاس صرف ایک تھیلا ہے۔ عورت کے پاس ٹین کا ایک بکسا ہے اور چھوٹا سا بستر ہے اتنے طویل سفر میں یہ مختصر سامان۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے بہت عجلت میں سفر کا ارادہ کیا ہو۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں میں جو شائستگی، متانت اور رکھ رکھاؤ ایسی ہی عموماً ہوتا ہے وہ ان میں مفقود ہے۔ جب لڑکا اس عورت کے ساتھ ڈبے میں داخل ہوا تھا تو میں نے اُس کے ہاتھ میں دبی ہوئی ایک چیز دیکھی تھی۔ وہ چیز چاقو کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی مگر سفر میں چاقو رکھنا ایسی معیوب بات نہیں مگر جس چابک دستی سے لڑکا اُسے اپنے ہاتھ میں چھپائے ہوئے تھا وہ کوئی ایسا شخص ہی پہچان سکتا ہے جس کی عمر میری طرح پولیس میں گزری ہو۔"

"غلط جناب غلط" ٹکٹ چیکر کا سر تیزی سے ہلنے لگا "پولیس میں تو ہزاروں آدمی ہوتے ہیں مگر کیسے کہ اُس کی نظر بھی آپ جیسی ہو، میں بہت حیرت زدہ ہوں صاحب!"

"اور بہت سی باتیں ہیں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے۔"

"اب آپ کا اگلا قدم کیا ہو گا جناب؟" ٹکٹ چیکر اشتیاق سے بولا۔

"میں ابھی کچھ اور تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکا ایک لمحے کے لیے بھی عورت کے پاس سے نہیں ٹلتا۔ میں کوشش کروں گا کہ عورت کو گفتگو پر آمادہ کر سکوں۔"

"سفر میں بھی آپ کو یاد ڈیوٹی ہے۔ میں خوب صاحب خوب! اسٹیشن قریب آرہا ہے۔ جی تو نہیں چاہتا مگر مجھے بھی ڈیوٹی کے لیے اترنا ہو گا جب تک آپ ساتھ ہیں یہاں آتا رہوں گا۔ اگر آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو بے تکلف بلا لیجیے گا" ٹکٹ چیکر نیاز مندی سے بولا۔ مدراسی افسر نے اُسے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ ایک اہم مشن پر اُس کا تقرر کچھ دنوں کے لیے بمبئی ہو گیا ہے اگر اُس کا گزر بمبئی یا مدراس سے ہو تو وہ ضرور ملے۔ دونوں میں بڑی محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں گُم سُم اور بہرے کی طرح سُنتا رہا۔ مدراسی افسر نے ٹکٹ چیکر سے میرے اور چمپا کے بارے میں جو باتیں کی تھیں اُن کا مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے لمحوں میں وہ کوئی بھی ارادہ کر سکتا تھا۔ مجھے اسی ڈبے میں سوار ہونا رہ گیا تھا۔ میں بظاہر تمام باتوں سے بے خبر کبھی گردن جھکائے کبھی کھڑکی سے باہر بھاگتی جھاڑیاں دیکھتے ہوئے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ٹکٹ چیکر چلانے والا تھا۔ مدراسی افسر کی توجہ پھر ہماری طرف مبذول ہو جائے گی اور اگر مجھ سے یا چمپا سے کوئی غلطی ہو گئی تو اُس کا شبہ اور توانا ہو جائے گا۔ اب اپنی اس کوتاہی پر پشیمان ہونے سے بھی کیا ہو سکتا تھا کہ میں نے مدراسی افسر سے انگریزی کیوں نہیں بولی۔ میرا دماغ ہی خراب ہو گیا تھا۔ جنگل میں یہی کہتا تھا مگر میں کیا کروں جب مجھے اُس کی یاد آتی ہے اور گھر یاد آتا ہے تو کچھ خیال ہی نہیں رہتا۔

اس موقع پر خاموش رہنا مناسب نہیں تھا۔ ٹکٹ چیکر چلا گیا تو میں نے اسٹیشن سے کچھ پھل خریدے اور چمپا کو تھما دیے کہ وہ انھیں کاٹ دے۔ ساتھ ہی میں نے چائے منگوائی۔ چمپا نفاست سے انار، امرود اور سیب کی قاشیں بنانے لگی۔ کاٹنے میں اُسے دیر ہو رہی تھی۔ میں نے جیب سے اپنا چاقو نکال لیا اور چمپا کا ہاتھ بٹانے لگا اور دانستہ مدراسی افسر کا چہرہ نہیں دیکھا۔ چائے والے بیرے کو کچھ پیسے دے کر میں نے چمپا کے لیے پان بھی منگوا لیے۔ پھر میں نے مدراسی افسر کو مدعو کیا کہ وہ ہمارے ساتھ چائے پیے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ میری دعوت پر وہ بہت جزبز ہوا۔ پہلے اُس نے انکار کیا مگر میرے اصرار پر مجبور ہو گیا۔ میں اُس کی برتھ پر پڑے سے لے کے چلا گیا۔ چمپا نے اُسے چائے بنا کے دی۔ اُس کے چہرے پر کچھ ہی دیر بعد شگفتگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

"چاقو تو بہت اچھا ہے" اُس نے ہنستے لہجے میں کہا۔

"میرے استاد نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ سفر میں ہمیشہ چاقو اپنے ساتھ رکھو۔ اتنا بڑا سفر ہو جو کہ آدمی مر سکے" میں نے معصوم آواز میں جواب دیا۔

وہ مسکرانے لگا اور نرمی سے پوچھا "تم کیا کام کرتے ہو؟"

"فی الحال تو آوارہ گردی کرتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا "آوارہ گردی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔"

"چاقو بازی، دنگا بازی، لٹھ بازی ہر قسم کا ادھر اُدھر اور سٹے بازی کا گشت، کبھی اِدھر جاتا ہوں کبھی اُدھر جاتا ہوں۔"

"وطن کہیں مستقل نہیں تھا؟ دلچسپ نوجوان ہو۔"

"آپ سچ کہتے ہیں" میں نے اداسی سے کہا۔

"بہت دکھی معلوم ہوتے ہو۔ اصل وطن کہاں ہے؟"

"اب تو کہیں بھی نہیں۔ کبھی ہوا کرتا تھا۔"

"کچھ پڑھا لکھا نہیں؟" اُس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا" میں نے اداسی سے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟"

"سب بھول گیا۔"

"مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں بتاؤ۔ سفر بھی خاصا طویل ہے۔ شاید میں تمھارے کسی کام آسکوں۔ مجھے نوجوانوں کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔"

"کیا نہیں لگے آپ" میرے منہ سے آہ نکل گئی "لمبی کہانی ہے سفر ختم ہو جائے گا کہانی ادھوری رہ جائے گی" میں نے رُخ پلٹ کے کہا "آپ بتائیے مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی اوٹ پٹانگ باتیں لے کے بیٹھ گیا۔ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"میری باتیں اتنی دلچسپ نہیں ہیں۔ اپنی سناؤ۔ تم مجھے کسی بڑے باپ کے بیٹے معلوم ہوتے ہو" وہ امرود کی قاش منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اب تو میں خود اپنا باپ ہوں، زمین پر بوجھ ہوں۔"

"کچھ بتانا نہیں چاہتے" وہ مہذب انداز میں بولا۔

"کیا بتاؤں۔۔۔ دہراتے ہوئے اُلجھن ہوتی ہے۔"

"بمبئی کسی کام سے جا رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "ایک شخص کی تلاش ہے سنا ہے بمبئی میں رہتا ہے کچھ خاندانی معاملہ ہے جب معلوم ہوا تو جیسے کھڑے تھے ویسے ہی چل پڑے۔ سفر کی تیاری بھی نہ کر سکے" میں نے بچی اور خاندانی معاملہ کہہ کے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یقین تھا کہ مدراسی افسر کے ذہن کا غبار کچھ دُور ہوا ہو گا۔ یقیناً تجسس بھی سوا ہوا ہو گا مگر تجسس کا رُخ بدل جانا چاہیے تھا۔ میں اُسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے بھی باتیں کرنا آتی ہیں لیکن کوئی شخص جب بات نہیں کرنا چاہتا تو اُسے بات کرنے پر کیوں آمادہ کیا جائے کوئی چپ ہے تو اس پر شک نہ کیا جائے کوئی چپ ہے تو اُس کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں کوئی چپ ہے تو وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ تنگ کیوں کرتے ہو۔ ٹکٹ چیکر دوسرے اسٹیشن پر پھر خبر لینے آیا اور مجھے اُس کے ساتھ گفتگو میں مصروف دیکھ کے مسکراتا ہوا چلا گیا۔ تاہم مدراسی کے لب و لہجہ میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ گو جھجک اس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پھر بھی اُس سے انگریزی میں بات نہیں کی۔ وہ انگریزی کے ساتھ اُردو میں نہایت تحمل

سے بات کر رہا تھا۔ شام کے وقت میں نے اپنا تھیلا اس کے سامنے کھول کے ٹٹولنا شروع کیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ یہ دیکھ لے کہ کوئی مشکوک چیز تھیلے میں نہیں ہے۔ زرینہ نے اس میں سامان رکھا تھا۔ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ سفر کی رفاقت کا ایک دن عام دنوں کی رفاقت کے سو دن کے برابر ہوتا ہے۔ میرے گریز رویے سے چمپا کے چہرے پر شادابی آگئی۔ اس کے باوجود مجھے اطمینان نہیں تھا۔ ایسے عالم میں جب اعصاب میں کرنٹ سے رینگ رہے ہوں اور دماغ پھٹا جا رہا ہو، فیضو کے جرمن اور ابا جان سے ملنے کے تصور سے دل ہول رہا ہو، ایسی باتیں کرنا پڑیں۔ فیضو کے پیروں میں گھنگرو باندھنے والی عورت چمپا کی خاطر داری کرنا پڑے۔ ایک اجنبی مسافر سے غیر ضروری راہ و رسم رکھنا پڑے۔ مگر ٹھیک ہے۔ سات سال جیل خانے میں بھی گزر گئے ہیں۔ جب سے گھر سے قدم نکالا ہے یہی ہو رہا ہے۔ ساری دنیا یہی جانتی ہے کہ آدمی چھپ چھپ رہا ہے، جھوٹ بول رہا ہے۔ کیا معلوم اور کہاں کہاں جانا پڑے اور کیا کیا کرنا پڑے۔

چمپا نے پہلے دن ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا جب کہ وہ کسی بھی وقت بھی تماشا کھڑا کر سکتی تھی۔ میری باتوں سے وہ بھی متاثر معلوم ہوتی تھی۔ مدراسی بہت تیز آدمی تھا۔ سامنے جو کچھ ظاہر کر رہا تھا کیا اندر سے بھی وہی کچھ رہا ہو۔ رات تک کوئی مسافر ڈبے میں نہیں آیا۔ رات کا کھانا مدراسی نے ہمیں اپنی طرف سے کھلایا تو مجھے کچھ سکون آیا۔

کھانے کے بعد وہ مدراس اور وہاں کے کھانوں کے بارے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے عجیب واقعات سنانے لگا اور اس نے مجھے دعوت دی کہ میں بمبئی میں اس سے ضرور ملاقات کروں۔ اس کا نام راج کرشنا تھا۔ آخر وقت تک اس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پولیس کا افسر ہے اور اسی بات سے مجھے تشویش ہوتی تھی۔ شاید اس نے اس کا اظہار نامناسب سمجھا ہو کیونکہ بات چیت بے تکلفی کی حد میں داخل ہو گئی تھی۔ جہاں افسری برتری کا ذکر مناسب نہیں ہوتا۔

صرف ایک رات درمیان میں باقی رہ گئی تھی۔ علی الصباح گاڑی شہر بمبئی کی سرحدوں میں داخل ہو جائے گی۔ بمبئی شہر قریب آ رہا تھا اور میرے خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے ابا جان بھی بمبئی میں رہتے ہوں۔ جب وہ مجھے دیکھیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا۔ دھتکار دیں گے یا گلے لگا لیں گے۔ وہ چاہیں گے کہ میں یا تو جیل ہی میں سڑتا رہتا۔ تم نے تو انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہوگا۔ کیا آفت آئی تھی کہ اچھا خاصا گھر چھوڑ دیا۔ میں چلا گیا تھا تو کون سی قیامت آگئی تھی۔ لوگ اچانک مر بھی تو جاتے ہیں۔ سمجھ لیتے کہ میں مر گیا ہوں۔ آخر میں نے بھی تو ان کے لیے یہی سوچا تھا۔

بڑا برتن سمیٹ کے جا چکا تھا۔ مدراسی مسافر راج کرشنا پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری اور چھوٹنے ہی والی تھی کہ ایک مسافر بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے ایک نظر ہم لوگوں پر ڈالی اور اجازت طلب انداز میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ "معاف کیجیے، مجھے قریب ہی اترنا ہے۔" ہم نے لجاجت سے کہا۔

"ضرور ضرور، آئیے بیٹھیے۔" راج کرشنا فراخ دلی سے بولا۔ مسافر سمٹ کے ایک جانب بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک چرمی تھیلا تھا۔ عمر یہی کوئی ۲۵، ۳۰ سال۔ ناک چہرے سے نکلی ہوئی۔ انگریزی لباس پہنے ہوئے۔ رنگ سرمئی۔

راج کرشنا معذرت کر کے سونے کے لیے اوپر کی برتھ پر چلا گیا۔ نو وارد مسافر نے اصرار کر کے مجھے بھی لٹا دیا۔ میں نے پیر سکیڑ لیے۔ وہ کونے میں بیٹھا تھا۔ اوپر کی ایک اور برتھ خالی تھی مگر وہ سونے پر آمادہ نہیں ہوا۔ سامنے کی سیٹ پر چمپا اپنے جسم پر چادر ڈال کے لیٹ گئی تھی۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ نو وارد شخص نے کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند کیا اور ہم لوگوں سے روشنی بند کرنے کی اجازت چاہی۔ مدراسی ابھی جاگ رہا تھا۔ اس نے اس زحمت پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ نئے مسافر نے بتی گل کر دی۔ کمپارٹمنٹ میں اب ایک ہلکا بلب روشن تھا اور گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ ہچکولے لے رہی تھی۔ راج کرشنا کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد ایک کروٹ ساکت ہو گیا۔ چمپا بائی نے ساڑھی کے پلو سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا اس لیے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ نو وارد شخص کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ پھر وہ نشست سے سر ٹکا کے اونگھنے لگا۔ میری آنکھ سے نیند کوسوں دور تھی۔ کل بھی ایک پل کے لیے آنکھ نہیں لگی تھی۔ کچھ دیر سکون کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

بمبئی قریب آ رہا تھا۔ میرے پائنتی بیٹھے ہوئے مسافر کو آئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ دفعتاً مجھے کچھ کھٹکا ہوا۔ میں نے لیٹے لیٹے نیم باز آنکھوں سے دیکھا۔ مسافر نے دروازے کے قریب جا کے آہستہ سے کھڑکی کا شیشہ اٹھایا اور باہر جھانکا۔ پھر گھڑی دیکھی اور ایک گہری سانس لے کے اپنی جگہ آ کے بیٹھ گیا۔ میں سمجھا شاید اس کی منزل آنے والی ہے۔ مسافر چند لمحے ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ دوبارہ آہٹ ہوئی۔ مجھے بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کہیں چمپا کے ارادے میں بل تو نہیں آ گیا ہے۔ مسافر پھر اٹھا۔ اس نے چمپا کی طرف دیکھا۔ چمپا کے منہ پر ساڑھی کا پلو پڑا ہوا تھا۔ مسافر نے اپنا منہ قریب لے جا کے جیسے اسے سونگھا۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ چمپا کے بعد مسافر میری طرف آیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ جیسے ہی اس کے مڑنے کی آہٹ ہوئی، میں نے اپنی آنکھوں کے پپوٹے کسی قدر اٹھائے۔ مسافر راج کرشنا کی برتھ کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے جیب سے ہاتھ نکالا۔ ایک خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن میرے سنبھلنے سے پہلے اس نے خنجر راج کرشنا کے سر پر تان لیا تھا۔ میرا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس وقت میں مسافر کو چھیڑنے کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ میری ایک آہٹ بھی صورت حال سنگین بنا سکتی تھی۔ میں بمشکل دم سادھے پڑا رہا۔ سنبھلنے کا یارا نہ تھا۔ آنکھ کھولنے کی مجال۔ مسافر نے راج کرشنا

کے منہ پر ٹھوکا مارا۔ راج کرشنا کا جسم اچانک مضطرب ہوا۔ ایک ہلکی سی سسکاری کی آواز آئی۔ اس نے خنجر دیکھ لیا ہوگا۔ مسافر نے سرگوشی میں کچھ کہا۔ میں کوشش کے باوجود سن نہ سکا۔ راج کرشنا کا چہرہ میرے سامنے نہیں تھا لیکن اس کے جسم پر دوبارہ خفیف سا لرزہ طاری ہوا۔ اس نے کچھ کہا مگر مسافر نے اسے شاید دوبارہ دھمکی دی اور خنجر کسی قدر دور کیا کیونکہ راج کرشنا اٹھ کے بیٹھ رہا تھا۔ مسافر نے ایک بار پھر مجھ پر نگاہ کی۔ میری آنکھیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں کہ وہ انہیں جھانک کے دیکھتا تبھی اسے ان کے کھلنے کا پتہ چلتا۔ راج کرشنا کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ وہ بہت احتیاط سے نیچے اترا۔ مسافر نے خنجر کی نال اس کی گردن سے لگا دی تھی۔ راج کرشنا نیچے آ گیا تھا۔ مسافر نے اسے دروازے کے قریب چلنے کا اشارہ کیا۔ میرے سارے جسم میں سرد و گرم لہریں اٹھ رہی تھیں۔ راج کرشنا نے جوتے پہننا چاہے مگر مسافر نے اسے اجازت نہیں دی۔ میں لیٹا ہوا تھا لیکن میرا ذہن چوکنا تھا۔ مسافر کے جسم کی ہر جنبش، ہر حرکت میری نگاہ کی زد میں تھی۔ راج کرشنا ایک سعادت مند شاگرد یا کسی معصوم بچے کی طرح مسافر کی ہدایت پر دروازے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ چمپا نے کروٹ بدلی تو مسافر نے ایک لمحے کے لیے چونک کے اس کی طرف دیکھا مگر وہ ایک لمحہ ہی تھا۔ خنجر کی [illegible] اور میں اپنی طاقت جسم میں گھونٹ کے رہ گیا۔ مسافر کا ارادہ صاف ظاہر تھا۔ میں بہت پہلے ہی دھیرے دھیرے اپنی جیب تک ہاتھ لے گیا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ اسے کھینچ کے گھوڑا دبانے کی دیر تھی مگر مسافر ایک لمحے کی مہلت بھی نہیں دے رہا تھا۔ راج کرشنا کے بارے میں بہت جلد کوئی فیصلہ ہونے والا تھا۔ مسافر نے ہاتھ بڑھا کے دروازے کی چٹخنی نیچے گرا دی۔ اب اس کا ہاتھ ہینڈل کی طرف اٹھ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پوری صورت حال آنکھوں میں تولی اور کچھ بھی نہیں آیا تو میں نے تکیہ چمپا کے جسم پر پھینک دیا۔ ساتھ ہی کسی گیند کی طرح برتھ کے نیچے گر کے اوپر کی طرف اٹھا۔ چمپا بڑبڑا کر اٹھی۔ بے اختیار مسافر نے خنجر چمپا کی سمت کر دیا مگر جب اس نے دوسرے لمحے میری طرف دیکھا — مڑ کے دیکھنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں نیچے سے اس کے پیچھے [illegible] کی طرف اٹھ گیا تھا۔ میرے انداز سے ہی کوئی خامی نہیں رہی تھی۔ چمپا کی سسکی بلند ہوئی۔ ادھر میں چمپا کے مسافر نے پہلے چمپا کی جانب خنجر تانا، پھر میری آہٹ سے لڑکھڑا کے پیچھے کا رخ بدلنا چاہا مگر میں نے اسے درمیان ہی میں تھام کے اوپر اٹھایا۔ نیچے سے شعلہ نکلا اور ڈبے کی چھت میں سوراخ کرتا ہوا گزر گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی گردن دبا لی۔ راج کرشنا مبہوت کھڑا تھا۔ وہ ایک عام مسافر کے جسم سے واقف تھا۔ چمپا بھی جاگ گئی مگر تب تک میں مسافر کے خنجر والے ہاتھ کی ہڈی توڑ چکا تھا۔ خنجر نیچے گر گیا اور مسافر درد سے بلبلانے لگا۔ خنجر راج کرشنا نے اٹھا لیا اور مسافر کی جیبوں کی تلاشی لے کے ایک لمبا چاقو برآمد کر لیا۔ میری ضرب سے مسافر کی گردن ڈھلک گئی تھی۔ وہ قریب ہی بلبلانے لگا۔ میں نے اسے ایک ٹھوکر لگانی چاہی لیکن راج کرشنا نے مجھے روک کے بالائی بلب کو روشن کر دیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ راج کرشنا نے گھڑی دیکھی۔ پونے ۴ بج رہے ہوں گے۔ بمبئی آنے میں ۲ گھنٹے باقی تھے۔ میں نے دوبارہ دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ راج کرشنا نے اپنا ہاتھ بڑھا کے میری طرف اشارہ کیا۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے چومنے لگا۔ اسے آنکھوں سے لگا لیا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"میں اسے نہیں جانتا مگر یہ مجھے بہت اچھی طرح جانتا ہے۔" راج کرشنا کا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتما رہا تھا۔ "یقیناً یہ اس گروہ کا کوئی آدمی ہے جس کی تفتیش کے لیے مجھے بمبئی میں تعینات کیا گیا ہے۔ یہ لوگ مجھے بمبئی نہیں جانے دینا چاہتے۔ بہت پیچیدہ معاملہ ہے، پھر کسی وقت سناؤں گا۔ آج میرا کیا نہیں ہوگا۔" راج کرشنا تذبذب سے بولا۔ "اس کے دوسرے ساتھی بھی دوسرے کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے ہوں گے۔" راج کرشنا کا زرخیز دماغ کام کرنے لگا۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں کھڑکی سے جھانک کے دیکھوں۔ میں نے شیشہ اٹھایا تو دور سے روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آئیں۔ گاڑی کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ "تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لو۔" اس نے مجھے حکم دیا۔

"تمہارے کتنے ساتھی تمہارے ساتھ ہیں؟" راج کرشنا نے تحکمانہ لہجے میں مسافر سے پوچھا۔ مسافر کی حالت نہایت خستہ تھی۔ بازو جھٹکا تھا، گردن پیچھے کو جھکی ہوئی تھی۔ گردن پر میری ضرب سے اسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا مگر کاٹھی کا مضبوط تھا۔ گردن پر گوشت بھی زیادہ تھا اس لیے بچ نکلا۔ اس نے راج کرشنا کی بات کا جواب نہیں دیا۔ کراہنے لگا۔ "یہ نہیں بتائے گا۔" میں نے رائے ظاہر کی۔

"یہ لوگ خاصی دور سے ہمارا تعاقب کر رہے ہوں گے۔ جیسے ہی زنجیر کھینچی اور گاڑی اسٹیشن سے پہلے کسی سنسان مقام پر رکتی، اس کے دوسرے ساتھی بھی اتر جاتے۔ جو کام اسے سونپا گیا تھا، وہاں چونکہ پروگرام کے مطابق گاڑی نہیں رک پائی ہے اس لیے دوسرے ساتھی سب جاننے کے لیے ہمارے ڈبے کا رخ ضرور کریں گے۔ ابھی سفر میں تقریباً ۲ گھنٹے باقی ہیں۔ ہم کچھ اور نہیں کر سکتے تو کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے ڈبے میں بند ہو کر تو بیٹھ سکتے ہیں۔ وہ آ کے پھر دروازہ کھلوانے کے لیے زیادہ ہنگامہ نہیں کریں گے اور انہیں اپنے ساتھی کا حشر دیکھنے کے لیے کسی دوسری جگہ گاڑی رکوانے کی حماقت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ممکن ہے وہ بمبئی تک خود ہی اس انتظار میں رہیں کہ گاڑی رک جائے۔" راج کرشنا اس انداز سے باتیں کر رہا تھا جیسے اسے پہلے سے سارا پروگرام معلوم ہو۔

اسٹیشن آ گیا تھا۔ ڈبے میں باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، شیشے پر ہاتھ مارا مگر ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ

شاید کوئی مسافر ہوگا۔ گاڑی کوئی سات منٹ ٹھیری ہوگی' پھر اپنی منزل کی جانب رینگنے لگی اور کچھ دور جا کے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ "آپ کب تک تنہا اس طرح کھڑے رہیں گے۔ بیٹھ جائیے میں اس کا انتظام کر دیتا ہوں' بمبئی تک یہ سوتا رہے گا۔"

"یہ سب جیسے بہت قیمتی ہے عزیز دوست!" راج کرشنا کی آواز مسرت سے معمور تھی۔ "میں اپنے ساتھ ایک تحفہ لے کے ان کی خدمت میں پہنچوں گا جس اہم کام کی ذمے داری سونپنے کے لیے انھوں نے مجھے دلی بلایا' پھر بمبئی تعینات کیا' اس کا آغاز ہی اتنا خوش گوار ہوا ہے۔ میں اسے سنبھال کے رکھنا چاہتا ہوں اور بمبئی تک چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ سب تمھاری بدولت ہوا ہے۔ میں نے تمھیں بتایا نہیں کہ میں دراصل کون' ایک بڑا پولیس افسر ہوں۔"

میں نے رسمی تعجب کا اظہار کیا۔ "کرشنا جی! آپ بیٹھ جائیے' میں اسے تین چار گھنٹے تک بے سدھ کر سکتا ہوں' آپ اطمینان رکھیے یہ سرے گا نہیں' ہل سکتے ہیں۔" میں نے کرشنا کے جواب کا انتظار نہیں کیا' ناک کے ایک دوسرا ہاتھ مسافر کی گردن پر مارا' وہ بے ہوش ہو گیا۔ "اب آرام کیجیے۔" میں نے برتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راج کرشنا گھبرا سا گیا۔ اس نے بے ہوش مسافر کو ٹٹول کے دیکھا اور آنکھوں میں ممنونیت بھر کے بولا: "ہاں اب میں سکون سے بیٹھ سکتا ہوں۔" وہ میرے قریب بیٹھ کے شکریہ ادا کرنے لگا۔ "کیا تم جاگ رہے تھے؟" وہ حیرت سے بولا۔

میں نے اسے تفصیل سنائی۔ راج کرشنا میری پیٹھ تھپکنے لگا۔ گاڑی چھک چھک چھو چھو کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ راج کرشنا نے چمپا سے پان مانگ کر کھایا۔ اس نے چمپا سے درخواست کی کہ وہ تھوڑا پانی اور اس کے سوٹ کیس سے نیلی گولیاں نکال کے اسے دے دے۔ راج کرشنا نے گولیاں حلق سے اتار کے ایک گھونٹ پانی پیا۔ اب تو چمپا نے بھی سن لیا تھا کہ وہ ایک بڑا پولیس افسر ہے اور اس کے ہاتھ میں تمغہ بھی تھا۔ چمپا کے ایک اشارے پر وہ مجھے بے بس کر سکتا تھا لیکن چمپا ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ میں اسے جبراً بمبئی لیے جا رہا تھا اور میں نے موتیا بائی کے ہاں دو آدمی زخمی کر دیے تھے۔ یہ بات اتنی اہم نہیں تھی کہ ہمیشہ کے لیے میری زبان بند ہو جاتی۔ میں کبھی واپس آ جاتا تو پھر گلی گلی چمپا بائی موتیا بائی کو تلاش کرتا۔ میں غیض و غضب کے عالم میں اس کے ساتھیوں کو بھی نشانہ کر سکتا تھا۔ بات بڑھتی تو چمپا کا وہاں بھی مل جانا۔ اس نے میری بہن فہمیدہ اور نہ جانے اور کتنی لڑکیاں خریدی ہوں گی۔ پھر چمپا تو شہر اس کے ساتھی اور ریل میں تیسرے والے مسافر کا انجام دیکھ چکی تھی۔

راج کرشنا نے گھڑی دیکھ کے مجھے بتایا کہ بس اب بمبئی آنے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ہم نے مسافر پر چادر ڈال دی تھی۔ اسے ہوش آ گیا تھا مگر وہ لیٹے لیٹے کراہ رہا تھا۔ بمبئی آ رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار ابر سا چھا جاتا تھا۔ راج کرشنا بڑی شدت سے داور اسٹیشن کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں چمپا کے ساتھ اس کی قیام گاہ پر ٹھیروں۔ وہ میرا کوئی عذر تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ "تم میرے ساتھ ٹھیرو گے۔ اب میں تمھیں کہیں اور نہیں جانے دوں گا۔"

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ دو چار روز میں اس کے مکان پر ضرور آ جاؤں گا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ راج کرشنا کے توسط سے ان غنڈوں تک پہنچا جائے چمپا فہمیدہ کے سلسلے میں جن کا حوالہ دیتی تھی لیکن یہ بات مناسب نہیں تھی۔ راج کرشنا کو پھر ساری باتیں معلوم ہو جاتیں۔ وہ ہمیں چھوڑنے پر بہت مشکل سے آمادہ ہوا۔

چمپا نے اس کا اور اپنا سامان سمیٹ لیا تھا۔ مجھے چمپا سے یہ پوچھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ اسے بمبئی کے کون سے اسٹیشن پہ اترنا ہے۔ گاڑی بمبئی سینٹرل اسٹیشن تک جاتی تھی۔ داور اسٹیشن پر پولیس افسران کی ایک بڑی تعداد نے ہمارا ڈبا گھیر لیا۔ چمپا بھی حواس باختہ ہو گئی۔ راج کرشنا جیسے ہی ڈبے سے اترا' تمام افسر لپک کے بڑھے' سلیوٹ کیا اور مصافحہ کیا۔ یہ تمام لوگ راج کرشنا کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ راج کرشنا نے سادہ لباس میں ملبوس ایک افسر سے کہا کہ وہ ڈبے میں پڑے ہوئے شخص کو پولیس کے پہرے میں باہر نکالنے کا اہتمام کرے۔ اس نے مجھے نہیں چھوڑا۔ آخر تک اصرار کرتا رہا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور وہ اس شخص کی تلاش میں اپنے اثر و رسوخ سے میری مدد کرے گا جس کے لیے مجھے بمبئی کا سفر کرنا پڑا ہے۔ اس نے علیحدہ کھڑی ہوئی چمپا بائی سے بھی گزارش کی۔ چمپا نے بہت عاجزی سے وعدہ کیا کہ جب آتے ہوئے ہم دونوں ضرور اس کے پاس ٹھیریں گے۔ وہ افسر چند لمحے بھی چلے اور گر کے ہماری ہی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں نے اسے غلط پتا بتایا تھا کہ میری قیام گاہ دادر میں ہے۔ ہم نے اس کی سواری کی پیشکش کو بھی قبول نہیں کی۔ اس اجتناب سے وہ کچھ اداس ہو گیا۔

پولیس افسر اس کی توجہ کے منتظر تھے۔ بمبئی کے متعدد سپاہی اپنے مخصوص لباس میں اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ انتظام شاید اس کی فوری ہدایت کے تحت کیا گیا تھا۔ وہ جیسے ہی اس غول میں چھپا' ہم نے اپنی راہ لی۔ اسٹیشن سے باہر نکل کے میں چمپا کے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ دو دن سے ایک پل کے لیے آنکھ نہیں لگی تھی۔ سامنے بمبئی شہر پھیلا ہوا تھا۔ جب یہ خیال آتا تھا کہ اب آیا جان سے کسی بھی وقت ملاقات ہو سکتی ہے تو جسم میں خوف دوڑنے لگتا تھا۔ ڈبے سے اتر کے مجھے یہ محسوس ہوا تھا جیسے میں دوبارہ جیل خانے سے آزاد ہوا ہوں مگر اب یہاں پہنچ کے جب بمبئی شہر کی سڑکوں پہ نظر پڑتی اور یہ خیال آتا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی سڑک آیا جان تک جاتی ہوگی تو اعصاب تڑخنے لگتے۔ چمپا نے پریشان ہو کے میرا حال دریافت کیا مگر میں خاموش رہا۔ چند لمحے بینچ پر گم صم بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا: "کہاں چلنا ہے؟"

"پہلے کسی ہوٹل میں چل کے آرام کرو۔" اس نے ملائم لہجے میں کہا۔ "اس کے بعد تلاش میں نکلیں گے۔ میری طرف سے دل صاف رکھو۔"

"کس کے پاس چلنا ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس کا نام گھلا بائے ہے۔ وہیں داور کے علاقے میں رہتا تھا۔ پانچ سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ تلاش کرنے میں دیر لگ سکتی ہے۔ کسی ہوٹل میں سامان رکھ کے اور کپڑے بدل کے ڈھونڈنے نکلیں گے۔"

میں نے اس کی بات مان لی۔ چمپا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ کوئی فریب نہیں کرے گی۔ وہ اس علاقے کے ہوٹلوں کو جانتی تھی۔ میں نے خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ ٹیکسی نے ہمیں ایک کئی منزلہ ہوٹل کے دروازے پہ اتار دیا۔ [illegible] اتفاق سے ہوٹل میں ایک کشادہ ہوادار اور روشن کمرہ خالی تھا۔ کمرے میں آ کے چمپا نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں کیونکہ میری طبیعت اچھی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے کمرے میں میں نے اپنے آپ کو چھوڑا۔ بال سفر کی گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ جسم چپ چپا رہا تھا۔ چمپا نہا کے بال بکھرائے ہوئے واپس آئی۔ پھر میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں نے جلدی جلدی جسم پہ پانی ڈالا اور کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا۔ چمپا نے چائے منگوا لی تھی۔ ہوٹل کا بیرا اس کے پیروں کے نزدیک فرش پر بیٹھا تھا۔ چمپا نے اتنی سی دیر میں اسے نہ جانے کس طرح اپنا رام کر لیا تھا کہ وہ "بیگم صاحب' بیگم صاحب" کہتے ہوئے اس کا منہ سوکھ رہا تھا۔ چمپا اسے اپنے معمولات کی ہدایت دے رہی تھی۔ مثلاً ٹیکسی دروازے پر کھڑی رکھنے کی اور کوئی آئے تو پہلے اطلاع دی جائے وغیرہ۔

بیرا چلا گیا تو چمپا نے مجھے چائے بنا کے دی اور کچھ ٹوسٹ مکھن لگا کے دیے۔ "اب چلو' اسے تلاش کرنے نکلتے ہیں۔" میں نے اضطراب سے کہا۔

"جلدی مت کرو۔" اس نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "جلدی میں کام بگڑ سکتا ہے۔ اتنا لمبا سفر اسے تلاش کرنے ہی کے لیے کیا ہے۔ ہم نے جلدی کی تو وہ کھسک سکتے ہیں۔"

"مگر مجھے تو ایک پل گزارنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔"

"تم بس صبر کرو' باقی باتیں مجھ پہ چھوڑ دو۔ یہ سمجھ لو کہ تم ابھی بمبئی نہیں پہنچے' ابھی مجھے تلاش کر رہے ہو۔" وہ نرمی سے بولی۔

"مگر کب تک؟ کب تک؟" میں نے وحشت سے پوچھا۔

"تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے بالکل کچھ نہیں جانتے۔ تم فیض آباد میں کالے لوگوں کے ساتھ بالا خانے پہ آئے تھے' ان لوگوں کے مزاج سے تو آشنا ہو گے۔" وہ سنگلاخ لہجے میں بولی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"وہی لوگ ہیں' اتنی جیسے کوئی بڑا' کوئی چھوٹا' کوئی کمزور' کوئی طاقتور۔ لگتا ہے تمھیں کس جگہ پر بھول ہوئی ہے۔"

"صرف جگہ نہیں بدلتی' لوگ بھی بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب کو ایک ترازو میں مت رکھو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "جن لوگوں سے تمھارا واسطہ پڑا ہے' لوگ صرف وہی نہیں ہوتے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" وہ وضاحت کرنے لگی۔

"مطلب کچھ بھی ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹ کے تلخی سے کہا۔ "ایک شخص محلے کی آبروؤں کا امین ہے' دوسرا انھیں نیلام پر چڑھا دیتا ہے۔ تم دونوں کو ایک ہی خانے میں رکھ رہی ہو۔ چمپا بائی! ذرا زبان سنبھال کے بات کیا کرو۔ تم نے صرف نوٹوں اور گاہکوں کو دیکھا ہے۔"

"تم تو بگڑ گئے۔ میری عقل ماری گئی ہے۔" وہ خفت سے بولی۔ "بات کچھ کہنا چاہتی ہوں' کہہ کچھ جاتی ہوں۔ میری بات سے تمھیں تکلیف ہوئی؟"

"تکلیف وکلیف کیا' چمپا بائی! بس چلنے دو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"دیکھو' میں تم سے یہ کہنا چاہتی تھی۔" وہ اپنائیت سے بولی۔ "کہ یہیں ذرا تحمل سے کام کرنا ہوگا۔ تمھارا مزاج دوسرا ہے۔ مجھے ایک دو دن میں تھوڑی بہت واقفیت ہو گئی ہے۔ اول تو انھیں ڈھونڈنا' پھر ان کے مل جانے پر ان سے فہمیدہ کا پتا پوچھنا کہ انھوں نے اسے کہاں [illegible] کیا تھا۔ یہ ایک مشکل کام ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم انھیں اپنے سامنے دیکھ کے اکھڑ جاؤ گے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ خود ان کا سراغ لگاؤں اور تم یہیں ہوٹل میں رہو۔ میں ان کے سامنے تمھیں لے جانا نہیں چاہتی۔ وہ فہمیدہ کا ذکر کرتے وقت تمھارا لحاظ نہیں کریں گے۔ نہ جانے کس کس طرح اس کا ذکر کریں' تم سے برداشت نہیں ہوگا۔"

"میں فہمیدہ کو ان کے روپ میں دیکھ کے زندہ رہ گیا۔ مجھ سے زیادہ برداشت کس میں ہوگی؟ جو گالی تم نے دی ہے' جو طعنہ تم نے لگایا ہے' چمپا بائی! اس سے زیادہ کا امکان نہیں ہے۔"

"میاں! خدا گواہ ہے کہ میں آج تک کسی لڑکی کو اس کے گھر سے گھسیٹ کے بالا خانے نہیں لے گئی۔ میں اچھی لڑکیوں کو ادھر ادھر سے لے گئی ہوں جن کے پاس اپنے گھروں میں جانے کا راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ فہمیدہ نہ جانے کس طرح گلاب بائی اور اس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ میں نے جب اچھی طرح پرکھ لیا کہ میں نہیں تو کوئی اور اسے خرید لے گا' تب میں نے گلاب کے ہاتھ میں تھیلی تھمائی۔"

"بہرحال!" میں نے نفرت سے کہا۔ "تمھاری کوئی غلطی نہیں۔ اگر اچھے طلب گار موجود ہوں تو سودا اگر اچھا' ایمان بھی بیچ دیتے ہیں۔" چمپا بائی چپ ہو گئی۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں کانپنے لگی۔ آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گالوں پر ڈھلکنے لگے۔ "میں تمھارے ساتھ ہی چلوں گا' پھولوں والوں کا نہیں' وہ سمجھیں گے کہ میں تمھارے کاروبار سے متعلق کوئی آدمی ہوں اور یہ وہ سچ ہی سمجھیں گے۔" میری آواز چھونے لگی۔ "تمھاری ہی کوئی

میں نے کہا اپنے تمام گروہ کا راز فاش کر دیا اور اس طرح بمبئی پولیس ایک ایسے گروہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی جو ایک عرصے سے اس کے لیے پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ راج کرشنا کو اسی گروہ کے لیے بمبئی بلایا گیا تھا۔ وہ گروہ بیرونی مال کی ناجائز تجارت میں ملوث تھا۔" "اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری موجودہ زندگی صرف تمھارے سبب سے ہے۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "بعد میں اس کیس میں کامیابی کی بنیاد پر مجھے یہیں روک لیا گیا۔ اس شہر میں اس قدر جرائم ہوتے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ یہ بمبئی کے پولیس والے نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں۔ دماغ تو کام ہی میں نہیں لاتے۔ آج بھی جو مجھے یہ میں ایک کیس کے سلسلے میں گیا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ اوہ میں نے تمھیں کس قدر تلاش کیا۔ نہ جانے تم کہاں چھپ گئے تھے اور ملے بھی تو کس حلیے میں ملے۔ وہ عورت کہاں ہے جو تمھارے ساتھ سفر میں تھی؟"

"وہ چلی گئی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"وہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

میری اکتاہٹ اس نے نظر انداز کر دی۔ "اور اس شخص کا کیا بنا جس کی تلاش میں تم یہاں آئے تھے؟" اس نے کرید کی۔

"وہ بھی نہیں.... نہیں ملا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"خیر سفر کے دوران میں میں نے تمھیں اتنا آزجان پایا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو اس عمر میں ایک نوجوان کو ہونا چاہیے۔ میں کہہ نہیں سکتا مگر مجھے شبہ ہے کہ جوانی نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تم مناسب سمجھو تو مجھے کچھ بتاؤ۔ اس طرح تمھارا جی بھی ہلکا ہو جائے گا اور اگر میں تمھارے کسی کام آ سکتا ہوں تو میری طرف سے ہر خدمت حاضر ہے۔ تم میرے بارے میں جانتے ہو، میں پولیس کا ایک خاصا اور بڑا افسر تھا۔ بمبئی میں میری حیثیت ایک ایڈوائزر کی ہے لیکن میں ان لوگوں پر بھروسا نہیں کرتا۔ اپنی اسکیموں پر خود عمل کرتا ہوں۔ جو مہرے پر جو لوگ میرے ساتھ تھے سب کے سب بمبئی پولیس کے بڑے بڑے عہدے دار تھے۔ تمھارے ساتھ اگر کسی نے زیادتی کی ہو تو مجھے بتاؤ۔ وہ شخص کہیں بھی ہو میں اسے ہندوستان بھر میں تلاش کراؤں گا۔" وہ خود ہی سب کچھ کہتا گیا پھر اسے خیال آیا تو وہ جھینپ کے بولا۔ "میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا ہوں۔ ہاں تو تمھارے ساتھ کیا پیش آیا میرے دوست! کچھ بتاؤ؟" اس نے اشتیاق سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس وہ مجھے نہیں ملا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" اس کے چہرے پر الجھن عیاں ہوئی۔ "بہر حال تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔ خیر کبھی کبھی آدمی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے اور کسی سے کچھ کہنا سننا نہیں چاہتا۔ اب یہ بتاؤ تمھیں آرام کرنے کی خواہش ہے یا تمھیں بمبئی گھماؤں؟"

"میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "اب تو تم گرفتار ہو گئے۔ تم میری مرضی سے جاؤ گے اور سنو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے کسی معاملے میں مانع نہیں ہوں گا لیکن تم تھیر گئے ہیں۔ میں ایک بالکل تنہا آدمی ہوں۔ میری ماں مدراس میں رہتی ہیں۔ اگر یہاں بمبئی میں دیر ہو گئی تو میں انھیں بلا لوں گا۔ وہ تمھیں دیکھ کے بہت خوش ہوں گی کیونکہ تم وہ شخص ہو جس نے ان کے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔ میں اس وقت یہاں اکیلا ہوں۔ تمھیں کوئی ڈسٹربنس نہیں ہوگا۔ میں تمھیں بالکل نہیں چھیڑوں گا۔ چند دن یہاں رہنے میں کیا حرج ہے۔ میری مانو جانے کا ارادہ ملتوی کر دو۔" نہیں مت" وہ ملتجی لہجے میں بولا۔

میں نے سر ڈال دیا۔ میری آمادگی دیکھ کے راج کرشنا نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے سامنے شیونگ کا سامان رکھ دیا۔ وہ مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہا تھا جیسے میری اور اس کی برسوں سے شناسائی ہو۔ مجھے اس کے اس رویّے سے شرم آنے لگی۔

میں نے شیو بنا لیا تو اس نے آئینہ میرے چہرے کے مقابل کر دیا۔ "اب ذرا اپنا چہرہ خوب غور سے دیکھو۔ پہچاننے کی کوشش کرو اور بتاؤ کہ کیا اتنے دل کش چہرے والے نوجوان کو زندگی سے اس قدر مایوس ہونا چاہیے؟ صبح میرے ساتھی تمھیں دیکھیں گے تو پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ کہیں گے کہ میں نے رات بھر میں کوئی جادو کر دیا ہے۔ وہ مجھے کوئی دیوتا سمجھیں گے۔" وہ شگفتگی سے بولا۔ "وہ حلیہ ٹھیک لگ رہا تھا نا یہ؟"

"کرشنا بابو!" میں نے اپنی آواز سنبھالنے کی کوشش کی۔ "وہ کا حلیہ ہے اندر کا حلیہ نہیں بدلتا۔" میری آواز حلق میں جیسے مر کے رہ گئی۔ کیا کہنا چاہتا تھا کہ اندر تو تشیو ہوتا ہے نہ غسل نہ لباس تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس پر صابن لگتا ہے نہ پاؤڈر۔

"وہ بھی ضرور بدلے گا۔" کرشنا پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ "وہ بھی بدلے گا لیکن دونوں حلیے ایک ساتھ خراب ہو جائیں تو یہ بڑی تشویش ناک بات بلکہ بُری بات ہے۔"

رات کو سونے کے لیے راج کرشنا نے اپنا شب خوابی کا لباس دیا۔ اس کمرے میں ریڈیو بھی تھا اور گراموفون ریکارڈ بھی۔ کتابیں بھی تھیں اور رسالے بھی تھے۔ میں نے کوئی چیز نہیں چھوئی۔ پھر راج کرشنا اپنے کمرے میں چلا گیا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہلانے کے بعد آج جانے کہاں بستر نصیب ہوا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ میں نے سوچا کہ راج کرشنا نے تھوڑی غذا میں کھلا کے اور نرم بستر دے کے مجھے کس قدر اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ چیزیں مجھے راس نہیں۔ صبح اٹھ کے راج کرشنا پھر میرے جسم میں سنگے چبھو رہی تھیں۔ آدمی کسی آدمی کو اس طرح قبول نہیں کرتا جیسا وہ نظر آتا ہے۔ اس کا چہرہ اس کا نام عہدہ اور پتہ جاننے کی خواہ مخواہ فکر لگی رہتی ہے۔ کچھ نہیں ہوتا اس کا نام اور پتہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اپنے کرتوں کے لیے یہ کوئی اچھا ذکر نہیں ہے تو لوگ کیوں نہیں سمجھتے؟

مگر صبح اٹھ کے راج کرشنا نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ ناشتے کے بعد وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کے بازار لے گیا۔ بازار سے اس نے میرے ناپ کے جتنے بھی کپڑے مل سکے خرید لیے۔ باقی تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔ پھر اس نے میرے لیے دو جوڑی جوتے، چپل اور دوسرا سامان خریدا۔ "آپ پیسے ضائع کر رہے ہیں۔" اس نے میرے لیے تیل کی بوتل اور شیونگ کا سامان خریدا تو میں نے احتجاج کیا۔

"یہ تمھارے لیے نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ایک بالکل نئے آدمی کے لیے ہے جس کی صرف شکل و صورت اور قد و عمر تم سے ملتا جلتا ہے۔ وہ جس کے بارے میں تم نے سنا ہوگا کہ ہندوؤں میں آدمی مر کے دوسرا جنم لے لیتا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ تم نے بھی دوسرا جنم لیا ہے اور پچھلی کوئی بات تمھیں یاد ہی نہیں ہے۔"

"کرشنا بابو! آپ...." مگر اس نے مجھے کچھ نہیں کہنے دیا۔ گھر پہنچ کے اس نے مجھے اپنے سامنے نیا لباس پہنوایا اور دور کھڑا کر کے دیر تک محو ہو کے مجھے ناپتا تولتا رہا۔

"بالکل بمبئی کا بابو۔ اب تم دیکھنا اندر کا حلیہ خود بخود تمھیں بدلا بدلا نظر آنے لگے گا اور تم کہیں اب آتے ہی ہو گے۔ آج یہاں ایک بہت خاص میٹنگ ہونا ہے۔ میں تمھیں ان سے اپنے دوست کے بیٹے یا بھائی کی حیثیت سے ملاؤں گا۔ ویسے تم قطعاً آزاد ہو اگر کہیں جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں دوپہر کے کھانے پر تمھارا انتظار کروں گا۔ مکان کا نمبر، فون کا نمبر اور پتہ نوٹ کر لو یا ذہن میں رکھو۔ راستہ نہ ملے تو کسی بھی قریبی پولیس اسٹیشن سے راستہ پوچھ لینا۔"

میں کہاں جاتا؟ تمام راستے ایک جیسے تھے۔ تمام شہر ایک جیسے تھے۔ راج کرشنا کہہ رہا تھا کہ اب میری طبیعت کچھ ٹھیک ہو چلی ہے لیکن طبیعت زیادہ خراب ہوتی شروع ہو گئی تھی۔ کل شام تک مجھے کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ اب بھری بھری اکتاہٹ آنے لگی۔ وہی آہٹوں پر چونک اٹھنا۔ وہی اپنے آپ کو چھپانے کی خواہش۔ جسم پر کپڑے بھاری لگتے تھے اور آنکھوں میں انھیں دیکھنے کے لیے گھولن ہوتی تھی۔ اسی اثنا میں راج کرشنا کے ساتھی آ گئے۔

پولیس کی وردیوں میں ملبوس چھ سے بڑے قد کے افسران ان میں کچھ لوگ وہ تھے جنھوں نے کل رات مجھے جوہڑ سے اٹھایا تھا۔ ان کی آنکھوں کو مجھے پہچاننے میں دیر لگی پھر وہ حیرت سے کبھی راج کرشنا کو کبھی مجھے دیکھنے لگے۔ راج کرشنا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے مجھے ان سب سے اپنے ایک مرحوم دوست کے بیٹے اور بھائی کی حیثیت سے ملوایا۔ سب نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کسی نے انگریزی میں اور کسی نے اردو میں میری خیریت پوچھی۔ میں نے راج کرشنا سے انگریزی میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کر دیا تھا۔ پھر میٹنگ ایک دوسرے کمرے میں بند ہو کے بیٹھ گئے اور راج کرشنا میٹنگ ختم ہونے کی معذرت کر کے اندر چلا گیا تو میں کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کے بنگلے سے باہر آ گیا۔ سڑک پر کاریں بہت تیز چل رہی تھیں۔ میں گلیوں، سڑکوں سے گزرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ لمبے چمکیلے فٹ پاتھ نیلی اسکرٹیں اور سفید قمیصیں پہنے ہنستے بچے بغلوں میں دبائے تھے۔ سکول جا رہے تھے جیسے مدراس جا رہے ہوں۔ کیا ان کی بات ختم ہو گئی؟ پر گروں نے مڑ مڑ کے اور گھور گھور کے مجھے دیکھا جیسے میرے ناک نقشے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی ہو۔ شاید میں انھیں کوئی نیا یا عجیب آدمی معلوم ہوا۔ دراصل یہ میری آنکھوں کی غلط بینی تھی۔ مگر آگے چل کے کالج کی لڑکیوں کے ایک گروپ میں لڑکیوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کے میری طرف متوجہ کیا اور کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔ مجھے ان پر سخت غصہ آیا۔ میں نے انھیں گھور کے دیکھا۔ وہ سہم گئیں۔ لگ رہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آدمی کے ہاتھ میں چاقو ہو اور اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی ہوں۔ میں نے واپسی کا ارادہ کیا اور گردن جھکائے ہوئے راج کرشنا کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔

درمیان میں میرے جی میں آئی کہ یہیں سے جنگل نکل جاؤں کیونکہ میں اس لائق ہی نہیں ہوں کہ انسانوں کے درمیان رہ سکوں۔ میری وجہ سے راج کرشنا کو فضول تکلیف ہوگی۔ ان پڑھے لکھے لوگوں میں میری باتیں بدتمیزی لگی جائیں گی اور آدمی اپنی سکت سے زیادہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔ راج تو بات کرنے کو جی چاہتا ہی نہیں تھا۔ اچھا ہے کہ راج کرشنا کے آگے دار گھر سے دھکے دے کے نکالنے سے پہلے میں خود ہی اس بانگ راہی خاک اور دھول کی بلندی سے پاک کر دوں۔ ابھی موقع ہے۔ راج کرشنا کا گھر دور ہے اور بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ راج کرشنا مجھے تلاش کر کے خود ہی تھک جائے گا اور پھر میں اسی شہر میں کیوں رہوں۔ میرے لیے ہر جگہ ایک جیسی ہے۔ میں بمبئی ہی چھوڑ دوں گا۔ میں نے راستہ بدل دیا لیکن کچھ دور پہنچ کے بڑھنے سے آگے نہیں چلا گیا۔ میرے جسم پر راج کرشنا کے خریدے ہوئے کپڑے تھے۔ وہ صبح کس ذوق و شوق سے میرا لباس خریدنے کے لیے بازار گیا تھا۔ میں چلا جاؤں گا تو وہ بہت پریشان ہوگا اور اگر اس نے کہیں سے مجھے پھر ڈھونڈ نکالا تو میں اس کے سامنے آنکھ بھی نہیں اٹھا سکوں گا۔ میں اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہوا واپسی کے راستے پر چل پڑا اور آخر میں پہنچا۔ راج کرشنا میری تلاش میں گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ مجھے راستے میں ملا۔ "مجھے ڈر ہوا کہ تم کہیں واپسی کا راستہ نہ بھول گئے ہو۔" اس نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اور میں پریشان تھا۔ انتظار ہو رہا ہے۔ میٹنگ لمبی ہو گئی تھی اس لیے میں نے آن سب کو روک لیا ہے۔ تم گھبرا تو گئے نہیں؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تم مجمع کے درمیان جبس تو محسوس نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "سڑکوں پر بھی ہجوم ہی ہے۔"

"آدمی کو ہجوم میں رہنے کا عادی بننا چاہیے۔ انسان انسان سے بھاگ کر کہاں جائے گا؟"

گھر قریب ہی تھا۔ پانچ چھ منٹ بعد ہم دونوں ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ مجھے چھری اور کانٹے سے کھانے کی تمیز نہیں تھی۔ پہلے میں نے ان لوگوں کو دیکھا اور صرف روٹیاں کھانے پر اکتفا کیا۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں تھی البتہ راج کرشنا کی عزت کا خیال ضرور تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں اتنے بڑے افسر کا مہمان اس

جنبش ہوئی جیوں تھرتھرائیں، اب ایک آن کے بیسے کپکپائے، پھر اُس کی
نیلی آنکھوں کا نشہ بڑھ گیا۔ وہ دھوپ کے رُخ پہ رکھے ہوئے شیشے کی طرح
چمکنے لگیں۔ اس نے ان پر پلکوں کا آدھا غلاف چڑھا لیا۔ نیم باز آنکھیں کچھ
اور اثر انگیز ہوئیں۔ وہ مجھے کسی اشتہارے سے زیادہ جادوگر معلوم ہوا۔ اس کے
ساتھی پرے ہوئے کھڑے تھے۔ اس کے ایک اشارے کی دیر تھی۔ میں نے پیز
مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ضرورت کے وقت پیچ آدھی کر کے
اس سے چاقو کا کام لوں گا۔ چائے والا اسٹال سے باہر آ گیا تھا۔
ستانہ نے اپنے بائیں جانب کھڑے ہوئے ایک شخص کو ابرو کا اشارہ
کیا۔ وہ قد و قامت میں میرے برابر ہوگا، عمر میں مجھ سے زیادہ تھا۔ اس کے
اعضا میں لچک نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بھی بے رحمی کا غماز تھا، صرف ایک لمحے
میں وہ میرے روبرو موجود تھا۔ میں نے میز ایک طرف دھکیل دی۔ اس نے
اپنے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو اپنے ساتھیوں کی طرف اُچھال دیا کیونکہ میرے
ہاتھ میں چاقو نہیں تھا۔ میں نے بھی پیچ چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا اور
میرا فاصلہ بہت کم تھا۔ اس نے اپنا الٹا ہاتھ تیزی سے اٹھایا تاکہ میرے
کاندھے پر ضرب لگا کے پہلے ہی وار میں مجھے زمین پر بٹھا دے۔ میں اس کی
ضرب کمزور کرنے کے لیے خود ہی پیچھے جھک گیا تھا، پھر جب اس کا ہاتھ میرے
کندھے پر پڑا تو اس میں اتنا زور نہیں تھا، جتنے زور کی توقع میں اس نے اسے
اٹھایا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں نے پیچھے جھک کے گویا ایک طرح کا دفاعی
انداز اختیار کر لیا ہے لیکن میرا مقصد یہ تھا کہ وہ اوپر سے میرے کندھے پر ضرب
لگائے اور میں نیچے جھک کے اس کی بغل پر ضرب لگاؤں۔ بغل کی ضرب سے
بہت سے لوگ اپنا توازن کھو دیتے ہیں۔ یہی ہوا جب بالکل غیر متوقع طور پر
میں نے زمین سے اچک کر اس کی بغل نشانہ بنائی تو وہ گھبرا اٹھا اور اُچھل
کے ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ قدم پیچھے کرنے کی حالت میں اگر حملہ کیا جائے
تو فریق کو سنبھلنے کا زیادہ بہتر موقع مل جاتا ہے۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں اس کے
ساتھ ہی آگے بڑھا اور میں نے اس کا وار اسی پر آزمایا۔ البتہ فرق یہ تھا کہ وہ
صرف کندھے پر ضرب لگا کے مجھے جھکانا چاہتا تھا، میں نے اس کی گردن کے
جوڑ پر ضرب لگائی۔ وہ بوکھلاہٹ میں اوندھے سیدھے ہاتھ چلانے لگا جو
پھسلتے ہوئے میرے سر اور پسلیوں میں لگے۔ چھل نے نصیحت کی تھی کہ زیادہ
ہاتھ پاؤں چلانے سے بہتر ہے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں کھائے جائیں اور اپنے نشانے
کی تاک میں رہا جائے کہ جہاں ضرب لگانی مقصود ہو وہاں سے مقابل کا ہاتھ
فاصلے پر ہو۔ وہ کہتا تھا کہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے والا دیر تک محتاط نہیں رہ
سکتا بشرطیکہ مقابل کا آدمی جان بوجھ کے اس کے حملے برداشت کر رہا ہو اور
مناسب موقع کی تاک میں ہو ورنہ معاملہ اُلٹا ہو جاتا ہے۔ آدھی لڑائی تو محض
احتیاط اور کوشش سے جیتی جاتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں مکمل طور پر اپنی
ذات کے احاطے میں رہنا چاہیے اور مقابل کو اپنی آنکھ کے حصار میں رکھنا
چاہیے۔ میں ادھر اُدھر پینترے بدل بدل کے اس کی نظر میں نا مکمل کرتا رہا

پھر ابھی اس کی نظر میں پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوئی تھیں کہ آخر مجھے ایک موقع
ہاتھ آ گیا۔ میرا بھرا ہوا پنجہ اس کی ناک پہ پڑا۔ اس نے تلملا کے برق رفتاری
کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑنے کا ارادہ کیا۔ اب اس کی
یہی خواہش ہونی چاہیے تھی کہ وہ جوابا مجھے جسم کے کسی حصے پر خون کی لکیر
اُبھار دے جیسی اس کے چہرے پر اُبھر آئی تھی۔ اپنا خون دیکھ کے آدمی پر دیوانگی
طاری ہو جاتی ہے۔ میں اس کے گردن پکڑنے کی منتظر تھی۔ میں نے اپنا داہنا گھٹنا
جوا اس اُس کی ٹھوڑی کے نچلے حصے پر مارا۔ اس کے کئی دانت ایک ہی … گئے
ہو گئے ہوں گے۔ ایک بلند کراہ کے ساتھ ہی اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں نے
کسی وقفے کے بغیر اس کے پیٹ میں مکا مار کے پہلے تو اپنی گردن آزاد کرائی اور
اسے پھر سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔
آگے پہلے زرنش کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر اس کی ٹھوڑی کی ضرب
سر کے بجائے ہونٹ یا ناک کے حلق سے چکنا چور ہوئی تھی۔ وہ ضرب اس ضرب
سے زیادہ شدید تھی۔ زرنش فرش پہ بلبلانے لگا تھا۔ یہاں ستانہ کے آدمی کی ٹھوڑی
مجروح ہو جانے کے باوجود مجھے پے درپے ضربیں لگانی پڑیں، تب کہیں اس کے
حواس بحال طور پر باختہ ہوئے، وہ گرنے لگا۔ زرنش کے مقابلے میں یہ شخص …
سے لڑتا تھا۔ داؤ پیچ بھی اچھے خاصے جانتا تھا، ستانہ کی وجہ سے یہاں بھیڑ
بھی زیادہ اکٹھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے آدمیوں نے … نہیں ہونے دیا
اسٹال کی کئی میزیں الٹ گئیں۔ پانی کا فلٹر بھی ٹوٹ گیا۔ تقریباً سارا اسٹال
چند منٹوں میں الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ شخص ابھی ایک … ہاتھ پیر
رہا تھا، اس لیے اچانک ستانہ کے اشارے پر اس کے دو آدمی آئے، بازو
پکڑ کے اپنی جانب کھینچنے لگے۔ میری … روشنی نصیب میاں …
کہا، بہت سے اور بے ساختہ وار تھے۔ جب میں نے … آواز
دوران میرا ایک وار … وار سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہاں ستانہ کے سامنے
بھی اسی میں جلدی اور تیزی سے فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کا آدمی پاگل
ہو رہا تھا اور اپنے ساتھیوں کے قبضے سے آزاد ہو کے دوبارہ مجھ پہ حملہ کرنے
کی فکر میں تھا مگر انہوں نے اسے بڑی مشکل سے تھام کے رکھا اور اسٹال والے کا
میلی گرد پانے اس کا خون آلود چہرہ صاف کرنا شروع کر دیا مگر خون نہیں رکتا
اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اور اسے کلیاں کرائی جانے لگیں۔ پانی
پانی اس کے منہ سے سرخ ہو کے واپس آتا رہا۔
ستانہ کی آنکھوں کی نشیلی چمک گہری ہو گئی تھی اور اب اس کی …
پوری طرح اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ساتھی کی طرف متوجہ نہیں تھا
مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا، پھر وہ آہستہ قدموں سے میرے پاس آیا
اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک نعرہ لگا کے …
دائیں بازو کو بوسہ دیا اور اپنے گلے سے … اتار کے میرے گلے میں ڈال دی۔

☆

وہ جگہ گراؤنڈ فلور کے تین چار فلیٹوں پر مشتمل تھی جہاں ستانہ اپنے
آدمیوں کی معیت میں مجھے لے گیا۔ مجھے اس نے چوکی پہ اپنے برابر کی
جگہ دی، پھر لڈوؤں کا ایک طشت آ گیا۔ لڈوؤں پر پھولوں کی پتیاں بکھری
ہوئی تھیں اور درمیان میں ایک بڑی موم بتی جل رہی تھی۔ ایک بڑا گلاس
اور دودھ کی بالٹی بھی پاس ہی رکھی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نے دودھ کا بھرا
ہوا گلاس مجھے پینے کے لیے دیا۔ ابھی میں نے صرف ایک گھونٹ لیا تھا کہ
اس نے گلاس مجھ سے واپس لے لیا۔ پھر وہ گلاس باری باری تمام لوگوں میں
گھومتا رہا اور سب اس سے ایک ایک گھونٹ پیتے رہے۔ ساتھ ہی دودھ
لڈو تقسیم کیے جانے لگے۔ ستانہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ وہ
بات کم کرتا تھا، اشارے زیادہ کرتا تھا۔ "اڑے!" دفعتاً اس کی آواز گونجی۔
سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"اڑے اکاشی! بالی! دودھ پی لیا؟"
"پی لیا۔" وہ تینوں مرجھائی ہوئی آوازوں میں بولے۔
"پی لیا؟" ستانہ نے اپنی کھنک دار آواز میں دوبارہ پوچھا۔
"پی لیا استاد!" اس بار تینوں بیک وقت بولے۔
"پی لیا؟" ستانہ نے نسبتاً اونچی آواز میں پھر تکرار کی۔
"ہاں استاد!" ان تینوں نے پھر سر جھکا لیے۔
ستانہ نے ایک لمبی جھول کی اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولا "بول
کتنا ماتھا کا جانا ہے؟" اس کی آواز میں لچک اور کھنک تھی جیسے پیتل کا
ہنڈا لول رہا ہو۔
"یہ تمہاری مرضی پہ ہے استاد! میں نے خود کو تمہارے ساتھ باندھ
لیا ہے۔" میں بڑے اطمینان سے کہا "میں اس شہر میں نیا ہوں۔ بمبئی میں تمہارا
ذکر سنا تھا، سوچا ملاقات کروں، سو ادھر چلا آیا۔"
"اپن کا ذکر بمبئی میں کیدھر سنا؟ تو نے اچھا کیا ادھر آ گیا پر تجھے
یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی، سیدھا اپن کے پاس آتا۔" ستانہ شرابی
لہجے میں بولا۔
"میں نے سوچا جان پہچان میں ٹائم لگے گا۔ پہلے ہی استاد کو کالے
ہاتھ کے بتا دوں تو اچھا ہے۔ یہ شہر بہت ظالم ہے۔ کتنی دن سے …
پھر رہا ہوں پر شرافت یہاں چھو کے نہیں گئی۔ کوئی ہمارے شہر میں آ کے دیکھے
لوگ آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں، یہاں تو تم جیسا گھوست نظریں ٹیڑھی کرنے
لگا ہے۔"
"تمارا جرابی ہے" ستانہ بڑی … سے بولا "تو نے ادھر آ کے دیکھا ہوتا
تو … سمجھتا اڑتی چڑیا کا … کر لیتی ہے۔ اپن تو … تجھے بھی نظر …
… ہاتھ اٹھا دیتے پر اپن نے بھی سوچا ان سالوں کی تسلی ہو جائے، پھر
… صاحب کچھ اب یہ سب تیرے بھائی ہیں۔"
"ہم نے اسے کچھ نہیں بولا تھا استاد!" ماشر تالے نے احتجاج کیا۔
"چپ!" ستانہ نے اپنی سرخ آنکھیں ماشر تالے پر جما کے للکارا۔
"ولی سے … آیا ہے، اب اگر زبان کھولی تو پیچھے سے کتر لوں گا۔"
… ماشر تالے نے بڑھ کے استاد کے پاؤں پکڑ لیے اور مجھ
سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے پاس ہی بٹھایا۔ پھر سب نے
ماشر تالے کی تقلید کی۔ ہر شخص پہلے استاد کے پاؤں چھوتا پھر مجھ سے
مصافحہ کرتا۔ میں نے ستانہ کو اپنا نام سکندر بتایا تھا۔ ماحول میں اجنبیت کا جو
غبار چھایا ہوا تھا وہ رفتہ رفتہ چھٹ رہا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ مجھے
ڈر تھا کہ کہیں راج کرشنا گھر واپس نہ آ گیا ہو۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ میں
صرف قمیص پاجامے میں گھر سے نکل گیا ہوں تو وہ میری تلاش میں نکل کھڑا
ہوگا۔ میں ستانہ سے کہہ چکا تھا کہ بمبئی میں میرا کوئی ٹھکانا، کوئی گھر نہیں ہے۔
اب اگر میں جانے کی جلدی کرتا تو سب بنی بنائی خاک ہو جاتی لیکن ظاہر تھا
کہ وہ کب تک … اس طرح بیٹھے بیٹھے ستانہ نے مجھ سے بالی کا کوئی بھی
علاقہ مانگ لینے کی پیشکش کی تھی۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی واقفیت
ہی نہیں تھی اور نہ میرا مقصد کوئی علاقہ حاصل کرنا تھا اس لیے میں نے انکار
کر دیا کہ پہلے میں سارے علاقے کا جائزہ لوں گا پھر اسے بتاؤں گا۔ ستانہ کی
بھی شاید یہی خواہش تھی کہ میں اس کے ساتھ رہوں اور علاقے میں اس کا
نائب بن کے آدمیوں کی نگرانی کرتا رہوں۔ وہ ابھی روپے پیسے کا کوئی اعتبار
مجھ پر نہیں کرنا چاہتا ہوگا۔ وہ ابھی مجھے اور پرکھنا چاہتا ہوگا۔ میری بات
سے وہ خوش ہوا، پھر اس نے سب کو اپنے اپنے کام پر جانے کا حکم دیا اور
مجھ سے دلی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کلکتے کی جو معلومات تھیں وہ
میں نے دلی پر منطبق کر دیں۔ میں سات سال جیل میں رہ کے ہر طرح کی بات
سے واقف ہو چکا تھا۔ اس لیے ستانہ نے مجھ پر کوئی شک نہیں کیا۔
جس شخص کے میں نے دانت توڑے تھے اور ناک پھوڑی تھی وہ مرہم پٹی
کرا کے آ گیا تھا۔ ستانہ نے باقی دودھ اسے پلا دیا۔ اس کا نام دلراج تھا۔ دلراج
کا چہرہ بجھا ہوا تھا مگر وہ ستانہ کے اشارے پہ مجھ سے گلے مل لیا۔
رات کا کھانا میں نے ستانہ اور اس کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ
کھایا۔ کھانے کے بعد ایک آدمی نے اسے دوسرے کمرے میں چلنے کا
اشارہ کیا۔ ستانہ فوراً اٹھ گیا۔ میں نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا، پھر باہر چلا آیا
اور جو بیلی لیس … سوار ہو گیا۔ میں نے یہ احتیاط کر لی تھی کہ
کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ جب میں خاصی دور آ گیا اور میرے
خیال کے مطابق ستانہ کا علاقہ ختم ہو گیا تو میں نے اتر کے چند
قدموں کے فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ یہ جگہ بہت گنجان تھی۔ ایک بڑا
میڈیکل اسٹور ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس میں داخل ہونے سے پہلے
اپنے اردگرد کا اچھی طرح جائزہ لیا، فون کرنے کے لیے اسٹور کا رخ کیا۔
اسٹور کے مالک نے مجھے آسانی سے فون نہیں کرنے دیا لیکن جب میں نے ایک
روپیہ اس کے سامنے رکھا تو آنے کا شک کرتا ہوا آ گیا۔ اس نے میرے سامنے رکھ
دیے۔ یہ میری زندگی کا پہلا ٹیلی فون تھا۔ راج کرشنا نے میری آواز سنتے

چل پڑے۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو اڈے پر بھیڑ نہیں تھی ہم لوگوں کو علیحدہ کر کے مستانہ کے ساتھ تین آدمی تھے۔ مستانہ نے سب کے بازوؤں کا بوسہ لیا اور میرا کندھا خاص طور پر تھپتھپایا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے چھوڑ کے سبھی کو پہلے سے تیار کیے ہوئے جنگ کے چیلے پیش کیے گئے۔ بھنی ہوئی مرغیاں تھے اور کباب تیار تھے۔ مستانہ کی یہ مستانہ روی دیکھ کے کسی نے خوشامدانہ آواز میں کہا "استاد! ذرا دیدار کرا دو" اس کی تائید اور لوگوں نے بھی کی۔

"یہ اِن لوگوں کے لیے نہیں ہے اس سے سوغاتی جائیں گی تو یہ ترکیش ہے" مستانہ معمول سے زیادہ چہک رہا تھا اس کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"استاد! بس ذرا ایک سیکنڈ درشن"

"اوہ" مستانہ نے ہاتھ پھیلا کے خفگی سے کہا "آؤ آؤ سالا! تم بھی کیا یاد کرو گے مر جاؤ گے تو سالا یاد کرو گے روٹھ گئے" وہ چیخ کے بولا۔

ہم سب اندر کمرے میں پہنچ گئے۔ لڑکی چوکی پر بے سُدھ پڑی تھی اس کے بدن پر ایک چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ مستانہ ڈگمگاتا ہوا اس کے پاس گیا "بتی جلاؤ" اس نے منہ پر انگلی رکھ کے ہولے سے کہا۔ روشنی کر کے مزید روشن ہو گیا۔ مستانہ نے لڑکی کے پہلو میں بیٹھ کے دھیرے دھیرے چادر ہٹانی شروع کی۔ پھر دفعتاً ایک جھٹکے سے اسے کھینچ لیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور حلق میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ وہ گندمی رنگ کی ایک پری سی لڑکی تھی۔ اس کی عمر ۱۶-۱۷ سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کا چہرہ سنگ تراش کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا اور پورا بدن کسی مجسمے کی طرح ترشا ہوا تھا۔ پلکیں لمبی لمبی آنکھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی، بال سیاہ اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے۔ وہ خوابی کا جدید لباس پہنے ہوئے تھی۔ سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اس کی طرف سب ایک ٹک دیکھتے رہے۔ سب کی آنکھیں گنگ اور زبانیں دنگ تھیں۔ مستانہ نے انگلیوں سے اس کے رخسار سہلائے اور ہونٹوں سے اس کے گیسو اٹھائے پھر لرزتے بدن پر سر سے پیر تک اضطراب سے ہاتھ پھیرا۔ اسی اثنا میں کسی نے منہ سے سیٹی بجا دی۔ مستانہ نے پلٹ کے ہم سب کی طرف غصے سے دیکھا اور جھٹ چادر سے لڑکی کا بدن ڈھانپ دیا۔ "چلو" وہ ناگواری سے بولا۔

"ماسٹر قسم سے گرینڈ۔ ماسٹر نے چھوکری اپنے ہاتھ سے بنا لی ہے" ماسٹر کی لجھائی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ماسٹر! دل گھبرا رہا ہے۔ اسے اوپر پہنچا دو ورنہ......"

"چپ رہ" مستانہ نے ڈانٹ کر کہا "بس اسے اوپر پہنچا دو۔ چھوکری تمھاری ماں کی طرح اس وقت تک یہاں رہے گی جب تک......" مستانہ بولتے بولتے کہیں گم ہو گیا۔

"استاد چھوکری اپن اوپر پہنچاؤں گا۔"

"نہیں استاد! یہ لونڈی کا بچہ دس سیر کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ چھوکری کو اپن پریم سے اوپر پہنچاؤں گا۔ استاد! ایک چانس دو۔"

"استاد! اپن پہنچاؤں گا۔ ایک دم فرسٹ کلاس......"

"آئیں آئیں" مستانہ کی گرجدار آواز سے وہ سب خاموش ہو گئے۔ "کیا لفڑا ہے تم سالا روز چھوکری دیکھتا ہے۔ ایک چھوکری بچا نہیں سکتا۔ دھندا کریں گا تم سالا سب بچے! ماں کا بنا ہے" مستانہ باری باری سب پر غصے کی نگاہیں پھیرنے لگا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر رک گئی۔ میں الگ تھلگ خاموش کھڑا تھا۔ "ادھر آ سکندر!" اس کی آواز میرے جسم میں سنسنا گئی۔ میری جھجک بھانپ کے اس نے کرخت لہجے میں مجھے اپنے پاس بلایا۔ "اسے تو اوپر لے جائے گا اور تو...... تو" اس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے ساتھ جائے گا۔ سالا پوسٹ مارٹم کا روم نمبر ۷ میں تم سب کے ساتھ آدھا بھائی بیچ رہا ہے اور وہ چھوڑیاں خنک سے کھولی ملی گی۔ آج اپن نے تم لوگ کے لیے خاص انتظام کیا ہے۔"

اس کے اشارے پر میں نے لڑکی کو کندھے پر ڈال لیا۔ سبھوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک لاش اٹھائے ہوئے ہوں۔ نمیدہ کی لاش۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ میرے پیر لرز رہے تھے۔ میں نے اپنا چہرہ اس کے کپڑوں سے خشک کیا۔ اوپر کا راستہ ایک الماری سے گزر کے جاتا تھا۔ وہ صرف بظاہر الماری تھی اور کمرہ کیا تھا! ایک بڑا مچان تھا جس میں تنگی ہوا کے لیے فرش پر بنا ہوا چھوٹا سا سلاخوں والا روشن دان۔ لڑکی اگر چیختی تو اس کی آواز نیچے کمرے تک نہ جاتی۔ لڑکی سے رابطے کا واحد ذریعہ یہ روشن دان تھا۔ وہاں ایک بستر کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک طرف غسل خانے کا تنگ حصہ تھا۔ سکا باہر کھڑا رہا۔ میں نے لڑکی کو بستر پر لٹا دیا اور اس کے بازو کی چٹکی لے کے اُسے ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کی۔ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے اس کے بال درست کیے، سر کے نیچے تکیہ رکھا اور گردن تک چادر ڈال دی۔ وہ ہوش میں نہیں آئی۔ کرنا بھی کیا؟ سے کچھ کہہ سکتا۔ میرا ہاتھ خود بخود چاقو پر پہنچ گیا۔ میں اس کے سینے میں چاقو گھونپ سکتا تھا لیکن یہ بھی نہ کر سکا۔ میرے ساتھ آنے والے آدمی نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ ہم نیچے آ گئے۔ سکا نیچے کمرے ہی میں رہ گیا۔ یہ کمرہ چھوٹے سے صحن میں کھلتا تھا اور صحن باہر جانے والے راستے سے دور تھا۔ ایک عقبی راستہ بھی تھا مگر وہ عموماً بند رہتا تھا۔ جس کے بارے میں بتایا گیا تھا اس کے بعد بھی کئی کر سکتے تھے۔

صحن میں شور مچا ہوا تھا۔ رنڈیوں کی کھنکار اور مستانہ کے آدمیوں کے قہقہے۔ ہم دونوں جا کے ان کے درمیان بیٹھ گئے۔ سب کے سامنے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ مستانہ کے پہلو میں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ جتنے آدمی تھے اتنی عورتیں نہیں تھیں۔ کوئی دو تین آدمیوں کے پاس ایک ایک عورت

تھی۔ مستانہ نے مجھے دیکھ کے ایک مستانہ نعرہ لگایا۔ پھر اس کے حکم پر میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے اچانک جھک کے میرے گال کا پیالہ لے لیا۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا مگر میری اس بات پر سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔ "استاد! اسے لونڈیا کے پاس پہنچا دو۔ وہ اسے ٹھیک کرے گی۔" اس نے زنخوں کی طرح نقل اتارتے ہوئے کہا۔ میں یہ سب سنتا اور دیکھتا رہا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

چار بجے کے قریب وہ نڈھال ہونے لگے اور عورتوں کو نوچنے کھسوٹنے لگے۔ ایک ایک عورت کے پیچھے تین تین چار چار مرد دوڑے اور واپس نہیں آئے۔ پھر سب چلے گئے۔ مستانہ بھی چلا گیا۔ میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی اندازاً ساڑھے چار بجے ہوں گے۔ کمرے میں بچی ہوئی ہڈیاں، آدھی کھائی بوٹیاں، پیالے اور سالن کے دھبے اسپیلے تتر بتر پڑے ہوئے تھے۔ پھولوں کی کچلی ہوئی پتیاں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ میرا جسم ایک پہاڑ بنا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں کسی دوسرے کے لگتے معلوم ہوتے تھے۔ میں اٹھ کے باہر آیا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ سبھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ ہر بے آواز چاپلوں سے جنھیں صرف میں ہی سن سکتا تھا۔ سکا کے کمرے میں گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے گردن ڈالے پڑا تھا۔ میں نے صحن کے ایک اندھیرے گوشے میں چھپ کے ایک بار پھر تمام کمروں کا جائزہ لیا اور وہیں سانس روکے کھڑا رہا۔ پھر جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں باہر جانے والے تنگ راستے میں آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے قریب ٹھہرا ہوا چوکیدار رہتا ہے۔ راستہ روشن تھا۔ چوکیدار کے کمرے میں ایک رسی تھی۔ وہ رسی کھینچنے سے اندر چند کمروں میں ٹن ٹن گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ یہ گھنٹیاں میری موجودگی میں کبھی نہیں بجی تھیں۔ دروازہ ایک زنجیر سے بند کیا گیا تھا۔ کنڈے میں لوہے کی بڑی میخ ڈال دی گئی تھی۔ میخ نکالنے اور وزنی کنڈا کھولنے کی آواز سے چوکیدار جاگ سکتا تھا۔ وہ اگر اندر جاگ رہا تھا اور میں گردن نکال کے جھانک کے دیکھتا تو کام بگڑ جاتا۔ چنانچہ میں نے ملائم آواز سے، وہ شاید اونگھ رہا تھا، دست بچا کے بلایا۔ "کون ہے؟"

پھر اس نے دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ میں نے اُسے چیخنے کی مہلت نہیں دی۔ میری پہلی ہی ضرب سے وہ اپنے پیروں پر قائم نہیں رہ سکا۔ دوسری کاری ضرب کے اندر کمرے میں لڑھک پڑا۔ اس کے باوجود میں نے دو تین ضربیں اور لگانا مناسب سمجھا۔ پھر میں دروازہ بھیڑ کے دبے دبے قدموں سے واپس آ گیا۔ خاص دروازے کے کنڈے کی میخ نکالنے میں مجھے چند منٹ اور لگ گئے حالانکہ یہ کام سیکنڈوں کا بھی نہیں تھا۔ دل کی وحشت چھائی ہوئی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ میرا دل دھک دھک کے برابر تھا۔ بس کوئی اکا دکا گاڑی گزر جاتی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا

کہ کیا کرنا چاہیے۔ وہاں کھڑے رہنے سے بہتر تھا کہ میں آگے بڑھ جاؤں۔ ایک چوراہے پر وکٹوریا اور ٹیکسیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اب ٹیکسی والے مستانہ کو جانتے ہوں گے مگر میرے پاس چاقو تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو جگایا۔ "نہیں جائیں گا" وہ حقارت سے بولا۔

"جتنا روپیہ کہو گے دوں گا" میں نے اس کی سمجھ کے لیے ہی تیزی سے کہا۔ "باندرے تک جانا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔ ایک شخص بیمار ہے ڈاکٹر کو لانا ہے۔"

اس نے منہ بنایا۔ "کتنا روپیہ دے گا؟"

"بیس روپیہ" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"بیٹھو بالو!" میں اس کے برابر کی نشست پر بیٹھ گیا۔ چاقو میں نے ہاتھ ہی میں دبائے رکھا۔ ٹیکسی والے نے راستے میں کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ وہ تیز رفتاری سے مجھے باندرے لے گیا۔ میری جیب میں بیس روپے نہیں تھے اس لیے میں نے ٹیکسی راج کرشنا کے بنگلے پر ٹھہرائی۔ پہرے دار بنگلے کے وہ محافظ سپاہی پوری طرح چوکنا تھے۔ انھوں نے بندوقیں کاندھوں سے اتار لیں لیکن جب مجھ پر نظر پڑی تو تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے ان کے قریب جا کے سرگوشی کی۔ "یہ ٹیکسی والا جیسے زبردستی ایک سپاہی احتیاطاً میرے ساتھ آیا۔ اُسے میری نیت پر بھی کچھ شبہ ہو گیا۔ اپنی کفنی کی ٹرٹر پر راج کرشنا گاؤن پہنے ہوئے اندر سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تمنچہ تھا لیکن مجھے دیکھتے ہی اس نے تمنچہ دور پھینک دیا اور بے قرار ہو کے میرے سینے سے لپٹ گیا۔

سڑکوں پر گاڑیوں کی آمد و رفت میں ابھی تیزی نہیں آئی تھی کہ مستانہ کے اڈے پر جتنے لوگ موجود تھے سب منتقل کر لیے گئے۔ ادھر سے فون کر کے راج کرشنا روانہ ہوا۔ ادھر سے پولیس کی بھاری جمعیت بھی۔ پہرے دار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور دروازہ کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ راج کرشنا نے مجھے اپنے ساتھ ہی لے لیا تھا۔ جب میں وہاں سپاہیوں کی روشنی میں لڑکی کو اپنے کندھے پر ڈال کے لا رہا تھا تو میرے پیر بار بار زمین سے اکھڑ جاتے تھے۔ میں نے کسی کو اس کا چہرہ نہیں دیکھنے دیا۔ اب وہ ہوش میں آ گئی تھی اور اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ "روؤ نہیں تم اپنے گھر واپس جا رہی ہو" پولیس افسران تفتیش کے لیے اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر میں نے ضد کی کہ "وہ سیدھی گھر جائے گی۔" اس سے پہلے کہ اس کے گھر والوں کو خبر ہو میں نے کسی کو اسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ اسے پولیس کی گاڑی میں بٹھایا۔ اُسے گھر پہنچانے تک میں اس کے گھر کے اندر بھی نہیں گیا۔ مجھ سے اس کے گھر والوں کے چہرے نہ دیکھے جاتے۔

راج کرشنا کی گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ خود راج کرشنا اڈے ہی میں رہ گیا کیونکہ ابھی اُسے وہاں موقع پر گرفتاریاں کرنے اور کمرے سیل کرنے کا حکم دینا تھا اور یہ کام خاص طور پر اپنی نگرانی میں انجام دلانا تھا۔

راج کرشنا جلد سے جلد میرے پاس آنے کے لیے بے تاب ہوگا مگر یہاں نکلا میں ستانہ کے اڈے کے بعد جو کام اُسے کرنا تھا وہ اس سے زیادہ اضطراب کا تھا اسی لیے وہ وہاں ٹھہر گیا اور مجھے اس نے گھر روانہ کر دیا۔ گھر آکے میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سب سے پہلے میں نے راج کرشنا کے دلوائے ہوئے کپڑے چینج کیے۔ بدل کے کچھ سکون ہوا جیسے کپڑے بدلنے سے برسوں بلکہ پی لیے ہوں۔ پھر میں نے کرسی کی پشت سے کمر ذرا لگائی تھی کہ مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔

راج کرشنا شام سے پہلے گھر نہیں آسکا اور جب آیا تو اس کی آنکھیں ڈھنگی ہوئی تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے سر جھکا لیا۔ وہ میرے پاس آکے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں اندر ہی اندر دعا کرتا رہا کاش کرشنا وہ الفاظ خود کہہ دے جن کی ادائی کے لیے اس کے سینے پر بوجھ ہوگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ نہ اس نے کچھ بات کی، نہ میں نے۔ ہم دونوں بس ایک دوسرے کی سانسیں سنتے رہے اور میں اپنی انگلیوں سے مختلف چیزوں مختلف حیالوں کی شکلیں بناتا رہا۔ پھر میں نے ہی ابتدا کی کیونکہ سکوت ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ میں نے بہت ہلکی آواز میں اس سے پوچھا۔ "سب کام ٹھیک تو رہا؟"

"ہاں۔" وہ ایک لمبی آہ بھر کے بولا۔ "سب ٹھیک ہوگیا۔"

"اب، ابا تو کہیں نہیں جانا؟" میں نے شائستگی سے پوچھا۔

"نہیں اب شاید نہ جانا پڑے یا شاید جانا پڑ جائے۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا پھر چپ ہوگیا۔

"کپڑے بدل لیجیے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے زیرِ لب کہا۔

"ہوں۔" وہ اپنے گال رگڑتے ہوئے بولا۔ "تمہیں تو اب کہیں نہیں جانا؟" اس کے لہجے میں نہ تلخی تھی، نہ طنز تھا۔ البتہ شکایت تھی۔

"نہیں اب مجھے کہیں نہیں جانا۔" میں نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔

مجھ پر صبح سے گھبراہٹ طاری تھی کہ وہ گھر آنے کے بعد بہت سی باتیں کہے گا، بہت سی باتیں پوچھے گا اور میں اسے ساری باتیں کس طرح بتاؤں گا۔ میں نے تو خود ہی ان باتوں کا دروازہ کھولا ہے اب اسے بند کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ صبح ساڑھے چار بجے جب میں اچانک وارد ہوا تھا تو میں نے اسے یہ سب کچھ سرسری انداز میں بتایا تھا۔ اس وقت وقت بھی کم تھا۔ ہمیں روانہ ہونے کی جلدی تھی کیونکہ لمحوں میں اندھیرے کا پردہ چاک ہو جاتا۔ ڈرائیور کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان صرف رسمی گفتگو ہوتی رہی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ اس واقعے کے بعد وہ میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ وہ ایک بااصول شخص تھا لیکن سوالِ دل اچانک غائب رہنا اور آنا تو اس انداز سے آنا یہ سب کچھ اس جیسے ذہین شخص کے سوچنے کے لیے بہت کافی تھا مگر اب کچھ بھی ہو ستانہ کے ہاں خلافِ توقع دیر ہوگئی تھی۔ مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ واقعات اس طرح پیش آئیں گے۔ میں سمجھتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو چار روز میں واپس آجاؤں گا اور اسے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ معاملات کسی اور طرح اس کے گوش گزار کر دوں گا۔

"آپ نے میری بات کا خیال رکھا؟" میں نے اس سے نگاہیں ملانے کی ناکام کوشش کی۔ صبح میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ میرا نام کہیں استعمال نہ کرے۔

اس نے بے چینی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر یہ سب کیا ہے؟" آخر اس سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ وحشت سے بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"میں بہت ڈسٹرب ہوں ڈارلنگ! میں پاگل ہو سکتا ہوں۔" وہ تقریباً چیختا ہوا بولا۔ "میری مدد کرو میرے دماغ پر پانی ڈالو۔"

"دیکھیے۔" میں نے جھجکتے جھجکتے استدعا کی۔ "اب آپ کچھ نہ پوچھیں اور کسی قسم کا تردد نہ کریں تو اچھا ہے۔ میں آپ سے کیا کہہ سکوں گا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"ڈارلنگ! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "جانتے ہو اب تک کیا کچھ ہو چکا ہے؟ آج کے دن پر مجھے یقین نہیں آتا۔ کسی کو بھی یقین نہیں آتا۔ وہ حیران ہو ہو کے مجھ سے پوچھتے تھے کرشنا جی! یہ کیا ہوا؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے ابھی وہاں اور ٹھہرنا چاہیے تھا مگر میں ان کی نگاہوں سے بچ کے یہاں بھاگ آیا۔ شہر میں ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ وہ سب اندر چلے گئے ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ ہم نے تھانے بنانے جو تمام ٹھکانے آزمائے۔ ہم نے کسی کو بھی سنبھلنے اور بھاگنے کی فرصت نہیں دی۔ شہر کے معزز ترین لوگ اس میں شامل ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم یہاں سکون سے کیسے بیٹھے ہوئے ہو۔ میرا دماغ معطل ہو چکا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں بلکہ یہ کتنا سنگین معاملہ تھا اور اب کس قدر اہم ہوگیا ہے۔ کتنے ہی لوگوں کا خون ہو چکا تھا۔ یقیناً پولیس کا ایک گروہ بھی ان کی پشت پناہی کرتا ہوگا۔ جعل دولت سازی، زیرِ زمین منشیات کا بہت بڑا ذخیرہ۔ اُف!" اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "نہ جانے ابھی اور کیا کیا انکشافات ہوں۔" وہ پھر گویا ہوا۔ "رفیع نے ذاتی طور پر مجھے مبارک باد دی ہے۔ مجھ سے شکریے کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں کہا گیا۔ رات ہی پولیس افسران سے اس معاملے میں میری بات ہوئی تھی۔ انھیں شبہ تھا کہ جعلی کرنسی بابی کلاں کے علاقے سے آ رہی ہے مگر کہاں سے؟ مجھے اس علاقے کی چند ممتاز ہستیوں کے ناموں پر شرح دائرہ بنا دیا تھا مگر ثبوت ناکافی تھے اس لیے ان پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ میں اپنے ساتھی افسروں سے بار بار جھگڑتا تھا کہ ہمیں کسی کا لحاظ کیے بغیر ان کا محاسبہ کرنا چاہیے مگر وہ ڈرتے تھے۔ مجھے فون پر دھمکیاں دی جا رہی تھیں اور کہا جا رہا تھا کہ فوراً بمبئی سے نکل جاؤ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اوپر سے دباؤ پڑ رہا تھا۔ یہی معاملے نمٹانے کے لیے بمبئی میں میرے قیام کی مدت بڑھائی گئی تھی حالانکہ شہر کے کئی پولیس افسر ایک باہر کے آدمی کی مداخلت پر سبکی محسوس کرتے تھے مگر اچانک — اچانک صبح تم آگئے۔ اس سے پہلے شہر کا ایک اور گروہ ختم کرنے میں بھی تم شامل تھے۔ اب بھی تم ہی تھے۔ میری رہبری کرو۔" وہ ہانپتا ہوا بولا۔ "ورنہ میرا ذہن بھٹک جائے گا۔ پولیس والے کا ذہن بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا مگر ڈارلنگ! میں عہد شکنی کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔" اس نے شدت سے کہا اور میرے ہاتھ تھام لیے۔

"کچھ بھی نہیں۔ ذرا سی بات ہے۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "مجھے دو چار واقف ہو چکے تھے۔ آپ نے دیل میں خود ان کا مظاہرہ دیکھا ہے۔ انھیں ایسے آدمی کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ میں سولہ دن وہیں ان کے ساتھ رہا اور واپس آگیا۔ ممکن ہے میں ان کے ساتھ دو چار روز اور گزارتا اگر وہ لڑکی لے کے نہ آجاتے۔ اس طرح میرا فوراً نکلنا ضروری ہوگیا۔ اس وقت تک میں آپ کو بتانے کے لیے ان کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔"

"مگر کیوں؟ تم وہاں گئے کیوں؟" وہ جزبز ہو کے بولا۔

"آپ پریشان ہو رہے تھے۔ میں نے فون پر آپ کی گفتگو سن لی تھی۔ اس دن میٹنگ میں آپ لوگ اس معاملے پر بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا ایک کوشش کر دیکھوں مگر وہاں دن زیادہ لگ گئے۔ ویسے بھی میں ایک بے کار آدمی تھا۔ خیال تھا بیٹھے بیٹھے کوئی کام کر لینا ہی ٹھیک تھا۔"

"مگر یہ کام!" وہ دہشت سے بولا۔ "تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا۔ میں سولہ دن پریشان ہوتا رہا۔ ایک آدھ ہفتے کے بعد تمہاری کوئی اطلاع ہی نہیں مل سکی۔"

"مجبوری تھی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مگر تم... تم اتنی جلدی وہاں قبول کیسے کر لیے گئے؟"

"شاید میری صورت ہی ایسی ہے۔" میں نے جھنجھلا کے جواب دیا۔ "میں انھیں اپنی ہی برادری کا کوئی آدمی نظر آیا ہوں گا۔ خود میں نے بھی انھیں یہی جتانے کی کوشش کی تھی۔ جب میں نے ان کے دو چار آدمیوں کو زمین پر بچھا دیا تو انھیں میری ضرورت کا احساس ہوا لیکن اب میں یہاں آگیا ہوں۔" راج کرشنا کے لب کچھ کہنے کے لیے پھڑک کے رہ گئے۔ مجھے اپنے پر شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔" میرے اطمینان پر وہ تشکر بھرے انداز میں اٹھ گیا اور نہا دھو کے کسی قدر تر و تازہ نظر آنے لگا۔ پھر بھی اس کی بھوؤں کے درمیان کی جگہ سکڑی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد پولیس افسران آگئے۔ ان سب کے چہرے تمتما رہے تھے۔ انھوں نے صبح مجھے راج کرشنا کے ساتھ ستانہ کے اڈے پر سرگرم دیکھا تھا۔ ایک لڑکی کو ان کے سامنے آنکھ کے نیچے لایا تھا۔ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ممکن ہے ستانہ اور اس کے ساتھیوں نے باز پرس کے دوران مجھے برا بھلا کہا ہو مگر خود راج کرشنا نے ستانہ اور اس کے ساتھیوں کی تفتیش کے دوران "آفریدی" کی احتیاط کی تھی جیسے میں بھی ان کے ساتھ پھنس گیا ہوں۔ حوالات میں بھی انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا گیا تھا۔ میری خواہش پر سب سے پہلے لڑکی بازیاب کی گئی تھی تاکہ اسے کسی قسم کی زک پہنچنے کا احتمال نہ رہے مگر راج کرشنا کی یہ احتیاط بے معنی تھی۔ ستانہ اور اس کے آدمیوں کو بالآخر اس نتیجے پر پہنچنا ہی تھا کہ وہ بے وفا کون شخص ہو سکتا ہے اور پولیس افسران کو بھی معلوم ہونا تھا کہ راج کرشنا کی معلومات کا ذریعہ کون سا تھا۔ وہ سب میرے اردگرد بیٹھ گئے۔ ان کی خواہش راج کرشنا کی خواہش سے مختلف نہیں تھی کہ میں انھیں بہت دلچسپ باتیں سناؤں گا۔ مگر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ فون کی گھنٹی بار بار بجتی رہی اور راج کرشنا کے بنگلے پر رات کو تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ گھر نہیں کربلا ہے۔

ناشتے کی میز پر صبح کے اخبارات رکھے ہوئے تھے۔ تمام کے تمام انگریزی کے تھے۔ میں نے جان بوجھ کے ہاتھ نہیں لگایا۔ راج کرشنا سر جھکائے انھیں پڑھتا رہا۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ جلد آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں نے اخبارات دیکھنے شروع کیے۔ اخباروں نے خبر نمایاں لکھی تھیں۔ اُف یہ بہت سی خبر کے لیے بھی تھی۔ اخبارات نے شہر کی ان شخصیتوں کے نام چھاپنے سے گریز کیا تھا جنھیں آگے پیچھے گرفتار کیا گیا تھا لیکن روداد پوری چھاپی تھی۔ کہاں کہاں کیا کیا ملا۔ سکوں کی ڈھلائی، نوٹوں کی چھپائی، شراب اور دیگر منشیات کا ذخیرہ۔ جہاں جہاں یہ ذکر تھا، وہاں ہر جگہ راج کرشنا کا نام موجود تھا۔ اس کی تعریف میں بڑی بڑی باتیں لکھی گئی تھیں۔

اس نے اب تک کتنے گروہوں کو غیر مؤثر کیا اور پولیس میں اس کی خدمات کا کتنا بڑا ریکارڈ ہے۔ ایک اخبار نے "ایک سچا پولیس مین" کے عنوان سے راج کرشنا پر مختصر مضمون بھی چھاپا تھا۔

اس کے بارے میں اگلے پچھلے اتنے بہت سے واقعات پڑھ کے مجھے کمرے میں حبس سا محسوس ہوا۔ یہ تو وہ واقعات تھے جو میرے سامنے پیش آئے۔ اس سے پہلے راج کرشنا کی پوری زندگی جرم کشی میں گزری تھی۔ مجرموں کے لیے اس کا نام تازیانہ تھا۔ اگر کسی موقع پر راج کرشنا کو یہ معلوم ہوگیا کہ اس کے ساتھ رہنے والا آدمی بھی تین قتل کرنے کے الزام میں سات سال جیل میں گزار کے آیا ہے اور سزا کاٹنے کے بعد بھی اس نے بس نہیں کیا بلکہ بھاگ گیا، میں ایک شخص کو چھرا مار کے ختم کر دیا۔ کلکتے میں جانا دیاں اور موجدار جیسے بدمعاشوں کو یا تو مار کے ہلاک کر دیا اور اس شخص کا تعلق کلکتے کے مشہور آدمی تجمل سے رہا ہے، اس کی بہن کو مجھے پہنچا تھی اور اس کے گھر کے باقی آدمیوں کا کچھ اتا پتا نہیں ہے، وہ سولہ سترہ

سال کی عمر میں ایک کم سن لڑکی کو گھر سے لے کے فرار ہو گیا تھا۔ اگر راج کرشنا کو یہ ساری باتیں یا ان میں سے کوئی ایک بات معلوم ہو جائے تو اُس کے ذہن پر کیا اثر ہوگا؟ اگر وہ میرا خیال کرے گا تو اُس کے اُصول مجروح ہوں گے۔ اتنی عمر سچائی کی گزارنے کے بعد اُسے جھوٹ بولنا، جھوٹ سہنا پڑے گا۔ میں نے پہلے ٹھیک فیصلہ کیا تھا، مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اب میں خود وضاحت بھی نہیں کر سکوں گا کہ یہ سب مجھ سے کیوں ہو گیا۔ مجھ سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی کہ میں نے آپاجان اور اتی پر شبہ کیا کہ وہ کورا کو کہیں باہر نہ نکال دیں اس لیے میں کورا کو وہاں سے لے کے چلا آیا تھا۔ اگر میں وہیں بیٹھا ان سے فریاد کرتا تو شاید وہ میری بات مان لیتے اور کورا کو گھر میں رکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتے مگر وہ کیسے رکھتے اور میں نے کیا غلطی کی۔ جب تک کورا رہی اُسے اُوپر چھت پر بنے ہوئے ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا تاکہ محلے والے اُسے نہ دیکھ سکیں۔ اُسے رشتے داروں اور محلے والوں سے کب تک چھپا کے رکھا جا سکتا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اس کا راز فاش ہونا ہی تھا۔ میں اسے غلطی نہیں کہتا کہ مجھے کورا کا خیال ترک کر دینا چاہیے تھا۔ میں اُسے جب گیا چھوڑ آیا تو آپاجان کی خواہش یہ تھی کہ تھانے میں رپورٹ درج کرا دی جاتی۔ میں مر جاتا مگر مجھ سے یہ بھی نہ ہوتا۔ سو جو کچھ ہوا اُس میں میری مرضی کہاں شامل تھی۔

میں نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر راج کرشنا کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ کوئی لقب سمجھ میں نہیں آیا۔ میں قلم ہاتھ میں لیے لیے سوچتا رہا۔ میرے جی میں آیا کہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کے نیچے اپنا نام لکھ دوں مگر کون سا نام؟ بابر لکھوں، ظہیر خاں لکھوں، لالہ لکھوں، فقیر لکھوں، سکندر لکھوں، شہزادہ لکھوں، کیا لکھوں اور جاؤں گا کہاں؟ زرین کے پاس کہ وہ میرے بارے میں تقریباً سب کچھ جانتی ہے اور میرے لیے دعائیں کر رہی ہوگی۔ میری زرین! پتہ نہیں وہ اکیلی رہ گئی ہے یا فضل ابھی تک اُس کے پاس موجود ہے۔ میں زرین کے پاس جا کے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو جاؤں گا مگر وہ جب سامنے آتی ہے تو کورا کی یاد آتی ہے اور دل ہولنے لگتا ہے۔ تو جب تک بن رہی ہے راج کرشنا کے پاس ہی کیوں نہ گزار دوں۔ فیصلے کے پیروں میں گھنگرو دیکھ لیے، اُس کے حسن کے بارے میں تماش بینوں کے تبصرے سن لیے تو اب راج کرشنا کی آنکھیں دیکھنے اور باتیں سننے سے کیا اثر پڑتا ہے۔

شام کو گھر واپس آکے راج کرشنا اس کی معذرت کرنے لگا کہ مجھے دن بھر تنہا گھر میں رہنا پڑا اور وہ مجھے خیریت کا فون بھی نہ کر سکا۔ وہ کچھ مطمئن مطمئن، خوش خوش لگ رہا تھا۔ میں نے اُس کے خیال سے اپنے چہرے پر جبری خوش حالی طاری کی۔ اُس نے مجھے نیا لباس تبدیل کرنے کی ہدایت کی۔ وہ میرے لیے نئے سوٹ لے کے آیا تھا جس کے ناپ پہلے دن درزی نے لیے تھے۔ میری ٹائی کی گرہ اُس نے خود اپنے ہاتھ سے درست کی۔ جدید وضع کے اس لباس میں میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ "ایک شام فرسٹ کلاس۔"

وہ مجھے سر تا پا گھورتے ہوئے بے ساختہ بولا "لے جنٹلمین پیر ناز مسین"۔ راستے بھر وہ گفتگو میں بار بار انگریزی بولنے لگتا تھا۔ پھر اُسے میرا خیال آ جاتا تو فوراً زبان بدل دیتا۔

ہماری گاڑی جس دروازے سے اندر داخل ہوئی اُس کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ خاصی دور جا کے شاہی محلات کی طرز کی ایک شان دار عمارت بنی ہوئی تھی۔ مجھے راج کرشنا کے ساتھ قدم ملانے میں دشواری ہوئی۔ وہ ایک ایک قدم اپنے ترک کے انتظار اٹھا رہا تھا۔ میں نے بھی اُس کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ پگڑی والے ایک دربان نے جھک کے راج کرشنا کو سلام کیا۔ مجھے بھی کیا۔ میرے ہاتھ خود بخود مصافحے کے لیے اٹھ گئے پھر ٹھٹک کے رہ گئے۔ راج کرشنا بے نیازی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ میں بھی تیز قدموں سے اُس کے برابر ہو گیا۔ ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں دھیما دھیما سا شور تھا۔ عورتیں مردوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ راج کرشنا کی آمد پر ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ پھر کئی لوگ اُس کی طرف دوڑ پڑے اور بڑھ بڑھ کے مصافحہ کرنے لگے۔ کسی نے اُس کا بازو پکڑا اور کسی نے گلے لگایا۔ راج کرشنا مہذب انداز میں سب کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں بھی اس ہجوم میں اُس کے ساتھ تھا۔ "میرے پیارے بھائی ظہیر خاں۔" اُس نے لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرائی۔ لوگوں کی آنکھوں میں حیرت اُبل پڑی۔ "آپ کا بھائی؟" کسی نے تعجب سے پوچھا۔ راج کرشنا نے مسکرا کے کہا "ہاں میرا بھائی، میرا دوست، میرا بیٹا۔" لوگ مسکرا مسکرا کے خاموش ہو گئے۔ پھر اچانک کسی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھا، رستم جی تھے۔ وہی رستم جی جو پہلے دن ریستوران میں ملے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی تھی۔ "میں نورین ہوں۔" اُس نے شوخی سے کہا۔

"مجھے..... مجھے آپ کا نام معلوم ہے۔" میں نے ہڑبڑا کے جواب دیا۔

"ہائیں!" وہ جھلائی ہوئی نظروں سے بولی۔ "میں سمجھی کہ آپ میرا نام بھول گئے ہوں گے۔ آپ دونوں کو اُس دن کے بعد سے آج دیکھا ہے۔"

"فرصت ہی نہیں ملی۔" میں نے لفظ چبا چبا کے کہا۔

"پاپا بتا رہے تھے کہ کل آپ لوگوں نے بہت بڑے بڑے چور پکڑے ہیں، دلچسپ۔ مجھے تو پکچر لگی۔ پاپا نے مجھے اخبار بھی دیا تھا مگر مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔"

"میں نے نہیں کرشنا جی نے پکڑے ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"وہ باتیں ہیں۔" میں نے تلملا کے کہا۔

"چلیے دوستی۔" اُس کے چہرے سے دانت کھل کھلا اُٹھے۔

راج کرشنا لوگوں کے درمیان اس قدر گھر چکا تھا کہ میری طرف توجہ نہیں دے سکا۔ وہاں زیادہ تر انگریزی بولی جا رہی تھی۔ میں وہاں کے طور طریق سے بالکل نا آشنا تھا۔ جب نورین نے مجھے اپنی میز پر لے جانے کے لیے میرا ہاتھ تھاما تو میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اتنے بہت سے لوگوں کے

درمیان کسی اجنبی لڑکی کا ہاتھ تھام کے گھومنا پھرنا میرے لیے عجیب سی بات تھی مگر وہاں مردوں اور عورتوں میں ایسا کوئی تکلف نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ میں نے جھٹ اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے ساتھ جا کے ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ "کچھ کھیلیں گے؟" اُس نے مجھے تجسس نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تو پھر کن چیزوں سے دلچسپی ہے آپ کو؟"

میں اُس کے سوال کا جواب فوراً نہیں دے سکا۔ "کسی چیز سے نہیں۔"

"کسی نہ کسی چیز سے تو ہوگی؟"

"نہیں۔"

"یعنی دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کسی چیز سے نہیں۔"

"حیرت ہے۔" وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

"آپ کو کھانے کون کون سے پسند ہیں؟"

"جو مل جائیں ویسے مجھے میٹھے چاول بہت پسند ہیں۔"

"میٹھے چاول!" وہ ہنس پڑی۔ "اور لباس کون سا؟"

"کچھ بھی۔" میں نے اُکتا کے کہا۔ "آپ ایسے سوال کیوں کر رہی ہیں؟"

"پھر ہم کیا باتیں کریں؟" وہ چونک کے بولی۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اُس نے اپنے شانے اچکائے۔ "کیا میں اچھی باتیں نہیں کرتی؟"

"نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "آپ کی آواز بہت اچھی ہے اور آپ باتیں بھی اچھی کرتی ہیں مگر..... مگر میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا بات ہے؟" اُس نے اپنے ہاتھ سے میری کلائی چھوتے ہوئے کہا۔ "ٹمپریچر تو نارمل ہے۔" اور پھر اُس کے چہرے سے گھبراہٹ دور ہو گئی۔ "آپ کو اپنی زمینیں یاد آ رہی ہوں گی؟ سب کھلا کھلا، ہریالی ہی ہریالی۔ ایسا ہی ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"اور آپ کو کرشنا جی روک کے بیٹھے ہوں گے۔ اچھا جب مجھ سے ملیں گے تو میں کہوں گی آپ کو ابھی اور روکیں۔"

"کیوں؟ آپ کو کیا مزہ آئے گا؟"

"پھر آپ بہت دنوں بعد جب اپنے گھر جائیں گے تو آپ کو اپنی ہر ایک چیز نئی نئی معلوم ہوں گی اور آپ پہلے سے زیادہ سکون محسوس کریں گے۔"

"ہاں!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"آپ کچھ اُداس اُداس لگتے ہیں۔"

"نہیں تو۔" میں نے سیدھے ہو کے کہا۔

"باتیں بھی کم کرتے ہیں حالانکہ اُس دن کرشنا جی کہہ رہے تھے کہ آپ جب باتوں پر آتے ہیں تو سب کو خاموش کر دیتے ہیں۔ آپ کا موڈ بھی کب ایسا ہوتا ہے؟"

"موڈ کا پتہ کیسے چلتا ہے۔"

"اگر آپ کا جی گھبرایا کرے تو آپ ہماری طرف آ جایا کیجیے۔ پاپا کی کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں۔ اُن کے دو جہاز بھی ہیں۔ جب اِدھر ساحل پر ہوتے ہیں تو ہم چند روز وہیں رہتے ہیں۔ اب جہاز آنے ہی والا ہے۔ اس بار آپ بھی ساتھ چلیے گا۔ ہم ساحل سے بہت دور دور رہیں گے۔ میں نے ایسا پروگرام سوچا ہے کہ۔۔۔"

"بہت اچھا رہے گا۔" میں نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ راج کرشنا ہماری طرف آ گیا۔ اُس نے مجھے نورین کے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کے میرے متعلق کیا خیال کیا ہوگا یہ سوچ کے مجھے جھینپ آنے لگی۔

"شکریہ نورین کہ تم نے ان کا خیال رکھا۔" کرشنا نے کہا۔ اُس کی آواز موسیقی کے شور میں دب گئی۔ ہال کے ایک کونے میں بینڈ باجے والوں نے ساز بجانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں اور مرد ہال کی خالی جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کے ناچنا شروع کر دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ لوگ اس انداز سے رقص کرتے ہیں۔ "آئیے میرے ساتھ رقص کیجیے۔" نورین نے اشتیاق سے کہا۔

"تم آج کیوں رقص کر رہی ہو؟ رقص تو روز ہوتا ہے اور تم گم سم بیٹھی دیکھتی رہتی ہو۔ آج کیا بات ہے؟" کرشنا نے شگفتگی سے پوچھا۔

"آج۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "بس آج جی چاہ رہا ہے۔ آؤ۔"

اُس نے میری جانب ہاتھ پھیلایا۔ میں نے بے چارگی سے راج کرشنا کو دیکھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" کرشنا نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک ساز کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اِدھر سے اُدھر تھرکنے لگے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ یقیناً میرے بارے میں باتیں کر رہے ہوں گے۔ ساز نئی دھن بدلتے تو کبھی رقص میں تیزی آ جاتی، کبھی سُستی۔ مرد خود ہی چل دیتے اور عورتیں مرد بدل دیتیں لیکن وہ سب سنجیدہ تھے، بہت شائستہ۔ کسی نے کسی کے ساتھ کوئی اوچھی بات نہیں کی، نہ کوئی فقرہ کسا۔ مجھے بھائی شوکی جان اور شہر بانو وغیرہ کے رقص کے دوران میں جو باتیں ہوا کرتی تھیں وہ بھی یاد آنے لگیں۔ رقص کے بعد کھانے کی میزوں پر کھانا چُن دیا گیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ ایک خوش پوش ادھیڑ عمر شخص نے کھانے سے پہلے انگریزی میں اعلان کیا کہ کلب کے معزز اراکین کی خواہش کے مطابق آج کی رات کلب کے ریکارڈ میں مسٹر راج کرشنا کی رات کے طور پر درج کی جائے گی۔ کلب کے معزز اراکان کی درخواست ہے کہ مسٹر راج کرشنا سٹیج پر تشریف لائیں۔ اعلان کرنے والے نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ مسٹر راج کرشنا نے اس شہر کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں یہ کلب کی طرف سے

اُن کے اعتراف کا ایک حقیر اظہار ہے۔ اِس سلسلے میں کلب عنقریب راج کرشنا کے اعزاز میں ایک رسمی تقریب منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تقریب کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا۔ تمام بہترین خواہشات راج کرشنا صاحب کے لیے۔ بمبئی کے معززین انھیں خلوصِ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔" ایک بار پھر ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔

نورین میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ جوشیلے لہجے میں بولی "کلب میں یہ اعزاز بہت دنوں بعد کسی کو ملا ہے۔" راج کرشنا آنکھیں بند کیے سر جھکائے ہوئے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نورین نے اسے ٹوکا کہ اس کے لیے شہ کرسی خالی پڑی ہے اور سب لوگ منتظر ہیں۔ واقعی سب لوگ منتظر تھے۔ راج کرشنا سے دوبارہ بہ آوازِ بلند درخواست کی گئی۔ راج کرشنا جھجکتا ہوا اٹھا اور آہستہ قدموں سے شہ کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ کھڑے ہو کے تالیاں بجاؤں۔ میں کھڑا ہو گیا اور زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ میں اکیلا کھڑا تھا اور پشیمانی سے بیٹھنے ہی والا تھا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ راج کرشنا کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ تالیاں ختم ہوئیں تو وہ کسمساتا ہوا اپنی نشست سے اٹھا اور چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اس نے چاروں طرف سر گھمایا۔ پھر اُس کی نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں۔ اس نے انگریزی میں کہنا شروع کیا "خواتین و حضرات! اس اعزاز کا شکریہ، بہت بہت شکریہ۔" اُس کی آواز بہک رہی تھی "یہی باتیں، یہی احساسات کام کرنے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں مگر میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے کبھی ستائش کے خیال سے اپنا فرض ادا نہیں کیا ہے بلکہ میں نے اپنی زندگی کا جو مقصد بنایا تھا مجھے خوشی ہے کہ اُسی پر کاربند ہوں۔ ایک ہی مقصد، ایک ہی جذبہ میری رہبری کرتا رہا ہے۔ آج کے واقعات کے بارے میں آپ میری زبانی کچھ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے مگر یہ ایک مناسب موقع نہیں ہے۔ میں۔ میں ..." اس کا گلا رُندھنے لگا اور آواز لڑکھڑا گئی۔ "آج کے واقعات کے لیے آپ نے مجھے جس اعزاز سے نوازا ہے میں اصل میں اُس کا مستحق نہیں ہوں۔" یہ کہہ کے وہ رُک گیا۔ ہال میں بھن بھناہٹ ہوئی۔ سب ٹکٹکی باندھے راج کرشنا کو دیکھ رہے تھے۔ میرے جسم میں خون جم گیا تھا۔ "کل کے واقعے کے تمام اعزاز کا مستحق میرا عزیز ظہیر خاں ہے۔ وہ وجیہ اور دل کش نوجوان جو پہلی قطار میں منہ چھپائے بیٹھا ہے۔ یہ سب اُسی کا کرشمہ ہے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتاؤں گا اور نہ آپ براہِ مہربانی تفصیل پوچھنے کے لیے اصرار کریں۔ اس شہ کرسی پر بیٹھنے کا سزاوار ظہیر خاں ہی ہے۔ میں اُس کے لیے اپنی نشست خالی کرتا ہوں۔"

پہلے تو ہال میں جیسے سارے لوگ آوازوں سے محروم ہو گئے پھر دفعتاً ایک شور گونجا۔ نورین بے طرح مجھے جھنجھوڑنے لگی۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اپنا رویہ متعین کرنے میں میری عقل جواب دینے لگی کہ اس موقع پر کس تاثر کا اظہار کرنا چاہیے۔ اصولاً راج کرشنا کو یہ تاثر دینا چاہیے تھا کہ اُس نے میرے بارے میں جو کہا ہے، وہ میں نے انگریزی میں ناواقفیت کے سبب نہیں سنا ہے اور اگر میں اسی طرح بُت بنا بیٹھا رہتا تو ان پڑھے لکھے معزز لوگوں کے سامنے راج کرشنا کی توہین ہوتی کہ وہ جس عزیز کو اتنی عزت دے رہا ہے وہ ایک جاہل شخص ہے۔ میرا دل جھٹکے کھانے لگا اور جسم کی تمام طاقت خاک ہونے لگی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں مٹی کا پتلا ہوں اور ابھی ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ خوش قسمتی سے میری یہ گنگ کیفیت انکسار پر محمول کی گئی۔ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ پھر راج کرشنا ہی نے میرے اوسان بحال کیے۔ اُس نے اردو میں مجھے آواز دی "ظہیر خاں! ادھر آؤ اور یہ کرسی سنبھالو۔"

سب لوگوں کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میری ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش پر۔ نورین نے مجھے زبردستی اٹھا دیا اور میں اٹھنے کو تو اٹھ گیا مگر راج کرشنا تک پہنچنے کا گزوں کا فاصلہ میلوں برابر ہو گیا۔ ہر قدم پر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا لپک رہا۔ بجلی کی روشنی کی ہال سے نکلنے کے کئی دروازے تھے۔ ایک بار دل میں آیا کہ کسی ایک سے فوراً بھاگ نکلوں۔ راج کرشنا کا یہ مذاق بہت ستم ناک ہے۔ کرسی کے قریب راج کرشنا مجھے لینے آ گیا۔ اُس نے جب میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے کسی قدر توانائی محسوس ہوئی لیکن شہ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جب میں اُن سب کے سامنے کھڑا ہوا تو مجھے کسی کی شکل صاف نظر نہیں آئی۔ دھواں ہوئے بیٹھے تھے اور سارا ہال لرز رہا تھا۔ دیواریں مجھ پر گری پڑ رہی تھیں اور میں فرش میں دھنسا جا رہا تھا۔ میرے سارے حواس منتشر ہو گئے تھے۔ راج کرشنا نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور خود میرے برابر بیٹھ گیا۔

یقیناً لوگ اس بات کے منتظر ہوں گے کہ اب میں اپنی زبان سے کچھ کہوں گا مگر کسی کے منہ میں زبان ہوتی تو وہ کچھ کہتا۔ ابھی میری زبان پر تو فالج گر گیا تھا۔ راج کرشنا خود اُٹھ کھڑا ہوا "خواتین و حضرات مجھے اندازہ ہے کہ آپ ظہیر خاں کی زبانی کچھ سننے کے مشتاق ہوں گے۔ میری بھی یہی خواہش ہے مگر میں آپ سے درخواست کروں گا۔" اُس نے شستہ انگریزی میں کہا "کہ یہ ایک موزوں وقت نہیں ہے۔ یہ گفتگو ناگفتنی کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیے۔" اُس نے میرا بازو کھینچ کے مجھے جلدی سے اٹھا لیا۔ "میں اپنی اور ظہیر خاں کی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آئیے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" راج کرشنا نے سب کے سامنے سر جھکایا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی اور جب اُس نے آخری مرتبہ شکریہ ادا کیا تو میں نے اُس کے ساتھ آواز ملانے کی کوشش بھی کی، میری آواز تالیوں میں ڈوب گئی۔ میرے حواس کچھ کچھ درست ہونے لگے تھے اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے مجھے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میرے دل میں کچھ بولنے کی خواہش

ابھری لیکن ہمت نہیں پڑی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اپنی نشستوں سے اٹھ گئے تھے اور میرے اردگرد اژدحام ہو گیا تھا۔ راج کرشنا پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ آج کے واقعے کے بارے میں اُس سے کسی قسم کی تفصیل طلب نہ کی جائے چنانچہ لوگ پُراسرار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ نورین کے رخساروں پر سرخی دیکھ کے میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ سے کوئی ایسی نمایاں بدتہذیبی سرزد نہیں ہوئی ہے۔ میں شہ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے جو کچھ اپنے اندر، اپنے اوپر محسوس کر رہا تھا شکر ہے کہ اس کی خبر لوگوں کو نہیں ہوئی تھی۔ راج کرشنا نے بہت خوش اسلوبی سے بات ٹالی تھی اور وہی تھا جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ ایک برا وقت ٹل گیا۔

سب لوگ کھانے کی میزوں پر آ گئے۔ لوگوں کی ہمت افزا باتیں سن کے اور تحسین شناس نگاہیں دیکھ کے میری حالت کہیں معمول پر آئی۔ نورین اب بھی میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اُس بڑی میز کے اطراف بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد اس ماحول سے میری اجنبیت کسی حد تک ضرور دور ہو گئی۔ لوگ مشروبات پی رہے تھے اور پورے ہال میں سرخوشی ہو گئی تھی۔

سازندوں نے پھر ساز بجانے شروع کر دیے تھے۔ کئی عورتیں اور لڑکیاں ہولے ہولے ناچنے لگے تھے۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے فرش پر رینگ رہے ہوں یا کھڑے کھڑے سو گئے ہوں۔ راج کرشنا نے مجھ سے چپکے سے پوچھا "گھر چلتے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے تیزی سے کہا "چلیے، وقت بھی بہت ہو گیا ہے۔"

اپنے پاس بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں سے راج کرشنا نے معذرت کا اظہار کر کے جانے کی اجازت چاہی۔ نورین کہنے لگی کہ مجھے وہ یہیں چھوڑ جائے، رات کو کسی وقت وہ مجھے گھر پہنچا دے گی۔ راج کرشنا نے اس کی فرمائش مسترد کر دی۔ نورین کا چہرہ بجھ گیا اور وہ ہمیں دروازے تک رخصت کرنے کے لیے ہمارے ساتھ آئی۔ جن جن میزوں کے درمیان سے ہم گزرے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے مگر آخری میز سے پہلے والی میز سے گزرتے وقت مجھ سے آگے نہیں بڑھا گیا۔ وہ ۳۰، ۳۵ سال کی ایک صحت مند، خوب صورت اور خوش لباس عورت تھی جو اپنی کرسی سے اٹھ کے ہمیں وداع کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ پہلے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کے راج کرشنا کو پرنام کیا پھر مجھے۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنی جانب میری نگاہ کے ارتکاز سے اُس کی پلکیں مرتعش ہو گئیں۔ اُس نے جلدی سے اپنی ساری درست کی۔ اُس کا بدن سمٹنے لگا مگر میری نگاہ متزلزل نہیں ہوئی۔ راج کرشنا نے بھی میرا یہ انہماک دیکھ لیا تھا۔ اُس نے آگے بڑھنے کے بجائے لگاوٹ سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اِس طرح عورت راج کرشنا کی جانب متوجہ ہو گئی اور مجھے اُس کی طرف غور سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ پھر نورین نے مجھے آگے کی طرف کھینچا تو مجھے اپنی بے خیالی کا احساس ہوا اور میں ندامت سے آگے بڑھ گیا۔ میرے پیچھے ہی راج کرشنا نے بھی اُس عورت سے باتیں بند کر دیں اور ہمارے پاس آ گیا۔ دروازے پر ایک بار پھر میں نے گھوم کے اُسے دیکھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔ میں بھی پلٹ پڑا۔ نورین نے ہمیں رخصت کرتے وقت بہت سے وعدے لیے۔ نہ جانے میں نے کیا کیا کہا۔ وہ واپس اندر چلی گئی اور ہم دونوں تنہا رہ گئے تو میں نے سوچا میں راج کرشنا سے اُس عورت کے بارے میں پوچھوں جو آخری میز سے پہلے والی میز پر ملی تھی۔ راج کرشنا جیسے میرے دل میں گھسا بیٹھا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے مجھ سے پوچھا "کیا تم اُس عورت کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے بے قرار لہجے میں جواب دیا۔ "وہ کون ہیں؟"

"وہ ایک ستم رسیدہ عورت ہے، بہت مال دار۔ ابھی ایک سال ہوا اُس کا شوہر ایک حادثے میں مارا گیا مگر تم اُسے اس طرح کیوں گھور رہے تھے؟" اُس نے بے تابی سے پوچھا "کیا تمھیں وہ عورت اچھی لگی؟"

"نہیں۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ بات کچھ اور تھی۔" میں نے ایک بار پھر اپنے گلے میں پڑی ہوئی مالا ٹٹول کے دیکھی۔

"مجھے بتانا پسند کرو گے؟"

"میں ... میں۔" میری زبان پھسلنے لگی۔ "کیا آپ اُس عورت سے کوئی بات پوچھ سکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کے لیے کہیں یہ بری بات تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں۔" اُس نے مسکرا کے کہا۔ "پولیس والے ہر قسم کا سوال کر لیتے ہیں۔"

میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکا کہ اُسے بتاؤں یا خاموش رہوں۔ میں نے سوچا یہ ایک باریک بین آدمی ہے، بات سے بات نکالے گا لیکن تسلی کیے بغیر میرے اندر کھلبلی ہو رہی تھی اس لیے میں نے مدھم آواز میں کہا۔ "اُس عورت کے گلے میں جو ہار ہے، میں اُس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"ہار!" وہ حیرت سے بولا "مگر ... مگر وہ کیا ہار ہے؟"

"کیا آپ اُس سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ اُس نے کہاں سے خریدا ہے؟ بس آپ اتنی بات پوچھ لیجیے۔" میں نے اُس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ تو بہت معمولی بات ہے۔ میں اُس سے ابھی پوچھے لیتا ہوں لیکن اگر اُس نے کوئی اور سوال کیا؟"

"کیا آپ اُسے علیحدگی میں نہیں بلا سکتے؟"

"میں اُسے کہیں بھی بلا سکتا ہوں۔"

"تو بلا لیجیے۔"

"اچھا۔" وہ کچھ دیر ٹھیرا، پھر واپس عمارت کی طرف چل پڑا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ دروازے پر پہنچ کے وہ کچھ ٹھٹکا۔ اُس نے دربان کو

حکم دیا اور وہ مسز روپ پٹیل کو باہر بھیج کے ۔ ہم دروازے سے ہٹ کے کھڑے ہو گئے۔" دربان فوراً واپس آ گیا۔ اُس کے ساتھ روپ بھی تھی۔ اُس کا چہرہ فق تھا۔ راج کرشنا نے اُس سے اِس زحمت کے لیے معافی چاہی تو اُس کا رنگ واپس آ گیا۔ "مسز روپ! کیا آپ مجھ سے کچھ سلوک کریں گی؟" راج کرشنا نے نرم سا لہجے میں پوچھا۔

"ضرور۔ آپ کہیے، میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"میرا دوست ظہیر خاں یہ جاننا چاہتا ہے کہ آپ نے یہ ہار جو آپ کے گلے کی زینت بنا ہوا ہے کس طرح حاصل کیا ہے؟ کس طرح سے مراد یہ ہے" راج کرشنا نے وضاحت کی "کہ کب اور کہاں سے حاصل کیا تھا؟ مجھے آپ جواب دینے سے انکار کر سکتی ہیں۔ یہ ایک بے حد نجی بات ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ہم نے اسے کوئی تین سال ہوئے خریدا تھا۔ یہ چار موتی اور یہ ہیرا۔ مجھے ان کی قیمت کا تو پتہ نہیں ہے مگر یہ ایک بہت قیمتی ہار ہے اور پٹیل صاحب نے ہماری شادی کی تیسری سالگرہ پر مجھے پہنایا تھا۔ یہ ہار میں نے ہی پسند کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے اسے خرید بھی لیا ہے۔ سالگرہ آئی تو میں اسے دیکھ کے دنگ رہ گئی۔"

"بہت شکریہ۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے اسے کہاں پسند کیا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔ میں نے بیشتر جواہر نانا بھائی کے ہاں سے خریدے ہیں۔ یہ ہار انھی کے ہاں سے خریدا تھا۔ وہ اسے عام نمائش کے لیے نہیں رکھتے تھے۔"

"کیا انھوں نے اس ہار کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا تھا؟"

"کچھ ایسا یاد پڑتا ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "انھوں نے کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دُنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند اسے اُن کے ہاتھ بیچ گیا ہے۔ مگر ایسی باتیں تو تمام جوہری کرتے ہیں۔ مجھے بتائیے کہ کیا اس ہار سے کوئی انوکھی بات وابستہ ہے؟"

"ہو سکتی ہے۔" راج کرشنا نے کہا۔ "مگر نانا بھائی سے تصدیق کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ایسی کوئی انوکھی بات ہوئی تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

"آپ چاہیں تو یہ ہار لے جائیں۔ اس طرح آپ کا کام اور آسان ہو جائے گا۔ پھر میں آپ سے واپس لے لوں گی۔" روپ نے ہار اُتارتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسے آنکھوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔" راج کرشنا نے کہا۔

"کیا آپ ہار مجھے دکھائیں گی؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

مسز روپ نے ہار میرے سپرد کر دیا۔ میں نے غور سے وہ ہیرا اور موتی دیکھے اور ہار میری انگلیوں میں کانپنے لگا۔ بالکل وہی، ہو بہو وہی موتی تھے جو میری مالا میں پروئے گئے تھے اور یہ ہیرا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہی جسامت، وہی نیلا رنگ، وہی چمک دمک۔ اسے میں نے سب سے پہلے بدھو گیا میں انجینئر کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ جب میں جھونپڑی میں داخل ہوا تھا تو اُس نے اسے مجھ سے چھپا لیا تھا۔ پھر یہ ہیرا کوراکی اُس پوٹلی میں بھی موجود تھا جسے وہ انجینئر کی موت کے بعد چھوڑ گیا تھا۔ جانے کتنی مدت گزر چکی تھی جب ابا جان نے وہ پوٹلی کھول کے دیکھی تھی تو اس میں دوسرے ہیروں کے ساتھ یہ ہیرا بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ سب سے چھوٹا تھا۔ ان جواہر میں میری مالا کے چند موتی بھی تھے۔ ابا جان نے پوٹلی فوراً بند کر لی تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد کچھ دنوں تک تو مکان کی رقم سے اُن کا گزارا ہوا ہوگا پھر زمینوں کی رقم سے۔ پھر ابا جان کو یہ جواہر بیچنے کی ضرورت پڑ گئی ہوگی۔ انھوں نے یہ ہیرا سب سے آخر میں مجبوراً اٹھایا ہوگا۔ شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اگر چہ مسز روپ کے ہار میں یہ ہیرا اُس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا ہیرا ہوا اور موتی بھی میرے موتیوں سے اس حد تک محض مشابہ ہوں۔ ضروری نہیں کہ دُنیا میں صرف یہی ہیرا اور موتی ہوں۔ اس شکل و صورت کے اور بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ شہر کس شہر میں ابا جان کا قیام، مولوی اکرم کی زبانی سنے ہوئے اُن کے نئے اسی شہر میں ہیرے کی فروخت، نانا بھائی کا یہ کہنا کہ اسے ایک ضرورت مند بیچ گیا ہے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے میرے سینے میں جلن پیدا کر دی تھی۔ میں نے ہار واپس کر دیا۔ مجھ سے اس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا جا سکا۔

"کیا آپ کی اس ہار سے کوئی وابستگی ہے؟" مسز روپ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"کچھ نہیں۔" میں نے وحشت سے کہا۔ "آپ کا شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔ جب بھی آپ کو اس ہار کی ضرورت ہو بے تکلف مجھ سے مانگ لیجیے گا۔" اُس نے خندہ پیشانی سے کہا۔ "اور کرشن جی! آپ نے ظہیر خاں صاحب کی اتنی تعریفیں کی ہیں، کبھی انھیں ہمارے گھر لائیے۔"

"ضرور مسز روپ۔" راج کرشنا نے یہ کہتے ہوئے میری کمر تھپکی۔ "آؤ چلیں۔"

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راج کرشنا تمام راستے خاموش رہا۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ ایک عورت ڈرائنگ روم میں شام سے راج کرشنا کی منتظر ہے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اندر گئے۔

وہاں چمپا بائی بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

مگر وہاں سفید ساڑی میں ملبوس چمپا بائی ہی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کا بھی وہی حال ہوا جو میرا تھا۔ وہ بوکھلا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اُس نے میری طرف بڑھنا چاہا۔ میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا اور راج کرشنا کی اوٹ میں ہو کر چھری سے چاقو جیب سے نکال لیا لیکن مجھے پھل کھولنے کی مہلت نہیں ملی۔ چمپا جلد ہی سنبھل گئی۔ اُس نے سٹ پٹاتے ہوئے انداز میں راج کرشنا کو سلام کیا۔ "آپ کب آئیں؟" راج کرشنا نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد ٹھیٹ پاک لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"مجھے آئے ہوئے دیر ہو گئی۔" چمپا نے خفت سے جواب دیا۔

"بیٹھیے، بیٹھیے اور تو سب خیریت ہے؟"

"جی ہاں" اُس نے نظریں جھکا کے کہا۔ "میں دوبارہ بمبئی آئی تھی۔ آپ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سوچا آج اُسے نبھا دوں۔"

"بہت اچھا کیا۔" وہ بولا۔ "مگر آپ ٹھہری کہاں ہیں؟"

"ایک ہوٹل میں!" اُس نے مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل میں کیوں؟" راج کرشنا شکایتی لہجے میں بولا۔ "یہ گھر خالی پڑا ہے۔ آپ سیدھی اِدھر آ جاتیں۔ ظہیر بھی میرے ساتھ ہی ہے۔ کیوں ظہیر؟"

"جی جی ہاں۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"بس۔" وہ جھینپ کے بولی۔ "ناحق آپ کو زحمت ہوتی۔ آپ مل گئے اور دو باتیں رواداری کی کر لیں یہی بہت ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ظہیر بھی یہیں ملیں گے۔"

"تو پھر کیا آپ نہیں آتیں؟" راج کرشنا نے مسکرا کے پوچھا۔

"تو۔ تو میں شاید اور پہلے آ جاتی۔"

راج کرشنا ہنسنے لگا۔ "آپ نے کھانا ابھی نہیں کھایا ہوگا۔" وہ تردد سے بولا۔ "ہم لوگ تو کلب میں کھا کے آئے ہیں۔" اُس نے بھگو کو آواز دی۔

"نہیں نہیں۔ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں کھانا کھا کے آئی ہوں۔" وہ لجاجت سے بولی۔ "بس چائے پی لوں گی۔"

"غلط۔ آپ کھانا کھائیں گی۔ پھر چائے پئیں گی اور ہاں اس کے بعد آپ کھانا کھائیں گی۔ پھر آرام سے بیٹھ کے باتیں ہوں گی۔ مجھے آپ کے یہاں اب تک آنے کی خوشی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو رات کو یہاں قیام بھی کریں۔ مجھے اتنی اجازت دیجیے کہ میں لباس تبدیل کر لوں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چمپا کا جواب سنے بغیر دوڑ کے اندر چلا گیا۔ میں اور چمپا اکیلے رہ گئے۔ میں نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور تیز نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔ اگر یہاں تنہا ہو گئے تھے تو عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اُسے کس لہجے میں مخاطب کروں۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ جب وہ راج کرشنا سے بات کر رہی تھی تو اس کے ایک ایک لفظ پر میرا دل ہول جاتا تھا۔ نہ جانے اُس کی زبان سے اب کیا نکل جائے۔ یہ میرا گھر بھی نہیں تھا کہ میں اُسے دھکے دے کے نکال دیتا۔ "تم یہاں کیوں آئیں؟" اچانک اُس کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تو ٹھیک ہوں مگر تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میں نے چیخ کر کہنا چاہا لیکن میری آواز راج کرشنا کے خوف سے گھٹ کے رہ گئی۔ "بتاؤ تم واپس کب جاؤ گی؟"

"میں اب وہاں نہیں رہ سکتی۔"

"کیوں نہیں رہ سکتیں؟" میں نے جھنجلا کے پوچھا۔

"مجھ سے اب وہاں نہیں رہا جاتا۔ تمھاری بات مان کے میں وہاں چلی گئی تھی لیکن میں نے یہ دن کانٹوں پر کاٹے ہیں۔"

"لیکن آخر کیوں؟ تم آخر چاہتی کیا ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔" وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں جس حالت میں تمھیں چھوڑ کے گئی تھی۔ اُس نے مجھے چین لینے نہیں دیا اور وحشتوں میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی۔ ہر گلی کوچے میں تمھیں ڈھونڈتی رہی۔ دیکھو میرے پاؤں۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گئی تو کرشنا جی سے مدد لینے کے لیے یہاں آ گئی۔"

"مگر کیوں؟" میں نے نفرت آمیز انداز میں پوچھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟"

"کیسی معافی؟" میں نے تلملا کے کہا۔ "کیا وہ واپس آ جائے گی؟"

"وہ تو واپس نہیں آ سکتی۔ کاش میرے بس میں ہوتا لیکن جب تک تم مجھے دل سے معاف نہیں کرو گے مجھے سکون سے رات کو نیند نہیں آئے گی۔ خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔" وہ رونے لگی۔

"میں نے تمھیں معاف کیا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "یہ اُس کی قسمت تھی۔ اب تم اپنے گھر جاؤ اور دیکھو یہاں اپنی زبان مت کھولنا۔ کرشنا جی اگر تم سے میری قرابت کے بارے میں کرید کریں تو کچھ بھی بات بنا دینا مگر کوئی اور بات زبان پر مت لانا۔ سمجھ گئیں؟"

"سمجھ گئی۔ تم مجھے اتنا بُرا کیوں سمجھتے ہو۔ مجھے تمھاری عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تم اگر یہاں نہ ملتے تب بھی میں ان سے کچھ نہیں کہتی۔ بہرحال اچھا ہوا تم ان کے پاس چلے آئے۔ خدا تمھیں اپنی امان میں رکھے۔ مجھے کچھ سکون ہوا۔ مگر تم...... تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں کیا سوچوں گی؟" وہ سانس بھر کے بولی۔ "میری تو بس ایک ہی آرزو ہے کہ زندگی کے باقی دن تمھاری خدمت کرتے ہوئے گزار دوں۔ یہی سوچ کے بمبئی آئی تھی کہ تمھیں ڈھونڈ کے جہاں تم رہو گے وہاں میں بھی کسی کونے میں پڑی رہوں گی۔ تم مجھے اپنے گھر میں اتنی جگہ دے دو گے کہ میں اپنا سیاہ چہرہ چھپا سکوں اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکوں۔ تم مجھے ایک ملازمہ سمجھ کے قبول کر لو گے۔ میں اب اُن لوگوں میں واپس جانا نہیں چاہتی اور نہ تمھیں پریشان کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"

"تم یہ باتیں پہلے بھی کر چکی ہو اور میں ان کا جواب دے چکا ہوں۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے چمپا بائی۔ تمھیں میری حالت معلوم ہے۔ میں یہاں خود کرشنا جی کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ میری مانو تم کہیں اور کہیں اور چلی جاؤ۔ دُنیا بہت بڑی ہے۔ اگر تم نے اچھی زندگی گزارنے کا عہد کر لیا ہے تو تمھیں کوئی نہیں روکے گا۔"

"مگر مجھے ہر جگہ تمھارا خیال ستائے گا۔"

"میری بات چھوڑو۔" میری آواز بھرا گئی۔ "میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے جب تک بات چل رہی ہے چل رہی ہے۔ پتہ نہیں کل میں کہاں ہوں۔ بھول جاؤ مجھے۔"

"نہیں تم مر گئے۔" وہ وحشت سے بولی۔ "اور تمھارے سب بچھڑے ہوئے مل جائیں گے تم تو اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔"

"اتنی جلدی؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "تمھیں کیا معلوم؟"

"وہاں مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن اتنا تو میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری عمر کیا ہے۔ تمھارے تعلیں دماغ بھی دیا ہے، حوصلہ بھی تم ایک مرد ہو۔"

"بس چمپا بائی میرے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ راج کرشنا لباس تبدیل کر کے واپس آ گیا۔ میں نے چپ سادھ لی۔ چمپا بھی سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ وہ ہم دونوں کو مسکرا کے دیکھنے لگا لیکن ابھی ٹھیک طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے خیال آیا۔ بچھو نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ اس نے چمپا سے معذرت کی اور بچھو کو دیکھنے کے لیے خود ہی اٹھ کے اندر جانے لگا۔ ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی جیسے ہی وہ اوجھل ہوا میں نے چپکے سے کہا۔ "میں کل صبح تمھارے پاس آؤں گا۔ تم اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہو نا؟"

"ہاں!" اس نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

راج کرشنا بچھو پر ناراض ہوتا ہوا فوراً ہی واپس آ گیا اور کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کے یوں ہی کسمساتا رہا۔ وہ صرف ایک بار ریل میں سفر کے دوران چمپا سے ملا تھا لیکن ایک دن کی اس ملاقات کا نقش اتنا گہرا تھا کہ راج کرشنا اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت سمجھ بوجھ کا آدمی تھا اور سمجھ بوجھ کے آدمی کو بات کرتے ہوئے دیر لگتی ہے۔ چمپا نے مجھے تھاما لینے کا یقین دلا دیا تھا مگر میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ نجانے راج کرشنا کیا کمال کر بیٹھے اور چمپا سے بات بنائے نہ بنے۔ چمپا کی آمد کے بعد خود میری خاموشی اور سکوں آمیز اضطراب سے راج کرشنا کا ذہن کسی طرف بھی جا سکتا تھا۔ ایک بات سے پردہ اٹھا تو بہت سے پردے اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ راج کرشنا پولیس افسر تھا اور افسر بھی ایسا جس کے حواس عام آدمیوں سے کئی گنا تیز تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی آنکھیں بظاہر دلدار کی سمت دیکھ رہی ہیں مگر وہ ہم دونوں کو ٹٹول رہی ہوں گی۔ چند لمحے سکوت رہا پھر وہ جھجک کے بولا۔ "اور سنائیے کیسے مزاج ہیں آپ کی صحت تو ٹھیک ہے!"

"جی" چمپا سمٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ظہیر کو یہاں دیکھ کے آپ کو بڑا اچنبھا ہوا ہو گا۔ یہ مجھے ملے تو میں انھیں اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ ایک آپ کی کمی محسوس ہوتی تھی اب آپ بھی آ گئیں۔ بمبئی میں میرا گھر ہو اور آپ ہوٹل میں ٹھہریں۔ یہ ایک نامناسب بات ہے۔ دیکھیے بھی یہاں کئی کمرے خالی پڑے ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میری ماں یہاں ہوتی تو مجھے بہت برا بھلا کہتی کہ میں آپ جیسے محسنوں کو اسٹیشن ہی سے اپنے ساتھ کیوں نہیں لایا۔ بعد میں میں آپ دونوں کو کئی دنوں تک ڈھونڈتا رہا۔"

"شرمندہ مت کیجیے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" چمپا اٹک اٹک کے بولی۔ "ہاں ظہیر جیسے لڑکے اس وقت اپنے حواس کہاں کھو بیٹھے تھے اگر آپ اسے احسان سمجھتے ہیں تو وہ ظہیر خاں نے کیا ہے۔ میں تو ایک تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔"

"نہیں آپ بھی میری وجہ سے ایک نازک وقت سے دوچار ہو گئی تھیں۔ آپ نے میرے ساتھ بہت سلوک کیا۔ مجھے سب باتیں یاد ہیں۔ میں نے ظہیر خاں کو یہاں لا کے کہا تھا کہ یہ احسان کا معاوضہ نہیں ہے کہ معاوضہ ادا کیا جائے تو وہ احسان نہیں رہتا۔ آپ یہاں ٹھہریں گی مجھے خوشی ہو گی۔ ظہیر بھی اکیلا رہتا ہے۔ جب تک آپ کا جی چاہے آپ یہاں رہیے۔ کسی بات کا تکلف مت کیجیے۔"

"شکریہ" چمپا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دوں گی۔ ہوٹل میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کل صبح میں ڈرائیور سے کہہ دوں گا وہ آپ کا سامان لے آئے گا۔" راج کرشنا نے افسرانہ انداز میں فیصلہ سنا دیا۔ میں سنتا اور دیکھتا رہ گیا۔ چمپا بہت جزبز ہوئی۔ دونوں نے میری طرف دیکھا۔ میں درمیان میں دخل دینے والا کون تھا۔ یہ راج کرشنا کا گھر تھا۔ وہ اپنے گھر میں کسی کو بھی مہمان رکھے۔ میں نے نگاہیں چرا لیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ عورت کون ہے۔ تم ایک پولیس افسر ہو۔ پہلے ہی تمھارے گھر میں ایک مشتبہ آدمی موجود ہے۔ اب دوسرے کو دعوت دے رہے ہو۔ اپنے عہدے کا خیال کرو۔ کوئی بات کھل گئی تو لوگ کیا کہیں گے۔ ویسے ہی لوگ تمھارے دشمن ہیں۔ ہر جگہ کہتے پھریں گے کہ راج کرشنا جیسے مشہور پولیس افسر کے ہاں شہر کی نامی گرامی مشہور طوائف چمپا بائی ٹھہری ہوئی ہے اور ایک نوجوان جس نے قتل کے الزام میں سات سال جیل میں گزارے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ راج کرشنا کی باریک بین نگاہیں چمپا کے جسم کی باتوں اور انداز و اطوار کو بازو کیوں نہیں لے رہی ہیں۔ گو چمپا کے چہرے اور لہجے میں بہت سادگی تھی کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ ایک طوائف ہو گی مگر وہ تو راج کرشنا تھا۔ سڑک پر چلتا ہوا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اسے جاننا چاہیے تھا کہ ایک عورت کیوں تنہا ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ رات کو اس وقت یہاں موجود ہے۔ کوئی عورت کس وجہ سے بار بار اس شہر کا رخ کرتی ہے اور ہوٹل میں ٹھہرتی ہے۔ راج کرشنا کو یہ بھی محسوس کرنا چاہیے تھا کہ میں نے اس کے سامنے چمپا سے کوئی بات نہیں کی ہے اور نہ اس کی طرح میرے چہرے پر بشاشت چھا گئی ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو اس نے چمپا کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔ میں نے سرسری طور پر اس کا ذکر کیا تھا کہ بس وہ چلی گئی۔ راج کرشنا کو اگر میرا خیال تھا تو یہ باتیں محسوس کرنی چاہیے تھیں۔ شاید وہ صوفے کے درمیان ہمارے بارے میں اپنے لگائے ہوئے اندازوں پر پشیمان تھا اور اب ہمارے متعلق کوئی غلط بات سوچنے کے لیے اس کا ذہن آمادہ نہیں ہوا ہو گا۔ چمپا کی آمد پر میری خاموشی اور گھبراہٹ، اس نے میری کسر نفسی پر محمول کی ہو گی مگر میرے پاس خاموش رہنے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ مجھے اچانک یہاں دیکھ کے جھوٹ موٹ کی خوشی کا اظہار مجھ سے کبھی نہ ہو پاتا اور نہ میں ناراضی کا اظہار ہی کر سکتا تھا کہ چمپا کی برہمی کا اندیشہ بھی تھا۔

بچھو نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔ چمپا کی وجہ سے ہم دونوں بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ چمپا چند ہی لقمے منہ میں ڈال سکی۔ اس دوران میں راج کرشنا بمبئی میں قتل کرنے والے آدمی اور اس کے گروہ کے متعلق دلچسپ باتیں سناتا رہا۔ چمپا گردن جھکائے سنتی رہی۔ کھانے کے بعد راج کرشنا نے اسے آرام کا مشورہ دیا۔ وقت بھی کافی ہو چکا تھا۔ وہ واپس جانے کی درخواست کرتی رہی مگر راج کرشنا نے اس کی ایک نہ سنی۔ کمرہ کھلوا کے صاف کرایا اور جب تک چمپا اپنے کمرے میں داخل نہیں ہو گئی وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔

میں خاموشی سے اپنے بستر پر چلا آیا۔ اس وقت تو وہ باتوں میں ٹل گیا مگر کل صبح کل دوپہر کل شام، چمپا نہ جانے کب تک ٹھہری رہے۔ اسے بستر اور کون سا گوشہ میسر آئے گا۔ میں اپنے بستر پر لیٹا رہا۔ عجیب مشکل تھی۔ چمپا یہاں ہے اور راج کرشنا اپنی محسنہ کی خاطر داری کر رہا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں تک بات پہنچے۔ میں کہیں اور نکل جاؤں گا۔ جب تک چمپا رہے گی مجھے قسمی کی یاد آتی رہے گی اور میں خود یہاں کب تک رہوں گا۔ کب تک بستر لپیٹے گھر میں پڑا ہوا دیکھے جاؤں۔ دل کو قرار نہیں تھا۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ نانا بھائی جوہری کی دکان بند ہو گئی ہو گی۔ اس کے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ میں کلب سے سیدھا اس کی طرف جاتا اور اس سے التجا کرتا۔ "تجھے تیری اولاد اپنے خدا کی قسم مجھے صحیح صحیح بتا دے کہ یہ پتھر تو نے کہاں سے حاصل کیا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔" یہ وہی پتھر تھا جو کل آنے ساتھ جانے گھر لائی تھی اور جسے میں نے خود اٹھتے دیکھا تھا۔ وہ موتی تھے جو میری مالا میں پروئے ہوئے تھے۔ انھیں موتیوں سے ایک مالا بنا کے مجھے دی گئی تھی۔ بات یہ ہے مجھے خیال بھی آیا کہ راج کرشنا سے اسی وقت نانا بھائی کے ہاں چلنے کی استدعا کروں۔ مجھے شاید وہ آسانی سے اس شخص کا نام بتا دیتا جس سے اس نے یہ پتھر خریدا تھا۔ قیمتی چیزوں کی خرید و فروخت میں تو بڑی رازداری برتی جاتی ہے۔ ملاقات کا بھی یہی مشکل تھی کہ چمپا بائی آ گئی۔

میں صبح جلد ہی اٹھ کے باہر آ گیا مگر چمپا بائی اور راج کرشنا مجھ سے پہلے بیدار ہو چکے تھے۔ ناشتے کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ... تو اخبار بمبئی میں دوبارہ اور چمپا گھر میں ادھر ادھر گھومتی رہی۔ لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آیا تو راج کرشنا بھی باہر جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔" میں نے اسے مناسب سمجھی۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ جیسے اسے شبہ ہو گیا ہو کہ اب میں ... میں نے نہ انکار کیا، نہ اقرار۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور چمپا کیاری سے پھول توڑ رہی تھی۔ اس نے گلاب کا پھول مجھے اور راج کرشنا کو پیش کیا۔ راج کرشنا نے اسے کوٹ میں لگا کے چمپا کا شکریہ ادا کیا۔ "آج دوپہر تو آپ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلائیں گی۔ یہاں گوشت وغیرہ سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔ آپ جو بھی تیار کریں گی بڑے شوق سے کھاؤں گا۔ میں نے ڈرائیور کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ ہوٹل سے آپ کا سامان لے آئے۔"

چمپا نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر راج کرشنا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم ایک مصروف بازار سے گزر رہے تھے۔ راج کرشنا ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ سامنے نانا بھائی جوہری کی شاندار دکان تھی۔ میرا سر چکرا گیا۔ نہ معلوم نانا بھائی آج ان کے بارے میں کیا بتائے؟ شاید اسے ان کا پتہ بھی معلوم ہو۔ اگر یہ سب باتیں راج کرشنا کے سامنے ہوئیں تو میں اس سے کیا کہوں گا۔ گاڑی سے اتر کے میرے لیے اپنے پیروں پر چلنا دوبھر ہو رہا تھا مگر راج کرشنا مجھے گھسیٹتا ہوا دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دکان کے ایک باادب ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرے میں دو اطراف صوفے لگے ہوئے تھے اور ایک تن درست گول مٹول زرد رنگت کا شخص اونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں ہو گی۔ میرے جسم میں خون تھم گیا تھا۔ نانا بھائی نے تپاک سے ہمارا استقبال کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا کہ وہ ہماری کیا خدمت انجام دے سکتا ہے۔

"آپ کو ایک تکلیف دینی ہے۔" راج کرشنا نے جھجک کے کہا۔

"حضور حکم؟" وہ آنکھیں جھپکا کے بولا۔

"آپ کا وقت تو ضائع ہو گا لیکن کچھ ایسا ہی ضروری کام ہے۔" راج کرشنا نے آدھی انگریزی اور آدھی شکستہ اردو میں شائستگی سے کہا۔ "آپ مسٹر پٹیل سے تو خوب واقف ہوں گے۔ وہی پٹیل صاحب جن کا ایک حادثے میں گزشتہ سال انتقال ہو گیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "وہ بہت مہربان آدمی تھے۔ میرے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ بہت خوش ذوق لیکن آپ..... آپ..."

راج کرشنا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ "ان کی بیوہ مسز روپ پٹیل کے پاس ایک نادر ہار ہے۔ وہ ہار آنجہانی پٹیل صاحب نے آپ کے ہاں سے خریدا تھا۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ ضرور یاد ہو گا کیونکہ اس میں ایک منفرد قسم کا ہیرا اور چار بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے۔ ہیرا بہت چھوٹا اور نیلے رنگ کا تھا۔" نانا بھائی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "مسز روپ پٹیل نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ نے وہ ہار سپرد کرتے وقت ان سے اس کے ہیرے کی بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے چند نادر ہیروں میں ہوتا ہے اور ایک ضرورت مند نے آپ کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ کیسے آپ کو کچھ یاد آیا؟" نانا بھائی نے متجسس انداز میں گردن ہلائی۔ راج کرشنا نے تیزی سے کہا۔ "وہ ایسا ہیرا نہیں تھا جسے آپ کی جوہر شناس نگاہ بھول سکے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے وہ ہیرا کس سے خریدا

احساس ہوا کہ آپ کو میری کوئی بات گراں تو گزری ہو؟"
"یہ احساس مجھے بھی ہوا۔ ویسے بھی میں اطلاع کے بغیر پہنچ گیا تھا۔ ایسے موقعوں پر بات کس طرح کی جاتی ہے یہ بھی مجھے نہیں معلوم تھا۔"
"آپ نے بہت عجیب باتیں کیں۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "میں تمام وقت یہی سوچتی رہی کہ آپ کی باتوں میں کوئی ایسی بات کیوں ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ میں نے شاید آپ کو بتایا ہو کہ کرشنا جی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ سے آپ کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں اور میں اس ہدایت پر پوری طرح کاربند ہوں مگر کیا آپ خود کچھ نہیں بتائیں گے؟"
"کیا بتاؤں؟" میں نے اضطراری آواز میں کہا۔
"اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ بھی۔"
"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔"
"تو پھر مجھے ویسے ہی کسی اور وقت سہی یہ بتائیے کہ آپ نے کام کتنا کیا؟ کل کی غیر حاضری کا مجھے افسوس ہے بہرحال ہم کل کی کسر آج پوری کر لیں گے۔"
"آج پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"
"اچھا!" اس نے تعجب سے کہا۔ "مگر کیوں؟"
"بس آپ باتیں کیجیے۔"
اس کی پتلیاں بار دیں چمکیں۔ "کیا باتیں کریں؟" وہ کچھ بکھرے بکھرے لہجے میں بولی مگر فوراً اس کی آواز پُرسکون ہوگئی۔ "آئیے میں آپ کو بڑے لوگوں کے اقوال سناؤں۔ یہ اقوال زندگی میں بہت کام آتے ہیں۔"
"خاک کام آتے ہیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ آپ ہی بتائیے کیا آپ کے ڈیڈی کسی قول سے ٹھیک ہو جائیں گے؟"
"ہاں۔" وہ آہ بھر کے بولی۔
وہ اچھی خاصی آئی تھی مگر میری باتوں سے اُداس ہوگئی اور میٹھا ناکھانا بھول گئی۔ کہیں کھو سی گئی۔ ساڑی کا پلّو اس کے کندھے سے ڈھلک گیا لیکن اسے خیال ہی نہیں رہا۔ مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ "مس! آپ نے کرشنا جی کے ریکارڈ سنے ہیں؟ آئیے میں آپ کو سنواؤں۔"
وہ جھجکی مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اٹھا لیا۔ "آئیے مس!"
"سنیے۔ آپ مجھے مس نہ کہا کیجیے۔" اس نے کرب سے کہا۔
"کیوں مس؟" میری زبان سے نکل گیا۔ "پھر کیا کہوں؟"
"جولین کہا کیجیے۔ گھر میں سب مجھے جولین کہتے ہیں۔"
میں نے کچھ نہیں کہا۔ راج کرشنا نے میرے کمرے میں گراموفون اور ریکارڈ رکھ دیے تھے مگر میں نے گراموفون کبھی نہیں بجایا تھا۔ جب وہ آتا تھا تو خود کوئی نہ کوئی ریکارڈ لگا دیتا تھا۔ اسے صرف دھنوں کا شوق تھا۔ ہلکی مدھم دھنیں جیسے چشمہ بہتا ہو۔ میں نے گراموفون پر اس کا پسندیدہ ریکارڈ رکھ دیا۔ کمرے میں موسیقی گھل گئی۔ پھر جولین خود ریکارڈ منتخب کرکے سننے لگی۔ اس طرح اس کی طبیعت کچھ بہل گئی۔ جب وہ جانے لگی تو تیرگی چھا گئی تھی اور دھوپ [illegible] مگر شام ہو رہی تھی۔ راج کرشنا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی موٹر ہوتی تو میں ڈرائیور سے کہہ کے جولین کو اس کے گھر پہنچوا دیتا۔ گیٹ سے باہر میں نے دبے لہجے میں کہا۔ "میں چلوں آپ کے ساتھ؟"
"نہیں میں چلی جاؤں گی۔ روز ہی جاتی ہوں۔"
"میں چلتا ہوں۔" میں نے ضد کی۔
"واپسی میں رات ہو جائے گی۔"
"تو کیا ہوا، میں آجاؤں گا۔"
وہ منع کرتی رہی مگر میں اس کے ساتھ ساتھ بس اسٹینڈ تک پہنچ گیا۔ ہم دونوں ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ بس نے ہمیں اس کے گھر سے کچھ دور اتار دیا۔ آگے جانے سے پہلے میں نے اسے ایک جگہ روک لیا۔ سامنے پھل والے کی دکان تھی۔ میری جیب میں راج کرشنا روز کچھ پیسے ڈال دیتا تھا۔ میں نے بہت سے پھل خریدے۔ "یہ کیا ہے؟"
"یہ آپ کے ڈیڈی کے لیے ہیں میری طرف سے۔"
"اوہ نہیں یہ بہت زیادتی ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔
"کیوں؟ کیا میں انھیں کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا؟"
وہ کسمسا کے چپ ہوگئی۔ میں اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو مجھے اس کے باپ کی طبیعت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ مس جولین نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں چند منٹ بیٹھ کے واپس آگیا۔
جولین کے باپ کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا مگر وہ روز مجھے پڑھانے آتی رہی اور میں روز اس کے ساتھ اس کے گھر جاتا رہا اور ایک دن ایک ڈاکٹر کو بھی لے گیا۔ ڈاکٹر نے کوئی خاص امید ظاہر نہیں کی۔ چند دوائیں لکھ کے دے دیں۔ میں نے نسخہ جولین کو نہیں دیا بلکہ خود دوائیں خرید لایا مگر بڈھے نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اس کی حالت روز بروز گرتی گئی۔ میں چونکہ جولین کے ساتھ روز شام کو وہاں جانے لگا تھا اس لیے گلی کے بعض آدمی ہماری جانب نگاہیں اٹھانے لگے تھے۔ ہمارے گزرتے وقت ان کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ میں نے ان کی پروا نہیں کی۔ نکڑ کے ہوٹل پہ لڑکے ہمیشہ آگے کی طرف بیٹھے رہتے تھے۔ انھوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دی تھیں۔ پھر کھانس کھنکار ہونے لگی۔ ایک دوسرے سے اشارے ہونے لگے۔ جولین بھی یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور سہم سہم جاتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے مجھ سے کہہ ہی دیا کہ "یہ بہت برے لوگ ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ ادھر نہ آیا کریں۔ ان کی یہی عادت ہے۔"
"ہونے دیجیے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔
"مگر مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

"ان کی طرف توجہ ہی مت دیا کیجیے۔"
"مگر آپ کو پتہ نہیں ہے ان سے پورا محلہ نالاں ہے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے ہمیں احتیاط رکھنی چاہیے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرتی ہوں یہ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ بسا اوقات ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔"
"ایسے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان کا بس ایک ہی علاج ہے کہ ان کی طرف دیکھا ہی نہ جائے۔ نظر چرانا بھی توجہ دینا ہے یا پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی جائیں۔"
"یہ ہمیشہ چاقو رکھتے ہیں اور محلے میں آئے دن جھگڑے ہوتے ہیں۔"
جولین روز صبح ایک اسکول میں پڑھانے جاتی تھی اور سہ پہر کو مجھے پڑھانے آتی تھی پھر شام کو تھکی ہاری گھر پہنچتی تھی۔ میں نے راج کرشنا کی نظر بچا کے اس کی دعوت پڑھانے کے لیے انگریزی کی پہلی کتاب صرف پندرہ دنوں میں ختم کرلی۔ راج کرشنا نے خوش ہو کے مجھے کانی کا ایک سیٹ پیش کیا۔ یہ گیارھویں یا بارھویں روز کی بات تھی۔ مجھے اس کے ساتھ جاتے ہوئے گیارہ بارہ ہی دن گزرے ہوں گے۔ گیارھویں بارھویں دن حسبِ معمول شام کو میں اس کے ہمراہ جانے کے لیے بس اسٹینڈ پہ گیا تو اس نے مجھے گلی میں نہیں گھسنے دیا۔ بہت دیر ہوگئی تو اس نے خوف زدہ لہجے میں بتایا کہ صبح اسکول جاتے ہوئے لڑکوں نے مجھ پر جملے کسے تھے کہ شام کو آپ میرے ساتھ اس علاقے میں آئیں گے تو نتیجہ برا ہوگا۔ انھوں نے اور بھی بہت گندی گندی باتیں کی تھیں۔ اگلا دن تو وہ مجھے چھوڑ کے جلدی سے چلی گئی مگر میں نے اس کی بات نہیں مانی۔ میں بھی بس میں سوار ہوگیا۔ وہ راستے بھر واپس جانے کے لیے میری منت کرتی رہی اور سہمی رہی۔ میں نے اسے ہمت دلائی کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر آج میں ڈر گیا تو پھر کبھی اس کے گھر نہیں آسکوں گا۔
بس سے اترنے کے بعد میں نے پھل خریدے۔ پھلوں کا ایک تھیلا اس نے سنبھال لیا ایک میں نے۔ پھر ہم گلی میں داخل ہوگئے۔
نکڑ کے ہوٹل پر لڑکے شاید ہمارے انتظار میں تھے۔ ایک دم سیٹیاں بجنے لگیں۔ "آوے ہوئے!" ایک لڑکے نے آواز بلند کی۔ "چھوکری چھوکرے کے ساتھ آرہی ہے۔"
"سالا صبح اپن نے کیا بولا تھا کہ اب ادھر دکھائی نہیں آنے کا۔" ایک مشٹنڈا لونڈا تیزی سے باہر نکلا۔ "ماسٹر! سالا ادھر اپن کی بستی کیا سب لوگ مر گیا ہے؟ سب نامرد ہو گیا ہے؟" ایک اور لڑکا بولا۔
جولین نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "چلو چلو ان کی بات مت سنو۔" مگر میں نے جھٹکا دے کے اس سے اپنا بازو چھڑا لیا اور وہیں تھم کے رک گیا۔ میں نے پھلوں کا تھیلا جولین کے سپرد کیا اور ان لڑکوں کو دیکھنے لگا۔
"ماسٹر! دیکھتا ہے؟" ایک لڑکے نے ہنس کے کہا۔ "سالا آنکھیں دکھاتا ہے ابھی بہت جوش گیا ابھی اسٹارٹ ایکشن اور فنشنگ۔"
ماسٹر ہوٹل سے نکل کے گلی میں آگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے باقی لڑکے بھی کسل مندی سے آہستہ آہستہ آگئے۔ منتظر نگاہوں سے سب باپ کو دیکھنے لگے۔ جولین نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہوئی "یہاں سے چلو۔" اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔
"ابھی یہ ایسے نہیں جائیں گا۔ اپن نے تم کو پہلا وارننگ دیا تھا کہ ہم ادھر اس کو گھسنے نہیں دیں گا۔ تم ادھر دیکھا نہیں، ماسٹر! سالا تمہارے لیے ادھر چھوکرا لوگ کم ہے؟ اپن کے بول میں کیا ڈنک ہے؟ ایک دم پرفیکٹ ہے کہ نا؟ اپن ایک بال اور تم اس کو بولو ابھی فنش ہو جائے۔" وہ براہِ راست جولین سے مخاطب ہوا۔ جولین اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرا بازو کھینچنے لگی۔
"تم چپ رہنے کا! لے گا؟" میں نے تحمل سے کہا۔
"تم سالا کیا دیکھے گا؟ باپ کیا بوم مارتا ہے۔"
"ماسٹر چھوکری کے نخرے [illegible] کرتا ہے۔ سالا کو باقی کرو۔"
"ماسٹر! ابھی سچ بتا دیا، ادھر کا لونڈا کبھی سالا ادل رکھتا ہے اپن کا گنتی کا گنگ ہی لے جائیں گا۔"
"کوئی تم نے یو لائن پار کون ہے؟"
"پلا!" میں نے جواب دیا۔ "ابے سالا تم کون ہے؟ تم ابھی جاؤ بچے اور جب تک تمھارے زبان میں کانٹی چلے گی تم یہاں میں رہنے کی [illegible] نہیں ہوگی۔ میں یاد رکھوں گا۔ تم پہچان لو تم سالا اس جولین کو کچھ کہا یا ادھر گلی سے گزرتے ہوئے ہمارے کان میں تمھاری کوئی آواز پڑی تو تم سب یہاں نظر نہیں آؤ گے سمجھا؟ جیسے کبھی طرح زبان میں [illegible] جاؤ۔" میں نے اپنی آواز پرسکون ہی رکھی۔
ان سب نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اچانک ان کے منہ سے ایسی ہنسی چھوٹ پڑی جیسے ٹائر پھٹ جاتے ہیں۔ "ماسٹر! چھوکرا تھوڑا بہت چالو دکھتا ہے۔ اپن کی کوئی ٹیم ہے [illegible] گلے میں پٹا ڈالتا ہے۔ [illegible] سرکاری ہے۔"
"اوے سالا اپن سالا جبرا ایسے بگلا پڑا ہے۔" ماسٹر تیزی سے بولا۔ "اے چھوکرا! ادھر تم نیا نیا ہے۔ ابے تم جانتا نہیں کیا ہوتا ہے۔ رات ہو رہا ہے کھسک جاؤ ورنہ۔" وہ دو لڑکوں کو [illegible] ہاتھ جھٹک کے گریبان کا گوشہ [illegible] باہر ہیں جائیں گا۔"
جولین نے مجھے دھکا دے کے بھاگ جانے کی تلقین کی مگر میں نے گلی میں جولین کے مکان کی جانب قدم بڑھائے تھے کہ توقع کے مطابق ماسٹر نے میرے گریبان پر جھپٹنا اور اگلے ہی لمحے ان میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور [illegible] رستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ "ابے باز! اور دھرتی کی [illegible] جاسکتا ہے۔ کون! ادھر صبح کا اپن ایسے تمہارے لیے بیٹھا ہے

کر لیا ہوں اور شہروں میں بھی بہت سے بگڑے ہوئے معاملے ہیں آپ یہاں جا کے کام کیجیے جہاں کام کی قدر ہو جہاں آستین میں سانپ نہ پلتے ہوں، جہاں اپنے ہی لوگ جڑ کاٹنے کی فکر میں لگے ہوں، وہاں سے رخصت ہو جانا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

"اپنے ہی لوگ!" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں وہی جو آپ کے ساتھی ہیں۔"

"اوہ۔" وہ جیسے میری ساری بات سمجھ گیا۔ ہنس کے بولا۔ "ظہیر ہر جگہ ایسا ہوتا ہے کوئی ادارہ اس برائی سے بچا ہوا نہیں ہے۔ انھی لوگوں سے کام کرنا پڑتا ہے تم نے ضرور کہیں میری برائی سن لی ہے۔"

"برائی ہوتی تو ٹھیک تھا مگر آپ سمجھ نہیں رہے ہیں کہ لوگ آپ کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ آپ سے نفرت کرتے ہیں۔" میں نے جھلا کے کہا۔

"بے شک۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے اس کا احساس ہے لیکن مجھے انھی لوگوں سے کام لینا ہے انھیں نظر انداز کر کے کام کرتے رہنا چاہیے۔"

"بہر حال میں نے بات آپ کے گوش گزار کر دی ہے۔"

"اوہ نہیں۔" اس نے اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا۔ "میں اور [illegible] ہو لوں گا کچھ ایسے ضروری کام نمٹانے ہیں کہ میری موجودگی لازم ہے تم آخر اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو آخر تم نے کیا دیکھ لیا؟"

"ابھی ابھی جو لوگ آئے تھے آپ سے ملنے۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"وہ آپ کے سامنے تو بہت مؤدب رہے تھے لیکن وہ آپ سے مخلص نہیں ہیں۔ کوشش کیا وہ بہت بڑے لوگ ہیں ان میں ایک، جسونت تو بہت کمینہ ہے۔"

"کیا انھوں نے تم سے کچھ کہا؟" وہ برہمی سے بولا۔

"کاش وہ مجھ سے کچھ کہہ دیتے۔"

"پھر ۔۔۔؟"

"وہ آپ ہی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔" میں نے اسے وہ تمام باتیں بتائیں جو جسونت اور اس کے ساتھ کے دفتر کے افسر کے درمیان ہوئی تھیں۔

راج کرشنا کا چہرہ بجھ گیا۔ "مگر ۔۔۔ مگر کیا وہ یہیں یہ سب کہہ رہے تھے؟" وہ شکستہ سی آواز میں بولا۔

"ہاں!"

"تمہارے سامنے؟"

"ہاں میرے سامنے۔" میں نے تندی سے کہا۔ میں نے کچھ کہنے کو ٹوک دیا لیکن اتنی سی بات سے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

"مگر ۔۔۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔

ایک لمحے کے لیے میرا سارا وجود سرد پڑ گیا۔ اسے کیا بتاؤں کہ کمرے میں وہ بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اتنے بے وقوف تھے کہ جانتے گھر اور ہم لوگوں کی موجودگی میں اتنی شدت سے ہماری برائیاں کر رہے تھے وہ گویا پاگل ہو گئے تھے۔ ہر چند میں نے اسے چمپا والی بات بتانے سے گریز کیا تھا جسونت کو معلوم تھا کہ چمپا ایک طوائف ہے جسے راج کرشنا نے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ راج کرشنا کی بے احتیاطی کا یہی انجام ہونا تھا۔ میں پہلے ہی ڈر رہا تھا کہ بلا واسطہ اس کا ایسا ہی چرچا ہو کے ہوٹل میں چمپا کا سامان لیتے ہوئے جانا مناسب نہیں ہے۔ مگر میں نے جسونت سے سنی ہوئی باقی تمام باتیں اسے بتا دی تھیں اور اس کا یہ سوال کرنا بالکل جائز تھا کہ جسونت کو میری موجودگی میں اس بیہودہ سرائی کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ میری زبان ٹھہر گئی کہ میں اسے کیا بتاؤں۔ کوئی معمولی بات ہوتی تو میں کچھ بھی بہانہ کر دیتا لیکن اس کا تعلق راج کرشنا کی زندگی سے تھا۔ اسے یقین آنا چاہیے تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے کانوں کا بھیانک خواب نہیں ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں اور مجھے جسونت سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے دل کڑا کیا۔ "وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔"

"انگریزی میں؟" وہ سٹ پٹا کے بولا۔

"میں نے آپ سے چھپایا تھا۔ میں انگریزی جانتا ہوں۔"

"کیا ۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ اچھل کے بولا۔

"میں اسی لیے آپ سے کہتا تھا کہ آپ کس جوتشی پر پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ بس وہ باتیں کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

اس نے مجھے دبوچ لیا۔ "ظہیر ظہیر کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں۔" میں نے گردن جھکا کے کہا۔

"اوہ! تم نے وہ متضاد خبریں سنائی ہیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "میں بتا نہیں سکتا۔" وہ بہکتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم نے مجھے کتنا چونکایا ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں میں نے آپ سے بہت چھپایا۔"

"مجھے حیرت تھی کہ تم کتابوں کے بغیر اتنی عجیب باتیں کیسے کر لیتے ہو۔ تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"میں ایم اے کیا ہے۔"

"اور یقیناً فرسٹ کلاس لی ہوگی؟" میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ "اوہ میری جان۔" اس نے کھڑے ہو کے مجھے گلے لگا لیا۔ "تم نے مجھ پر احسان کیا مجھے بتا دیا۔"

"اب آپ کچھ اور مت پوچھیے۔"

"بالکل نہیں بالکل نہیں میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے یقین ہے ایک دن تم سب کچھ مجھے بتا دو گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر آپ تبادلہ کرا لیجیے میں نے اچھی باتیں نہیں سنی ہیں۔"

"میں اپنا کام جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش کروں گا۔ بے فکر رہو۔

ابھی میں کچھ اور زندہ رہوں گا! ابھی مجھے تمھارے ساتھ بہت سی سیر کرنی ہے۔"

میں اس کی اور بہت سی باتوں سے بچنے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ وہ مجھے روکتا رہ گیا۔ میں نے غلطی کی تھی اس کا احساس مجھے فوراً ہی ہو گیا۔ میں نے ظہیر خان کے نام سے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ ڈگری بھی ابھی جیل میں پڑی تھی۔ راج کرشنا کے لیے ہندوستان کی گنتی کی چند یونیورسٹیوں سے یہ پتہ چلا لینا کون سا مشکل تھا کہ ظہیر خان نامی طالب علم نے کب ایم اے کیا ہے اور جب اسے پتہ چلتا کہ میں نے جیل سے امتحان دیا تھا اور میں قتل کے الزام میں سات سال کی سزا کاٹ رہا تھا اور جمیل نامی شخص [illegible] تھا مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ راج کرشنا کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے گناہ کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اپنی مالا گلے سے اتار کے چہرے پر ڈال لی تب کہیں مجھے کچھ سکون ہوا۔

صبح میں اس سے آنکھیں ملانے سے گریز کرتا رہا۔ ناشتے کی میز پر وہ بہت خوش تھا جیسے میرے امتحان کا نتیجہ آج ہی نکلا ہے۔ وہ انگریزی میں مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ آج سے اپنی رپورٹ تیار کرنے میں زیادہ وقت صرف کرے گا۔ "میں ایک لمبی چھٹی کی درخواست دوں گا اور ہم گھومتے رہیں گے۔" چمپا بھی حیران تھی کہ آج وہ مجھ سے دوسری زبان میں کیوں مخاطب ہے۔ میں کوئی جواب دیے بغیر ناشتے کی میز سے جلد ہی اٹھ گیا۔ اس کی ہنسی نے [illegible] تب کیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے چمپا سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ باورچی خانے میں موجود تھی۔ میں نے سوچا وہ باہر آ جائے تو اس سے کہوں کہ وہ کہیں اور چلی جائے کیونکہ اس کی موجودگی راج کرشنا کی رسوائی کا سبب بن رہی ہے۔ وہ باہر آ کے کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ اس نے پہلے غلاف بدلے چادریں تبدیل کیں، ڈرائنگ روم کی میز پر تازہ پھول سجائے۔ راج کرشنا کے کمرے میں جا کر اس کا بستر درست کیا۔ میں سوچتا ہی رہا اور بنگلے سے باہر چلا آیا۔ شہر کی سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ آج [illegible] کی نظر نہیں آیا۔ جب میں گھر آیا تو خلافِ معمول چمپا موجود تھی۔ میری [illegible] میں اس کا رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میرے ساتھ چلو۔ میں نے کہا۔ "چلو مجھے کیا کام ہے۔" واپس آ کے بھی وہ دیر تک رہی اور کہیں رات کو واپس گئی۔

رات بہت ہو گئی راج کرشنا گھر نہیں آیا۔ ہم لوگوں نے اس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ رات کو کوئی ایک بجے کے قریب موٹر کے رکنے کی آواز آئی۔ میں بھاگا ہوا گیا مگر وہ راج کرشنا کی موٹر نہیں تھی۔ ایک پولیس افسر موٹر سے اترا۔ میں اسے جانتا تھا وہ ایس پی شکلا تھا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" اس نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آؤ۔ کرشنا جی کے پاس۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"ڈاکٹر چیمبرن اسپتال میں ہیں۔ زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" وہ مجھے موٹر میں دھکیلتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے؟ آپ مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے!" میں نے چیخ کر کہا۔

"کرشنا جی زخمی ہو گئے ہیں۔"

"زخمی! کہاں کیسے؟" میری آواز دہل گئی۔

"ان پر حملہ کیا گیا ہے۔" شکلا نے مختصر جواب دیا۔

میرا سینہ بند ہونے لگا۔ اسپتال میں پولیس افسران کا ہجوم تھا۔ مجھے فوراً ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سامنے راج کرشنا لیٹا تھا۔ اس کے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے چکر آنے لگا۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور راج کرشنا کی آنکھیں کھولنے کے انتظار میں بیٹھنے لگا مگر اس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں بے جان قدموں سے اس کے پاس گیا اور راج کرشنا کے جسم سے لپٹ گیا۔ میری آہ و بکا سے اس کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اس نے کراہ کے میرا ہاتھ لیا۔ اپنی لرزتی ہوئی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور انگریزی میں ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وقت کم ہے لاڈلے۔ تم ٹھیک کہتے تھے۔ مجھے افسوس ہے میں تمھارے کام نہ آ سکا۔ میں نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے۔ میں نے تمھارے بابا صمد زماں خاں کو تلاش کرنے کے لیے ہر جگہ سرکلر بھجوا دیا ہے۔ میں خود تمھیں ان کے پاس بھی لے چلتا مگر ۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ہمت رکھنا لاڈلے!" اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

وہ مجھے لاڈلے کے نام سے پکارتا تھا لیکن مجھے جرأت نہیں ہوئی۔ راج کرشنا کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ سانس کا ہر اسٹروک [illegible] تھا میں اس کے سینے سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "مجھے بتائیے وہ کون تھے؟ کون لوگ تھے وہ؟" لیکن اس نے مجھ سے بات نہیں کی۔ اس پر غفلت طاری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے باہر مجھے اس کے پاس سے ہٹا دیا۔ میں پکارتا رہا مگر انھوں نے میری ایک نہیں سنی۔ کمرے سے باہر پولیس افسران نے مجھے گھیر لیا۔ وہ مجھ سے راج کرشنا کا حال دریافت کر رہے تھے مگر مجھ میں انھیں بتانے کی طاقت نہیں تھی۔ آخر میری حالت دیکھ کے وہ خود خاموش ہو گئے۔ ایس پی شکلا میری کمر تھپکنے لگا۔ اس نے مجھے دبا کر ایک گوشے میں صوفے پر بٹھا دیا اور تسلی دینے لگا۔ میں نے راج کرشنا کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میری نظریں اس کے کمرے کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر تیزی سے اندر جا رہے تھے اور باہر آ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر اطمینان کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اسپتال کی راہداری پولیس افسروں کی گفتگو سے گونج رہی تھی۔ سب کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں۔ وہ مجھے گھور گھور کے مزید خوف زدہ کر رہے تھے۔

"ہمت نہیں ہارنی چاہیے ظہیر خاں!" ایس پی شکلا نے گھمبیر لہجے میں پھر مجھے صبر کی تلقین کی۔

"یہ سب کیسے ہوا شکلا جی؟" میری سسکیاں نکل گئیں۔
"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ بچ کے کہاں جائیں گے۔"
"مجھے بتایئے؟ وہ کون کمینے تھے؟ مجھ سے مت چھپایئے۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "شکلا جی! مجھے بتایئے یہ سب کیسے ہوا؟" میں نے اُس کا شانہ جھنجوڑ ڈالا۔

"اطمینان رکھو ظہیر خاں! سب کچھ سامنے آجائے گا۔ اس وقت تو تمہیں دعا کرنی چاہیے کہ کرشنا جی ٹھیک ہو جائیں۔" وہ تسلیمی انداز میں آہستگی سے بولا۔

مجھے احساس ہوا کہ راہ داری میں میری آواز دُور دُور تک پہنچ رہی ہوگی۔ سب لوگ میری طرف متوجہ تھے۔ شکلا ٹھیک کہتا تھا۔ مجھے کرشنا جی کے لیے دعا کرنی چاہیے تھی۔ وہ وقت دعا ہی کا تھا مگر میری دعاؤں میں اثر کہاں تھا۔ میں نے بہت سی دعائیں کر کے دیکھ لی تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ تاہم میں نے اپنے دل میں دعا کی "اے خدا! کرشنا جی کو بچا لے چاہے اُن کے بدلے میری جان لے لے۔ ویسے بھی میں نالائق ہوں۔" شکلا میرے پاس خاموش کھڑا رہا۔ کچھ پولیس افسر اسپتال سے چلے گئے۔ کچھ اور آگئے۔ پھر شہر کے معززین آنے لگے۔ راج کرشنا کے کمرے سے کوئی خبر نہیں آئی۔ میں رات بھر ڈاکٹروں سے پوچھتا رہا مگر انھوں نے مایوسی سے سر ہلانے کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

صبح ہونے والی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ بکھو کے ہمراہ پشپا بوکھلائی ہوئی راہ داری میں آتی دکھائی دی۔ جیسے ہی اُس کی نظر مجھ پر پڑی وہ میری طرف لپکی۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور بکھو کی آنکھیں بھی سُرخ تھیں۔ وہ دونوں میرے پاس آ کے چپ چاپ کھڑے ہو گئے اور میرا چہرہ دیکھنے لگے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں مگر مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ پشپا نے مجھے گلے لگا لیا اور خود بھی سسکنے لگی۔ پوری رات گزر گئی تھی۔ راہ داری میں لوگ بے چینی سے ٹہلتے رہے تھے۔ نرسیں دوڑتی بھاگتی رہی تھیں۔ راہ داری کے آس پاس سنگین بردار سپاہیوں کا پہرا تھا۔ صبح ہوتے ہی راج کرشنا کا پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم اسٹریچر پر اُس کے کمرے سے باہر نکالا گیا اور فوراً آپریشن تھیٹر میں منتقل کر دیا گیا۔ آدھا گھنٹا گزرا۔ ایک گھنٹا گزرا۔ پھر کچھ اور وقت گزر گیا لیکن آپریشن ختم نہیں ہوا۔ کوئی دو گھنٹے لگے۔ راج کرشنا کو دوبارہ اُس کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر اب بھی کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ کسی کو اُس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بہت منتیں کیں مگر ڈاکٹروں نے مجھے اُسے دوبارہ دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ اُسے نلکیوں سے آکسیجن دی جا رہی ہے۔ پشپا ساڑی کے پلّو سے سر ڈھانپ کے ایک کونے میں سمٹی ہوئی دعائیں کر رہی تھی۔ ایس پی شکلا نے مجھے گھر جانے، ناشتہ کرنے اور لباس تبدیل کر کے اسپتال واپس آنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اُس کی بات نہیں مانی۔ ایک ایک پل بتانا دوبھر ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر کیا کانا پھوسیاں کر رہے ہیں۔ نہ کسی سے کچھ بولتے ہیں، نہ کسی کی سنتے ہیں۔ بس اِدھر اُدھر چلتے پھر رہے ہیں۔ راج کرشنا کے کمرے سے کوئی باہر نکلتا تو میرا دل ڈوبنے لگتا۔

راج کرشنا! میری نحوست اُسے بھی لگ گئی۔ مجھے اُس کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ مانو وہی ہوا جس کے خوف سے کلیجا کٹنے لگتا تھا۔

صبح کوئی گیارہ بجے اسپتال کا بڑا انگریز ڈاکٹر راج کرشنا کے کمرے سے برآمد ہوا تو اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ میں اُس کی طرف دوڑ پڑا۔ اُس نے میرا ہاتھ دبا کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے ایک طرف جھٹک کے راج کرشنا کے کمرے میں گھس گیا۔ اُس کے منہ پر چادر پڑی ہوئی تھی اور اُس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ میں ٹھٹک کے رُک گیا۔ اُس کے سرہانے کھڑی ہوئی نرس نے چادر اُٹھا کے مجھے اُس کا چہرہ دکھایا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اپنی جگہ منجمد کھڑا رہ گیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے تھام کے باہر پہنچایا۔ دروازے کے پاس پشپا موجود تھی۔ وہ میرا بازو اپنے کندھے پر رکھ کے اور میری کمر پکڑ کے مجھے ہجوم سے دور لے گئی۔

راج کرشنا کی ارتھی اُٹھنے سے پہلے اُس کی ماں کا انتظار ہو رہا تھا۔ بنگلے پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ میرا جی کر رہا تھا کہ میں کسی کمرے میں بند ہو جاؤں کیونکہ جو شخص بھی آتا تھا مجھے رُلا جاتا تھا۔ دوپہر کو جولین بھی آ گئی تھی۔ اُس کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پشپا نے اُسے سنبھالا اور وہ دونوں تعزیت کرنے والوں کی پذیرائی میں مصروف ہو گئیں۔ میں کرشنا جی کی پائنتی پکڑ کے بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے دن سویرے سویرے راج کرشنا کی دھان پان بوڑھی ماں گھر میں داخل ہوئی تو اُسے اپنے بیٹے کی لاش کے پاس پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر وہ یوں ہی گُم صُم کھڑی رہی، نہ روئی، نہ چلائی۔ پھر اُس کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی آہ نکلی۔ وہ دھڑام سے راج کرشنا کے مُردہ جسم پر گر گئی اور دیر ہو گئی مگر وہ نہیں اُٹھی۔ لوگوں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی تو انھیں پتہ چلا کہ وہ کب کی اپنے بیٹے کے پاس پہنچ چکی ہے۔

میں نہیں مرا۔ اُس کی ماں مجھ سے زیادہ اُس سے محبت کرتی تھی۔ میں بے غیرت تو فہمیدہ کی موت پر بھی زندہ رہا تھا۔ میں نے تو اُن کی موت کی خبر ہضم کر لی تھی۔ میں گرو کے بغیر اب تک زندہ تھا۔ دونوں ارتھیاں ایک ساتھ اُٹھیں۔ بمبئی میں کرشنا جی کا کوئی عزیز نہیں تھا مگر گھر میں کہرام مچ گیا۔ ایس پی شکلا اور دوسرے پولیس افسر لوگوں سے لگے ہوئے کھڑے تھے۔ جولین میرے سینے سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی۔ رستم جی بھی اُن کے ساتھ آ گئے تھے۔ مسز روپ بھی موجود تھیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

تو اب رو بھی نہیں پا رہا تھا اور وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ زرین بار بار میرا بازو پکڑ لیتی تھی۔ جولین آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی اور منہ پھیر لیتی۔ سڑک پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ شمشان گھاٹ میں بھی بہت بڑا ہجوم تھا۔ اُن میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عام لوگ، سڑک پر چلتے پھرتے لوگ، غریب غربا، وہ جنھیں راج کرشنا نے بدمعاشوں کے مظالم سے بچایا تھا۔ دونوں ارتھیاں پورے اعزاز کے ساتھ شعلوں کے سپرد کر دی گئیں اور آگ لگا دی گئی۔ کرشنا جی اور اُن کی ماں جلنے لگے اور دیکھتے دیکھتے دھواں بن گئے۔ سہ پہر کے قریب ہم واپس ہوئے تو گھر پہ ویرانی مسلط تھی۔ جولین اور پشپا سرخ آنکھوں کے ساتھ واپس آنے والوں کی منتظر تھیں۔ میں نے کمرے میں بند ہو کے اندر سے کنڈی لگا لی۔ میرا سارا جسم دُکھ رہا تھا۔ جولین اور پشپا دروازہ کھٹکھٹاتی رہیں مگر میں نے نہیں کھولا اور نہ مجھ میں دروازے تک جانے کی ہمت تھی۔ میری آنکھوں میں کمرہ گردش کر رہا تھا۔

راج کرشنا کا قاتل گرفتار نہیں ہوا، نہ اُس کے گرفتار ہونے کی کوئی اُمید تھی۔ وہ بمبئی پولیس کے ایک بہت بڑے افسر کلکتی کے گھر سے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کر کے واپس آ رہا تھا کہ باندرے کے قریب ایک سنسان مقام پر اُس کی گاڑی روک لی گئی۔ اُس رات ڈرائیور بھی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ انھوں نے مشین گنوں سے اُس کا جسم چھلنی کر دیا اور ہجوم جمع ہونے سے پہلے بھاگ گئے۔ راج کرشنا سڑک پر تڑپتا رہا۔ جب راہ گیر اُدھر سے گزرے تو انھوں نے گشتی پولیس والوں کو ڈھونڈ کے اس حادثے کی اطلاع دی۔ ایک دن پہلے ہی میں نے اُسے پولیس افسر جسونت کی باتیں بتا کے متنبہ کیا تھا اور اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے کام جلد نمٹانے کی کوشش کرے گا۔ کام نمٹ گیا۔ جسونت کے بقول شمشو گروپ نے اُسے زندہ مدراس واپس نہیں جانے دیا۔ اخبارات راج کرشنا کی موت کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ بڑے لوگوں کے تعزیتی بیانات چھپ رہے تھے۔ بمبئی پولیس کو مکمل اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ کسی بھی مشکوک شخص کو پکڑ سکتی ہے۔ دادی فلا کے لوگوں کا ایک گروہ تھانے کے آگے دھرنا دے کے بیٹھ گیا تھا کہ جب تک قاتل نہیں پکڑے جائیں گے، وہ وہاں سے نہیں ہٹیں گے۔ پولیس نے چند آدمی گرفتار بھی کیے تھے مگر ظاہر ہے اُن میں سے کوئی بھی قاتل نہیں ہوگا۔

جولین اپنے گھر واپس نہیں گئی۔ اُسے بھی چپ لگ گئی تھی۔ ذرا ذرا سی دیر میں آنکھیں بھگو لیتی تھی۔ تین دن تک گھر میں صرف رات کو ہم تنہا ہوتے، ورنہ دن بھر لوگ آتے رہتے اور خوامخواہ کی باتیں کر کے ہمیں تنگ کرتے رہتے۔ زرین بھی روز گھنٹوں میرے پاس خاموش بیٹھ کے چلی جاتی تھی۔ ایس پی شکلا اور دوسرے افسر زیادہ تر گھر ہی میں رہتے۔ جب بھی کوئی آتا تھا، راج کرشنا کی تعریف کرتا تھا مگر مرے ہوئے آدمی کی تعریف کرنے سے کیا حاصل۔ اس دن لوگ مرنے والے کے وارثوں کو دُکھ ملنے کا کام کرتے ہیں اور انھیں اُن کے مرنے والوں کے نقصان کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ وہ شاید بھولنے یا صبر کرنے ہی نہیں دیتے۔ مجھے چتا والے گھر کے دروازے سے ہٹ کر آیا تو ہوا تھا۔ وہاں مجھے جسونت بھی نظر آیا اور وہ شخص بھی جو اُس کے ساتھ راج کرشنا سے ملنے گھر آیا تھا۔ وہ دونوں سر جھکائے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کے میرے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

قاتلوں کو معلوم تھا کہ اُس رات راج کرشنا کہاں گیا ہے اور کس وقت کس کے گھر سے واپس ہوگا اور کس راستے سے گزرے گا۔ انھیں سب باتیں معلوم تھیں مگر کون پوچھ سکتا تھا کہ انھیں یہ سب کیسے معلوم ہو گیا۔ شمشو گروپ کے نام سے مجھے دہشت ہونے لگی تھی۔ میں نے کئی بار گھر سے نکلنے کا خیال کیا مگر میں کس کا گریبان پکڑتا اور کہاں جاتا۔ بہت سے لوگ مجھ سے دوستی کا اظہار کر چکے تھے۔ مستانہ اڈے کی بات اور تھی۔ اُس وقت مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ تین دن گزرنے کے بعد گھر میں لوگوں کی آمد و رفت بڑی حد تک کم ہو گئی۔ جولین روز تازہ اخبار ڈال دیتی تھی۔ راج کرشنا کی خبروں کا زور اب کم ہو گیا تھا۔ اخبارات نے مجرموں کی گرفتاری میں پولیس کی ناکامی پر مایوسی ظاہر کی تھی اور لکھا تھا کہ راج کرشنا کی موت کسی بڑی سازش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس سانحے پر توجہ نہ دی گئی تو پھر کسی پولیس افسر کی زندگی محفوظ نہیں رہے گی اور یہاں غنڈوں اور بدمعاشوں کا راج ہوگا۔ اخبارات سے معلوم ہوتا تھا کہ راج کرشنا کی موت کا چرچا اپنے شہر میں ہو رہا ہے اور پولیس اپنی ناکامی پر پشیمان ہے۔ کلکتی کا بیان بھی چھپا تھا کہ پولیس اپنے تمام وسائل بروئے کار لا رہی ہے لیکن پانچ دن گزر گئے تھے اور قاتلوں کی کوئی سُن گُن نہیں مل سکی۔ دادی فلا کے تھانے پر بیٹھا ہوا گروہ بھی پولیس افسروں کے وعدوں پر منتشر ہو گیا تھا۔

پانچویں دن ایس پی شکلا نے تین چار پولیس افسروں کے ہمراہ آ کے مجھے حکومت کے احکام سنائے۔ مجھے تین مہینے تک اس مکان میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ بہ وقت ضرورت یہ مدت بڑھائی بھی جا سکتی تھی۔ حکومت نے راج کرشنا کی خدمات کے اعتراف میں پچاس ہزار روپے کی رقم کا اعلان کیا تھا۔ مجھے پیشکش کی گئی تھی کہ میں چاہوں تو مجھے پولیس کی ملازمت میں لیا جا سکتا ہے۔ گورنر کی طرف سے دس ہزار روپے کی ایک خصوصی رقم بھی راج کرشنا کے پس ماندگان کے لیے مختص کی گئی تھی۔ راج کرشنا کے پس ماندگان میں اب میں رہ گیا تھا۔ ایس پی شکلا نے ایک دستاویز میرے سپرد کی تھی۔ اس کی رو سے میں مدراس میں راج کرشنا کی تمام جائداد اور نقدی کا تنہا وارث قرار پایا تھا۔ میں یہ سن کر دنگ رہ

باوراج کرشنا نے اسپتال میں میرے پہنچنے سے پہلے مجسٹریٹ کو بلا کے وصیت کر دی تھی جو اس نے مجھ سے کہا تھا۔ کرشنا جی نے اپنا بیان لکھوا دیا ہے مگر میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ اس نے حادثے کے متعلق کوئی بیان لکھوایا ہو گا۔ میں تو تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس آخری وقت میں مجھے اس قدر یاد رکھے گا جب کہ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ شنکلا یہ وصیت سنا رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ایک جائداد کا وارث مجھے زین نے بنایا تھا۔ ایک جائداد کا وارث مجھے راج کرشنا نے بنا دیا تھا۔ وہ شاید خود کی موت کا معاوضہ تھا۔ راج کرشنا کی موت کا۔ میں نے تمام دستاویزات شنکلا کو واپس کر دیں۔ "شنکلا جی! معاف کیجیے۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "مجھے کسی جائداد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ روپے پیسے میرے لیے بے کار ہیں۔ آپ حکومت کی ملکیت بنا دیں اور کرشنا جی کی یادگار کا کوئی اور مناسب انتظام کیجیے۔"

"کرشنا جی کی آتما تمھارے فیصلے سے ناخوش ہو گی۔" شنکلا گلوگیر آواز میں بولا۔ "اور میں تمھیں مشورہ نہیں دوں گا کہ تم حکومت کی طرف سے دی ہوئی رقمیں واپس کرو۔ تم اس کا جو چاہے استعمال کرو مگر انھیں واپس مت کرو۔ یہ رقمیں نہیں کرشنا جی کو ان کی شان دار خدمات کے عوض دی گئی ہیں۔ بہت کم ہیں۔ سنا ہے حکومت کرشنا جی جیسے دیانت دار اور فرض شناس پولیس افسر کی یادگار قائم کرنے کے لیے اور ان کی زندگی پولیس افسروں کے لیے ایک مثال بنانے کے لیے بھی بہت کچھ سوچ رہی ہے۔ تم نے اخبار میں پڑھا ہو گا کہ گورنر نے انھیں کتنا زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔"

"مگر لوگوں نے انھیں مار دیا۔ اب خراج تحسین پیش کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان انعامات کا اعلان سن کے کیا وہ واپس آ جائیں گے۔ یہ رقم واپس کر دیجیے۔ میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔"

"تم ہی اس کے مستحق ہو کیوں کہ کرشنا جی نے اپنا وارث مقرر کیا ہے۔ سب کو موت آنی ہے ظہیر خاں! اب مر جانے والے آدمی کے پاس دوسرے آدمی کو یاد کرنے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جو قاتل ہیں کیا وہ زندہ رہیں گے۔ وہ بھی مر جائیں گے مگر ان کے مرنے پر کوئی انھیں یاد نہیں کرے گا۔ کرشنا جی مجھ سے تمھاری بہت سی باتیں کرتے تھے۔ وہ تمھاری بڑی عزت کرتے تھے۔ آخری دن وہ بہت دیر تک تمھارے بارے میں باتیں کرتے رہے۔"

"وہ کیا کہہ رہے تھے؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔

"وہ تم سے بہت متاثر تھے۔ کہتے تھے کہ میری یہ زندگی ظہیر خاں کے سبب سے ہے۔ اس نے دو بار مجھے بچایا ہے۔ وہ ایک ذہانت والا اور ذہین نوجوان ہے۔"

"لیکن وہ چلے گئے اور میں دیکھتا رہ گیا۔"

"اب تمھارا فرض ہے کہ تم ان کی کمائی ہوئی رقم صحیح طریقے سے استعمال کرو۔ اگر تم نے اس کے ساتھ غریبوں کا سلوک کیا تو یہ اچھی بات نہیں ہو گی۔ دیکھو ظہیر! تم نے غور نہیں کیا۔ جسے کوئی اپنا سمجھتا ہے اُسی کے لیے ایسا کر سکتا ہے۔ وہ کسی کا اتنا خیال رکھتا ہے۔ کیا تم ان کی خواہش کی بجا آوری سے انکار کرو گے؟" شنکلا نے نرمی سے کہا۔

"شنکلا جی! یوں تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر یہ اچھا نہیں لگتا۔ کرشنا جی کی خواہش ہوتی تو وہ مجھ سے جان بھی طلب کرتے تو میں انکار نہ کرتا مگر یہ سب کچھ......" میں نے دوبارہ ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"شنکلا جی! کرشنا جی کی روح کا اگر آپ کو اتنا ہی خیال ہے تو ان کے قاتلوں کو بھی پکڑنے کی کوشش کیجیے۔ مجھے صرف ایک بار بتا دیجیے وہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو کرشنا جی کی قسم۔"

"پوری کوشش کی جا رہی ہے۔" شنکلا افسردگی سے بولا۔ "انھوں نے بہت منظم منصوبہ بنایا تھا۔ بہرحال ہم ان سب تک پہنچ ہی جائیں گے اور یقین کرو کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔"

"رعایت کرنے کا معاملہ تو بعد میں آتا ہے۔ پہلے آپ وہاں تک پہنچ تو جائیں۔ آپ کبھی ان کا سراغ نہیں لگا سکتے اس لیے کہ آپ......"

شنکلا نے میری بات کاٹ دی اور اپنے ساتھی پولیس افسروں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تمھارے احساسات کا اندازہ کر سکتا ہوں ظہیر خاں! اطمینان رکھو کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو کے رہے گا۔" وہ ترش لہجے سے بولا۔ غالباً اسے اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں میرے منہ سے کوئی نامناسب بات نکل جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ اس نے کاغذات دوبارہ سمیٹ لیے اور جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

میں نے سوچا چلتے چلتے ایس پی شنکلا کے کانوں میں ایک بات ڈال دوں۔ اس سے کہہ دوں کہ تم بھی کسی دن کرشنا جی کی طرح کسی سڑک پر تڑپتے ہوئے نظر آؤ گے کیونکہ تم میں بھی وہی خامیاں ہیں جو کرشنا جی میں تھیں۔ کرشنا جی کی موت کے بعد کسی پولیس افسر نے ہمارا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا شنکلا نے کیا۔ اس نے اپنا بیشتر وقت ہمارے ساتھ گھر ہی پر گزارا۔ وہ موجود ہوتا تو وہی آنے جانے والوں سے ڈھنگ کی بات کرتا۔ میرا کسی سے ملنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب بھی کرشنا جی کا نام احترام سے لیتا تھا جیسے کرشنا جی اس کے قریب بیٹھے ہوں۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ مجھے، جولین اور چمپا کو مار مار کے کچھ نہ کچھ کھلائے۔ جب بھی آتا تھا صبر و ضبط کی تلقین کرتا رہتا تھا۔

راج کرشنا کی وصیت کی خبر اخبارات کو بھی ہو گئی۔ کئی نوجوان اور نامہ نگار مجھ سے ملنے اور مجھ سے بات کرنے کے لیے گھر آتے رہے۔ میں ان سے نہیں ملا۔ یقیناً شہر والوں میں اس خبر پر حیرت کا اظہار کیا جا رہا ہو گا کہ آخر راج کرشنا نے ظہیر خاں نامی ایک اجنبی نوجوان کو اپنی کل جائداد کا وارث کیوں بنایا۔ میں نے کاغذات میز کی دراز میں ڈال دیے تھے۔ مجھ سے ان کی [illegible] بھی نہیں دیکھی گئیں۔ کچھ دن تک ہر روز شہر کے مختلف علاقوں اور تھانوں میں راج کرشنا کی موت پر تعزیتی جلسے ہوتے رہے۔ ان میں مجھے بھی

بلایا جاتا تھا۔ میں کسی جلسے میں شریک نہیں ہوا۔ ایک دن نورین نے مجھے فون کر کے اطلاع دی کہ کلب کی جانب سے کرشنا جی کی موت پر ایک ماتمی شام منائی جا رہی ہے جس میں میری شرکت ضروری ہے۔ میں وہاں بھی نہیں گیا۔ آخر لوگ خود ہی تھک گئے۔ دس دن بعد لوگوں کی آمد و رفت میں بے حد کمی ہو گئی۔ ایس پی شنکلا اور دو ایک افسروں کے سوا تقریباً سبھی نے آنا بند کر دیا۔

❁

دس دن بڑے آرام سے گزر گئے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی گھر آ جائیں گے۔ وہ دوسرے کمرے میں موجود ہیں اور ابھی مجھ کو آواز دیتے ہوئے باہر نکلیں گے۔ سڑک پر کسی گاڑی کا ہارن بجتا تو میں اپنی جگہ سے اچھل پڑتا تھا کہ کرشنا جی آ گئے ہیں اور کھانے کی میز خالی پڑی ہے۔ چمپا نے ابھی تک کھانے کا انتظام نہیں کیا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ شاید کوئی کرشنا جی کو پوچھے کہ وہ گھر میں موجود ہیں یا کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ان کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ہر وقت ایسا لگتا تھا جیسے کرشنا جی کہہ رہے ہوں ظہیر! تم مجھے بھول تو نہیں گئے۔ میں انھیں کیسے بھول سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ انھیں کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں۔ جولین نے ابھی تک اپنے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ دس دنوں تک تو مجھے کوئی احساس ہی نہیں ہوا کہ اسے اپنے گھر بھی جانا چاہیے۔ اس عرصے میں وہ ایک بار بھی نہیں گئی تھی۔ ماں وہ اپنے آپ کو دیکھنے نہیں گئی تھی۔ خود میں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ گھر کی تمام دیکھ بھال جولین اور چمپا ہی کرتی رہی تھیں۔ میں تو زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ جولین کی ماں پورے گھر میں تنہا تھیں اور اپنی بچی کو دیکھنے کے لیے خود ہی وہاں آ جاتی تھیں۔ کرشنا جی کو گئے ہوئے ستائیسواں روز تھا کہ میں نے جولین سے کہا کہ وہ اب اپنے اسکول جائے اور اپنے گھر میں جا کے رہے۔ وہ کب تک یہاں رہے گی۔ میرا کیا ہے۔ میں تو ان باتوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ ایک بات اور سنو۔ حکومت نے مجھے اپنے "کہ اس مکان میں رہنے کی اجازت دی ہے مگر کرشنا جی کے بغیر یہاں ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔ در و دیوار پہ ان کی پرچھائیاں لرزتی رہتی ہیں۔ ہر گوشے میں ان کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جب سے وہ گئے ہیں ان کا کمرہ بند پڑا ہے۔ وہاں جاتے ہوئے اور ان کی چیزیں چھوتے ہوئے ہول آتا ہے۔ اب کسی نہ کسی دن یہاں سے جانا ہی ہے۔ حکومت قیام کی مدت میں کچھ اور توسیع کر دے تو بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اس سے پہلے ہی چلے جائیں۔" میری بات سن کے جولین کی آنکھیں بھر آئیں۔ چمپا جس نے اب تک بہت ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا، اس کا بند بھی ٹوٹ گیا۔

"مگر تم نے کیا سوچا ہے؟" جولین نے اضطراب سے پوچھا۔

"میں کسی بھی جگہ چلا جاؤں گا۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"میرا کیا ہے۔ میں تو پہلے بھی کہیں چلا جاتا مگر کرشنا جی نے پیروں میں بیڑی ڈال رکھی تھی۔" پھر میں نے چمپا سے مخاطب ہو کے کہا۔ "اب تمھیں بھی اپنا کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لینا چاہیے۔" مجھے بعد میں خیال آیا کہ جولین کے سامنے مجھے چمپا سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی لیکن بات منہ سے نکل گئی۔ چمپا کوئی جواب دینے کے بجائے سر جھکائے رونے لگی۔

جولین نے ہم دونوں کو حیرت سے دیکھا اور تند لہجے میں بولی۔ "میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔ کیوں نہ ہم سب ایک ساتھ رہیں۔ کرشنا جی نے مجھے جو مکان دلایا تھا اس میں تمھاری گنجائش ہے۔ وہ ویسے بھی ضرورت سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ ہم سب وہاں رہ سکتے ہیں۔ اگر تنگی محسوس ہوئی تو ہم کوئی دوسرا مکان لے لیں گے۔"

"نہیں جولین۔" ان دونوں سانحات کے بعد مجھے اب کہاں بھول گئی تھی اور ہمارے درمیان شاگرد اور استاد کے رشتے کا حجاب ختم ہو چکا تھا۔ پہلے بھی وہ کنارہ کر گیا تھا۔ وہاں گھر میں گھر کے ایک فرد کی طرح رہ رہی تھی۔ میں نے انکار کیا تو اس کی آنکھوں میں اداسی اور حیرانی سمٹ آئی۔ "تمھیں جانا ہی ہے۔ مجھے بہت ڈر رہا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ میں نے جولین کو اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے اس نے کبھی چمپا سے کریدنے کی کوشش کی ہو اور چمپا نے راج کرشنا کی طرح اسے بھی کچھ بتا دیا ہو۔ خیر چمپا سے مجھے بعد میں پوچھنا تھا کہ اس نے اس سے وہ طلاق کیوں کی۔

"میں تم سے کچھ کہہ تو نہیں سکتی۔" جولین نے مایوسی سے کہا۔ "لیکن اگر تم مجھے اجازت دو تو میں ابھی کچھ دن یہاں ٹھیرنے کی درخواست کروں گی۔ مجھے امید ہے تم میری بات ضرور مان لو گے۔"

"لیکن اس سے کیا حاصل ہو گا؟" میں نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔

"تو پھر تم میرے گھر چلو۔ تمھارا دل بھی بہل جائے گا۔ ہم دونوں ماں بیٹی اکیلے ہیں۔ تم تو سب کچھ جانتے ہو۔ ہمارے پاس دھن دولت بھی نہیں اور پھر تم بھول گئے۔ یاد کرو کرشنا جی کی کیا خواہش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تم بہت پڑھ لکھ جاؤ۔ وہ تمھارے لیے اپنے دل میں بڑی آرزوئیں رکھتے تھے۔ تم میرے ساتھ ہو گے تو میں تمھیں ان کی خواہش کے مطابق خوب پڑھاؤں گی۔ تمھیں ہمارے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ وہ گھر بھی تمھارا ہو گا۔"

"مجھ سے اصرار مت کرو جولین!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں اب اس شہر میں رہنا نہیں چاہتا۔ میں کسی گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔ تم بھی ایک دن مجھ سے تنگ آ جاؤ گی۔ تم... تم نہیں جانتیں کہ میں کہیں ٹک نہیں رہ سکتا۔" میں وہاں سے اٹھ گیا۔ بہتر یہی تھا کہ میں یہ گفتگو ہی نہ کروں۔ مجھے اندازہ تھا جولین اسی طرح اصرار کرتی رہے گی۔ وہ ایک بہت نفیس لڑکی تھی۔ کرشنا جی بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ مجھے بھی

وہ بہت اچھی لگتی تھی لیکن کرشنا جی کی بات اور تھی۔ وہ تو اس طرح بات کرتے تھے کہ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر ہر مرتبہ جیسے انھیں پتہ چل جاتا تھا اور وہ ایسی بات کرتے تھے کہ ندامت کے سوا کچھ نہیں بچتا تھا۔

جولین نہیں گئی۔ اس کی ان دنوں آئی ہی اور میرے سر پر کرشنا جی کاغذات کا جو بوجھ ڈال گئے تھے وہ بتدریج بڑھتا گیا۔ ایس پی ٹنگلا شور دیتا تھا کہ مجھے مدراس جا کے کرشنا جی کی جائداد کا کوئی مناسب انتظام کرنا چاہیے۔ اسے اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس گھر میں بھی ان کا خاصا سامان تھا۔ میں یہ سب کہاں رکھتا اور کس کے سپرد کرتا؟ حکومت کی طرف سے وہ لوگ چپکے ہی رہ گئے تھے۔ مجھے کرشنا جی نے عجب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ مدراس جا کے ان کی جائداد کی دیکھ بھال کروں۔ مجھے یہ سب کچھ ایک ناٹک نظر آتا تھا اور لیں ہی سب کچھ چھوڑ کے چلاؤں جیسے کرشنا جی چلے گئے تھے، اس کا حوصلہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے خفا ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ مجھے ان چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا، وہ سب جان گئے تھے پھر بھی انھوں نے احتیاط نہیں کی۔ وہ چپکے چپکے ابا جان اور گھر والوں کا پتہ چلا چکے تھے۔ اتنی رازداری سے کہ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ نہ جانے انھیں کب میرے بارے میں اتنی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ان کے طرزِ عمل میں ایک بال کا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں یہ سچا نہیں کر سکوں گا۔ میں تو ان کے سامنے بھی کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ دن بھر گھر بیٹھا رہتا تھا یا بازاروں میں گشت کرتا رہتا تھا۔ شاید انھوں نے مجھے ایک کھونٹے سے باندھنے کے لیے یہ ذمے داری سونپ دی ہو۔ انھوں نے جو کیا کاش وہ یہ وصیت میرے سامنے کرتے تو میں ان کے پیر پکڑ کے معذرت کر لیتا مگر انھوں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ چھپا نے انھیں اتنا ہی بتایا ہوگا کہ مجھ سے ابا جان اور گھر والے بچھڑ گئے ہیں لیکن چھپا نے اس نے فیصلہ والی بات بھی بتا دی ہو اور انھیں میرے حال پر ترس آ گیا ہو۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ گھر والوں کو تو میں نے خود چھوڑا تھا۔ سات سال جیل میں رہنے کے بعد میں نے پلٹ کے گھر کی خبر نہیں لی تھی۔ میں جیل سے چھوٹ کے سیدھا اس کی تلاش میں نکلا تھا جو نہ جانے کس تہ خانے میں روپوش ہو گئی تھی۔ کرشنا جی ایک صرف گھر والوں کی گمشدگی سے واقف تھے۔

میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ میں نے ان کے متعلق بدگمانی کیوں کی۔ ان کا جذبہ ترس پر محمول کیا۔ ترس کیسا؟ چھپا کے آنے سے پہلے جب وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے تب بھی وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ چھپا تو بہت بعد میں آئی تھی اور آنے کے بعد اس نے فوراً تمام باتیں نہیں بتا دی ہوں گی۔ ہو سکے تو ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔ وہ بات کرنا چاہتے تھے تو میں ان سے کچھا کچھا رہتا تھا۔ اب وہ مجھ سے چھپ گئے۔ میرے دماغ میں کوئی معقول بات نہیں آ رہی تھی۔ اگر میں مدراس جا کے ان کی جائداد بیچ کے نقدی وصول کر لیتا ہوں تو میں اس کا کیا کروں گا؟ میں گھر بناؤں گا؟ سامان اکٹھا کروں گا اور پھر لوگ میرے گھر آیا کریں گے؟ وہاں کھانے پکا کریں گے؟ اگر یہی کرنا تھا تو پھر تدریں اور جیل کے پاس بیٹھنے میں کیا حرج تھا۔ تدریں نے بھی اپنی تمام جائداد میرے نام کر دی تھی۔ نیا گھر بساؤں گا۔ دیں، مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی کہ کیا کروں گا اور اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں جکڑ لوں گا کیونکہ روپیہ پیسہ اکٹھا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اتفاق سے ہاتھ لگ گیا ہے تو مجھے کوڑی کی قیمت سمجھ کے اسے استعمال کرنا چاہیے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو چھپا اور جولین نے بھی کچھ نہیں کیا جبکہ میں نے صاف طور پر ان سے کہہ دیا تھا کہ چھپا اپنا کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈ لے اور جولین اپنے گھر چلی جائے۔ وہ دونوں سائے کی طرح میرے پیچھے لگی رہتی تھیں۔ میں ملتفت نہیں ہوتا تھا تو مجھے ان کی نگاہیں تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ کبھی جولین میرے سامنے کھانا لا کر رکھ دیتی، کبھی چھپا اور وہ دونوں عموماً چپ ہی رہتیں۔ جب سے میں نے جولین سے انکار کیا تھا وہ ہر وقت نڈھال نڈھال سی رہتی تھی۔ وہ اپنے کپڑوں کی طرف سے بھی بے فکر ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے انکار سے ناخوش ہے مگر کیا میں اس سے اقرار کر لیتا؟ ان دونوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے میں نے گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ میں روز صبح گھر سے نکل جاتا اور رات گئے گھوم پھر کے واپس آتا تو وہ دونوں ڈبڈبائی آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں سے مجھے دروازے کے قریب دالان ہی میں ملتی ہوئی ملتیں۔ میں کہہ دیتا کہ بھوک نہیں ہے تو پھر وہ بھی کچھ نہیں کھاتیں۔ پھر پہلے ان کی وجہ سے یہ کتابیں بند کر دیا۔ کھانے کی میز پر بھی خاموشی طاری رہتی تھی۔ بچھو کی تیزی و طراری بھی کرشنا جی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

پولیس نے بہت سے لوگوں کو پکڑا اور چھوڑ دیا۔ لاج کرشنا کے مجرم محفوظ رہے۔ اخبارات بھی چپ ہو گئے تھے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے ان کے قاتلوں کو عبرتناک سزائیں دلوانے کے لیے جلسے اور مظاہرے کیے تھے لیکن میرے ذہن میں ابھی تک پولیس افسر جسونت کی باتیں محفوظ تھیں۔ بھجو گروپ! جب بھی کوئی کرشنا جی کا ذکر کرتا یا میں ان کی تصویر دیکھتا، بھجو گروپ کا نام میرے دماغ میں چبھنے لگتا۔ میں نے ایک دن اشارۃً ایس پی ٹنگلا کے سامنے یہ نام لیا تھا تو وہ چونک پڑا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ بھجو تو اس بمبئی کا ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے کئی کارخانے ہیں۔ اور بھی کئی قسم کے کاروبار ہیں۔ اس کی جائداد کا کوئی شمار ہی نہیں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں بھجو سیٹھ کے بارے میں کیا متجسس کیوں ہوں۔ میں نے اسے جسونت کی زبانی سنی ہوئی باتیں نہیں بتائیں اور کہا یونہی میں نے اس کا ذکر بہت سنا ہے۔ ایس پی ٹنگلا میرے جواب

سے مطمئن نہیں ہوا اور اس نے چلتے چلتے بھجو سیٹھ، اس کی امارت اور اثر و رسوخ کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا۔ میں سنتا رہا۔ ایس پی ٹنگلا کے جانے کے بعد میں نے بہت غور کیا مگر کوئی مناسب صورت ذہن میں نہیں آئی۔ بھجو گروپ کے لوگ مجھ سے ضرور واقف ہوں گے کہ میں کرشنا جی کے ساتھ رہتا تھا۔ ممکن ہے ان کا مجھ سے تعلق ہو سکتا ہے۔ کرشنا جی پر وار کرنے سے پہلے انھوں نے ان کے متعلق ہر بات جان لی ہوگی کہ وہ کہاں رہتے ہیں، ان کی مصروفیات کیا ہیں اور ان کے ساتھ کون رہتا ہے اور یہ بات بھی ان سے مخفی نہیں رہی ہوگی کہ کرشنا جی مجھ کو کلب لے گئے تھے۔ کلب میں ان پر ہونے والے حملے کا علم بتانے والا بھی میں ہی تھا۔ کاش وہ کرشنا جی کے بجائے مجھے ختم کر دیتے کیونکہ میری اس دنیا میں کوئی ضرورت نہیں تھی اور میری موت کے بعد ممکن تھا کرشنا جی سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتے۔ میرے کہنے کے مطابق یہ شہر ہی چھوڑ دیتے۔ کرشنا جی کی ابھی دنیا کو بہت ضرورت تھی۔ ان کی پوری زندگی ہی لوگوں کی خدمت کرتے گزری تھی۔ زندہ رہتے تو لوگوں کے کام ہی آتے۔ کرشنا جی میرے لیے صرف جائداد ہی نہیں چھوڑ گئے تھے ایک اور بار بھی ڈال گئے تھے۔ میں سوچتا تھا اگر ان کے قاتلوں کو درگزر کر کے بمبئی سے چلا گیا تو مجھے کہیں چین نہیں ملے گا اور کرشنا جی کی روح بھی مجھ سے شاکی رہے گی۔ جیل سنے گی تو طمانچے مارے گی لیکن اگر مجھے کوئی بتا دیتا کہ وہ فلاں شخص ہے تو میں کبھی کا اس کے سینے میں چاقو اتار چکا ہوتا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ سیٹھ بھجو کے دکان سے آدمی تھے جو اس حملے میں شامل تھے۔ سنا ہے کئی آدمی آزاد ہو گئے تھے۔ وہ بھی میری طرف سے اپنے دل میں خار لیے پھر رہے ہوں گے۔ کرشنا جی کی وجہ سے پولیس کے کئی افسر میری صورت آشنا ہو چکے تھے۔ ایسی صورت میں اچھی طرح سوچ کر ادھر ادھر کا جائزہ لے لینا چاہیے تھا۔ جس طرح انھوں نے مرتے دم کا خیال رکھا، مجھے بھی کرشنا جی کی طرف سے ایسی نظم و ضبط کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ جذبات کے ریلے کی طرح یوں ہی گھستا چلا جاتا تو بعد میں میرے حوالے سے کرشنا جی ہی کی رسوائی ہوتی۔

مجھے اس تاخیر سے بہت گھٹن ہو رہی تھی لیکن ہاتھ پاؤں سمیٹے ہوئے بیٹھے میں نے انتظار کیا۔ شاید پولیس ہی کوئی کارنامہ انجام دے ڈالے۔ اب اتنی دیر گزر جانے کے بعد پولیس سے توقع رکھنا بے کار تھا۔ میں نے بہت سوچا اور سوچتے سوچتے میرا ذہن بھجو سیٹھ کے نام پر جا کے ٹھہر گیا۔ اسی شخص کی ایما پر سب کچھ ہوا ہوگا۔ اس کی اجازت کے بغیر اس کے آدمی کرشنا جی جیسے بڑے پولیس افسر کو ختم کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے کسی طرح اسے تلاش کرنا چاہیے تھا لیکن بھجو سیٹھ تک رسائی آسان بات نہیں ہوگی۔ اس تک پہنچنے میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آ سکتی ہیں اور درمیان میں بات خراب ہو سکتی ہے۔ بہتر یہی نظر آتا تھا کہ مناسب وقت کا انتظار کیا جائے جب تک لوگ کرشنا جی کا واقعہ بھول نہ جائیں اور میری صورت لوگوں کی نظروں سے معدوم نہ ہو جائے۔

دیر ہو رہی تھی۔ کرشنا جی کی موت کو ایک مہینے سے زیادہ گزر چکا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ تمام کاغذات جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔ جولین نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا مگر وہ رہتی ہمارے ساتھ ہی تھی۔ وہ کچھ دبلی اور زرد ہو گئی تھی۔ ایک دن اس نے بہت دنوں بعد اپنا خوب صورت لباس پہنا اور مجھے اصرار کر کے اپنے ہمراہ ہینگنگ گارڈن لے گئی۔ اس کے باپ کی حالت پھر خراب ہو چلی تھی۔ واپسی کے راستے میں جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ بس میں برابر بیٹھے ہوئے تھے، اس نے خواہش ظاہر کی کہ کسی ریستوراں میں چل کے چائے پینی چاہیے۔ ہم درمیان میں اتر گئے اور ایک بہت اونچے قسم کے ریستوراں کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ ریستوراں کا ماحول پرسکون تھا۔ کرشنا جی بھی ایک بار مجھے ایسے ہی ایک ریستوراں میں لے گئے تھے۔ میں گم سم بیٹھا تھا۔ جولین نے میرا ہاتھ دبا کے سرگوشی کی۔ "ہمیں بھی کچھ بولنا چاہیے۔"

"ہاں"۔ میں نے گھبرا کے کہا "مگر تمھی آغاز کرو۔ میں سنتا رہوں گا۔"

"خیر!" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "تم سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ بے شک تمھیں کرشنا جی کی موت کا بہت صدمہ ہوگا مگر اس سے کچھ کم مجھے بھی نہیں ہوگا۔ میں نے ان کی موت قبول کر لی ہے کیونکہ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اسے قبول ہی کرنا پڑتا ہے۔ تمھیں بھی ایسا کرنا چاہیے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ تم زندگی سے کب تک لاتعلق رہو گے۔ اگر تم مجھے اپنا ایک ہمدرد سمجھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ میں تمھارے متعلق اچھی باتیں سوچ سکتی ہوں تو مجھے کچھ بتاؤ۔ آخر تم اتنے رنجیدہ ہوتے کیوں ہو؟"

میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ سوال مجھ سے بہت لوگ کرتے ہیں اور مجھ سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ ایک کرشنا جی جدا نہیں ہوئے جولین!" میری آواز بھرا گئی۔ "مت پوچھو۔"

"مجھے کچھ کچھ معلوم ہوا ہے اور اتنا تو میں خود اندازہ کر سکتی ہوں کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے تم جیسے آدمی کو گھن لگا دیا ہے۔ اب تو خیر اسے کرشنا جی کی موت کا سبب کہا جا سکتا ہے مگر میں نے دیکھا ہے کہ تم ان کی موجودگی میں کس طرح سہمے سہمے رہتے تھے۔ تم سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی اور کرشنا جی نے بھی تاکید کر دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے بتانے سے کچھ نہیں ہوگا ورنہ تم بتا دیتے اور ظاہر ہے میری حیثیت ہی کیا ہے۔ میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتی لیکن میں تمھارا دکھ ضرور بانٹ سکتی ہوں۔ مجھ پر اتنے اعتماد کا اظہار ضرور کرو۔"

"اعتماد کی بات نہیں ہے جولین!" میں نے بیزاری سے کہا۔ "مجھے تم پر پورا اعتماد ہے لیکن میں تمھیں کیا بتاؤں۔ شاید تم سے چھپانے کو کچھ رہا ہو۔"

"چھپا دیدی نے صرف اتنی بات بتائی ہے کہ تم سے تمھارے کچھ عزیز

بچھڑ گئے ہیں مگر اتنی بات تو تم سے قریب بیٹھنے والا کوئی بھی شخص جان سکتا ہے۔ تم نے خود بھی کئی بار اس قسم کی باتیں کی ہیں کہ تمہارا کوئی گھر نہیں ہے۔ تمہارے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ تم پڑھنا نہیں چاہتے۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح تمہاری کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں رہتے ہوئے تم گھر میں گھٹے رہتے ہو۔ تم اپنی اس عمر میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ کرشنا جی کے اور تمہارے ناموں کا فرق اتنا واضح ہے کہ کوئی بھی تمہارے بارے میں آسانی سے چند رائیں قائم کر سکتا ہے۔ تمہیں اس حالت میں دیکھ کے جی بہت کڑھتا ہے۔ بہت رونا آتا ہے۔" اس نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور خاموش ہو گئی۔

"میرے متعلق اتنا مت سوچو جولین! تمہاری اپنی پریشانیاں کچھ کم نہیں ہیں۔ تمہارے باپ بیمار ہیں، ماں اکیلی رہتی ہیں۔ اب تمہیں ان کے پاس چلی جانا چاہیے۔"

"تمہیں اس طرح چھوڑ کے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے اور نہ مجھے کچھ ہوگا۔ میری فکر مت کرو۔ مجھے آسانی سے موت نہیں آئے گی۔ یہ تو میری زندگی کا معمول ہے۔ میں اسی طرح لوگوں کو ستاتا رہوں گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم ٹھیک نہیں ہو۔" اس نے اتنی زور سے کہا کہ قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ اُسے احساس ہوا تو وہ سٹپٹا سی گئی اور سر جھکا کے ندامت سے بولی۔ "مجھے افسوس ہے لیکن ظہیر! تمہیں اپنے متعلق سوچنا چاہیے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ مان جاؤ ظہیر! میرے ساتھ گھر چلو۔ میں تمہارے کسی معاملے میں حائل نہیں ہوں گی۔ مجھے تم سے کچھ درکار نہیں ہے۔ میری صرف اتنی آرزو ہے کہ تمہارے کچھ دکھ کم ہو جائیں۔ شاید تم تسلیم کرتے ہو کہ میں ایک بُری لڑکی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ رہ کے تمہیں کچھ بُرا محسوس نہیں ہوگا۔"

میرا سر جھنجھنانے لگا اور میں نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ بیرے نے میز پر چائے لا کے رکھ دی تھی۔ جولین چائے بنانے لگی پھر جب اس نے چائے کی پیالی آگے کر کے مجھے ہولے سے آواز دی تو میں نے سر اٹھایا۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ میرے سامنے تھا اور اس کی بڑی بڑی اور گہری آنکھیں بھی پرنم ہو رہی تھیں۔ اس کی ان آنکھوں سے میرا جسم لرزنے لگتا تھا۔ وہ کنواری آنکھیں کسی قدر متاثر ضرور تھیں پہلے البتہ ایسی نہیں لگتی تھیں۔ میں نے بوکھلا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ریستوراں میں بیٹھے ہوئے بیشتر لوگوں کی نظریں جولین پر مرکوز تھیں۔ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میرے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی ہے جو حسن و جمال میں ہزاروں میں ایک ہے اور آج اس نے جو لباس پہنا ہے حالانکہ سادہ ہے مگر وہ اس میں اور بھی اچھی لگنے لگی ہے۔ میں نے جلدی جلدی چائے حلق میں انڈیلی اور اس سے کہا "اب چلو۔" وہ کچھ دیر مذبذب رہی مگر دوسرے لمحے اس نے ایک گہری سانس لے کے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کر دیا۔ بل ادا کرتے ہی ہم اٹھ گئے۔ میں نے غیر ارادی طور پر پلٹ کے دیکھا۔ سب ہماری طرف متوجہ تھے۔ ریستوراں سے باہر نکل کے ہم کچھ دور تک پیدل چلتے رہے۔ سڑکوں پر اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ اس نے ایک دکان کے قریب رک کے اچانک مجھ سے پوچھا "تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے حیرانی سے کہا "مجھے کس چیز کی ضرورت ہوگی۔"

"کسی بھی چیز کی۔ آدمی کی سیکڑوں ضروریات ہوتی ہیں۔"

"ہاں ہوتی تو ہیں مگر ..... مگر مجھے کوئی چیز یاد نہیں آ رہی ہے۔" میں نے جھجک کے کہا "تمہیں تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؟ مجھے معاف کرنا میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں۔"

وہ مسکرانے لگی "چلو تمہیں کچھ خیال تو آیا۔"

"بتاؤ تم کیا خریدنا چاہتی ہو؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی "پھر کبھی آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے ضد نہیں کی۔ ہم دونوں بس میں سوار ہونے کے بجائے پیدل ہی راستہ طے کرتے لمبے بازاروں میں گھومتے رہے۔ میری نظریں ہمیشہ بھٹکتی رہتی تھیں۔ میں آنے جانے والوں کے چہرے دیکھتا رہتا تھا۔ شاید کسی جگہ تقدیر پھر جائے اور وہ کہیں مل جائے۔ سنا تھا آدمی کی قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری رفتار تیز نہیں تھی۔ ایک جگہ کچھ آگے فٹ پاتھ پر زیادہ بھیڑ تھی۔ ہم آگے بڑھے تو ہمیں پتہ چلا کہ دو مقامی لوگوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ ہم نے راستہ بدلنے کا ارادہ کیا مگر دفعتاً سامنے سے آدمیوں کا ایک ریلا ہماری جانب بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے جولین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے تیزی سے کھینچ کے اپنے پیچھے کر لیا۔ وہ سہم کے میری کمر سے چپک گئی۔ پھر بھاگتے ہوئے لوگ ہمارے پاس سے گزر گئے تو جولین نے مجھے ٹہوکا دیا۔ میں نے مڑ کے دیکھا۔ ایک نوجوان کچھ دور جا کے رک گیا تھا اور ہمیں حیرت بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔ مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے جولین کی گلی میں میرا داخلہ بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں تھا۔ اس کے ساتھی اسے ماسٹر کہہ کے پکارتے تھے۔ میں نے اس کی نیت بھانپنے کا تحمل کیا۔ اس کے ارادے بُرے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میں نے اُسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا۔ ادھر مجمع بھی چھٹ گیا تھا۔ پولیس آ گئی تھی۔ ہمارے چلتے چلتے ماسٹر نے جھکتے ہوئے مجھے سلام کیا۔ میں نے منہ پھیر لیا لیکن ماسٹر تیزی سے میرے پاس آ گیا اور سر نیچے کر کے گردن جھکا کے خاموش کھڑا ہو گیا۔ "کیا مرضی ہے ماسٹر؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماسٹر اپن نہیں ہے ماسٹر، تم ہے۔ اپن تو ڈکی ہے۔" اس نے میری

پنڈلیاں پکڑ لیں اور عاجزی سے بولا "اپن کو اکسکیوز کر دو ماسٹر! سالا اس دن اپن کا مغز پھر گیا تھا۔"

"میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"اپن کو معلوم ہے تم لوگ گریٹ مین۔ اپن نے اس سالا فنٹا سنگھ سے بہت سے فلموں کو ٹرام بالتے دیکھا ہے۔ اپن نے تمہارا جیسا ہاتھ نہیں دیکھا۔ اب بھی اپن کی کمر میں کبھی کبھی درد اٹھتا ہے۔" پھر وہ جولین سے مخاطب ہو کے تیزی سے بولا "اپن کرسن سے بھی ایکسکیوز کرتا ہے۔ کرسن اپن کا سسٹر ہے۔ اپن کو معلوم ہوا تھا کہ کرسن اُدھر سے چلا گیا ہے۔ اس واسطے اپن پھر اُدھر نہیں گیا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اب تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہم نے اس دن حساب صاف کر دیا تھا۔ حساب صاف کرنے کے بعد ہم کچھ یاد نہیں رکھتے۔" میں نے سرسری انداز سے کہا "آگے سنبھل کے رہنا۔"

اس نے سر ہلا کے اقرار کیا "اپن پرامس کرتا ہے ماسٹر! اس دن کے بعد سے اپن نے تم کو بہت کھوج کیا۔ آج اتنے دن بعد تم دکھائی دیا ہے۔ اپن کا لک ہے کہ کرسن بھی تمہارے ساتھ ہے۔ اپن پہلے پارٹمنٹ کا نوکری بلڈنگ۔ وہ جمی سالا ایک دم فراڈ ہے۔ اپن پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ کرسن کو کوئی گنگ ہی لے جا سکتا ہے۔ کرسن لاز بیٹ ہے۔ بہت سا چھوکری لوگ اُدھر رہتا ہے پر کرسن جیسا چھوکری بائی چانس پیدا ہوتا ہے۔ کرسن سب سے ڈفرنٹ تھا اور سب سے ڈفرنٹ آدمی کے پاس گیا۔"

"زیادہ بات مت کرو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"سوری ایم ساری ماسٹر!" وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔

"ابھی تم کو اپنی زبان ٹھیک کرنی چاہیے۔"

"ویری ویری ٹرو ماسٹر! یہ سالا زبان بہت چلتا ہے ماسٹر! لو اسے اپنے ہاتھ سے کاٹ دو نہ سالا یہ کبھی نہ چلے گا۔ اپن کا تو ہاتھ سے زیادہ زبان چلتا ہے۔"

"جھگڑا بھی جب ہوتا ہے تو پہلے ہاتھ چلانا سیکھو پھر زبان چلتی ہوئی بھی اچھی معلوم ہوتی ہے ورنہ چھری لگا دو۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماسٹر! اس لیے تو سالے ستی میں تمہارا کھوج لگاتا پھرتا تھا۔ آج مل گیا ہے تو اپن تم سے ایک ریکویسٹ کرے گا۔ ماسٹر انکار مت کرنا۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات کچھ نہیں ماسٹر!" وہ لجاجت سے بولا "یہ اپن کا لائف بن جائے گا۔ اپن کو اپنی سروس میں لے لو ماسٹر! اپن بالکل چینج ہو جائے گا۔ جیسا تم بولے گا ویسا کرے گا۔ اپن بڑے اینڈ مائنڈ تمہارا ٹیچی کرے گا۔ تم چلا سکو دو ماسٹر!" اس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے "آدمی بنا دو ماسٹر!"

جولین نے میرا بازو کھینچ کے چلنے کے لیے کہا لیکن ماسٹر بچوں کی طرح مچل رہا تھا۔ "تم پہچاننے میں غلطی کر رہے ہو ماسٹر! میں کوئی اٹھائی گیرا نہیں ہوں۔ نہ میں اُستادی شاگردی کا کام کرتا ہوں لیکن میں تمہیں رائے دوں گا تم کوئی اور دھندا کرو تو بہتر ہے۔ ان کاموں میں کچھ نہیں رکھا اور یہ تمہارے بس کا روگ بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

"ماسٹر! اپن کو ماسٹر مت بولو۔ اپن کو جنگلی بولو۔ اپن کا نام ڈارلنگ ہے۔ ادھر سب لوگ بالک ماروتی بولتا ہے۔ ماروتی اس نام کو پہچاننے کا مسٹیک نہیں کر رہا۔ ماروتی نے تمہارے پیچھے بہت دھکا کھایا۔ اپن جانتا ہے ادھر تمہارا کوئی اڈا نہیں۔ ادھر بستی میں اپن سارا لوگوں کو جانتا ہے پر تم استاد ہے ایک دم تھرڈ استاد۔ اپن اتنا نہیں اتنا دھاکڑ ہے۔ تم نے اڈا کھول لیا تو ادھر سالا بمبئی میں سب کا اڈا ختم ہو جائے گا۔ سب کا بزنس ٹھپ ہو جائے گا۔ اپن بولتا ہے ماسٹر! ادھر بمبئی میں بہت سالا گڑبڑ ہے۔"

وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "بہت جلتا ہے۔ یہ بیوم کیا کر سکتا ہے۔ ایک بار ٹرائی کرنے دو ماسٹر! نہیں چلا تو ماروتی یہ دھندا چھوڑ دے گا۔ سالا پان بیڑی سگریٹ بیچا کرے گا۔ اس بستی سے غائب ہو جائے گا۔ ماسٹر! ماروتی کا ریکویسٹ ایکسیپٹ کر لو۔ ماروتی کے گلے میں اپنا پٹا ڈال دو ماسٹر!"

میں سوچنے لگا کہ اس سے کس طرح جان چھڑائی جائے۔ انکار کی صورت میں یہ اور راستہ کھوٹا کرتا رہے گا۔ جولین بار بار مجھے اشارے کر رہی تھی اور ماسٹر کبھی میری پنڈلیاں پکڑتا تھا، کبھی میرے ہاتھوں کو چوما کرتا تھا۔ اُسے اتنا بھی خیال نہیں تھا کہ یہ ایک سڑک ہے اور میرے ساتھ ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اتنا مجھے ضرور یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کے دل میں کوئی کینہ نہیں ہے۔ میں نے اسے نرمی گرمی سے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "تم کہاں رہتے ہو؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے مجھے اپنا پتہ بتایا اور میرا پتہ پوچھنے لگا۔ میں نے نہیں بتایا۔ اس نے بھی ضد نہیں کی۔ "میں کسی وقت خود تمہارے پاس آؤں گا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"آنے کی بات مت کرو ماسٹر! اپن کو ابھی ساتھ لے چلو۔ اپنے ڈوری پر باندھ دو۔" وہ بے تابی سے بولا "اپن بہت خوار ہو گیا۔ بیٹ فرسٹ کلاس ماسٹر! ملتی ایک دم ڈاگ کے ماتک پہرہ کرے گا۔"

میں نے اُسے نرمی سے سمجھایا تو وہ کسی طرح مان گیا۔ اس نے جولین سے ایک بار پھر معافی مانگی اور مجھ سے کہنے لگا کہ وہ میرا انتظار کرتا رہے گا اور میں نے آنے میں دیر کی یا نہ آیا تو وہ میری تلاش میں سڑکوں پہ نکل آئے گا اور جب تک میں اسے ساتھ لے نہیں جاؤں گا وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ چاہے میری ناراضی کی صورت میں اسے جان کا خطرہ مول لینا پڑے۔ مجھے اس کے دیوانے پن پر بہت تعجب ہوا مگر وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے رگ پٹھوں میں ابھی تک میری کوئی ضرب اثر کر رہی تھی۔ وہ پریشان

پریشان بھی نظر آ رہا تھا۔ آخر جب تک اس نے مجھ سے وعدہ نہیں لے لیا، میرے سامنے سے نہیں ٹلا۔ پھر ہم آگے بڑھ گئے۔ جولین نے مڑ کے یہ اطمینان کیا کہ وہ ہمارا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ اس کے چہرے کی شگفتگی بحال ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ چلتی رہی۔ پھر اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا: "یہ کیا کہہ رہا تھا؟"

"تم اس سے اتنی کیوں ڈر رہی تھیں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں پھر چاقو نہ نکال لے۔ اس کا کیا بھروسا۔ میں اس دن کا منظر کبھی نہیں بھول سکتی۔" وہ جھرجھری لے کے بولی۔

"چاقو نکالنا ایسا آسان نہیں ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب اس کی طرف سے کوئی اندیشہ دل میں مت لانا۔"

"یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ وہ ایک خبطی لفنگا ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔ اس کا دل کالا ہے۔" پھر وہ خود اپنی بات کی تردید کرنے لگی۔ "مگر...... مگر وہ کیا کہہ رہا تھا؟ یہ میں کیا سن رہی تھی؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج مارتی مجھے بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔"

"ہاں وہ خاصا بدل گیا ہے۔"

"مگر تم نے اس سے وعدہ کیوں کیا کہ تم دوبارہ اس کے پاس جاؤ گے! ایسے لوگوں سے دور ہی رہنا ٹھیک ہے۔ تم اس کے پاس مت جانا۔"

"دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو اس سے نجات مل گئی۔"

"اس کا ذکر ہی چھوڑ دو۔ مجھے اس کے تصور سے متلی ہونے لگتی ہے۔ ہم نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔" وہ الجھتی ہوئی بولی۔ "تمھیں کچھ یاد آ رہا ہے؟"

"نہیں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"کچھ بھی نہیں؟" وہ شکایتی انداز میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

اس کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی۔ ہم ایک مختصر فاصلہ طے کر کے گھر جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ بس ہچکولے کھاتی ہوئی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ جولین تمام راستے نظریں نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔ بہت دیر ہو گئی تو اس نے میری طرف دیکھا نہ بات کی۔ آخر میں نے دھیمی آواز میں پوچھا: "کیا تم میری کسی بات سے ناراض ہو گئیں؟"

اس نے چونک کے پہلو بدلا اور بجھی ہوئی آنکھوں سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ "کیا مجھے تم سے ناراض ہونے کا حق حاصل ہے؟" اس نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں۔ میری کوئی بات تمھیں بری لگ سکتی ہے لیکن تم مجھے معاف کر دینا۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے۔ اسی لیے میں لوگوں کے ساتھ رہنے اور ان سے بات کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"اوہ نہیں۔" اس نے بے قرار ہو کے کہا۔ "تم ایسی باتیں مت کرو۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ کوئی تم سے ناراض نہیں ہو سکتا بلکہ بات اس کے برعکس ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ شاید تم مجھ سے خفا ہو۔ شاید میرے ساتھ رہنے پر، شاید میرے زیادہ دخل دینے پر یا کسی اور بات پر۔ تمھیں اس طرح گم صم دیکھ کے عجیب عجیب خیال آتے ہیں۔"

"اور میں یہ سوچتا ہوں کہ میری وجہ سے تمھیں دکھ ہو رہا ہے۔ تم نہ جانے کیا سمجھ رہی ہو گی۔ تم میرے ساتھ رہتی ہو، میرا خیال کرتی ہو اور میں کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ مجھے یہ احساس اور پریشان کر دیتا ہے۔"

"تم اپنے دل میں ایسا گمان کبھی مت کرنا۔ ضروری نہیں ہے کہ آدمی زمانے میں ایک دوسرے کا خیال رکھے۔ کچھ چیزوں میں یہ سودا تبادلہ نہیں ہوتا۔ ہر جگہ دکان نہیں ہوتی اور اس کے بکنے کے بازار نہیں سجتے۔ بتاؤ کیا ماں کا حق ادا ہوتا ہے؟ ماں اپنے بیٹے کی پرورش میں بہت دکھ جھیلتی ہے مگر کیا ماں کو اس انداز سے سوچنا چاہیے کہ اس کا بیٹا اس کی شفقت کا معاوضہ ادا نہیں کر رہا ہے؟ کچھ لوگ اب بھی اس بری دنیا میں ایسے ہیں جو ان باتوں سے بلند ہو کے سوچتے ہیں۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ بہت اچھی باتیں کرتی ہو۔"

"تم بھی کچھ کم اچھے نہیں ہو۔ بعض اوقات تو مجھے تم پر رشک آتا ہے کہ میں تمھاری طرح کیوں نہیں ہوں۔" وہ مسکرا پڑی اور پُر جوش لہجے میں بولی۔ "ظہیر! خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔ دکھوں کا علاج یہ نہیں ہے کہ آدمی خوشیوں سے کنارہ کر کے اپنے دکھ اور بڑھا لے۔ ہمت سے کام لینا چاہیے۔ پتہ نہیں۔" وہ ایک دم اٹک کے بولی۔ "میں تم سے یہ باتیں کرتے ہوئے کیسی لگ رہی ہوں۔"

"تم اچھی لگ رہی ہو۔"

ایک اسٹاپ پر کچھ اور مسافر بس میں سوار ہو گئے۔ بس کھچا کھچ بھر گئی۔ ہم نے باتیں بند کر دیں۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور ہم پر گرے جا رہے تھے۔ جب بھی میں بس میں بیٹھتا تھا، میرا ذہن بھی بس کے ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ بس تو سڑک پر چلتی تھی اور میرے خیالوں کا کوئی راستہ طے نہیں تھا۔ بس سڑک پر چلتی تھی اور میرا ذہن ہوائی جہازوں کی طرح آسمانوں میں اڑ رہا ہوتا تھا۔ میں خواب دیکھا کرتا تھا کہ اگلے اسٹاپ پر اتروں گا تو سپنا مجھے نظر آ جائے گی۔ میں اسے دیکھوں گا تو میرا کیا حال ہو گا! اس کا کیا حال ہو گا؟ وہ مجھے پہچانے گی بھی یا نہیں! اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اس میں اور مجھ میں بہت فرق آ گیا ہو گا۔ شاید مجھے زمین پر کھڑا دیکھ کے وہ تڑپ کے بے ہوش ہو جائے گی۔ بس میں سفر کرتے ہوئے مجھے بہت سکون ملتا تھا کیونکہ میں اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ جب کنڈکٹر سفر ختم ہونے کا اعلان کرتا تو میرے خوابوں کا شیرازہ بکھر جاتا تھا۔

اسٹاپ آنے سے پہلے جولین نے مجھے بیدار کیا۔ میں اس کے پیچھے بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا نیچے اترا۔ چمپا گھر میں اکیلی نہیں تھی۔ وہاں پی شکلا جی آ چکا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو مسکرا کے بولا: "کیا سیر ہو رہی ہے ظہیر خاں!"

مجھے نہ جانے کیوں جھینپ آ گئی۔ "کہیں نہیں۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"آج تو کچھ مزاج ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"آپ نے کیا کیا؟" میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "کوئی سراغ ملا ابھی تک۔ آپ آنکھ مچولی ہی کھیل رہے ہیں۔"

"وہ جھاڑ جھنکار کی بھی ہوئی ہے ظہیر خاں!" وہ شکستگی سے بولا۔ "اب شاید ہی کوئی نتیجہ برآمد ہو۔ جو لوگ کرشنا جی سے لگاؤ رکھتے تھے اور جنھیں کرشنا جی اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی طرح مشورے دیتے تھے، وہ شاید ہمیشہ زیر زمین رہیں گے۔ فیڈرل گورنمنٹ کی طرف سے سختی کے ساتھ احکام آئے ہیں کہ مجرم جلد از جلد گرفتار کیے جائیں مگر ایک دن فیڈرل گورنمنٹ بھی تھک کے خاموش ہو جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہونا چاہیے شکلا جی! ایسا نہیں ہو گا۔" میری آواز کانپنے لگی۔ شکلا میرے پاس آ کے میری کمر تھپتھپانے لگا۔ "تم نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تم مدراس بھی نہیں گئے۔ وہاں سے کرشنا جی کے تیم کا خط آیا تھا۔ تمھیں اس طرف توجہ دینی چاہیے۔"

"مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ہائیں!" وہ حیرت سے بولا۔ "تمھیں کرشنا جی کے معاملوں سے دلچسپی نہیں ہے!"

"میری سمجھ میں نہیں آتا شکلا جی کہ میں کیا کروں۔"

"تمھیں وہاں جانا چاہیے۔ اگر تم کہو تو تمھارے ساتھ میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کرشنا جی نے ایک بڑی جائداد چھوڑی ہے۔ بیالیس علاقے سے زیادہ وہ مدراس کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس کی ملازمت تو انھوں نے شوق اور لوگوں کی خدمت کے لیے اختیار کی تھی۔ تم جا رہے ہو تو چمپا دیدی اور مس جولین کو بھی ساتھ لے لو۔"

"یہاں کون رہے گا؟" چمپا نے جلدی سے کہا۔ "جولین کو لے جاؤ۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے ظہیر کے لیے شکلا جی کا ساتھ کافی ہے۔ میں گئی تو یہاں چمپا دیدی اکیلی رہ جائیں گی۔ کام ختم کر کے یہ لوگ جلدی ہی آ جائیں گے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میرا جانا مناسب ہوتا مگر اس موقع پر جانا......" جولین چپ ہو گئی۔

میں متفکر رہا۔ شکلا نے دوسرے دن مجھے مدراس چلنے کا حکم سنا دیا۔ میں نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ ظاہر ہے کرشنا جی مجھے جس الجھن میں ڈال گئے تھے، اس سے کسی نہ کسی صورت تو نکلنا تھا۔

دوسرے دن شکلا مقررہ وقت پر آ گیا۔ چمپا اور جولین نے میرا سامان پیک کر دیا تھا۔ چمپا نے میرے بازو میں امام ضامن باندھا اور جولین نے اپنے ہاتھ سے سینڈوچ بنا کے دیے۔ وہ بہت لذیذ سینڈوچ بناتی تھی۔ میں نے کھانے کے اوقات شکلا جی کو سونپ دیے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ہر سفر سے پہلے ایسا ہی ہوتا تھا۔ ریل میں بیٹھ کے میں راستے بھر کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا جاگتا رہا۔ ہر اسٹیشن پر اتر کے میں پلیٹ فارم کا ایک چکر لگا کے واپس آ جاتا۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گزرتے رہے اور مدراس آ گیا۔ کرشنا جی کا تیم اور دوسرے کارندے ہمیں اسٹیشن پر لینے کے لیے آئے۔ جب شکلا نے ان سے میرا تعارف کرایا تو ان کی آنکھوں میں سے آنسو بہہ نکلے۔ تیم نے فوراً میرے ہاتھ چومے اور گلے لگ کے میری ٹھوڑی کو بوسہ دیا اور باقی کارندوں نے پیر چھوئے۔ وہ ہمیں کرشنا جی کے گھر لے گئے۔ کرشنا جی کا سامان، ان کی تصویریں اور علامتیں آنکھوں کے آگے تھیں۔ انھیں دیکھ کے میری طبیعت بوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد تیم نے جائداد کی تمام تفصیلات ہمیں بتانی شروع کیں۔ شہر میں کرشنا جی کے کئی اور مکانات بھی تھے اور نواح میں چند زمینیں تھیں جن کی دیکھ بھال ان کی ماں کرتی تھیں۔ تیم نے کرشنا جی کے متعلق ہمیں بہت سی باتیں بتائیں کہ وہ اپنے باپ کے اکلوتے لڑکے تھے۔ ان کی ایک بہن نوجوانی میں مر گئی تھی۔ یہ ساری جائداد ان کے باپ کی تھی جو کرشنا جی کی شادی کی آرزو میں مر گئے۔ تیم کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے خاندان والوں سے بالکل مختلف تھے۔ باہر رہتے تھے، گھر سے ایک پیسہ نہیں منگاتے تھے۔ گھر آتے تو ایک ایک آدمی سے اس کا حال پوچھتے، بچوں کی خیریت دریافت کرتے اور ہر ایک کی کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرتے۔

بوڑھا تیم کرشنا جی کے واقعات بتاتے ہوئے زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ ان کی عادات، پسند، مشاغل اور ان کی ایک ایک بات بتاتا تھا اور آہیں بھرتا تھا۔ کہتا تھا کہ کرشنا جی نے ولایت جا کے تعلیم حاصل کی تھی اور ہمیشہ کتابوں میں گم رہتے تھے۔ موٹا جھوٹا لیکن صاف ستھرا پہنتے تھے۔ اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتے تھے۔ سادہ اور اچھا کھانا کھاتے تھے۔ تمام ملازم ان کے مدراس واپس آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ اپنی ماں سے محبت تھی اور ماں کو ان سے۔ ابھی ایک گونگی بہری ملازمہ جو کرشنا جی کی ماں کے ساتھ بمبئی گئی تھی، وہ تیم کے لوٹنے کے بعد واپس آ گئی تھی۔ اس نے دونوں ماں بیٹوں کی موت کی تفصیلات سنائیں تو کئی روز تک ہم کے گھروں میں چولہا نہیں جلا۔ ہم دونوں سر جھکائے اس کی باتیں سنتے رہے۔ پھر شکلا اور میں تیم کے ساتھ جائداد کا جائزہ لینے کے لیے شہر کے مختلف علاقوں اور نواح میں پھرتے رہے۔ دو تین دن کہیں شام کو ہم اس کام سے فارغ ہوئے۔ میری حیثیت تو ایک تماش بین کی سی تھی۔ شکلا ہر جگہ تیم سے سوالات کرتا اور کاغذ پر کچھ لکھتا جاتا۔ پھر میرا چہرہ دیکھتا اور میری رائے پوچھتا۔ میں اسے کیا رائے دیتا؟ کرشنا جی نے نہ جانے کیا سمجھ کے یہ سب کچھ میرے نام کیا تھا۔ رات کو تیم وغیرہ ہمیں کمرے میں چھوڑ کے چلے گئے تو شکلا میرے سرہانے آ گیا۔ اس نے متوحش لہجے میں مجھ سے پوچھا: "تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"کس بات کا ارادہ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم نے کل اور آج تمام جائداد دیکھ لی ہے۔ یہ ایک خاصا بڑا کام ہے۔ یقیناً تمھارے ذہن میں کوئی تدبیر ہو گی۔" وہ فکرمندی سے بولا۔

"میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے شکلا جی! میں تو حیران ہوں کہ کرشنا

کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "اب تم انھیں سمجھ لو اور سنبھال لو۔"

"شنکلا جی! ایسی بھی کیا جلدی ہے، اب ہم چل ہی رہے ہیں۔ یہیں! یہاں ان فائلوں کا کیا کروں گا۔" میں نے کسی قدر ترشی سے کہا۔

"تم انھیں جتنی جلدی اپنی تحویل میں لے لوگے میرا بوجھ کم ہو جائے گا۔ وہاں شاید فرصت نہ ہو اور موقع نہ ملے۔ یہاں صرف ہم موجود ہیں۔ بہتر ہے کہ تم تمام فائلیں خوب سمجھ لو اور جو بات بھی مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو، پوچھ لو۔ اس وقت میرے ذہن میں سب کچھ تازہ ہے۔"

"میں کیا پوچھوں گا، آپ نے سب کچھ دکھا دیا ہے، تو ٹھیک ہے۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"آپ مجھ سے یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ نادم کر رہے ہیں۔"

"بات بہت بڑی رقم کی ہے ظہیر میاں! ایسے معاملات یوں بے پروائی سے نہیں برتے جاتے۔ تمام جزئیات سے تمھارا واقف ہونا ضروری ہے۔ تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کہ کتنی رقم بینک میں جمع کرائی گئی ہے؟" اس نے رازدارانہ انداز سے پوچھا۔

"کتنی ہی بڑی رقم ہو، میں نے اس کی خواہش تو کی نہیں تھی۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "اور نہ مجھے کچھ جاننے کی جستجو ہے۔ یہ فائلیں آپ اپنے ہی پاس رکھیے، میں گھر چل کے انھیں آپ سے لے لوں گا۔"

"ظہیر میاں!" شنکلا نے ایک لمبی سانس لی اور تھکاوٹ کے انداز میں مسہری کے سرہانے سے اپنا سر ٹکا لیا۔ "خاصی معقول رقم کی بات ہے۔ تمھارے نام سے بینک میں ساڑھے آٹھ لاکھ روپے جمع کرائے گئے ہیں۔ سمجھے! ساڑھے آٹھ لاکھ روپیہ۔"

"جی!" میرے ہونٹ لرزنے لگے۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ میں شنکلا جی کی تیز سانسیں صاف سن سکتا تھا۔ "مگر میں اس کا کیا کروں گا؟" میں نے منتشر آواز میں کہا۔

"اب سب کچھ تمھاری لیاقت اور ظرف پر منحصر ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کے استعمال میں محتاط رہو گے اور کرشنا جی کی توقعات پر پورے اترو گے۔" شنکلا اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا، میرے کانوں میں جلن ہونے لگی۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ شنکلا مجھے چپ دیکھ کے اپنے بستر پر چلا گیا۔ یک بارگی میرے جی میں آئی کہ میں تمام فائلیں اس کے سر پہ دے ماروں یا اس کے سامنے جلا دوں۔ وہ میرے ظرف کی بات کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ میں اس کی نظر میں ایک عمدہ منتظم ثابت ہو سکوں اور کورا کی نظر میں خود کو گراؤں۔ کرشنا جی نے مجھے سونے کی زنجیر میں جکڑنے کی کوشش کی تھی۔ انھیں اپنی باریک بیں نگاہ سے یہ نظر نہیں آیا تھا کہ میرا تو روآں روآں بندھا ہوا ہے۔ وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ اگر وہ کسی کو عزیز سمجھتے ہیں تو اس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں مگر وہ یہ حقیقت نظر انداز کر گئے کہ ان کی طرح دوسرا بھی کسی کو عزیز رکھ سکتا ہے اور اس کے لیے ان سے بھی زیادہ سوچ سکتا ہے۔

انھوں نے اپنی محبت میں مجھ پر سکے نچھاور کیے تھے تاکہ میں دنیا کی بلاؤں سے محفوظ رہوں حالانکہ وہ خود کہتے تھے کہ سکے دکھوں کی تلافی نہیں کر سکتے۔ وہ خود بھی سکوں سے دور رہتے تھے۔ پھر کرشنا جی نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ بے ہنر آدمی پہ سونے کے پتھر کیوں پھینکے؟ کیا اس لیے کہ میں خود کو کھو دوں گا، نہیں میرے تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ چکے ہیں، ان کا یہ سوچنا بھی ٹھیک ہی تھا۔ میرے ہاتھ پیروں پر واقعی فالج گر گیا تھا۔ جب سے کھڑا ہوا تھا میں نے اپنے ہاتھ پیروں کا کتنے دن کھایا تھا، پہلے جیل میں کماتا رہا، پھر ادھر اُدھر لوگ مجھے بھیک دیتے رہے۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ پکنے لگا۔

صبح ہوتے ہی شنکلا نے تیاری شروع کر دی۔ کرشنا جی کے تمام کارندے ہمیں رخصت کرنے کے لیے ہوٹل میں جمع ہو گئے تھے۔ ہوٹل چھوڑنے سے پہلے شنکلا نے مجھے ایک گوشے میں علیحدہ لے جا کے کہا کہ کرشنا جی کے ملازموں کے لیے بھی کچھ رقم کا اعلان کرنا چاہیے۔ میں نے کہا، جو آپ مناسب سمجھیں کر دیں۔ شنکلا کے ذہن میں اس بات کا خیال شاید پہلے سے تھا۔ اس نے مجموعی طور پہ ۴۰ ہزار روپے کارندوں میں چیکوں کے ذریعے تقسیم کیے۔ کارندے ہاتھ پھیلا پھیلا کے دعائیں دینے لگے اور سسکیوں سے رونے لگے۔ مجھے بھی رونا آ گیا۔ میں نے شنکلا جی سے کہا کہ انھیں اور رقم دے دی جائے مگر انھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔

ہماری گاڑی گھر کے دروازے پہ رکی۔ جولین اور چچا بھاگی ہوئی آئیں۔ دونوں ہمیں دیکھ کے دنگ رہ گئیں اور میرے بازوؤں سے لپٹ گئیں۔ چچا نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور مجھے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے کوئی آیت پڑھ کے میرے سر اور سینے پہ پھونکی۔ کرشنا جی کا سامان ان کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ شنکلا نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے چچا اور جولین کے لیے مدراس سے کپڑے خریدے ہیں۔ چھوٹو ملازم بھی فوراً کام میں لگا ہوا تھا۔ چچا اور جولین صوفے پہ میرے آس پاس دبکی ہوئی تھیں اور شنکلا سامنے کے صوفے پہ بیٹھا تھا۔ جولین شکایت کرنے لگی کہ ہم نے اپنے پہنچنے کی پیشگی اطلاع کیوں نہیں دی۔ انھوں نے ہمیں لینے کے لیے اسٹیشن آنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ گھر آ کے چچا اور جولین کو دیکھ کے مجھے کچھ ہلکا پن محسوس ہوا۔ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شنکلا نے ہم سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ مجھے شنکلا کے ساتھ رہنے کی بہت عادت ہو گئی تھی اس لیے میں کچھ اداس ہو گیا تھا کہ اب وہ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دے گا۔ میں نے اس سے چند منٹ اور ٹھہرنے کی درخواست کی۔ کرشنا جی کے کسی ملازم کو ابھی تک ہمارے آنے کا علم نہیں کیا گیا تھا مگر ہمارے آتے ہی ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ سب ادھر ادھر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ کوئی خیر مقدم کرتا تھا، کوئی مجھے سلام کرنے کا منتظر تھا۔ شنکلا نے جولین سے معذرت کر کے مجھے میرے کمرے میں لے آیا اور تمام فائلیں میرے حوالے کرتے ہوئے ان کی تفصیل سمجھانے لگا۔ یہ بینک کے کاغذات ہیں، یہ جائداد کی رسیدیں ہیں، یہ مکانوں اور زمینوں کے بیع ناموں کی نقلیں ہیں، یہ متفرق کاغذات ہیں۔ وصیت کا فائل یہ ہے۔ میں نے سب کچھ دراز میں ڈال دیا اور شنکلا سے معافی مانگی کہ سفر کے دوران میں میرے منہ سے کچھ باتیں نکل گئی ہوں گی۔ شنکلا نے مجھے خوب زور سے بھینچ لیا اور اس کی آنکھوں کا سارا چہرہ بھیگ گیا۔ "تمھیں جب بھی میری ضرورت پڑے مجھے کرشنا جی کا خادم سمجھ کے بلا لینا۔" اس نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا اور چند لمحوں بعد رخصت ہو گیا۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا تو میرے دل میں آیا کہ میں اسے روک کے کہوں کہ کرشنا جی کی رقم میں سے آپ بھی کچھ لے لیجیے مگر اچھا ہوا کہ یہ بات میری زبان سے ادا نہیں ہوئی ورنہ وہ بہت سبکی محسوس کرتا۔ اس کی نظروں میں میری کیا وقعت رہ جاتی کہ میں اسے گھر سے بلا کے رخصت کر رہا ہوں جب کہ میری دلی خواہش تھی کہ وہ اس رقم میں سے جس قدر چاہے کسی گریز کے بغیر لے لے۔ میرے لیے اس کے بغیر وہاں جانا اور یہ کام نمٹانا ناممکن تھا۔ شنکلا چلا گیا اور جولین چچا میرا سامان کھولنے لگیں۔ انھوں نے میری عدم موجودگی میں میرے بہت سے کپڑے دھلوا لیے تھے۔ میرا کمرہ بھی آئینہ بنا ہوا تھا۔ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے میں ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ دونوں مجھ سے باتیں کرنے کے لیے منتظر تھیں۔ میں نے جولین سے اس کے باپ کی خیریت دریافت کی۔ اس کی حالت کبھی بہت بگڑ جاتی تھی، کبھی سنبھل جاتی تھی۔ جولین اداس ہو گئی۔ چچا نے فوراً موضوع بدل دیا اور مجھ سے مدراس میں کرشنا جی کے خاندان والوں اور ملازموں کا حال پوچھنے لگی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے ان کی جائداد کا معاملہ کس طرح طے کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس ساڑھے آٹھ لاکھ روپے جمع ہو گئے ہیں اور اب میں ایک لکھ پتی آدمی ہوں۔ لکھ پتی تو خیر میں پہلے بھی تھا مگر اب میرے پاس اتنی رقم موجود تھی اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ یہ رقم کس طرح صرف کر رہا ہوں۔ [illegible] شرمندہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ مجھے ہر وقت احساس رہتا کہ یہ دولت اس کی عطا کی ہوئی ہے مگر کرشنا جی ایسے گئے تھے کہ اب ان کی واپسی کا تصور بھی ناممکن تھا۔ میں نے سرسری طور پر چچا اور جولین کو کرشنا جی کے گھر کا حال بتایا۔ انھوں نے پھر بھی نہیں پوچھا کہ مجھے جائداد سے کتنی رقم حاصل ہوئی۔ میں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ جولین کو دیکھ کے سب سے پہلے میرے ذہن میں ماسٹر مادی کا خیال آیا تھا لیکن ابھی تک جولین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ چچا نے بتایا تھا کہ نورین اور رستم جی میری عدم موجودگی میں دو تین بار گھر آئے تھے اور نورین فون کر کے بار بار یہ پوچھتی تھی کہ میں کب واپس آ رہا ہوں اور جیسے ہی میں آؤں انھیں مطلع کر دیا جائے۔ وہ نورین اور رستم جی کی تعریف کر رہی تھی۔ انھوں نے کئی بار پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔

"اور وہ ماسٹر مادی؟ تم نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" میں نے تجسس سے پوچھا۔ "اس نے تمھیں پریشان تو نہیں کیا؟"

"نہیں اِدھر تین چار دن سے تو وہ بالکل نہیں آ رہا ہے۔ شاید کسی طرح پتہ چل گیا ہے کہ تم شہر میں نہیں ہو حالانکہ میں نے ہر ملازم کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ تمھارے بارے میں اس سے کچھ پوچھے تو لاعلمی ظاہر کریں۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ مجھے خط میں اس کے بارے میں تمھیں کچھ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ تم وہاں پریشان ہو جاؤ گے۔ اب جیسے ہی اسے معلوم ہو گا کہ تم آ گئے ہو تو وہ پھر آ جائے گا۔ وہ عجیب آدمی ہے۔ کچھ کہتا نہیں، بس دروازے پہ پکارتا رہتا ہے۔ تمھیں بلاتا ہے اور منتیں کرتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔ میں اسے بُرا بھلا کہتی ہوں، کبھی کہلوا دیتی ہوں کہ گھر میں موجود نہیں ہوں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ عجیب قسم کا آدمی ہے۔ میں تو اسے پہلے سے دیکھ رہی ہوں۔ پہلے تو وہ ایسا نہیں تھا۔ اب اس کا حال بہت خستہ ہے۔"

"میں اس کے پاس ہو آؤں گا۔"

"تم وہاں مت جانا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ کچھ وقت گھر میں جولین اور چچا کی باتیں سنتے سنتے گزر گیا لیکن جیسے ہی رات آئی مجھے بے چینی ہونے لگی۔ چچا اور جولین اس گھر میں موجود تھیں اور وہ مجھے اس طرح برت رہی تھیں جیسے میں اسی گھر کا ایک فرد ہوں اور میں بھی یہاں آنے کے بعد سے پورے اس طرح کی باتیں کر رہا تھا جیسے اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ مجھے ایسا لگا جیسے نجیل اور زرین کمرے میں آ گئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تم نے انھیں کس پاداش میں بھلا دیا؟ انھوں نے کیا قصور کیا تھا، وہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔ نجیل تو یہاں تک کہتا تھا کہ مجھے مستقل طور پر فیض آباد میں زرین کے پاس رہنا چاہیے کیونکہ وہ اکیلی ہے اور اس کا خاندان اس کا دشمن ہے مگر میں وہاں سے چلا آیا کیونکہ زرین اور نجیل بھی کورا کی طرح میرا خیال رکھتے تھے اور مجھے گویا بالواسطہ طور پر مجبور کرتے تھے کہ میرا رویہ بھی ان سے کورا کی طرح ہونا چاہیے مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ کورا تو نہیں تھے۔ اگر میرے نصیب میں کورا ملتی تو کیا کبھی میں کورا کے بغیر یہاں بھٹکتا پھرتا؟ مجھے اس کی غیر موجودگی میں اپنے دوست بنانے کی فرصت کیسے مل گئی؟ مگر کورا ایسی نہیں ہے، اس کے احساسات بہت صاف و شفاف ہیں۔ جیسا اس کا چہرہ ہے اس کا دل بھی ویسا ہے۔ وہ میرے متعلق کسی بدگمانی کے ایک لمحے سے بھی اپنا دل میلا نہیں کرے گی۔ اسے احساس ہو گا کہ میں صرف اسی کے لیے زندہ رہا اور زندہ رہنے کے لیے انسانوں کے درمیان رہنا پڑا ہے۔ آدمیوں کے درمیان ہی رہ کے میں اسے تلاش کر سکتا تھا۔ اب اگر راستے میں کوئی نجیل، کوئی زرین، کوئی راج کرشنا، کوئی جولین اور کوئی چچا مل جائے اور مجھے رستہ دکھائے، پانی پلا کے میری پیاس بجھائے تو کورا کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ انھوں نے اس کی عدم موجودگی میں میرا خیال رکھا۔ میں نے اس کی یادگاروں سے اپنا دل اور اس کا ایک ایک گوشہ سجا رکھا۔

ناشتے کے بعد چچا گھر میں اکیلی تھی۔ جولین اسکول چلی گئی تھی۔ میں

اخبار میں کرشنا جی کی کوئی خبر تلاش کر رہا تھا کہ چھایا نے آہستگی سے مجھے مخاطب کیا۔ "پیارے میاں! دشمن جیتے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اب ہمیں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔"

"ہاں!" میں نے نرمی سے کہا۔ "چھوڑنا تو پڑے گا۔ تم نے کیا انتظام کیا ہے؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے سر اٹھا کے اُسے دیکھا، وہ بُت بنی بیٹھی تھی۔ "تمھیں کچھ تو سوچنا ہوگا۔ اب کرشنا جی نہیں ہیں۔" میں نے ہچکچا کے کہا۔

"یہی تو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"لیکن مجھے کسی گھر کی ضرورت نہیں ہے۔ بات وہی ہے جو پہلے تھی۔ تم اپنا کوئی انتظام کر لو۔ میں اس شہر میں شاید زیادہ دنوں تک نہ رہوں۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" اس نے وحشت سے پوچھا۔

"کہیں بھی۔"

"میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔"

"پھر وہی ضد۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھرو گی۔ اپنی ضد چھوڑ دو۔" میں نے التجا کی۔ "تمھیں معلوم ہے کہ اب تمھارے لیے آگرے یا فیض آباد جانا ممکن نہیں ہے۔ تم نے وہ زندگی ترک کر دی ہے لیکن تم کہیں بھی جا سکتی ہو۔ تمھیں روپوں کی ضرورت ہو تو میں فراہم کر سکتا ہوں۔"

"روپے پیسے کا میں کیا کروں گی۔ تمھارے سوا میرا اور کون ہے۔"

مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ چھایا سے التجا کرنا، اس کے ساتھ مغز مارنا فضول ہے۔ وہ ماننے کی نہیں۔ مجھے خود اس کا کوئی نہ کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔ اس نے پہلے کی طرح آنسو بہانا شروع کر دیا تھا۔ "میں تمھارے لیے کیا کروں؟ کون سی ایسی دعا ہے جو میں نے نہیں کی۔ خدا نے بھی مجھ گنہگار کو معاف نہیں کیا ہے مگر وہ میری سنے گا ضرور۔" وہ بین کرنے لگی۔ "آہ! ایک کرشنا جی کا سہارا ہو گیا تھا، وہ بھی چلے گئے۔ وہ جیتے تو شاید تم اتنے باولے نہ ہوتے۔"

"اور ہاں، تم نے تمام باتیں کرشنا جی کو بتا دیں۔" میں نے تنک کے کہا۔ مجھے اُس کی بات سے خیال آیا کہ یہ وہی تھی جس نے کرشنا جی کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ "تمھیں کچھ احساس نہیں ہوا کہ وہ مجھے کتنا عزیز سمجھتے تھے اور میں نے اُن سے ہر بات چھپائی تھی؟ میں نے تمھیں تاکید کر دی تھی کہ اپنی زبان مت کھولنا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا مگر تم اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکیں۔ نہ جانے تم نے اُن سے کیا کیا کہا ہوگا۔"

"میں نے کرشنا جی کو فہمیدہ کی بات نہیں بتائی تھی۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "جانتا ہی نہ تھا۔ میں نے انھیں اس بابت کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر کرشنا جی مجھے قسمیں نہ دلاتے اور بھگوان کا واسطہ نہ دیتے تو میں اپنی زبان ہرگز نہ کھولتی۔ انھوں نے خدا کا واسطہ دیا تھا۔ تب میری زبان سے اتنا نکلا کہ تمھارے گھر والے تم سے بچھڑ گئے ہیں۔ انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمھارے ابا جان کا نام بتاؤں۔ وہ ان کی تحقیق اپنے ذرائع سے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ بتا

میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ تمھارے لیے بے حد فکرمند رہتے تھے اس لیے مجھے بتانا پڑا کہ تمھارے ابا جان پہلے بمبئی کے کسی محلے میں رہتے تھے۔ جب میں دوبارہ بمبئی آئی تھی تو نور جانی کو بلا کے میں نے تمھارے ابا جان کا پتہ پوچھ لیا تھا۔ وہ جیل میں کولا کی منت سماجت کر کے پتہ پوچھ آیا تھا۔ میں وہاں گئی کہ شاید آس پڑوسیوں سے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے۔ میں مولوی اکرم سے بھی ملی تھی۔ میں نے کرشنا جی کو بتا دیا۔ وہ وہاں گئے اور انھوں نے مولوی اکرم کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ وہ تمھارے ابا جان کا سامان دکھانے پر تیار ہو گئے۔ شکر ہے کرشنا جی کو سامان میں کوئی ایسی کام کی چیز نظر آ گئی ہوگی۔ جب وہ گھر واپس آئے تو مطمئن تھے۔ کہتے تھے کہ میں انھیں ڈھونڈ کر نکالوں گا۔ انھوں نے کبھی میرے بارے میں نہیں پوچھا۔ پوچھتے تو مجھے جھوٹ بولنا پڑتا۔ انھوں نے مجھے جھوٹ بولنے سے بچا لیا۔ پیارے میاں! اب وہ موجود نہیں ہیں لیکن یقین کرو میں نے اُن سے فہمیدہ کے سلسلے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ اور ایک بات بتا دوں، مجھے بہت سے مردوں سے واسطہ پڑا ہے۔ طرح طرح کے مردوں سے ملتی رہی ہوں۔ انھیں سمجھ سکتی ہوں، تم نہیں سمجھ سکتے۔ کرشنا جی ایسے آدمی نہیں تھے کہ انھیں فہمیدہ والا حادثہ معلوم ہوتا تو وہ تم سے نفرت کرنے لگتے۔ اُن کی طبیعت تو سب سے جدا تھی۔ آہ! وہ جیسے چپکے سے دیکھیں چلے گئے۔ خدا نے مجھے کیوں نہیں اٹھا لیا۔"

چھایا نے کچھ اس انداز میں کرشنا جی کا ذکر کیا کہ میرا سینہ بھی ابلنے لگا۔ آنکھوں کا بند ٹوٹ پڑا اور میں چھایا سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ دوپہر کو شکلا کا فون آیا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ شکلا بہت دنوں بعد دفتر گیا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کرشنا جی کے بھیجے ہوئے خطوط کا جواب آ گیا ہو اور ابا جان کا پتہ چل گیا ہو۔ لیکن شکلا میرا حال پوچھتا رہا۔ اس مرتبہ اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ نہ جانے مجھے کیوں تسلی سی ہوئی۔ شاید مجھے شکلا کی زبانی ابا جان کا پتہ جاننا پسند نہیں تھا۔ میری سانسیں نالوں میں آ گئیں تو میں نے اُس سے کرشنا جی کے معاملے کی تفتیش کے متعلق معلوم کیا۔ شکلا کے جواب کا مجھے پہلے سے علم تھا۔ تفتیش کرنے والی ٹیم نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر کے فائل حکومت کو بھیج دی تھی۔ صبح کے اخبار میں بھی کرشنا جی کی کوئی خبر نہیں تھی جیسے وہ اس شہر میں لوگوں کے درمیان کبھی موجود نہ رہے ہوں۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ اچانک فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن مجھے اس اطلاع کی اُس وقت خبر ہوئی جب شکلا کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں اس سے کہہ رہا تھا کہ کسی طرح مجھے کوئی آتا پتہ بتا دو، کوئی اشارہ دے دو۔ میں خود انھیں تلاش کر کے حکومت کے حوالے کر دوں گا یا اپنے آپ ان سے نمٹ لوں گا۔

میں نے طے کیا کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وقت خاصا گزر گیا ہے اس لیے اب مجھے باہر نکلنا چاہیے اور خود کوئی صورت نکالنی چاہیے ورنہ اپنے آپ سے ہمیشہ شکوہ رہے گا۔ دل میں ایک چور رہے گا اور کرشنا جی کے نام پر ندامت سی محسوس ہوگی۔ انھیں معلوم ہو جاتا

کہ کرشنا جی کا پوچھنے والا بھی کوئی موجود ہے۔ میں اس ادھیڑ بن میں گم تھا کہ چھایا اسکول سے واپس آ گئی اور آتے ہی چہکنے لگی کہ آج اُسے پرنسپل نے اُس کی کارکردگی پر شاباشی دی ہے۔ چھایا نے اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ شام ہونے سے پہلے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پہلے کسی طور مکان کا مسئلہ حل کرنا چاہیے۔ حکومت کی طرف سے کسی وقت بھی نوٹس آ سکتا ہے۔ میرے ہوٹل کرکون نے یاد دلایا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ایسا کوئی حکم آنے سے پہلے اپنا انتظام کر لیا جائے۔ جولین تو اپنے گھر جا سکتی تھی مگر چھایا؟ چھایا کسی طور باز نہیں آئی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ میں کرشنا جی کی رقم میں سے کچھ رقم نکال کے ایک مناسب مکان خرید کے جولین اور چھایا کو اس میں بسا دوں۔ مجھے اس شہر میں کچھ عرصے اور رہنا پڑے گا۔ پھر شاید نئے مکان اور نئے ماحول میں چھایا اپنا ارادہ بدل دے۔ میں یہ رقم کرشنا جی کی رقم میں سے قرض کے طور پر نکالوں گا اور جب کبھی توفیق ہوئی واپس رکھ دوں گا حالانکہ یہ بھی میرے ذہن کا ایک واہمہ سا ہے۔ میں یہ رقم خرچ نہ کروں تب بھی اس کا بوجھ میرے سینے پر رہے گا اور میرے سوا اسے کون ہاتھ لگائے گا۔ پھر بھی ارادہ نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ فی الحال جولین کے مکان میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ اس کی اور چھایا کی چھنتی بھی بہت ہے۔ جولین کی موجودگی میں چھایا اور چھایا کی موجودگی میں جولین کا دل بہلا رہے گا۔ میں نے جولین سے اسی وقت کہہ دیا کہ وہ سامان منتقل کرنے کے لیے بھکو سے کہہ دے۔ کچھ ملازموں کی کوشش کر دے کیونکہ ہم زیادہ اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جولین کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگی اور پھر نہ جانے اُسے کیا ہوا، میری طرف لپکی اور میرے دونوں بازو پکڑ کے کپکپانے لگی جیسے میرا ساتھ ایک لمحے کے لیے تو میں سُن ہو گیا۔ جولین کی جھلملاتی ہوئی آنکھیں میری آنکھوں سے بہت قریب تھیں۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ متجسس آواز میں بولی۔

میں نے تیزی سے اثبات میں گردن ہلائی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہاں!" وہ میرے بازو چھوڑ کے فوراً چھایا کی طرف بھاگی اور اس کو لپٹ گئی۔ اُس کے چہرے پر اچانک خون سا سمٹ آیا تھا۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً بھکو کو بلایا اور کرشنا جی کے کمرے کا سامان بہت حفاظت سے پیک کرنے کا حکم دیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ میرا ارادہ نہ بدل جائے۔ اُسے پُرجوش دیکھ کے مجھے اطمینان ہوا اور میرا دل باہر نکلنے کو چاہا۔ میں ان دونوں سے کہے بغیر سڑک پر آ گیا اور سوچنے لگا کہ کس طرف جاؤں! میرے ذہن میں بار بار ماسٹر مانی کا نام گونج رہا تھا۔ مجھے اس کا پتہ یاد تھا۔ میں بس میں بیٹھ گیا اور پوچھتا پاچھتا اس کے فلیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری دستک پر ایک تنا سا سانولا، پستہ قد نوجوان برآمد ہوا۔ اس کا نام خانابادی تھا۔ تمام میری شکل دیکھتے ہی اچھل پڑا اور دروازے ہی سے چلایا۔ "ماسٹر! ماسٹر! اکرم بیرکر میرے کہ کوئی آیا ہے۔"

اندر سے ایک کراہتی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"او سالا! ادھر اپنا کوئی والا استاد آیا ہے۔" بوڑھے نے زور سے صدا لگائی اور بے خفیف لہجے میں کہنے لگا۔ "سالاں جی جب؟"

"سالاں جی جب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "اسے کیا ہوا؟"

"ابھی ادھر کیا بولیں۔" وہ اپنا ماتھا پیٹ کے بولا۔ "ماسٹر ایک دم ٹھاپ ہو گیا ہے۔ آؤ ادھر اس نے آ کر ساتھ کیا لیکن ماسٹر اپنا کام ہو گیا ہے۔"

میں نے اس کی گردن پکڑ کے اسے دروازے سے ہٹایا۔ یہ ایک تنگ تاریک فلیٹ تھا۔ درمیان میں ایک مختصر سی راہداری سے ماسٹر مانی لنگڑاتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اس کا بازو گردن میں لٹکا ہوا تھا۔ ماتھے اور سر پر پٹی بندھی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ "او دیا دی گنگ آ" اس نے پھنسی ہوئی آواز میں نعرہ لگایا۔ "اپن کو ذرا دیکھ رہا ہے۔"

میں نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔ "ماسٹر! یہ کیا ہو گیا؟"

ماسٹر کی گردن جھک گئی۔ میں نے جھنجھوڑا تو وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "بلیک گرینڈ ماسٹر اپن کا اسٹار بیڈ لک ہو گیا ہے۔" وہ اپنے ایک ہاتھ سے میری پنڈلی چھونے لگا۔ "پر تم کہاں تھا! اپن بولا ادھر ٹنڈا لگا آیا۔"

"مجھے معلوم ہے، میں شہر میں نہیں تھا۔"

"اپن کا ٹائٹ تھا کہ تم ادھر نہیں تھا بوت۔"

"مگر یہ کیا ہوا؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"ایکسی کیوزی استاد! ادھر دو ٹکی آن لوگ اپن کو اسٹریٹ میں بوم مارا پھرتا تھا۔ اپن ٹھیک تھا جب سے اپن کرایہ سے آؤٹ آف بانڈ ہوا، اپن کا ماتھا ایک دم ڈاؤن ہو گیا۔ اپن نے تم کو ساری بات پہلے بولا تھا۔ بس ادھر اپن کا دھندا اور ریسٹ کرتا تھا اور وہ کرن کے پاس بڑا ٹنڈا لگاتا تھا۔ اپن نے ویسی جگہ لے لیا تھا کہ جب تک۔۔۔۔"

"بات ختم کرو۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"او ماسٹر! اپن ایم ساری۔" وہ جھینپ کے بولا۔ "اپن مر رہا ہے ایک دم۔۔۔" اس نے اپنے آپ کو گالی دی اور دفعتہ میری چھاتی سے اپنا سر رگڑنا شروع کر دیا۔ "ادھر ماسٹر!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "تم سامنے آیا تو اپن بیاؤ کنٹرول ہو گیا۔ اپن کا بہت انسلٹ ہو گیا ہے ماسٹر! ان لوگوں کو کاٹ دو یا ان کا جان ان ٹو ڈیڈ بچاؤ سٹ۔ انجیکٹ کرو ماسٹر! اپن تمھارا سلیو ہے۔ اوپر سے نیچے تک نوکر۔ کالی وٹیں کرو ماسٹر! یہ ٹنڈا ابھی ادھر کنٹری کا مارا پھو کر آتا ہے۔"

"تم کیا باتیں کر رہے ہو؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "ہاتھ لگنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کیا بمبئی بھر میں تمھیں کوئی دوسرا نہیں ملا؟"

"غلط بات مت ملا ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "یہاں اپن کا بیرٹ نہیں مانا۔ اپن اُدھر کوئی میں آزاد رہتا تھا اور کسی کا ہم کو ادھر گھسنے نہیں دیتا تھا۔ سالا استاد لوگ بھی کچھ سوچ کے ادھر دور رہتا تھا۔ ادھر لوگ ملاتے ہیں

کسی کا مغز پھرا تھا کہ ٹائم کی کرتا۔ بستی میں ایک سے ایک خطرناک علاقہ پڑا ہے۔ اپن اور اُدھر کا گینگ تھا ماسٹر! ابھی اپن اُدھر سے کیسے جانے۔ اپن باہر آ گیا۔ اپن نے ابھی مومینٹ ڈیپاٹ کر دیا تھا کہ یا تو تمہارا سیلوری کرے گا یا پھر سٹیل کھائے گا اور اپن کو باقی چانس اُسی جان تم مل گیا۔ تم مل گیا تو اپن کا وہ ٹیڈا ڈی میں پھر سے جان آیا۔۔۔" وہ بولتا رہا اور میں نے اُسے بولنے دیا۔ مارٹی پہلے سے بہت ہی [illegible] عاجزی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنے عہدے مکمل طور [illegible] میں سے بچ چکا تھا اور اس کی جو حالت اب ہو گی وہ اس جگہ سے ظاہر تھی۔ اس کا [illegible] پہلے سے بہت ابتر تھا فلیٹ میں بڑی بے ترتیبی تھی۔ سیاہ برتن ایک طرف منتشر پڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانے سے فلیٹ میں جھاڑو نہیں ہوئی ہے۔ بچا ہوا سڑا اُدھڑا ہوا تھا اور جگہ جگہ جالے تنے ہوئے تھے جن کو سے مارٹی کراہتا ہوا نکلا تھا۔ وہ بھی کسی جنس سے کم نہیں تھا۔

"مگر یہ کیا کر لیا؟" میں نے اس کے زخموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے ضرور پھر زبان چلائی ہو گی۔ یہ کیا حال کر لیا؟"

"بس لڑائی ہو گیا۔ اپنے علاقے کا چند لوگ اپن کو جانتا تھا اور ایڈا اپن کا گھومنا پھرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ سالا گھورتا رہتا تھا۔ اپن نے اُن سے کوئی چھیڑ نہیں کیا تھا پر ایک دن جب بالکل ٹھوک گیا۔ سالا اپنا چھوکرا لوگ پہلے ہی ایک ایک کرکے بھاگ گیا تھا۔ اُدھر تم بھی نہیں ملا تو اپن سیدھے اُترا۔ اپن میں اپن کا پیٹ پیچھے اُترا اور اپن نے ایک شاپ کیپر سے جھگڑا لگا کر ٹاپ کیپر نے اپن کی بات مان لی پر بعد میں علاقے کے آدمی لوگ سے کمپلینٹ کر دی۔ وہ سالا گالیاں بکتا ہوا اِدھر آ گیا اور اپن سے سارا پیسہ مانگا۔ اپن سب پیسہ خلاص کر چکا تھا۔ اُنھوں نے اپن کو باہر نکال دیا اور۔۔۔۔! باقی اپن کیا بولے۔ اپن کا یہ حلیہ بیچ بول رہا ہے۔ پھر علاقے کا آدمی ادھر آیا اور تڑی مارا کہ اپن کو علاقے کے استاد چھنگا استاد کے پاس جاکے معافی مانگنی چاہیے۔ اپن نے اِدھی ریجیکٹ کر دیا۔ سالا سب اینگری ینگ مین ہو گیا اور علاقے سے دفع ہونے کا آرڈر دیا۔ اپن نے ریکوسٹ کی کہ اپن دو ویک کے اندر اندر چلا جائے گا چھولا ہے نہیں تو کا۔ سالا تھوڑا آدمی کا بچہ تھا مان گیا۔"

"مارٹی کو بہت ملا استاد!" مٹھا پہلی بار درمیان میں بولا۔ "ابھی تو کچھ ٹھیک ہے۔ سالا دو دن تک تو فلیٹ پڑا رہا۔ اپن تو سمجھا مارٹی کلٹی ہو گیا۔ تم کو یہ بہت یاد کرتا تھا۔"

مٹھے نے مجھے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ میرے جواب دینے پر وہ دونوں بھی چپ ہو گئے۔ "یہ استاد چھنگا کون ہے؟" کچھ توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

"یہاں کا دادا ہے۔ سالا اولڈ مین!" مٹھے نے نفرت سے کہا۔

"کب سے اس طرف ہے؟"

"بہت دنوں سے۔ اپن نے جب سے آنکھ کان کھولا ہے اُسے ایسا دیکھا سنا ہے۔ سالا بڈھا ہو گیا ہے پر ابھی بہت جان ہے۔ ایک دم ایکا۔ کے مالک ہے۔"

"یہاں بستی میں تم اور کتنے استادوں کو جانتے ہو؟"

"اپن کو زیادہ میل جول رکھنے کا ٹائم نہیں ملتا تھا۔ بستی بہت بڑا ہے استاد! کچھ کو بس مل جاتا ہے کچھ کا نام سنا ہے۔ اپن جو بھی تھا چھوٹا موٹا اپنے کنٹری کا گینگ تھا۔ اپن کو وہیں سے ٹائم نہیں ملتا تھا۔" مارٹی نے کراہتے [illegible]

"تمہارے باقی چھوکرا لوگ کدھر ہیں؟"

"تمہی بولو وہ کب تک مارٹی کا ساتھ دیتا۔ چھوکرا [illegible]" تھوکتے ہوئے بولا۔ "سب ایڈا اُدھر خوار ہو رہا ہے۔ مارٹی کیا کر سکتا [illegible] سیڈ ٹیم، گوکان لیس فلش۔ ابھی یہ اولی تمہارہ گیا ہے۔"

"کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ میرے ساتھ چل سکو؟" میں نے ایک طویل خاموشی کے بعد کہا۔

"تم اپن کو جیل میں لے چلو۔" وہ جل کے بولا۔

"میرے ساتھ نیچے آؤ۔"

مارٹی کی آنکھیں بھر کے گئیں۔ مٹھا بے ساختہ [illegible] دونوں میرے پیچھے لڑھکتے ہوئے پھوٹ کے سیڑھیوں سے نیچے اور باہر آ گئے۔ یہ کوئی فیشن ایبل علاقہ نہیں تھا۔ تاہم آبادی گنجان تھی۔ سڑک [illegible] چوڑی نہیں تھی۔ اور اس کے دونوں طرف کئی منزلہ مکانوں [illegible] تھیں۔ مارٹی زخمی ہونے کے باوجود سینہ پھلا کے میرے [illegible] اور مٹھا بائیں طرف چل رہا تھا۔ کچھ آگے چل کے مٹھے نے [illegible] میں نے بائیں سمت دیکھا۔ دو آدمی فٹ پاتھ پر ایک کھمبے سے ٹیک لگائے [illegible] گھور رہے تھے۔ میں نے مٹھے سے پوچھا نہیں کہ یہ کون ہیں۔ ان کے چہرے بشروں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ [illegible] لمبے لمبے اور معقول لباس میں تھا۔ ہم اُن دونوں آدمیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ سڑک آگے جاکے مڑ جاتی تھی۔ اِدھر اُدھر تنگ گلیاں تھیں گلیوں میں بڑی بھیڑ تھی۔ ہم دوسری سڑک پر آئے تو مٹھے نے پھر کنکھیوں میں سے نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ تین آدمی ایک جنرل اسٹور کے پاس کھڑے [illegible] جانب اشارہ کر رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی وہ ایک دوسرے سے اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے ہم سے غافل ہوں۔ ہم مختلف سڑکوں سے گزرتے رہے اور کبھی مٹھا کبھی مارٹی مجھے کنکھیاں مارتا۔ کھنکارتا اور آنکھیں چلاتا رہا۔ ہم کہیں ٹھہرے نہیں۔ جب سڑکیں پوری طرح روشنیوں سے جگمگا گئی تھیں تو [illegible] علاقے کے بڑے حصے سے گزر چکے تھے اور راستے میں ہمیں مختلف لوگ [illegible] چکے تھے۔ اِکا دُکا پولیس والے بھی گشت کرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ [illegible] کے زخموں کا خیال تھا۔ اس حالت میں اُسے زیادہ نہیں چلنا چاہیے [illegible] میں نے پیدل علاقہ گھومنا اس لیے مناسب سمجھا۔ شاید 9 بجے ہوں گے [illegible] ہم نے تقریباً تمام سڑکیں طے کر لی تھیں۔ ہم چوک میں واپس آ گئے۔ اس وقت [illegible] نے اچانک میرے کان میں سرگوشی کی کہ ہمارے پیچھے آ رہا [illegible]

[illegible] مٹھے کی بات بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری نظر میں [illegible] کچھ پہلی تھیں۔" وہ اُدھر گلی میں چھنگا استاد کا پاڑا ہے۔" مارٹی [illegible] ہوتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم چوک میں واپس آ کے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی میں ٹھیلے لگے [illegible] تھیں۔ اُن سے تین چار دکانوں کے بعد پان والے کی دکان تھی اور اس سے ایک چھوٹا سا ہوٹل ملحق تھا۔ میں وہیں [illegible] نے مٹھے کو پیسے دے کے پان لانے کے لیے کہا۔ مارٹی اپنا [illegible] چھپائے ہوئے تھا۔ "استاد! دیکھ رہے ہو؟" اس نے میری طرف منہ [illegible] کے کہا۔ میں خاموش رہا۔ سات آٹھ آدمی چاروں طرف [illegible] تھے۔ ہم اُن کی نگاہوں کے احاطے میں تھے۔ مٹھا اُچھلتا کودتا [illegible] آیا۔ میں نے کھایا اور ایک مارٹی کو دیا۔ پان چباتا ہوا میں کچھ [illegible] کھڑے سوچتا رہا۔ وہ لوگ میرے نزدیک نہیں آئے لیکن [illegible] کھڑے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا پھر چوک میں آ گیا۔ وہ لوگ بھی آگے [illegible] اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ جس گلی کی طرف مارٹی نے اشارہ کیا تھا [illegible] چھنگا استاد کا پاڑا ہے، وہ چوک سے قریب ہی تھی۔ ہم آہستہ [illegible] اسی گلی کے دہانے پر پہنچ گئے لیکن اندر جانے کے بجائے [illegible] میں نے دیکھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے آدمی بھی ادھر ادھر [illegible] چھنگا کے پاڑے والی گلی زیادہ روشن نہیں تھی اور گنجان بھی کم تھی [illegible] جیب میں ہاتھ ڈال کے چاقو ٹٹولا۔ پھر میں نے مارٹی کو دیکھا۔ وہ [illegible] کی طرف نظریں جمائے ہوئے تھا۔ میں نے مٹھے کو دیکھا۔ اس کی [illegible] گم ہو چکی تھی۔ وہ بالکل ساکت میرے پہلو میں دبکا کھڑا تھا۔ میں نے [illegible] کے اپنے نزدیک ترین کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ [illegible] میں نے پھر اشارہ کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف بے تابی [illegible] اور سینے پر ہاتھ رکھ کے اشارے سے تائید چاہی کہ میں اُسی کو [illegible] بلا رہا ہوں۔ وہ آتے ہوئے جھجکا۔ آخر اس کے ساتھیوں نے [illegible] آگے حرکت کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ میرے پاس آیا تو [illegible] دائیں اور بائیں سے دو آدمی پھرتی کے ساتھ آ کے اس کے [illegible] کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "مجھے چھنگا استاد کے [illegible] لے چلو۔"

"چھنگا استاد!" انھوں نے تذبذب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "تم کون ہے؟"

"بس اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے نرم آواز میں کہا۔

"تم کون ہے؟" ایک نے سختی سے پوچھا۔

"میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ میں ایک پردیسی ہوں۔ چھنگا استاد کی بہت شہرت سنی ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتا۔ میں [illegible] ملنے آیا ہوں۔"

وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہوئے اور اُن میں سے ایک نے جھڑکتے ہوئے تیوری سے کہا۔ "مگر تم کیوں اس سے ملنا چاہتا ہے؟"

"میں اُسے دیکھنا اور اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ میرے بجائے مارٹی سے مخاطب ہوا۔ "کیا لفڑا ہے؟ تم سالا باز نہیں آیا۔ پھر تُو اِسے بلا لایا۔ بالو! جاؤ! ابھی بات اپن نے خلاص کر دی ہے۔ مارٹی سے کہہ دیا ہے کہ وہ لفڑا اپن نہ کرے۔"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں مجھے چھنگا استاد کے پاس لے چلو۔" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"چھنگا استاد اِس ٹائم کسی سے نہیں ملتا۔ سوچو بیپاری اگر اپن تم کو چھنگا کے پاس لے چلے گا۔ یہ بات مارٹی کی ہے تو تمہارا اُدھر جانا بیکار ہو گا۔ بات نہ بڑھاؤ۔ مارٹی سے کہہ دو کہ وہ آگے یہ حرامی پن نہ کرے۔"

"زبان سنبھال کے بات کرو۔" میں نے تحمل سے کہا۔ "مجھے چھنگا استاد سے مارٹی کی بات بھی کرنی ہے اور اپنی بھی۔ سویرا کس نے دیکھا ہے، تم ضمانت دے سکتے ہو کہ سویرے تک چھنگا استاد زندہ رہے گا یا میں زندہ رہوں گا۔ تم اُسے جاکے بتاؤ، ایک پردیسی اُس سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مارٹی کی بات کرتا ہے بابو! تو اپن سے کر۔ چھنگا استاد سے ملنا ہے تو سوچ لو کہ استاد سالا کوئی زنانہ نہیں ہے کہ پردے میں چھپا بیٹھا ہے۔ تم اُس سے ضرور ملو اور وہ بھی تم سے ضرور ملے گا۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ اُن کی ہچکچاہٹ کا سبب میری سفید پوشی کے سبب ہے۔ وہ مجھے دیکھ کے سادہ لباس والے کے لک میں شمار کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ چاقو میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس اثنا میں اُن کے دوسرے ساتھی تاش کے پتوں کی طرح ہمارے پاس آ گئے تھے۔ "میں استاد سے صرف چند باتیں کرنا چاہتا ہوں، میرے کی بات مت کرو۔ استاد سے جاکے کہو کہ ایک پردیسی آیا ہے۔ وہ منع کرے گا تو میں واپس چلا جاؤں گا لیکن اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میرے ساتھ ایک زخمی آدمی ہے۔ ایک آدھا آدمی ہے اور ایک میں ہوں اور میں اس سے تنہائی میں بات کرنا نہیں چاہتا۔"

میری بات سن کے ان سب نے کھلا کے ایک دوسرے پر دوبارہ نظر کی۔ میں نے ان کے اشاروں کنایوں کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ "کیوں مارٹی!" جو آدمی سب سے آگے تھا، اس نے مارٹی سے جلے بھنے لہجے میں پوچھا۔ "کیا چکر ہے؟"

"مارٹی سے کچھ مت پوچھو۔ کوئی چکر نہیں ہے۔ دو اور دو چار کی بات ہے۔ تم دیر لگا رہے ہو اور میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔" میں نے سرد آواز میں کہا۔

"دیکھو بابو! ابھی چھنگا استاد نے مارٹی کو بخش دیا ہے۔ استاد اس علاقے کا راجا ہے۔ وہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اُس کے علاقے کے باسیوں کو تنگ کرے۔ مارٹی نے جو کچھ کیا، اُس کی سزا اُسے مل گئی۔"

"ہم اس کا جواب تمھیں چھنگا استاد کے سامنے دوں گا۔ تم خیال نہیں کرتے ہو کہ میں چھنگا استاد سے ملنے کی اجازت چاہ رہا ہوں۔ تم خود باتیں نہ بناؤ، اپنا آدمی اس کے پاس بھیجو۔ اگر وہ اجازت نہیں دے گا تو میں زبردستی اس کے پاس نہیں چلا جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ چھنگا استاد منع نہیں کرے گا۔" میں نے جان بوجھ کے اپنا مطالبہ دہرایا۔

"تم کوئی لاٹ صاحب ہو کہ چھنگا اسی وقت تم سے ملے؟"

"اس کا فیصلہ بھی چھنگا ہی کرے گا۔"

"فیصلہ اس کے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔" پیچھے کھڑے ہوئے کسی آدمی نے درشتی سے کہا۔ "جاؤ، بھاڑ میں جاؤ بابو! ورنہ ابھی تمھارا حلیہ بگاڑ دیں گے...."

ابھی اس نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ایک آدمی گلی سے لپکتا ہوا ہمارے پاس آیا اور ہانپتے ہوئے بولا: "استاد بلا رہا ہے۔"

"بلا رہا ہے!" کئی حیرت بھری آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

میں نے ملائی اور ٹھپے کے بال پکڑ کے انھیں آگے کی طرف دھکیلا۔ چھنگا کے آدمی ہمارے آگے پیچھے چلنے لگے۔ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ چھنگا کا اڈا کوئی سو قدم پر تھا۔ پاڑے کے پاس کچی اور نیم پختہ عمارتیں تھیں۔ جس عمارت میں ہم داخل ہوئے وہ اوسط درجے کی دو منزلہ پختہ عمارت تھی۔ باہر کی روشنیاں مدھم تھیں لیکن اندر خاصی روشنی تھی۔ دروازہ مضبوط تھا۔ ایک ڈیوڑھی جیسی جگہ سے گزر کے ہم ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ یہ ایک ویران سا بڑا کمرہ تھا۔ صرف دو چار پائیاں دیوار سے لگی ہوئی تھیں اور کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ عمارت کا کوئی دوسرا راستہ بھی ضرور ہوگا۔ ہماری رفتار تیز نہیں تھی۔ ٹھپے کا چہرہ فق پڑا تھا۔ ملائی بالکل خاموش تھا۔ ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا جیسے بڑے بڑے ملے ہوئے تھے۔ آدھے کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی اور سامنے فرش سے کچھ اونچی پختہ جگہ پر چوکی جیسا ایک بڑا چبوترا تھا۔ چبوترے پر بیک وقت کئی آدمی بیٹھ سکتے تھے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ دری پر تھے۔ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ دیوار پر چھت کے قریب چند روشن دان تھے اور اطراف میں کئی دروازے تھے جو کھلے ہوئے نہیں تھے۔ چبوترے پر فربہ جسم کا ایک سانولا سا شخص مختلف عمروں کے آدمیوں کے درمیان سب سے نمایاں تھا۔ اس کی داڑھی صاف تھی اور باریک ترک دار مونچھیں اوپر کی طرف چڑھی ہوئی تھیں۔ بال کڑھے ہوئے، پیشانی چوڑی، ناک بیٹھی ہوئی اور چہرے پر چاقو کے کئی نشان اور ناک پر ایک کالا سا تل تھا۔ عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوگی لیکن جسم اور چہرے سے وہ زیادہ عمر کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کا قد درمیانہ لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں تیز چمک اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ ہمیں آتے دیکھ کر اس کے سوا سب ہوشیار ہو گئے۔ وہ ساکت بیٹھا رہا۔ میں، ملائی اور ٹھپا آہستہ آہستہ چل کے رک گئے۔ ہمارے ارد گرد اس کے آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ چھنگا نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور انگلی کی خفیف سی جنبش سے ہمیں اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں اور ہاتھ پر بھی دو ایک گہرے نشانات تھے۔ میں نے اس کے بولنے کا انتظار کیا مگر وہ اپنی زبان بند کیے ہوئے مجھے گھورتا رہا۔

"چھنگا استاد!" میں نے معتدل لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ اس نے منہ کھولے بغیر اقرار میں گردن ہلائی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ زبان کھولے۔ تجربے نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ زبان بھی کھلوا لی جائے تو بہتر ہے کیونکہ کبھی کبھی زبان آدمی کا جسم ہوتی ہے۔ "میں اس شہر کا آدمی نہیں ہوں، چھنگا استاد!" میں نے اپنی آواز اونچی کر کے کہا۔ "سنا تھا بمبئی میں ایک چھنگا استاد ہے، ایک علاقے پر ہیبت دلوں سے راج کرتا ہے۔ آدمی سے بات بھی سمجھتا ہے۔ یہ تمام اس نے اپنے بل پہ حاصل کیا ہے۔ چاقو چلانا اسے خوب آتا ہے اور وہ اپنے علاقے تک محدود رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔"

اس کی باچھیں سکڑیں، پھر پھیل گئیں اور پتلیاں متحرک ہو گئیں۔

"کیا بات ہے؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔ اس کی آواز بھاری تھی، کسی قدر غیر متوازن مگر اس میں ایک گرج ضرور تھی۔

"میں تمھارے پاس تمھاری شہرت سن کے آیا ہوں اور تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میری آواز میرے قابو میں تھی۔

"بولو بولو۔" وہ پہلو بدل کے بولا۔ "کیا کام ہے؟"

"چھنگا استاد! ابھی تمھارے ایک آدمی نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میں اس سوال کا جواب چھنگا استاد کے سامنے دوں گا۔ میں اسے ضرور جواب دوں گا لیکن استاد! میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ تم ان لوگوں کے درمیان اس اونچی جگہ کیوں بیٹھے ہو؟"

"کام کیا ہے؟" وہ بگڑ کے بولا۔ "مخول مت کرو۔"

"مخول نہیں چھنگا استاد! میری بات کا جواب دو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "چلو تمھاری طرف سے میں جواب دے دیتا ہوں۔ تم ان سب سے زیادہ اپنی قوت سے اور اپنے بل پر بیٹھے ہو۔ تم نے کئی بار ان پر ثابت کیا ہے کہ تم ان سب سے برتر ہو، جسم کے طور پر بھی، دماغ کے طور پر بھی۔ کیا یہی بات نہیں ہے؟"

اس کی گردن آگے نکل آئی تھی۔ "کام کی بات کرو۔" اس نے گرج کے کہا۔ "صاف صاف بولو، لمبی مت مارو۔"

"میں کام ہی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے لہجے کی شگفتگی برقرار رکھی اور اس پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "آج میں بہت کام کی بات کرنے آیا ہوں۔"

"آگے بولو۔"

"تمھاری پشت پر، تمھارے سامنے اور دائیں بائیں جتنے آدمی بیٹھے ہیں، یہ سب جانتے ہیں کہ تم ان کا جوڑ نہیں ہو۔ اگر تمھارے کسی آدمی کو بھی یہ احساس ہو جائے کہ استاد کی آنکھوں میں دم نہیں رہا، اس کا ہاتھ کپکپانے لگا ہے، اس کے جسم میں پہلے جیسی پھرتی اور اس کے دماغ میں پہلے جیسی

تیزی نہیں رہی تو یہ تمھیں چبوترے سے نیچے اتار دیں گے اور جب تم خود یہ محسوس کرنے لگو گے تو تمھارے لیے عزت اسی میں ہوگی کہ تم ان کے درمیان سے اٹھ جاؤ۔"

چھنگا کے تمام آدمی بے کلی سے کبھی مجھے کبھی اسے دیکھنے لگے۔ چھنگا کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ غصے سے اس کی پتلیاں سکڑ گئی تھیں۔ ماری کھسک کے مجھ سے کچھ اور قریب ہو گیا۔ چند لمحوں تک سکوت طاری رہا۔ پھر چھنگا کی کڑکتی ہوئی آواز گونجی: "تمھارا کوئی پرزہ ضرور ڈھیلا ہوا ہے۔ ابھی پہلے اپنا غم کو دیکھو۔ تم اپنے آپ ہی ایک آدمی کلٹی ہو جاؤ۔ اے! یہ تم کس کو پکڑ لایا!" وہ اپنے ساتھیوں پہ ناراض ہونے لگا۔

تمام آدمیوں میں بھن بھناہٹ ہوئی لیکن میری اونچی آواز سب پر غالب آ گئی۔ "چھنگا استاد! ماری میرا آدمی ہے۔ تمھارے آدمیوں نے میرے آدمی کو اکیلا سمجھ کے مارا۔"

"ماری نے چالاکی کی تھی۔" وہ طیش میں بولا۔

"اور تمھارے آدمیوں نے اتنا بھی خیال نہیں کیا کہ ماری اکیلا آدمی ہے۔ اسے بھی بھوک لگ سکتی ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ماری نے بے اصولی کیا۔"

"میں اسی بے اصولی کی بات تم سے کرنے آیا ہوں۔ سب سے بڑے بے اصول تم ہو کہ تم اب علاقہ سنبھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، پھر بھی یہاں دم دبائے بیٹھے ہو۔" چھنگا ایک لخت چبوترے سے اٹھ گیا۔ اس کے تمام ساتھی بھی کھڑے ہو گئے۔ "چھنگا! تمھارے آدمیوں کی طرح ماری کا بھی ایک استاد تھا اور اب وہ اس علاقے میں آ گیا ہے۔ اصولی اور بے اصولی کا پتہ تمھیں ابھی چل جائے گا۔ تم چبوترے سے نیچے اتر آؤ۔ میں تم پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ تمھارے دن چلے گئے۔ اگر تم عزت کے ساتھ اترنا نہیں چاہتے تو تمھاری مرضی۔" میں نے چاقو اچھالتے ہوئے کہا۔ "میں آ گیا ہوں اور مجھے تم سے یہ علاقہ حاصل کرنا آتا ہے۔"

ایک ساتھ کئی چاقو ہوا میں لہرا گئے۔ کچھ لوگ میری طرف جھپٹے۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "چھنگا! منظور ہے؟" میں نے چاقو کی دھار پہ انگلی پھیری۔ ایک سیاہ شکل کے چھوٹے قد کے آدمی نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے نے فوراً اس کی تقلید کی۔ میں اپنے قدم مضبوطی سے زمین پہ جما چکا تھا۔ میں نے اپنا گریبان اور بازو آزاد کرانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ میری توقع کے مطابق اسی لمحے چھنگا کی آواز گونجی: "ہٹ جاؤ۔" اس کے آدمیوں کو اس کا حکم ماننے میں تامل ہوا۔ چھنگا نے دوبارہ دہاڑ کے کہا: "ہٹ جاؤ۔"

تمام آدمی کسمساتے ہوئے مجھ سے الگ ہو گئے لیکن وہ میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے رہے۔ چھنگا نے پھنکار کے پھر انھیں دھتکارا تو انھوں نے گھیرا توڑ دیا اور کمرے کی دیواروں تک ہٹ گئے۔ یہ حکم دینے کے بعد چھنگا چبوترے سے کود کے کھڑا ہو گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مجھے گھورنے لگا۔

اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ "چھوکرا! ابھی جان ہے تو ایسے چلے جاؤ۔" اس نے اپنی آواز پر ضبط کیا۔ "چاقو سنبھالو۔ یہ لال سندور کھڑا سفید ہو جائے گا اور یہ سفید کپڑا لال ہو جائے گا۔"

"ابھی جاؤ، مجھ کو بھی لگ گیا کہ یاد رکھنا۔ تم جیسا تو چھوکرا! تمھارا تم ایک آسکی رعشق وہ شکی ہے۔ بابے ابھی تم ایدھر کہاں سے آ گیا۔ چھنگا نہیں چاہتا کہ وہ تم پہ ہاتھ اٹھائے۔"

"چھنگا!" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "ابھی تمھاری کوئی آخری خواہش ہو تو بولو۔ چھوکرا اپنے بڑے کو ضرور عزت دے گا۔"

چھنگا گہری سانسیں بھرنے لگا۔ "تم نہیں مانتیں گا!" اس نے ایک سمت منہ اٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے ایک چاقو اچھلتا ہوا چھنگا کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے اسے بڑی چابک دستی سے پکڑا تھا۔ چاقو ہاتھ میں آنے کے بعد چھنگا نے اس کی دھار کا جائزہ لیا اور تمسخرانہ انداز میں بولا۔ "چھوکرا! اپنے اوپر ترس کھاؤ۔"

"تم بہت حکم چلا چکے چھنگا! اب تم بڈھے ہو چکے ہو۔ مجھے تمھاری عمر کا خیال آتا ہے۔ تمھیں ایک بردبار اور تجربہ کار آدمی کی طرح میرے حق میں دست بردار ہو جانا چاہیے۔ یہ جتنے آدمی کھڑے ہیں، میں انھیں تم سے اچھی طرح استعمال کر سکتا ہوں۔ جتنا زیادہ میں ان کا خیال رکھ سکتا ہوں، تم نہیں رکھ سکتے۔ اچھا ہے کہ یہ سب لوگ یہاں موجود ہیں۔ میں حال میں تم پر ہاتھ اٹھانے کو نہیں چاہتا لیکن تم خود اپنی عزت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ سوچ لو۔"

"ہو ہو ہو..." چھنگا نے غضب میں جھٹکا دیا۔ اس کا چاقو تیزی سے گردش کرنے لگا تھا اور ہم میں جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اور پیر پھیلا لیے اور شاید اس بات کا منتظر رہا کہ پہلے میں کوئی جنبش کروں۔ میں نے عجلت نہیں کی اور اس نے توقف نہیں کیا۔ وہ مجھ پر ناراض بلی کی طرح جھپٹا۔ میں نے اسے اپنی طرف بڑھنے دیا اور پلک جھپکنے کی مہلت میں دائیں طرف ہٹ گیا۔ چھنگا فوراً پلٹ پڑا اور اپنی جگہ ایک لمحے ٹھہر کے اور ناک کی سیدھ میں دوبارہ وار کیا مگر اس بار بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں نے اس کے پیچھے جگہ بدل لی اور جب تک چھنگا دوبارہ مجھ تک پہنچتا، میں پھرتی سے گھومتا ہوا کمرے کے درمیان آ گیا۔ چھنگا مجھ پر نگاہ رکھتا ہوا ایک فاصلے پر ٹھہر گیا اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد چند قدم آگے بڑھا۔ پھر ایک دم اس کا جسم تڑپا۔ اس بار اس نے سامنے سے آنے کے بجائے اچانک بائیں سمت گھوم کے وار کرنے کے لیے پر تولے۔ مجھے اس کی زد سے بچنے کے لیے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ اس نے حرکت کرنے کے لیے مجھے معقول وقت دے دیا تھا۔ چھنگا نے پے در پے مختلف زاویے بدلے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے چاقو اور میرے جسم میں ایک انچ کا فاصلہ رہ گیا۔

کمرے میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں نے اب تک چھنگا پر

کوئی وار نہیں کیا تھا۔ درمیان میں کئی موقعے ایسے آئے کہ میں اُس کی کلائی پر ہاتھ ڈال سکتا تھا مگر نہ میں نے اپنے چاقو سے تاک لگائی، نہ اُس کے حملے کا جواب حملے سے دیا۔ میں اِدھر اُدھر اُس کے واروں، جستوں اور جھپٹوں سے بچتا ہی بل کھاتا رہا لیکن کئی موقعوں پر یہ ممکن تھا کہ جب وہ پلٹ کے وار کرنے کے مرحلے میں ہو تو میں درمیان میں حملہ کرکے اُسے گرا دوں۔ میں نے یہ گریز اس لیے کی کہ چھنگا کے آدمی پیش آنے والا کوئی ناخوشگوار واقعہ دیکھیں اور ہر بات کے شاہد ہیں انھیں یہ یقین ہو کہ یہ بھی آسکتا تھا۔ کوئی اچانک سانحہ اُن کے لیے ناقابلِ قبول ہوتا۔ میں نے یہ گریز اس لیے بھی کی کہ جلد ہی میں خواہ مخواہ کام نہ بگڑ جائے مناسب ہوگا کہ چھنگا کو میرے بارے میں اندازے لگانے اور سمجھنے کا موقع مل جائے۔ اُس کی یہ احتیاط اُس کے اپنے ثبات میں لرزش اور غصے میں تنزل کا سبب بن سکتی تھی۔ ہر امکان پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا۔ بہرحال یہ مرحلہ جیسا معاملہ نہیں تھا۔ مرحلے کے وقت مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس وقت میں اپنے حواس میں تھا اور چھنگا کی ایک ایک جنبش میری نگاہ کے دائرے میں تھی۔

شروع شروع میں چھنگا استاد نے جس چستی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اب بھی موجود تھی مگر اب اُس میں ایک بوکھلاہٹ سی شامل ہوگئی تھی اور وہ غالباً اس نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ قوت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اُسے محفوظ رکھا جائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ چھنگا چند داؤں میں نپٹنے کا خواہش مند ہوگا کیونکہ وہ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنی مشاقی اور برتری ثابت کرسکتا تھا۔ اس کے برعکس میرے لیے طوالت مناسب تھی۔ میں طوالت ہی سے اُس کے ساتھیوں کے سامنے اپنی اہلیت ثابت کرسکتا تھا اور وہ میرے بارے میں کوئی مستقل رائے قائم کرسکتے تھے۔ یہ میرے لیے میرے ہاتھ کی آزمائش کا وقت تھا اور اُس کے لیے اُس کی بقا کا۔ اس لیے میں نے معاملے کو طول دیا۔ میں حلقے کے اندر چکر کاٹتا رہا اور چھنگا چاقو لیے میرے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ کئی منٹ اسی آنکھ مچولی میں گزر گئے۔ ننگے چاقوؤں کی موجودگی میں یہ آنکھ مچولی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتی اور ایسی صورت میں چند منٹ گزارنا ایک طویل مدت کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں دوبارہ جیل میں آگیا ہوں اور قریب ہی تجمل کھڑا ہوا مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور میرے مقابل کو اکسا رہا ہے کہ وہ اس طرح وار کرے اور پھر مجھ سے کہہ رہا ہے "لاڈلے! اس داؤ سے بچ کے دکھا۔" چھنگا نے داؤ پہ داؤ آزمائے۔ میں طرح دیتا اور وہ گرفت کرتا رہا۔ وہ تیزی سے بدلتا رہا۔ اس میں مرحلہ وار ہی ہنرمندی نہیں تھی تاہم وہ اپنی صلاحیتیں خوب آزما رہا تھا کیونکہ وہاں جتنے لوگ موجود تھے وہ اُن سب میں ممتاز تھا۔ فربہی کے باوجود اُس کے جسم میں بلا کی تیزی اور لچک تھی مگر شاید اُس کی نگاہ پر چربی چڑھ گئی تھی۔ جو بات میں نے اُس کے اندر دیکھی تھی اور اپنے بارے میں تسلیم کرلی تھی وہ میرے اندر اُس نے دیکھنا گوارا نہیں کی۔ یہ غرور بہت دنوں بعد پیدا ہوا ہے۔

تجمل کا کہنا تھا کہ ہمیشہ یہ غرور رہے تو شطرنج کے میدان میں اترنا چاہیے اگر کچھ پہلے بھنک بھی یا دھوکا کہی پایا ہو اُس نے وہ توجہ نہیں دی جو اُسے دینی چاہیے تو بعد میں نگاہ کا فیصلہ بدلنے کا وقت نہیں ملتا۔ تجمل کا کہنا تھا کہ نگاہ کا فیصلہ بدلنے کے لیے ذہن کھلا رکھنا چاہیے۔ جب خاصی دیر ہوگئی تو میں نے چیخ کر کہا۔ "چھنگا! اب بھی موقع ہے، تم کہو تو میں چاقو پھینک دیتا ہوں۔ مناسب ہے کہ اب کسی کوٹھری میں بند ہو کے پرانے دن یاد کیا کرو۔ ہم بھی تمھاری خدمت کریں گے۔"

جیسا کہ مجھے یقین تھا چھنگا کے غیظ و غضب کا پارہ انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ کسی پاگل کی طرح مجنونانہ میری طرف بڑھا۔ میں اس بار بھاگا نہیں بلکہ میں نے پہلی مرتبہ ہاتھ بڑھا کے اچانک اپنا چاقو اُس پہ تان لیا۔ اس طرح کہ اگر وہ اپنی جھونک میں آگے آتا تو چاقو آر پار ہوتا مگر اُس نے یہ انداز دیکھ کے عین وقت پر پینترا بدل دیا اور چونکہ بہت قریب آ کے اُس نے رکنے اور مڑنے کی کوشش کی تھی اس لیے وہ کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ اگر وہ اُس لمحے زمین پر جھک جاتا تو میرا وار سیدھا اتر جاتا۔ اُس نے میرے چاقو والے ہاتھ کے نشانے سے بچنے کی کوشش میں رخ بدلا تو میری ٹانگ اچانک ٹھیک اُس کی بغل میں پڑی۔ وہ ڈگمگا گیا اور کہیں ایک آدھ ثانیے کے بعد اُسے ہوش آیا کہ اُسے فرش پر لڑھکتے ہوئے دور ہو جانا چاہیے۔ چاقو کے سامنے ایسے مرحلے بار بار آتے ہیں گردن جھکنے، زمین بوس ہونے اور گھٹنے ٹیکنے، دست بردار ہونے سے عزت نہیں گھٹتی بعد میں اس سے ایسا ہی کچھ وہ درمیں لڑھکنیاں کھاتا ہوا میری توقع کے خلاف فرش سے حیرت انگیز طور پر اٹھ گیا۔ اُس لمحے مجھ سے اندازے کی ایک معمولی چوک ہوگئی جب وہ فرش سے اٹھ کے کھڑا ہوا تھا تو مجھے اُس کی طرف جھپٹنا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اپنی جگہ رک کے اُس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ شیطنت کی جگہ پر تھا۔ میں بڑھا تو وہ بجلی کی طرح اپنی جگہ سے حرکت کرگیا اور جو داؤ میں نے اُس پر صرف کیا تھا اُس نے اسی کا بدلہ مجھے بنایا۔ البتہ میں اُس کی ٹھوکر کی زد سے بچنے کے لیے فرش پر جھکتا ہوا آگے نکل گیا تھا۔ میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ مجھے اُس کے جسم کو اسی حد تک نشانہ بنانا تھا جس حد تک وہ برداشت کرسکے۔ اُس کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ یہ اُس کا اکھاڑا تھا اور اُس کے آدمی منٹوں میں میری لاش ٹھکانے لگا سکتے تھے۔

تجمل نے مجھے ایک اور بات بتائی تھی کہ بالکل اچانک بہت قریب جا کے ہی ارادہ بدلنا چاہیے۔ بظاہر کچھ کرتے اور عمل کچھ کرنے کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں بات اتنی ہی ہوتی ہے کہ ارادہ کس لمحے بدلا جائے۔ اگر پہلے بدل دیا تو عموماً بے اثر ہو جاتا ہے۔ اگر سر پر پہنچ کے بدلا تو مقابل کے پاس گڑگڑانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا مگر میں تجمل کے اس مشورے پر اسی وقت عمل کرتا جب مجھے فیصلہ کرنے کی جلدی ہوتی۔ جب ہم دونوں پھر سامنے آئے تو میں نے ہاتھ اٹھا کے اُسے موقع دیا کہ

وہ میرا ہاتھ آسانی سے پکڑ لے۔ اُس نے یہ موقع جانے نہیں دیا۔ جب اُس نے میرا چاقو والا ہاتھ پکڑا تو تماش بینوں میں کھلبلی مچ گئی۔ میں نے مجمعے کی ایک چیخ سنی۔ کسی نے اُس کے شکنجے زور سے دھپ لگا کے زمین پر بچھانے کی کوشش کی تھی۔ چھنگا دوسرے ہاتھ سے میرے جسم پر چاقو اُتارنا چاہتا تھا۔ میں گھوم گھما کے بچانے جھٹکے سے اُس کی مخالف سمت کھنچ گیا اور ایک پل میں یہ صورت ہوگئی کہ وہ اُس طرف میں اِس طرف اور ہم دونوں کے کھنچے ہوئے بڑھتے ہوئے ہاتھ درمیان کے فاصلے پر حاوی آگئے۔ میں نے اُس کے پنجے سے ہاتھ چھڑانے کی ضد نہیں کی بلکہ گھومنے لگا۔ نتیجے میں اُسے بھی میرے ساتھ گھومنے پر مجبور ہونا پڑا اور اُس کی میرے قریب آنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ میں نے اُسے پانچ چھ تیز چکر دلائے۔ ہم دونوں جیسے اسکول کے بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اور اپنے جسم اتنوں کی روانی کے برابر دھری پر رکھے ہوئے فرش پر اچھل کود رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے چکر کی لپیٹ میں تھے۔ چھٹا چکر تھا کہ بالکل اچانک ایک جھٹکا دے کے میں اُس کے قریب ہوگیا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ اٹھا مگر میں اپنا سر اُس کے سینے پر مار چکا تھا۔ اُس کے پنجے سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔ اُس کے قدم اس حربے سے لڑکھڑا گئے لیکن میں نے اُس کے بہکے ہوئے قدموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اُسے سنبھلنے کی مہلت دی۔ وہ تیزی سے اوسان بحال کر کے میری طرف بڑھا اور اُس نے میرے سینے، گال اور شانے پر وار کرنے کے لیے کئی داؤ آزمائے۔ میں جھکتا اور بیلو بچاتا رہا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھا اور جھنجھلایا ہوا تھا۔ اسی عالم میں میں نے اُس کی چھاتی پر ایک بھرپور ہاتھ مار کے اُسے دور دھکیل دیا۔

جب ہم دونوں پھر آمنے سامنے ہوئے تو میں نے اُس کی پیشانی بھیگی ہوئی دیکھی۔ تیز روشنی میں اُس کا پسینہ چمک رہا تھا۔ میرے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ اب خاصی دیر ہوگئی تھی۔ میں نے بے تحاشا ہاتھ چلانا شروع کر دیا۔ وہ اِدھر اُدھر مٹکتا، لچکتا رہا۔ میں نے اُسے ایک پل بھی چین نہیں لینے دیا۔ کئی بار ایسے اسباب ہوئے کہ میں اُس کا جسم لہولہان کرسکتا تھا لیکن میں نے مجبوراً اپنے ہاتھ کھینچ لیے جب کہ وہ میرا جسم ادھیڑ ڈالنے کی فکر میں تھا۔ ممکن ہے اُس کے ساتھیوں نے میری گریز کو میرے کسی اندرونی خوف پر محمول کیا ہو یا وہ میری حماقت پر حیران ہوں مگر میرا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ سب جان کار لوگ تھے۔ اپنے ثانی لینے والوں کو کس سے بہت اذیت ناک کام تھا۔ جب میں نے اچھی طرح اُس کی ہمت کا جائزہ لے لیا تو پہلی مرتبہ میں نے اُس کا بایاں بازو ٹھیک کے وار کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ سمجھ گیا۔ اُس نے جھٹ اپنا زاویہ بدل لیا لیکن چاقو میرے دوسرے ہاتھ میں تھا اور میں نے اُس کے دائیں بازو پر ایک لکیر کھینچ دی۔ خون اُس کا کرتا پھاڑتی ہوئی کہنی تک چلی گئی۔ کرتے پر خون کی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ وہ اچھلا اور بل کھا کے پیچھے ہٹا۔ میں نے کسی تعجب کے خیال کا اظہار کیا جیسے میں اُس کی حالت پر متعجب ہوں۔ میرا چاقو والا ہاتھ گرا ہوا تھا اور میں بھولے انداز میں کھڑا تھا۔ چھنگا میرے لٹکے ہوئے چاقو والے ہاتھ ہی پر جھپٹا۔ میں نے اُسے فوراً بلند کر دیا۔ چھنگا کا ہاتھ میری بغل سے گزر گیا لیکن واپس نہیں آیا۔ میں نے اپنا بازو تیزی سے بھینچ کر کے اُسے دبا لیا تھا۔ اسی لمحے میں نے اپنا چاقو اچھال اور اُسے مارنی کی طرف پھینک دیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے چھنگا کا ہاتھ دبائے اُس کی گردن پر ضرب لگائی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے میری گردن پکڑ رکھی تھی۔ ضرب معمولی نہیں تھی۔ چھنگا کی مسلسل چیخ نکل گئی۔ اُس نے بوکھلاہٹ میں میری گردن چھوڑ دی۔ میں اسی امر کا منتظر تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کے دفعتاً اپنی پوری طاقت سے اُس کے جسم پر ٹکر ماری۔ میری بغل میں دبا ہوا اُس کا ہاتھ کھنچ گیا تھا۔ اُس کی ایک کربناک چیخ بلند ہوئی۔ فرش پر چاقو گرنے کی آواز آئی۔ میں نے اُس کا ہاتھ آزاد کر دیا اور اُس سے علیحدہ ہو کے اُس کی پسلیوں پر تین چار تند ضربیں لگائیں۔ چھنگا فرش پر ڈھے گیا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پھر میں نے اُس کا چاقو فرش سے اٹھا لیا اور اُس کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے نظریں جھکا لیں۔ چتکبرا مارنی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا اور مارنی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ تیز سانسوں اور چھنگا کی کراہوں کے سوا کوئی اور آواز کمرے میں نہیں تھی۔ میں چاقو تانے چھنگا کے پاس آیا۔ وہ فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ کے اُسے کھڑا کیا اور اُس کا چاقو اُس کے آگے کر دیا۔ چھنگا نے مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے اور اُس نے والہانہ طور پر میرے گلے میں اپنے بازو ڈال دیے۔ کمرے میں جیسے کسی نے شور کا بٹن دبا دیا۔ مارنی اور چتکبرا میری کمر سے چمٹ گئے۔ چھنگا کے آدمیوں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا۔

مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ میں جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ جولی اور چیا دروازے پہ کھڑی ہوئی میرا انتظار کر رہی ہوں گی اور ناخنوں نے مجھ کو میری کوشش ہی وار کر دیا ہوگا لیکن یہاں سے جلدی نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میرے اشارے پر چھنگا کے خون آلود کپڑے فوراً بدل دیے گئے۔ اُس کے زخمی بازو پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور اُس کے پیچھے مالش کی جارہی تھی۔ میں خود چھنگا کو چبوترے پر لے آیا تھا اور وہ میری گردن میں ہاتھ ڈالے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر میں چھنگا کے آدمی قریبی چوک کے گل فروشوں کے ہاں سے ہاروں اور گجروں کے ٹوکرے لے کے آ گئے اور چھنگا نے اپنے ہاتھ سے میری گردن ہاروں سے بھر دی۔ میں نے آدھے ہار اتار کے چھنگا کے گلے میں ڈال دیے۔ اُس نے انھیں فوراً اتار دیا۔ پھر وہاں جتنے آدمی موجود تھے وہ ایک ایک کر کے آتے اور میرے گلے میں ہار ڈالتے رہے۔ میں قریب رکھی ہوئی سینی سے ایک ایک لڈو اُن کے منہ میں ڈالتا رہا۔ مارنی میرے دائیں طرف اور چھنگا بائیں طرف بیٹھا تھا اور چتکبرا میری کمر سے چپکا ہوا تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ یہ ہنگامہ ہوتا رہا۔ پھر میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ چھنگا نے مجھے روک لیا اور گمبھیر آواز میں بولا۔ "کہاں جاتا ہے؟ اب اس جگہ ہمیشہ بیٹھے گا یا پھر سویرے چلا جائے گا۔"

"نہیں چھنگا! تم وہیں رہو گے اسی چبوترے پر بیٹھے رہو گے۔"

میں اب چلتا ہوں۔ تم بے شک اس علاقے کے راجا ہو۔ تمھارے ہاتھ میں بجلی بھری ہوئی ہے۔ تم جوان ہو اور کئی جوانوں پر بھاری ہو۔ تم حوصلے کے آدمی ہو۔"

"نہیں راجا! راجا تو تم ہو۔ اپن کو اتنا مت گراؤ۔ اپن اب یہاں نہیں رہے گا۔ یہ جگہ تمھارا ہے۔ تم ہی اس کا مالک ہے اور یہ سب تمھاری چاہت ہے۔ اپن دو ایک دن میں اپنے گاؤں چلا جائے گا۔"

میں نے اس سے بہت اصرار کیا۔ چھنگا نہیں مانا۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ وہ میرا نائب بن کے علاقے میں موجود رہے مگر وہ کسی بات پر آمادہ نہیں ہوا تو ایک دو دن ٹھہرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوا۔ مجھے فوراً دوسرا انتظام کرنا تھا۔ ملنگ میرے پاس ہی بیٹھا تھا لیکن یہ موقع اس کا نام لینے کا نہیں تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر گھمائی اور ایک دراز قد، مضبوط اور توانا آدمی کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے پاڑے کی گلی کے نکڑ پر مجھ سے کہا تھا کہ فیصلہ چھنگا کے ساتھی بھی کر سکتے ہیں۔ وہ میرے پاس آ گیا۔ میں نے بلند آواز میں کہا: "یہ علاقہ تم دیکھو گے جب تک میں مستقل طور پر یہاں نہ آ جاؤں۔" پھر میں نے ادھر ادھر دیکھ کے پوچھا: "کیا کسی کو اعتراض ہے؟"

❤

مارٹی اور ملّا مجھے گھر تک پہنچانے آئے۔ رات بہت گزر چکی تھی۔ جولین اور چمپا دروازے کے قریب ہی پچھلے لان پر بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کے دونوں دیوانہ وار میری طرف دوڑیں۔ میں نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی معذرت کر لی۔ میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ چھنگا کے خون سے میری قمیص سرخ ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے وہیں ایک آدمی سے اسے بدل لیا تھا۔ میرے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جب تک جولین اور چمپا نے میرے ہاتھ پاؤں ٹٹول کے نہ دیکھ لیے ان کی وحشت کم نہیں ہوئی۔ میں نے مارٹی اور ملّا کو بھی اندر بلا لیا۔ ان کا اتنی رات گئے واپس جانا ٹھیک نہیں تھا۔ دونوں جھجکتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور دونوں نے چمپا کے پیر چھو کے جولین کو سلام کیا۔ جولین اور چمپا نے میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھوک نہیں لگ رہی تھی مگر ان کے خیال سے میں میز پر بیٹھ گیا۔ سارا گھر اجڑا ہوا تھا۔ اتنے مختصر وقت میں تقریباً تمام کا تمام سامان باندھ دیا گیا تھا۔ مارٹی اور ملّا مزے لے لے کے کھانا کھاتے رہے۔ میں نے جولین سے اپنے کپڑے منگا کے مارٹی کو پہننے کے لیے دیے۔ پھر میں نے اس کے زخم کھول کے دیکھے۔ زخم معمولی تھے۔ چمپا نے اس کی پٹی بدل دی۔ مارٹی کی آنکھیں بہنے لگیں اور وہ بیٹھے بیٹھے سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے ان دونوں کو اپنے کمرے میں سلا دیا اور خود ڈرائنگ روم میں آ کے لیٹ گیا۔ چمپا سحر ہونے تک جاگتی رہی اور مجھ سے پوچھے بغیر میرا سر دباتی رہی۔

صبح دن نکلنے تک ہم نے مکان بدل لیا۔ حکومت کی طرف سے جو ملازم وہاں تعینات تھے وہ وہیں رہ گئے۔ نجو کو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جولین نے فون پر ٹسکالا کو مکان چھوڑنے کی اطلاع دے دی تھی۔ ملّا اور مارٹی سامان اٹھانے لگے۔ جولین کا گھر کرشنا جی کے سرکاری مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جیسے ہی ہم اس کام سے فارغ ہوئے، میں ملّا اور مارٹی کو لے کے وہاں سے روانہ ہو گیا اور چھنگا کے علاقے میں پہنچ گیا۔ علاقے میں گشت کرنے والے آدمی سڑک ہی پر مل گئے اور ہمیں اپنی معیت میں پاڑے لے گئے۔ چھنگا وہاں سے جا چکا تھا اور وہی آدمی موجود تھا جسے میں نے گزشتہ رات چھنگا کی جگہ مقرر کیا تھا۔ اس کا نام زورا تھا۔ میرے پہنچتے ہی زورا جھوم کے آگے آیا۔ میں نے اسے حکم دیا کہ علاقے کے تمام آدمیوں کو پاڑے میں بلایا جائے۔ پھر میں اس منتظر میں زورا سے علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ دوپہر تک پاڑے کے بڑے کمرے میں علاقے کے تمام آدمی جمع ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر نے رات کا واقعہ نہیں دیکھا تھا مگر اپنے ساتھیوں سے تمام روداد سن لی ہوگی۔ میں نے کوئی زیادہ لمبی چوڑی بات نہیں کی۔ یہی بتا دیا کہ مجھے دو باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ ایک تو لڑکیوں کا اغوا اور دوسرے طوائف بازی۔ جتنی بھی دو چار ہوں جہاں ہیں، ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے علاقے میں چلی جائیں یا انھیں گزر بسر کے لیے اس وقت تک بھتے سے پیسے پہنچائے جائیں جب تک وہ کسی کام دام پر نہ لگ جائیں۔ علاقے سے کوئی لڑکی اغوا نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے اعلان کیا کہ آئندہ سے وصول ہونے والا بھتہ ضرورت کے اعتبار سے تمام آدمیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ استاد کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے علاقے میں زیادہ دنوں تک نہیں رہنا ہے۔ جب بھی ان میں سے کوئی آدمی میری یا چھنگا استاد کی جگہ لینے کے قابل ہوگا، علاقہ اُسے سونپ دیا جائے گا۔ جب بھی کوئی آدمی یہ سمجھے کہ وہ موجودہ استاد سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے، اُسے کسی تامل کے بغیر استاد کو چیلنج کر دینا چاہیے۔ پاڑے میں باقاعدہ ورزشیں ہوا کریں گی اور ہر قسم کے ہتھیاروں کی مشق کی جائے گی۔ آپس میں کوئی اختلاف ہو تو اسے استاد کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

میں دن بھر وہیں رہا تھا۔ پھر میں نے مارٹی اور ملّا کو پاڑے میں چھوڑ دیا تھا۔ اس رات بھی مجھے گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی۔ چمپا اور جولین نے کہا تو کچھ نہیں مگر ان کا نہ کہنا ہی سب کچھ کہنا تھا۔ اسی طرح کوئی بیس پچیس دن گزر گئے۔ سارا نظم منتقل ہو گئے تھے۔ میں نے پاڑے ہی میں لے جا کر بازی اٹھا دی تھی۔ بچے بازی بانے اور مختلف قسم کے داؤ پیچ بتانے شروع کر دیے تھے اور یہ سلسلہ صرف مارٹی تک محدود نہیں تھا۔ دوسرے بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ پاڑے کی عمارت میں رنگ و روغن کرا دیا گیا تھا۔ صرف ایک مہینے میں علاقے کے سارے آدمی چھنگا کا نام بھول چکے تھے۔ وہ میرے اردگرد جمع رہتے تھے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن علاقے کا گشت کرتا تھا اور واپس اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایتیں دیتا تھا۔ شہر کے دوسرے اڈوں کی سرگرمیاں بھی مجھے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جولین اور چمپا نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ رات گئے جب میں گھر واپس لوٹتا تو وہ مجھے جاگتی اور ٹہلتی ہوئی ملتیں۔ حالانکہ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا انتظار نہ کیا کریں۔ ویسے اب انھیں مجھ سے بات چیت کا وقت ہی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ آتے ہی میں اپنے

کمرے میں بند ہو جاتا اور اپنی بلا کے دانے منہ پر بکھیر لیتا۔ کوا چمکنے سے میری آنکھوں میں آ کے بیٹھ جاتی۔ میں اسے اپنی آنکھوں میں بند کیے سو جاتا اور صبح کسی کے جاگنے سے پہلے ہی ناشتے کے بغیر گھر سے نکل جاتا۔ پھر ایک رات ایسا ہوا کہ مجھے پاڑے ہی میں رکنا پڑا۔ اس رات علاقے کے ایک آدمی بسنتا کا پڑوسی علاقے کے ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ چنانچہ مجھے بیل بازار کے استاد بالم خاں کے پاڑے میں داخل ہونا پڑا۔ بالم خاں سے میرا ذکر شناسا ہو گا۔ مارٹی نے مجھے بتایا تھا کہ علاقے کے آدمی میرے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ میں پولیس کا آدمی ہوں۔ کبھی کہتے ہیں کہ میں ان میں سے نہیں ہوں، مجھ پر کسی بھوت یا جن کا سایہ ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ میں نے استاد مستانہ کے اڈے میں گھس کے پولیس کو رپورٹ کر دی تھی اور سارے اڈے کو پکڑوا دیا تھا اور میری ایک بڑے پولیس افسر سے دوستی تھی۔ مارٹی اپنے طور پر ان کی تردید کرتا رہتا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ کسی تردید یا تائید میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ لوگ جو کہتے ہیں انھیں کہنے دے۔ اگر لوگ زیادہ تنگ کریں تو ان سے کہہ دے کہ مستانہ نے ایک نوجوان لڑکی اغوا کی تھی، وہ تھوڑا نہیں تھا اس لیے پولیس کو رپورٹ کر دی گئی۔ اس طرح طرح کی افواہوں اور کہانیوں کے باوجود میرے علاقے کے لوگ چھنگا کے مقابلے میں میری کہیں زیادہ عزت کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے قریب رہنا چاہتے تھے۔

اس رات جب زخمی بسنتا پاڑے میں واپس آیا تو مجھے بالم خاں کے پاس جانا پڑا۔ بالم خاں میری شکل دیکھتے ہی میرا مذاق اڑانے لگا اور مجھ پر ناقابل برداشت فقرے کسنے لگا۔ حالانکہ اس کے آدمیوں نے اس کی زبان روکنے کی بھی کوشش کی مگر بالم خاں، جو گندمی رنگ کا ایک لمبا چوڑا آدمی تھا اور جس کی آواز میں کھنک تھی، اس نے میری بات پر کان نہیں دھرے۔ نتیجۃً بات بڑھ گئی اور اتنی بڑھی کہ بالم خاں چاقو تان کے کمربستہ ہو گیا۔ میں نے صلح کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے دل میں میرے لیے کوئی بڑی نفرت لیے بیٹھا تھا۔ مختصر یہ کہ مجھے اس سے مقابلہ کرنا پڑا اور اسی رات بالم خاں کا علاقہ بھی میرے علاقے میں شامل ہو گیا۔ بالم خاں زخمی ہونے کے بعد علاقہ چھوڑ کے بھاگ گیا۔

بالم خاں کا علاقہ بہت چھوٹا تھا۔ وہ صرف چند گلیوں اور ایک لمبی سڑک پر مشتمل تھا۔ آمدنی بھی معمولی تھی۔ شاید وہ چھنگا کے علاقے پر مدت سے تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے دیکھا تو اسے اپنا پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا مگر بالم خاں صرف دیکھنے کا آدمی تھا۔ محض تین چار واروں ہی میں گہرے زخم کھا لیے اور چلتا بنا۔ میں اس رات گھر نہیں جا سکا۔

دوسرے دن کوئی بارہ بجے مارٹی ہانپتا کانپتا ہوا پاڑے میں آیا اور اس نے خوف زدہ آواز سے میرے کانوں میں سرگوشی کی کہ کوئی علاقے میں آئی ہوئی ہے۔

"کون؟" میں اچھل پڑا۔ "جولین؟"

"ہاں راجا وارنگ!" اس نے گھبرا کے کہا۔ وہاں میرا نام خود بخود راجا پڑ گیا تھا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"اس نے آتے ہی اپنے سے تو ٹوری کہا ہے۔ وہ اپن کا ایڈریس پوچھتی ہوئی اپنے فلیٹ گئی تھی جہاں تم فرسٹ ٹائم آیا تھا۔ ادھر لوگوں نے ایڈریس بھیج دیا۔ اب اپن کو علاقے کا سارا لوگ جانتا ہے۔ ابھی لوٹن پہنچ گیا!"

"اسے تمھارا پتہ کیسے معلوم ہوا؟" مگر فوراً مجھے یاد آیا کہ جب مارٹی مجھے دیا ماں بازار لایا تھا، جولین اس کے ساتھ تھی۔ میں مارٹی کے ساتھ بھاگا بھاگا علاقے کے چوک میں پہنچا۔ اسے ٹیکسی نے ایک جگہ روک رکھا تھا۔ میں اسے اسی وقت علاقے سے باہر لے گیا۔ گھر آ کے میں نے اسے تنبیہ کی کہ وہ وہاں کیوں گئی۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ منہ چھپا کے رونے لگی۔ رات کو چونکہ میں گھر نہیں آیا تھا، اس لیے وہ میری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ میں اس دن گھر ہی رہا کیونکہ جولین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن دوسرے دن وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ اب وہ لمحہ قریب آ رہا تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں نے جولین کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ آئندہ بھی کئی کئی رات گھر سے غائب رہ سکتا ہوں۔ وہ کام کی نوعیت پوچھنے لگی۔ میں اسے کام کی نوعیت کیسے بتا سکتا تھا۔ خود میرا حلقہ میں کہاں گرا تھا۔ میں تو وہاں مجبوراً ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں مجھے ایک آدھ دن پھر پاڑے میں رکنا پڑا تھا۔ دوسرے گھر آتے ہی چمپا اور جولین کی آنکھیں سُونی پڑ گئی تھیں۔ چمپا ابھی تک چپ تھی مگر ایک رات جب میں دو تین دن کے بعد واپس آیا تو وہ بھی تنبیہ کرنے لگی کہ میں چھوٹے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا ہوں اور کرشنا جی کو بھول چکا ہوں۔ "مجھے کام کا بڑا انجام ہوتا ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے التجا کرنے لگی کہ میں غنڈوں اور بدمعاشوں کا ساتھ چھوڑ دوں۔ مجھے اپنے عزیزوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں جلد ہی باقاعدگی سے گھر آنا شروع کر دوں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بعد کے علاقوں میں میری مصروفیت اور بڑھ گئی۔ میں تین تین چار چار دن بعد گھر واپس آتا، میرے کپڑے میلے ہوتے اور میں اپنی صورت دکھا کے یا ایک رات سو کے صبح صبح واپس چلا جاتا۔ جولین کے گھر فون نہیں تھا مگر چمپا مجھے بتاتی رہتی تھی کہ ٹسکالا بھی آتے تھے، مجھے پوچھتے تھے۔ میں نے ٹسکالا کو کہیں سے فون نہیں کیا۔ کرشنا جی کے گھر کے خطوط کا کہیں سے کوئی جواب آیا نہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ کسی بات کا کوئی جواب آ سکتا ہے۔ اگر آیا تو ٹسکالا مجھ سے ملنے کے لیے ضرور آتے۔ ان چھ ماہ میں مسلسل چھ مہینے چھنگا کے پاڑے میں خود کو تماشا بنا رہا۔ پھر کئی کے کئی استاد مجھ سے ملنے کے لیے آئے لیکن میں زیادہ تر اپنے ہی علاقے میں محدود رہتا۔ بہت کم کسی سے ملتا جلتا تھا۔ زورا، چمپا، مارٹی اور ملّا ہر وقت مجھے خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ بالم خاں کا علاقہ شامل ہونے کے بعد میرا علاقہ خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود زورا اور مارٹی کی خواہش تھی کہ اسے اور وسیع کیا جائے کیونکہ یہ بمبئی کے اور بہت سے علاقوں کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ میں نے ان کی بات پر توجہ

نہیں دی۔ وہ جاؤں مجھ سے قریب رہنے کیلئے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔

تین مہینے گزر گئے۔ بمبئی کا تنا ہیں کوئی آقا ایسا ہو جس کے بارے میں مجھے تمام تفصیلات معلوم نہ ہوئی ہوں آخر وہ لمحہ آگیا جب میں نے زورا اور مارٹی کو بلا کے اپنی ایک خواہش ظاہر کی۔ میں نے انھی کے ذریعے تمام معلومات اکٹھی کی تھیں اور یہ کام اُس وقت تک ناممکن نظر آتا تھا جب تک میرے ساتھ کچھ اور لوگ شریک نہ ہوں۔ میں پوری طرح اصل چہروں سے واقف نہ ہو جاؤں۔ غیر متعلق لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور متعلق لوگوں کی نشان دہی کیلئے تمام قسم کے لوگوں کا ساتھ ضروری تھا۔ میرا حلقہ علاقے کے لوگوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ انھیں بانٹنے میں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔ وہاں بستی بھی گھوڑی جاتی تھی اور روز طرح طرح کے کھانوں کی نقل بنتی تھی۔ چھینگے کے دور میں ہر روز کے تفریح روز مجلا ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی مجبوراً بانٹے میں گانا سننے کے لیے طوائفیں لانے کی اجازت دینی پڑی۔ جس رات رقص و سرود کا یہ ہنگامہ گرم ہوتا، میں وہاں نہیں رہتا تھا۔ مارٹی اور منّے کے سوا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کسی میں جرأت بھی نہیں تھی کہ وہ میرا تعاقب کر سکے۔ میں نے زورا، مارٹی، چھیدا اور دوسرے قریبی آدمیوں کو اشارہ کر دیا کہ وہ زیادہ آمدنی والے علاقوں پر نظر رکھیں اور معلوم کریں کہ کون سا علاقہ کن لوگوں سے متعلق ہے۔ یہ کام اُن کیلئے مشکل نہیں تھا۔ بمبئی کے دوسرے علاقوں میں ہر ایک کے لیے تنخواہ اور ہم پیشہ آدمی موجود تھے اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ مارٹی، زورا اور منّے کی زبانی ہر چھوٹی موٹی بات میرے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ وہ مجھے بتاتے تھے کہ کس علاقے میں کیسے متعلق کیا باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ پھر میں نے انھیں تیواری والے کے علاقے کے آدمیوں سے رابطہ بڑھانے کی ہدایت کی۔ وہ تیواری کے چند آدمیوں کو اپنے ہاں لے بھی آئے تھے اور انھیں رات بھر حیدرآباد سے آئی ہوئی طوائف کی نام کا گانا سنواتے اور انگریزی شراب پلاتے رہے۔ میں اُس محفل میں موجود نہیں تھا لیکن تھا بانٹے ہی میں۔

"میں نے زورا اور مارٹی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو صرف چند لمحوں کیلئے اُن پر سکتہ طاری ہوا۔ پھر انھوں نے میرے ہاتھ چوم کے کہا: "راجا جی! تم بولو تو اپن سر کاٹ دے۔"

تیسرے دن تمام کو رات نے وہ علیحدہ علیحدہ بانٹے سے روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے کشتی یا کل گی قوم کا جانشین آئے تھے۔ زورا اور مارٹی کے ہاتھوں میں اب خاص پھرتی آگئی تھی۔ مٹھا اور چھیدا بھی اُن کے ساتھ تھے۔ رات بجتے بجتے وہ امیروں کی اس بستی زورا آبادی میں مختلف مقامات پر چھپ گئے تھے۔ مٹھا کوٹھے کے ڈرم میں گھس گیا تھا۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے وہ یکے بعد دیگرے اپنی اپنی جگہوں سے نکلے اور ایک معینہ مقام پر ایک دوسرے سے مل گئے۔ چھیدا اور زورا کے کندھوں پر چڑھ کے سب سے پہلے مارٹی نے باؤنڈری عبور کی۔ وہ اپنے ساتھ ضروری سامان بھی لے گئے تھے۔ مٹھا باہر ہی رہ گیا۔ زورا، چھیدا اور

مارٹی نے باؤنڈری اُتر کے سب سے پہلے دروازے کا قفل کیا اور تیزی سے چوکی دار کے سر پر پہنچ کے اُسے کچھ دیر کے لیے حرکت اور آواز سے معذور کر دیا۔ پھر وہ کوٹھی کی طرف بڑھے۔

صبح کے اخباروں میں خبر آنا ممکن نہیں تھا لیکن دوپہر تک سیٹھ شمبھو ناس اور اُس کے داماد گردھاری لال کے قتل کی خبر شہر میں پھیل چکی تھی۔ میں گھر سے چار دنوں سے غائب تھا۔ اُس دن سہ پہر کو گھر پہنچا تو جولین بیدار تھی۔ میں چمپا کے ساتھ اُس کے کمرے میں گیا تو اس نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ میں نے بے اختیار اُس کی پیشانی چوم لی۔ وہ ہاتھ کے بیچ میں اور میرے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں حیران رہ گیا۔ چمپا نے مجھے بتایا کہ تین دن پہلے اُس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا سر چکرانے لگا۔ جولین نے میرے ہاتھ بھگو دیے تھے۔ پتہ نہیں کس وقت چمپا مجھے اُٹھا کے میرے کمرے میں لے گئی۔ مجھے رات بھر کوئی سدھ بدھ نہ رہی۔ صبح ہوئی تو چمپا نے مجھے جگایا۔ دھوپ چڑھ آئی تھی۔ مجھے فوراً بانٹے جانے کا خیال آیا۔ ابھی شمبھو گروپ کا ہر فرد وہ تیواڑی والا موجود تھا۔ میرا بانٹے جانا ضروری تھا۔ چمپا نے میرا اضطراب دیکھ کے جھجکتے جھجکتے کہا: "ایک آدمی باہر بیٹھا ہوا تھا۔ انتظار کر رہا ہے۔"

"میرا انتظار کون ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"باہر جا کے دیکھ لو۔" چمپا ڈری ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے چادر ایک طرف پھینک دی اور بستر سے اُچھل کے نیچے آیا۔ جب میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچا تو میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ جگل میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں سمجھا یہ فریب نظر ہے۔ میں ابھی تک سو رہا ہوں مگر اُس کا دل قامت سراپا میری آنکھوں سے دور نہیں ہوا۔ وہ اُٹھا۔ کمرے کے وسط میں میز کے پیچھے کرسی پر جما ہوا بیٹھا تھا اور تیز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ چوکھٹ پر میرے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ اُس کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ مجھ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکا۔ میں دروازے ہی پر ٹھٹکا ہوا آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ پھر مجھے اُس وقت خبر ہوئی جب میں اُس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ اس نے مجھے زور سے جکڑ رکھا تھا۔ ہم دیر تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔ میں نے اپنی آنکھیں بھینچ لی تھیں مگر آنسو پھوٹ پڑے اور میرا سر اُس کے کندھے پر تڑپنے لگا۔ جگل نے یک لخت مجھے اپنی چھاتی سے ہٹا دیا اور میرے بازو پکڑ کے مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کی نظروں سے بچنے کے لیے میں نے دوبارہ اُس کے سینے میں سر چھپانا چاہا مگر اچانک ایک دھماکا سا ہوا۔ قدم زمین سے اُکھڑ گئے اور میں ایک طرف جھک گیا۔ جگل نے اُلٹے ہاتھ سے میرے گال پر طمانچہ رسید کیا تھا۔ میں ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اُس نے دوسرا طمانچہ لگا دیا۔ میں نے مضبوطی سے اپنے پیر زمین پر جمانے کی کوشش کی تاکہ اگلے طمانچے

لگنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں روکا۔ وہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگا اور اُس نے ایک جھٹکے سے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

"لاڈلے جانی!" اُس کی کراہتی ہوئی آواز اُبھری۔ "دیتا بھی سے بچالا ابھی ہے۔"

"ہاتھ کیوں روک لیے جگل بھائی!" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"تو نے ہاتھ پیر پھیلا دیے۔" وہ منہ پھیر کے بولا۔

میں نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "ہاتھ مت روکو۔ مارو، خوب مارو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میری سانس نکال دو۔"

"ہاتھوں میں جان ہوتی تو اتنی دیر نہ لگتی لاڈلے!" وہ میرے سر کے بال جھنجوڑتے ہوئے مضطرب لہجے میں بولا۔ "تیرا دل پتھر کا بنا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے اُسے نوچ کے پھینک دوں۔"

"تو نوچ لو نا۔" میں نے جذباتی انداز میں کہا۔ "دیر کیوں کرتے ہو۔ ایک ذرا سی ہمت کر لو۔ پھر یہ آزار ہی ختم ہو جائے گا۔ مجھ سے بھی اب یہ ہمت نہیں ہوتا۔ میں اپنا ہی کریکا سینہ چھپانے کے لیے لوگوں سے دور رہتا ہوں۔"

"چپ رہ۔" وہ شکستہ آواز میں چلایا۔ "دنیا میں آدمی اکیلا نہیں ہوتا لاڈلے!" اُس کی آواز ڈوبنے لگی۔ "سب کچھ تجھی پر نہیں ہے کہ تو کیا چاہتا ہے۔ دوسروں پر بھی ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں تو نے کیا پڑھا لکھا ہے۔ کتابوں میں تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔"

"میں نے کچھ نہیں پڑھا لکھا۔ میں بالکل جاہل ہوں، جنگلی ہوں، کتّا ہوں۔ ہاں! مجھے اس دنیا میں نہیں رہنا چاہیے۔"

جگل کے طمانچوں اور آواز کی گرج سن کے بیمار جولین بھی چادر لوٹتے ہوئے بستر سے اُٹھ آئی تھی اور چمپا کے پہلو میں سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ "اگر آپ لوگ بیٹھ جائیں۔" اُس نے لرزیدہ آواز میں ہمیں ٹوکا۔

جگل چونک کے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے میرے بازو چھوڑ دیے اور میری گردن میں باہیں ڈال کے گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ "تو نے پلٹ کے خبر بھی نہیں لی بادشاہ!" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ منٹ گزر گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو اُبل رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ "تم یہاں کیسے آگئے؟" میں نے رندھی ہوئی آواز میں دھیمی سے پوچھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ جگل اُس گھر میں آیا ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ یہ میرا گھر تو نہیں مگر جگل نہ جانے کتنی دور سے چل کے میرے پاس آیا ہے۔ اُسے دیکھ کے میری زبان گنگ ہو گئی تھی اور اس کے بعد اُس نے مجھے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

"آ گیا۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آخر پہنچ ہی گیا۔"

"لیکن تم... تم کیوں آگئے؟"

"چلا جاؤں گا لاڈلے!"

"نہیں نہیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "میرا مطلب..."

"تیرا مطلب کچھ بھی ہو۔" وہ میری بات کاٹ کے پژمردگی سے بولا۔ "میں تجھے دیکھنے آیا ہوں، خود کو تجھے دکھانے نہیں آیا۔ تو کہے تو چلا جاؤں گا۔"

"نہیں جگل بھائی!" میں نے اضطراب سے کہا۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تم غلط سمجھے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تم اپنی پیشانیاں بڑھانے یہاں کیوں آگئے؟ میں نے پہلے ہی تمھیں کون سا خوش رکھا تھا۔"

"جانے دے۔" وہ ہاتھ جھٹک کے بولا۔ "طعنے مت دے۔ تو بالکل نہیں بدلا۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا۔ "تو تو وہی ہے، وہی لاڈلا لاڈلا جا۔ کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ تو اپنے بھاگنے کے بعد یہاں موجود نہیں ہوگا۔ تو تو ہر وقت وہیں تھا۔ تیری سب چھاپیں تو وہیں رہ گئی تھیں۔ کوٹھے! اُسے بھی ساتھ لیتا آتا۔" وہ میرے بال کھینچنے لگا۔ "تو پوچھے کیسے نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے تیری کون سی بات ٹالی تھی۔ برس لگنے کو آ رہا ہے۔"

"مجھے جانا تھا۔" میں نے رکتے رکتے کہا۔

"جانا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھے جانا ہے۔ تیرے پیروں میں زنجیر پڑی ہے۔ پر تو کچھ دیر بعد جا سکتا تھا اور جا کے واپس آ سکتا تھا۔ مجھے صرف اپنے پیروں کی زنجیر کیوں دکھائی دیتی ہے۔ تو نے... تو..." چمپا کو سامنے کھڑا دیکھ کے اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ مسرور اُٹھی۔ چمپا کے پیچھے جولین دبکی کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔

"آپ بیٹھ کے ناشتہ کر لیجیے۔" چمپا نے جھجکتے ہوئے مداخلت کی۔

"ناشتہ؟" جگل بست بنا کے بولا۔ "نہیں بھئی۔ ہم ہوٹل سے فرسٹ کلاس کر کے آئے ہیں ناشتہ نہیں۔ پر ہاں لاڈلا اب ناشتہ کرے گا۔ چل اٹھ۔" وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "کچھ کھا لے۔"

"مگر آپ... آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ سیدھے اسٹیشن سے یہاں آ رہے ہیں۔" چمپا نے دبی آواز میں کہا۔ "آپ بیٹھیے۔"

"کھانے پینے کا کسے ہوش ہے بائی! اپنا ناشتہ تو اسے دیکھ کے ہی ہو گیا۔" وہ میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اس سے پوچھو، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ کھاتا پیتا ہی نہیں ہے۔ کیسا دبلا ہو گیا ہے۔"

"باہر جو لوگ کھڑے ہیں انھیں بھی اندر بلا لیجیے۔" جولین نے جھکتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔ "یہ گھر اُنھیں کا ہے۔" جولین کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔

"باہر کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ۔ دو تیرے دو ایک جاننے والے ہیں۔" جگل بے پروائی سے بولا۔ "انھیں باہر ہی رہنے دے۔ یہ گھر ہے، بازار نہیں ہے۔"

"کون کون ہے؟" میں نے تیزی سے اُٹھتے ہوئے کہا اور جگل کے جواب دینے سے پہلے دروازے کی جانب بھاگا۔ کان کے باہر کرسیاں ڈالے

گردن جھکائے فیض آباد کے استاد جامو اور کالتے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے دیکھا دونوں مجھ پر جھپٹ پڑے۔ جامو نے مجھے اوپر اٹھا لیا۔ کالتے اپنا سر میرے سینے پر مارنے لگا۔ انھوں نے راہ گیروں کی پروا بھی نہیں کی۔ "چلو، چلو اندر چلو۔" میں نے انھیں کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکے مگر میں انھیں اندر جولین کے گھر کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہ دونوں تجمل کے پاس مبارک باد کا شور مچاتے ہوئے آگئے۔ انھوں نے مجھے پاس ہی بٹھا لیا۔ وہ کبھی مجھے گھورنے لگتے، کبھی مسکرا اٹھتے۔ یہ دیکھ کے جولین کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ وہ ہم سب کو جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اب کوئی پردہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ جولین نے بہت کچھ سن لیا تھا۔ تجمل، جامو اور کالتے کے چہرے ایسے نہیں تھے جنھیں اتنی عمر کی لڑکی نہ پہچانتی ہو۔ اسے میرا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔ تاہم وہ بہت خوش خوش نظر آ رہی تھی جیسے اس کے عزیز رشتے دار آ گئے ہوں اور وہ اپنے باپ کے مرنے کا غم بھول گئی ہو۔ وہ بار بار اندر جاتی تھی اور چند لمحے بھی نہیں گزرتے تھے کہ واپس آ جاتی تھی۔ اندر اس کی ماں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس کے اصرار پر ہم سب گول میز کے گرد بیٹھ گئے۔ یہ میز وہ اپنے پرانے گھر سے ساتھ لائی تھی اور چار ہی آدمی اس کے اطراف بیٹھ سکتے تھے۔ میز پر بہت اہتمام تھا۔ اتنی سی دیر میں یہ سب چیزیں تیار ہو گئی تھیں۔ بھاجی بھی تھی، پوریاں بھی تھیں، مٹھائی بھی تھی، بسکٹ، ٹوسٹ اور مکھن بھی کچھ موجود تھا۔ جب جھپا چائے دانی لے کے آئی تو جامو نے آہستگی سے پوچھا: "کیسی ہو جھپا بائی؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تم تو بالکل بدل گئی ہو۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"چپ رہو جامو!" تجمل نے تلخی سے کہا۔ "فضول باتیں مت کرو۔"

جامو نے کلبلا کے گردن جھکا لی۔ ناشتے کے دوران میں خاموشی رہی۔ کسی نے کچھ کہا نہیں۔ انھوں نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ انڈیلے اور ڈرائنگ روم میں میرے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے۔ تجمل نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا تھا۔ میرے آنسو تھم گئے تھے لیکن حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر تجمل کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بمبئی میں ہوں اور اس جگہ رہ رہا ہوں؟ اسے میرا پتہ کس نے بتایا؟ مجھے اندازہ تھا کہ اب کیا ہوگا۔ تجمل میری انگلیاں ٹٹول رہا تھا اور بار بار مجھے دبوچ لیتا تھا۔ جامو اور کالتے نے کچھ بولنا چاہا تو تجمل نے پھر انھیں جھڑک دیا۔ "استادوں نے تو زبان پہ تالا لگا لیا ہے۔ تو ہی کچھ بول لاڈلے! تجھ پہ کیا بیتی؟ تو اتنے دنوں کہاں رہا؟"

"کالتے!" تجمل نے مشتعل ہو کے کہا۔ "لاڈلے کو پریشان نہ کر۔ میں جانتا ہوں یہ تجھے کچھ نہیں بتائے گا۔ یہ بڑا گنیوں ہے۔ سب کچھ اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔ اسے مت چھیڑ۔"

لیکن یہ زبان بندی کتنی دیر کی تھی۔ مجھے دیکھ کے ان کے ذہنوں میں بے شمار سوال اٹھ رہے ہوں گے۔ یہ فیض آباد کی جھپا بائی ہے جس کے کوٹھے پر میری بہن ناچتی تھی اور جو میرے خوف سے فیض آباد سے بھاگ کے اپنی بہن موتیا بائی کے پاس آگرے چلی گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ اور یہ خوب صورت لڑکی کون ہے جو آتی ہے تاکی سے ان لوگوں کو دیکھ رہی ہے۔ یہ گھر کیسا ہے جہاں میں بیٹھا ہوں اور اگر مجھے گھر ہی بنانا تھا تو تجمل اور زرین نے کیا بگاڑا تھا۔ جلد یا بدیر مجھے بہت سے سوالوں کے جواب دینے تھے۔ مجھے بتانا تھا کہ میں نے زرین کے ہاں سے آنے کے بعد کیا حاصل کیا اور جب میں نے کچھ حاصل نہیں کیا تو واپس کیوں نہیں آیا؟ وہی سوال و جواب، وہی کیوں اور کیسے۔ میرے پاس ان کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ مجھ سے تو آئینے کے سامنے بھی نہیں جایا جاتا۔ میں ان کے سامنے اپنے زندہ رہنے کی کیا وضاحتیں پیش کر سکوں گا۔ میں انھیں کیا بتاؤں گا کہ جو کچھ جو تار دیا، وہ تیر اڑانے کے بغیر ہو گیا۔ گاڑی میں کرشنا ہی مل گئے حالانکہ ساری گاڑی آدمیوں سے بھری ہوئی تھی اور اب جب اس شہر سے نکلنے میں چند ہی روز یا چند ہی ہفتے کا کام باقی رہ گیا تھا تو وہ آ گئے۔ مجھے یہاں کون سا ہیرا ملا تھا۔ مجھے تو آگے جانا تھا کیونکہ جب بھی میں کہیں کچھ دیر کے لیے ٹھہرتا، جی گھبرانے لگتا تھا۔ اسی لیے میں نے عہد کر لیا تھا کہ اب کوئی کرشنا ملے یا کوئی زرین یا کوئی جولین نظر آئی تو میں فوراً راستہ بدل دوں گا لیکن اب وہ آ چکے تھے۔ تجمل آ گیا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں میں زنجیریں پہنانے آ گیا تھا۔

"آپ لوگ بتائیں تو...... آپ کا سامان کدھر ہے؟" جولین نے متذبذب آمیز شائستگی سے پوچھا۔

تجمل نے سر اٹھا کے شاید پہلی بار جولین کو غور سے دیکھا۔ وہ دوہری ہو گئی۔ "یہ کون ہے لاڈلے؟" وہ سرگوشی میں بولا۔

"یہ جولین ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جولین!" اس نے تجسس سے دہرایا۔

"ہنھ۔" وہ کسمسا کے رہ گیا اور جولین سے مخاطب ہو کے نرمی سے بولا: "ہمارے پاس کوئی سامان واماں نہیں ہے۔ تم ہماری فکر مت کرو، اپنے گھر کا کام کرو۔"

"مگر آپ یہیں رہیں گے۔" وہ نیچی نظروں سے بولی۔

تجمل چپ رہا۔ جولین اس کے جواب کی منتظر تھی کہ دفعتاً دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ مارٹی اور ٹمٹا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت ان کا آنا بے سبب نہیں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس کے دادا گردھاری کے قتل کی خبر صبح کے اخباروں میں شائع ہو چکی ہوگی۔ ایک ساتھ بہت سے وسوسوں نے میرے دماغ پر یورش کی۔ میں نے تجمل کے ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑائی اور اچھل کے

دروازے پر جا پہنچا۔ وہ مارٹی اور ٹمٹا ہی تھے۔ دونوں حواس باختہ تھے۔ انھیں اندر آنے سے روکنے کے لیے میں خود باہر چلا گیا۔ "راجا ڈارلنگ! وہ سالا پولیس لیفٹ رائٹ کر رہا ہے۔ وہ اپن کے اڈے کا کوئی جنٹلمین سمجھ کے لے گیا ہے۔" ٹمٹا خوف زدہ آواز میں بولا۔

"زورا اور چھیدا کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں ابھی باہر ہے۔" مارٹی نے آنکھ دباتے ہوئے جواب دیا۔ "پھر دوسرے اڈے کا بھی کوئی لوگ پکڑا گیا ہے۔ راجا جی، ابھی جلدی سے چلو۔ زورا اور چھیدا بولتا ہے کہ اس ٹائم استاد کو پاس سے ہٹنا ہونا مانگتا۔"

"مگر میں..." میں نے پریشانی سے کہا۔ "میں ابھی نہیں جا سکتا مارٹی! ابھی کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ چھیدا اور زورا سے بولو کہ وہ اڈے سے ہی کہیں باہر نکلیں۔ جیسے ہی موقع ملا، میں ادھر آتا ہوں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے مارٹی!"

"گیسٹ سے کام کا کم کے تھوڑا ٹائم کے لیے اودھر چلو راجا! پیچھے آدمی پکڑنے کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

"مجبوری ہے مارٹی! وہ ایسے مہمان نہیں ہیں۔"

"کون لوگ آ گیا؟" وہ حیرت سے بولا۔

"کچھ پرانے لوگ آ گئے ہیں۔ میں نے اسی لیے آج تمھیں اندر نہیں بلایا۔" میں نے دروازے کی جانب دیکھ کے کہا۔ "مارٹی! تم اس وقت چلے جاؤ۔ میں زیادہ دیر تمھارے پاس ٹھہر گیا تو ان میں سے کوئی بھی باہر آ سکتا ہے۔"

"تم آج کیسا بات بولتا ہے راجا ڈارلنگ!" مارٹی نے تجسس سے پوچھا۔ "ایسا کون لوگ ہے؟ ابھی تم سمجھا کرو راجا! وہ سالا تیواری لوگ ایک دم چوپٹ ہو گیا ہے۔ شک پڑا تو وہ ادھر آ کے گڑبڑ کر سکتا ہے۔ وہ سالا ہر علاقے میں جا کے ٹوٹنے لگا کہ کون مائی کا لال نے ان کا گرینڈ فادر کا قتل کر دیا۔ ابھی تمھارا جوڑا اور وکیل مری ہے۔ تم شام سے چلا گیا تھا۔ ادھر بول رائٹ غائب ہوا۔ اب تم اودھر نہیں جائیں گا تو زورا اور چھیدا بھی......"

مارٹی نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ دفعتاً کسی نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ میں گھبرا کے مڑا تو ٹمٹا اچھل پڑا۔ "ا..." ٹمٹا کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ تجمل باہر آ گیا تھا۔ "کیا بات ہے لاڈلے؟" وہ کرخت آواز سے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے جھینپ کے کہا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ ماسٹر مارٹی اور ٹمٹا ہیں۔"

"کیا چکر ہے؟" وہ ترشی سے بولا۔

"کوئی چکر نہیں ہے۔" میں نے ناگواری سے جواب دیا۔

اس نے مارٹی کی گردن دبوچ لی۔ "کیا ڈراما ہے ماسٹر؟"

مارٹی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "راجا استاد!" اس کی گھٹی ہوئی آواز نکلی۔ اس کا سارا جسم پھڑکنے لگا تھا۔

"راجا استاد!" تجمل نے برجستگی سے دہرایا اور مجھ سے پوچھا۔ "لاڈلے! یہ کون لوگ ہیں؟"

"میرا اڈے کے لوگ ہیں۔"

"کون سے اڈے کے؟ تیرا ان سے کیا ناتا ہے؟ یہ تجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟" تجمل کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اس نے ساری کچھ باتیں سن لی ہیں۔

"اڈے پر!" میں نے آہستگی سے کہا۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ تم اندر جا کے بیٹھو۔ اس بیچ میں دخل نہ دو۔"

"لاڈلے!" وہ یکایک گرج کے بولا۔ "زبان سنبھال کے بات کر۔"

"کوئی بات نہیں ہے، تم تو خواہ مخواہ......" میں نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا۔ "یہ میرے ساتھی ہیں۔ انھوں نے میرا ساتھ دیا ہے۔ تمھیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ تم کیوں......"

"میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" وہ بلند آواز سے بولا۔

"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ معمولی بات ہے۔ میں ابھی تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم اندر جاؤ۔"

"کدھر ہے تیرا اڈا؟" تجمل نے مارٹی کے گلے پر گرفت سخت کرتے ہوئے پوچھا۔ مارٹی چیخنے چلانے لگا۔ "راجا جی! راجا استاد! ابھی اپن کیا بولے؟"

ٹمٹا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ "اسے چھوڑ دو تجمل بھائی!" میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی پوری کوشش کی۔ "اسے چھوڑ دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"قصور کس کا ہے؟ یہ تو میں تجھے بعد میں بتاؤں گا جب تیری انگلیاں پھونک کے حساب لوں گا۔" وہ طیش میں بولا۔ "میں نے سنا تھا تو مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ بتا یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "تم نے کیا سنا تھا؟"

"میں اگر کچھ اور سنتا تو تیرے پاس کبھی نہ آتا۔ مگر میں...... میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"تمھیں پوری بات معلوم نہیں ہے۔"

"وہی تو میں تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تمھیں ہر بات بتا دوں گا۔" میں نے تلملا کے کہا۔ "انھیں جانے دو۔ انھیں کیوں روکتے ہو؟"

"مہمان کے سامنے منھ کھولتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے؟"

دو گیا۔ اپن نے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔ اور وہ سالا بالم خان بھی بہت تڑی مارتا تھا اپن کا راجا کے دو چار ہاتھوں میں گلٹی ہو گیا۔ راجا تو راجا ہے جامو استاد! جب سے اپن پاڑے میں بیٹھا ہے علاقے کا بھی لڑکی چین کا مرلی بجاتا ہے اور آج تک کوئی نہیں جو راجا کی آنکھ سے آنکھ ملا سکے۔ راجا تو ۔۔۔" چھیدا روانی میں بکے جا رہا تھا۔

"بس ۔" میں نے ترشی سے کہا "بس۔"

" ابھی اپن نے کچھ بھی نہیں بولا راجا ۔۔۔۔"

"بولتے رہو" یک بہ یک تجمل کی گرجتی ہوئی آواز ابھری۔ تھا اکیلے کے زورا کی کرسی کے پیچھے چلا گیا۔ چھیدا پلکیں جھپکانے لگا۔ "بولتے رہو" تجمل نے دوبارہ تیز آواز میں کہا۔

"دادا! ۔ دادا!" چھیدا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "اپن کو نہیں مالم کہ تمھارے حکم کا کیا مطلب ہے۔ اپن نے جو بولا ہے سچ بولا ہے۔ ماں قسم اپن ممبئی میں آدھی کرتے ہوئے بال پر چاندی پھٹنے لگا پر اپن نے راجا جیسا کوئی استاد نہیں دیکھا۔ اپن تو بولا کہ راجا آگے رہ تم تو اکیلا کار راجا نہیں لگا۔ پر راجا اپنے پاڑے سے باہر نہیں نکلا۔ اس سالا بالم کا بڑا ٹیم آگیا تھا۔ تبھی راجا کا آدمی چھیڑ دیا۔ دادا! راجا وہ پہلا پاڑا ماسٹر ہے جس نے پاڑے کا ایک پیسہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک بات بولو تو بولوں ۔۔ باتوں کا ڈھیر ہے۔"

چھیدا باتیں کر رہا تھا تو بھی کی نگاہیں تجمل کی جانب مرکوز تھیں مگر تجمل کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ آنکھیں میچے چھیدا کی باتیں سنتا رہا۔ چھیدا خاموش ہوا تو تجمل نے اپنی غنودہ آنکھیں کھول لیں۔ ان میں سرخی دوڑ رہی تھی۔ اس نے چھیدے سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ اسی اثنا میں پاڑے کے کئی آدمی تھیلوں اور ٹوکروں میں لیے چھپڑے سے اندر داخل ہوئے۔ درمیان کے چبوترے پر پہلے جہاں کاہی جھنگا بچھا تھا اور اب بیٹھنے لگا تھا اور میری عدم موجودگی میں زورا یا چھیدا بیٹھتے تھے۔ اسی چبوترے پر دیکھتے دیکھتے تمام چیزیں بچھا دی گئیں۔ لگتا چبوترے پر چھپڑکا پھر رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ پاڑے کے لوگ کھانے پینے کی ہر دکان سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لائے ہیں۔ چبوترے پر بیٹھنے کی جگہ بھی مشکل سے رہی تھی۔ زورا نے تجمل کو چبوترے پر چلنے کے لیے کہا۔ اس نے انکار نہیں کیا۔ یہ سامان پوری ایک برات کے لیے کافی تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی چھیدا کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔ میں اور تجمل بس ان کا ساتھ دینے کے لیے ٹونگتے رہے۔ جامو اور کالا نتے نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ ان کے چہروں پر بشاشت نمایاں تھی۔

میرا دماغ خالی خالی تھا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے یا غلط؟ تجمل کی غیر متوقع آمد پر اور کیا ہونا چاہیے تھا۔ یہ دوپہر کا کھانا تو نہیں تھا مگر اس کے بعد کھانے کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔ عدالت میں باقاعدہ ملکیتی کمرے موجود تھے۔ ان میں پاڑے کے بعض آدمی مستقل قیام کرتے تھے۔ کھانے کے بعد سفر کی تھکن دور کرنے کے لیے تجمل سے کمرے میں چلنے کو کہا گیا مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ البتہ جامو اور کالا نتے اس کی اجازت سے ماری اور زورے کے ساتھ باہر چلے گئے۔ پاڑے کے باقی لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ صرف زورا اور چھیدا رہ گئے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی چلے جائیں تاکہ میں تجمل سے کوئی بات کر سکوں اور اسے بتا سکوں کہ جو کچھ اس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، یہ محض اس کے وقت سے پہلے یا بعد میں آنے کا اتفاق ہے۔ میں نے ابھی زورا اور چھیدا کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ نہیں کیا تھا کہ پاڑے کا نوجوان لڑکا تھے بوکھلایا ہوا اندر آیا۔ اس نے تجمل کو دیکھا تو ٹھٹک کے زورا کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ زورا اس کے پاس پہنچا۔ تھے نے اس کے کان میں کوئی اہم بات کہی۔ زورا کا چہرہ اچانک تمتمانے لگا۔ تھے کا انداز بتا رہا تھا کہ بات کی نوعیت معمولی نہیں ہے۔ زورا فوراً چھیدا کے پاس گیا اور چھیدا میرے پاس آیا۔ تجمل کے سامنے یہ کانا پھوسی مجھے معیوب لگی لیکن نہ جانے وہ کیا بات تھی جس نے زورا اور چھیدا مضطرب ہو گئے تھے۔

میں نے چھیدا کی سرگوشی بظاہر لاپروائی سے سنی تھی مگر اب مجھ سے ایک پل نہیں بیٹھا جا رہا تھا۔ زورا اور چھیدا فوراً باہر جانا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں روک لیا اور تھے کو ہدایت کی کہ وہ پاڑے کے تمام آدمیوں سے فوراً رابطہ کرے کہ کسی غیر ضروری جھگڑے سے پرہیز کیا جائے۔ تھے چلا گیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ "کیا قصہ ہے لاڈلے!" تجمل کی تیکھی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے دادا!" چھیدا نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

"کیا ہے لاڈلے! تم ہی بتا۔"

"پرسوں یہاں ایک سیٹھ تھیمبو داس اور اس کے داماد گرجا داری کا قتل ہو گیا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "تھیمبو سیٹھ سٹہ کا مالک تھا۔ ممبئی میں ہر جگہ اس کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ تھیمبو کا کام تیوا ڈی دیکھتا تھا۔ تیوا ڈی والے دھمکی بھیجی ہے کہ سیٹھ تھیمبو کے خون کے بدلے کے لیے تیار رہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دھمکی اس نے دوسرے لوگوں کو بھی بھیجی ہو لیکن ہے کہ تیوا ڈی کا اچھا خاصا بڑا اڈا ہے اور وہاں کسی بات میں کوئی مار نہیں سکتا۔ تیوا ڈی دادا شاید یہ جاننا چاہتا ہے کہ تنکا کس کی داڑھی میں نکلتا ہے۔"

"اور سیٹھ تھیمبو کو اپنے راستے سے ہٹایا کس نے ہے؟" تجمل نے ہم تینوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"ہم نے" میں نے سکون سے کہا۔

"راجا!" زورا اور چھیدا نے ایک ساتھ احتجاج کیا۔

" ہاں تنکا تو ہم سب کی داڑھیوں میں نظر آ رہا ہے۔"

"وہ راجا نے نہیں دادا! تھیمبو کو اپن نے ختم کیا ہے۔"

"میرا راجا کے بولنے پر ۔" تجمل آہستگی سے بولا۔

"ہاں! میری ہدایت پر۔" زورا اور چھیدا کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے تجمل سے کہا۔ "میں نے ہی ان سے کہا تھا۔"

"مگر دادا! کام بہت صاف ہوا ہے گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ سالا پولیس کا باپ بھی اپن تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"مگر تیوا ڈی پہنچ چکا ہے۔" تجمل نے زیر خند سے کہا۔

چھیدا اور زورا چز بز ہونے لگے۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جواب صرف میرے پاس تھا۔ تیوا ڈی کی دھمکی خاص طور پر اس پاڑے کے استاد کو دی گئی تھی۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ تیوا ڈی اپنے سیٹھ کے قتل کے متعلق کوئی رائے قائم کر چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو کرشنا جی کے ساتھ رہتا تھا اور جس نے ایک بار ٹرین میں دوسری بار کلب میں ان کی جان بچائی تھی۔ چونکہ میں نے تیوا ڈی سے الجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے اس نے بھی مجھ پر توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا ہو گا مگر اب ۔۔۔۔ اب کوئی خفیف سا شبہ بھی اس کے قدم روک نہ سکا ہو گا۔ وہ کسی وقت بھی اس طرف آ سکتے تھے۔ جب ان کا شبہ یقین میں بدل جائے گا یا علاقے پر پولیس کا دباؤ کم پڑ جائے گا۔ بظاہر وہ کوئی اور صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ "تم پہلے جا کے سیٹھ نور بھائی سے ملو کہ وہ علاقے سے گرفتار شدہ آدمیوں کو اپنی ضمانت پر رہا کرانے کا انتظام کرے۔" میں نے چھیدا کو ہدایت دی "اور زورا تم علاقے جا کے اپنے آدمیوں کو خبر کر دو تا کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو پہنچا دو۔"

زورا اور چھیدا کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس وقت یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ تجمل کے سامنے ان سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل جاتی تو خواہ مخواہ الجھن پیدا ہوتی۔ مجھے زورا اور چھیدا پر اعتماد تھا اور یہ اندیشہ نہیں تھا کہ گرفتاری کے بعد پولیس کی مار انھیں کمزور کر دے گی۔ اسی لیے پاڑے کے بہت سے آدمیوں میں سے میں نے انھیں منتخب کیا تھا لیکن ان کے کاندھوں پر زیادہ زور نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ یہ تاکید مجھے تجمل ہی نے کی تھی۔ جب میں اور تجمل تنہا رہ گئے تو میں نے اس سے بات کرنے میں خود پہل کرنی چاہی مگر الفاظ میرے حلق ہی میں پھنس کے رہ گئے۔ وہ لگاتار میرا چہرہ تک رہا تھا۔ مجھ سے کوئی بات نہیں ہو سکی۔ مجبوراً میں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ تجمل کا چہرہ کھنچ گیا اور وہ انگلیاں مروڑنے لگا۔ "لاڈلے! یہ سب کیا ہے؟" وہ الجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"جو تم دیکھ رہے ہو۔" میری زبان بہکنے لگی۔

"مگر میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔" وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ "لاڈلے! بھگوان! میں یہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"میں خود بھی نہیں چاہتا تھا۔" میں نے مرے لہجے میں کہا۔

"پھر یہ کیوں ہے؟" اس کی آواز پھٹنے لگی۔ "تیرے پاس تو ہی دولت تھی۔ تو نے آزاد تجھیں کر کے مجھے چھوڑ دیا تھا اور ہر امتحان میں اول نمبر آتا رہا مگر تجھے کیا ہو گیا لاڈلے! تجھے کیا ہو گیا ہے لاڈلے! اگر یہی بات تھی تو تو نے کہا کیا کیا کر رہا تھا۔ تو مجھ سے کہتا تو میں دل سے بیٹھا تا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہی باتیں کرو گے تمھیں یہی باتیں کرنا بھی چاہییں لیکن تمھیں نہیں معلوم کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ ممکن ہے تم مجھ سے اتفاق نہ کرو مگر مجھے اس کی فکر نہیں ہے کیونکہ میں نے وہی کیا ہے جو میرے دل اور دماغ نے کہا تھا۔ میں تمھارے پاس سے چلا آیا تھا اور اس لیے چلا آیا تھا کہ مجھے چھپا بائی سے اپنے گھر والوں کا پتہ پوچھنا تھا۔ جیسے تم اور جامو بھی کچھ تاخیر سے سہی، چھپا بائی کو ڈھونڈ کے ان کا پتہ چلا سکتے تھے لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم اور میرے گھر والوں کی نشان دہی کسی اور کو ہو۔ مجھے اندیشہ تھا کہ چھپا بائی نے کچھ تو نہ جانے کیا کیا باتیں کھلیں گی۔ جامو اور کبیر خان اور دوسرے لوگ اس سے نہ جانے کس کس طرح اور کیا کیا اگلواتے۔ تمھی کے بیچ میں تمھیں دیکھنے سے پہلے گھر والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ میں ان سے دوبارہ کوئی رابطہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔"

میری آواز بھرا گئی۔ تجمل کی آنکھیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے دبا لیا تھا۔ "مختصر یہ کہ میں چھپا بائی کو ڈھونڈتا ہوا آگرہ سے بمبئی گیا۔ چھپا بائی نے بتایا کہ اس نے تم کو بمبئی سے وہاں کیا تھا میں اسے جبراً اپنے ساتھ بمبئی لے آیا اور ۔۔۔۔" میں نے ٹرین میں کرشنا جی کے ملنے سے بمبئی میں ابا جان کی تلاش میں ناکامی چھپا کی واپسی کی ساری روداد تفصیل سے اسے سنادی۔

"پھر تو واپس کیوں نہیں آگیا؟" وہ شکوے سے بولا۔

"پھر میں نے سوچا کہ اب کہاں جاؤں گا، جہاں جاؤں گا لوگوں کو پریشان کروں گا۔ ابھی تو وعدہ نہیں ملی تھی کہ ابا جان بھی لاپتہ ہو گئے۔ میرا جی کسی جگہ نہیں لگتا تھا۔ میں اسی شہر میں پڑا رہا۔ ایک دن اچانک جوہو کے ساحل پر کرشنا جی نے مجھے پہچان لیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور مجھے مسلسل نادم کرتے رہے۔ انھوں نے میرے کپڑے بنوائے، مجھے بڑے لوگوں کے کلب میں لے گئے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ بالکل اپنا بھائی، بیٹی اور اولاد سمجھتے تھے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن ہر بار کرشنا جی کے خیال نے قدم روک لیے۔ میں نے انھیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ انھوں نے پوچھنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تو انھوں نے یہ ذکر ہی چھوڑ دیا۔ ابھی مجھے وہاں رہتے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ کرشنا جی کچھ پریشان پریشان نظر آنے لگے۔ میں ایک دن ان سے کہے بغیر گھر سے نکل گیا اور بائی کلا کے علاقے میں پہنچ گیا۔" میں نے مستانہ کا سارا واقعہ، چھپا کے گرفتار ہونے، لڑکی کی واپسی، اخبارات کے تذکرے، کرشنا جی کی شہرت اور شہر میں ان کے چرچوں کا حال اسے سنایا۔ "اس واقعے کے بعد کرشنا جی مجھے اور عزیز رکھنے

لگے۔ پھر ایک مرتبہ اُن پر کلب میں حملہ ہوا۔ اتفاق سے میری نظر پڑ گئی۔ وہ حملہ کرنے والوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُن کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ میں نے کئی بار انھیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا مگر انھیں اپنا کام اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ ہر وقت قاتلوں میں گھرے رہتے تھے۔ کلب کے حملے کے بعد ہم گھر لوٹے تو چمپا بائی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ کے حیران رہ گیا۔ میں نے اُس پر بہت زور دیا کہ وہ واپس چلی جائے۔ چمپا بائی تو تیار ہو گئی تھی مگر کرشنا جی نے اُسے روک لیا۔ چمپا نے اپنی رہائش بدل لی تھی۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کرشنا جی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ جب کرشنا جی اُسے گھر رکھنے پر آمادہ تھے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ویسے بھی کسی نہ کسی دن مجھے وہاں سے جانا ہی تھا۔ بس میں تمھیں کیا بتاؤں کہ کیا کیا ہوتا رہا۔ میں روز نکلنے کی تدبیر کرتا تھا اور روز ارادہ بدل دیتا تھا۔ میں ہر وقت یہی سوچتا تھا کہ اب کس طرف جاؤں۔ پھر ایک دن کرشنا جی میرے لیے جولین کو لے آئے۔ میں انھیں کیسے بتا سکتا تھا کہ مجھے پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر میں انھیں سچی بات بتا دیتا تو وہ سوالات کرتے کرتے جیل تک پہنچ جاتے مگر میں کرشنا جی کو غلط سمجھا تھا۔ وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ جولین نے مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہے۔ اُس کا باپ بیمار تھا۔ میں روز اُسے گھر چھوڑنے جانے لگا۔ گلی کے لڑکے ہم پر آوازے کسنے لگے چنانچہ ایک روز مجھے اُن سے بات کرنے کے لیے رکنا پڑا۔۔۔۔"

تجمل میرے اور قریب کھسک آیا تھا۔ میں نے اُس سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ تجمل نے درمیان میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، نہ "ہوں ہاں" کی۔ نہ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ میں تو جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ بس مجھے اُس کی گہری سانسیں سنائی دیتی رہیں۔ "میں نے کرشنا جی کو بتا دیا تھا کہ پولیس افسر جسونت اپنے ایک ساتھی سے اُن کے متعلق کیا باتیں کر رہا تھا۔ وہ بولے "تم نے یہ سب کیسے سن لیا؟" میں نے انھیں یقین دلانے کے لیے بتا دیا کہ میں انگریزی سمجھتا ہوں۔ اس پر وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے لے کے کمرے میں ٹہلنے لگے اور وہ بات بھول گئے جو میں نے اُن سے کہی تھی۔ میں نے دوبارہ اُن کی توجہ جسونت کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنا کام جلد سے جلد نمٹا کے یہاں سے اپنے گھر مدراس چلے جائیں گے مگر دوسرے ہی دن وہ سڑک پر تڑپتے ہوئے پائے گئے۔ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں آئے۔"

"میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو کرشنا جی کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ کرشنا جی ایک فرض شناس اور دیانت دار پولیس افسر ہیں۔ انھیں بچانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے بہت دعا کی "اے خدا! اُن کے بجائے میری جان لے لے۔" میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ جن لوگوں نے کرشنا جی کو مارا ہے، اُن سے میں ضرور نمٹوں گا۔ میں نے کرشنا جی کا پٹیوں میں لپٹا ہوا جسم دیکھا تھا۔ اُن کی آواز ۔۔۔۔ مرتے وقت اُن کی آواز میں نے سنی تھی۔" میرا سینہ پھٹنے لگا۔ میں بلک بلک کے رونے لگا۔ تجمل نے مجھے گلے لگایا۔ مجھے اور رونا آ گیا۔

"لاڈلے! لاڈلے! ارے لاڈلے!" وہ مجھے تسلی دے رہا تھا مگر خود اُس کی آواز بھی بھرانے لگی تھی۔

"کرشنا جی چلے گئے۔" میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔

"لاڈلے! لاڈلے بھائی!" اُس نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اپنے دامن سے میرا چہرہ خشک کرنے لگا۔ "لاڈلے! بابا کہتی ہے جب ہمارا سکندر بھی چلا گیا، رستم پہلوان بھی مر گیا، اُس کا بیٹا سہراب بھی خاک ہو گیا۔ بڑا بڑا بادشاہ مر گیا۔ بڑا بڑا پھنے خاں مر گیا۔ تُو بھی ایک دن مر جائے گا، میں بھی تجھ سے پہلے چلا جاؤں گا۔ کچھ آنسو اور لوگوں کے لیے بھی رکھ۔ آدمی کو تمام آنسو ایک ہی ماتم پر برباد نہیں کرنے چاہئیں۔ اُن کی بار بار ضرورت پڑتی ہے۔"

"مگر کرشنا جی بہت اچھے آدمی تھے تجمل بھائی!"

"پیر پیغمبر اُٹھ گئے لاڈلے! یہ تو دنیا ہے پیارے بھائی!"

"وہ بہت اچھے تھے، تم نے انھیں نہیں دیکھا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں نے تیری آنکھوں میں اُسے دیکھ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے لاڈلے! وہ بہت اچھا آدمی ہو گا۔ تیری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

"میری آنکھیں دھوکا کھا گئیں۔ میں نے انھیں نہیں پہچانا۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "میں اُن سے اپنے آپ کو چھپاتا رہا۔ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ چمپا نے وعدہ خلافی کی تھی اور انھیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ چپکے چپکے ابا جان کو تلاش کرتے رہے۔ مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ چلتے وقت انھوں نے مجھے بتایا..... انھوں نے مجھے لاڈلے کے نام سے پکارا تھا، کہا تھا، "لاڈلے! مجھے افسوس ہے....."

"آگے بات کر لاڈلے!" تجمل اضطراری لہجے میں بولا۔

"آگے پھر کیا تھا۔ جسے جانا تھا وہ چلا گیا۔ سارا گھر اُجڑ گیا۔ اُن کی ایک ماں تھی۔ اُس نے ارتھی سے سر ٹکایا تو پھر اُٹھایا نہیں۔ دونوں کو ایک ساتھ جلا دیا گیا۔ شروع شروع میں بڑا چرچا رہا۔ اخبار بھی لکھتے رہے، جلسے ہوتے رہے، مظاہرے ہوتے رہے مگر اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ایس پی شکلا کرشنا جی کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ روز گھر آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ کرشنا جی اپنی تمام جائداد میرے نام کر گئے ہیں۔ وہ مجھے مدراس لے گیا۔ ابا جان اُدھر خزانے کی تلاش میں نہ جانے کہاں مارے مارے پھر رہے ہیں اور بیٹے پر دولت کی بارش ہو رہی ہے۔ کرشنا جی کی تمام جائداد بیچ کے ساڑھے آٹھ لاکھ روپے

تم سے بینک میں جمع کر دیے گئے۔"

"لاڈلے!" تجمل نے حیرت سے کہا۔

"میں نے یہ دن ضائع نہیں کیے تجمل بھائی!" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے دولت بنائی ہے۔ میں لکھ پتی آدمی ہوں۔ بھرت پور کی حویلی اور جاگیروں کا بھی میں ہی مالک ہوں۔ تم بھی اپنا تمام پیسہ میرے نام کر دو۔"

"لاڈلے! تُو نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھ لیں۔ کلیجا چھلنی کیے چلا لے بس کر۔ میں نے تو تجھے نہیں سکھائی تھیں یہ باتیں۔ تُو تو مجھ سے بڑا چالو باز نکلا، تیرا چاچا تو لفظ بھی نہیں آتا۔"

"تم جو چاہے کہہ لو۔ میں نے تم سے تقریباً ہر بات کہہ دی ہے۔ یقین کرو میں نے کرشنا جی کی ارتھی پر عہد کیا تھا کہ میں اُن کے گنہگاروں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ حقیقت کا تو مجھے بعد میں پتہ چلا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ مجھ سے صفائی مت کر۔"

"میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ شہر میں میرا ایسا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ جسو بہت اثر و رسوخ کا آدمی تھا اور مجھے بہت سے لوگوں نے کرشنا جی کے ساتھ رہتے ہوئے اور اُن کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے خاصا وقت گزارا تاکہ انھیں کرشنا جی سے میرا تعلق بھول جانے کا وقت مل جائے۔ پھر مجھے انھیں تلاش بھی کرنا تھا کہ وہ کون ہیں جو جسو کے آلۂ کار تھے۔ میں کس سے پوچھتا۔ بتاؤ میں کس سے پوچھتا کہ کرشنا جی کا قاتل کون ہے۔ اس کے لیے مجھے کسی اڈے میں آنے کی ضرورت تھی، آدمیوں کی ضرورت تھی۔ سو مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ میں نے جسو کو مار دیا ہے تجمل بھائی! تیواڑی ابھی باقی رہ گیا ہے۔ جب تک میں اُس کا خون نہیں دیکھ لوں گا، کرشنا جی کی روح مجھ سے شکایت کرتی رہے گی۔ میں نے جسو کو پہلے اس لیے مارا کہ وہی بنیاد تھا۔ میں نے سوچا پہلے اُن کی بنیاد اکھاڑ دوں۔ سمجھے تم؟ مجھے ان کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تو دنیا ہی سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"لاڈلے!" اُس نے میری گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔ "میرے طوطے! تو مجھے بھی تو بتا سکتا تھا۔ تُو اکیلا کیوں رہا؟ کیا میں مر گیا تھا؟ کیا ہم سب مر گئے تھے؟"

"مگر تمھارے ساتھ بھی وہی مسئلہ رہتا۔ پہلے تو یہ بات طے کرنی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اور یہ پہچان کسی اڈے کے بغیر ممکن نہیں تھی اور تم تو یہاں موجود ہی نہ تھے۔"

"ہیں — !" وہ چیخ کر بولا۔

"ہاں تم — ! یہ سب کچھ تمھی نے تو مجھے دیا تھا۔"

"کمال کر رہا ہے لاڈلے!"

"تم مجھ سے ایسی اُمید رکھتے ہو؟" میں نے درشتی سے کہا۔

"نہیں لاڈلے! نہیں میرا دماغ چل جائے اگر میں ایسا سوچوں پگلے! میں نے تجھے اور بہت سی باتیں بھی تو بتائی تھیں۔ میں نے کہا تھا چاقو ہر جگہ نہیں چلتا اور دوسرے کی کنگلی ہمیشہ سامنے رکھنا۔"

"میں کوئی بات نہیں بھولا۔ مجھے سب یاد ہے۔ تم نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ کبھی کبھی چاقو سے اپنی انگلی بھی کاٹ لینی چاہیے اور تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ چاقو اُن لوگوں کو نہیں اُٹھانا چاہیے جو زمین کے اُوپری حصے سے محبت کرتے ہوں۔"

"ہاں! میں نے کہا تھا۔" وہ کرب سے بولا۔ "پیارے لاڈلے! اگر مجھے ایک اشارہ کر دیتا۔ تجھے میرا خیال کیوں نہیں آیا۔ اگر چمپا بابو کو خط نہ لکھتی تو میں تیری صورت دیکھنے ہی کی آرزو میں مر جاتا۔"

"چمپا نے بابو کو خط لکھا تھا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ تیری طرف سے ناامید ہو گئی تھی۔ تُو روز روز گھر سے غائب رہنے لگا تھا اور کچھ بتاتا بھی نہیں تھا اور وہ دونوں بڈھے تیرے پاس گڑگڑاتے تھے۔ وہ کبھی خط نہ لکھتی مگر جب مجبور ہو گئی تو اُسے بابو کو لکھنا پڑا۔"

"چمپا نے تمھیں بھی تنگ کیا۔ وہ ایسی ہی ہے۔ پہلے تمھی کو کہہ کے بٹھایا۔ پھر میرے پیچھے پڑ گئی اور کرشنا جی کو سب کچھ بتا دیا اور اب تمھیں......"

"غصہ مت کر۔ جو معافی مانگ لے اُس کے لیے دل بڑا کر لینا چاہیے۔ وہ عورت کیا کر سکتی تھی، ماں نے تیرے بھلے ہی کے لیے بابو کو لکھا تھا۔ چمپا کو معاف کر دے لاڈلے! یہ سارا گورکھ دھندا ہے۔ تُو کہیں کسی کا گریبان پکڑے گا اور کہاں کہاں جا کے بچائے گا۔ ہو سکے تو اس دنیا کو آگ لگا دے۔"

"وہ سامنے رہتی ہے تو مجھے تمھی یاد آنے لگتی ہے۔"

"اتنی بڑی معافی کوئی نہیں مانگتا۔ ذرا یہ تو سوچ لے کہ اُس کا کیا قصور تھا۔ جانے دے لاڈلے! میری خاطر نہ سہی اُس کی خاطر جس کے لیے تُو نے اپنا یہ حال کر رکھا ہے۔ جانے دے۔ کوئی اور بات کر۔ یہ بتا کہ تُو نے تیواڑی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"ابھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"اب تُو بے فکر ہو جا۔ میں آ گیا ہوں۔ تیرا عہد پورا ہونا چاہیے، وہ ضرور پورا ہو گا چاہے مجھے باقی عمر جیل ہی میں گزارنی پڑے۔"

"تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"تُو تو بڑا شیر ہے شیر ببر۔ مگر تجھے کیا ضرورت پڑی ہے، میں جو موجود ہوں۔ تُو کہے تو میں ابھی اُس کا سر کاٹ کے لے آؤں۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"دیکھ لاڈلے! جسو کو مارنے کے بعد تُو نے تیواڑی کو ویسے ہی ادھ موا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لونڈے گیری پہ اُتر آیا ہے۔ ذرا صبر کر لے پھر سب کچھ تیرے سامنے آ جائے گا۔ جیسے جو تُو چاہے گا وہی ہو سکتا ہے۔"

"میں کرشناجی کے قاتل کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔"
"ٹھیک ہے لاڈلے! ٹھیک ہے۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
"اب کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ مجھے جانا ہے۔"

اُس نے شاید میری بات نہیں سنی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک کھلی آنکھوں سے جیسے سو گیا۔ پھر ایک دم جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور میری گردن میں ہاتھ ڈالے مجھے پاڑے میں گھماتا رہا۔ اس نے پاڑے کا وہ حصہ بھی دیکھا جہاں زور ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہاں چند آدمی زور آزمائی میں مصروف تھے۔ ججل وہاں جلدی ہی لے چلا اور پاڑے سے باہر آ کے گلی کے نکڑ تک چلا آیا۔ حسبِ معمول نکڑ پر پاڑے کے تین چار آدمی موجود تھے۔ اُدھر سے جامو اور کالتے واپس آ رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں دور سے دیکھ لیا اور لپکتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ کالتے نے آنکھیں مسلسل شروع کر دی تھیں۔ جامو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ٹھا کالتے کی ٹانگوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ مارٹی جامو اور کالتے پیچھے کھڑے تھے۔ ججل نے مارٹی کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ مارٹی نظریں جھکائے جھکا ہوا اس کے روبرو پہنچا تو ججل نے نرم آواز میں اسے مخاطب کیا "مارٹا میرے لیے حقے کا انتظام کر۔"

"وا دا!" مارٹی نے مسنی سے اسے پکارا اور اس کی پنڈلیاں پکڑ لیں۔ ججل نے مارٹی کے بال پکڑ کے سر جھنجھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کے ٹھا بھی اچھلتا ہوا ججل کی ایک ٹانگ سے لپٹ کے رونے لگا۔ ججل نے اس کی گردن میں پنجہ ڈال کے اسے اٹھایا اور زمین پر چھوڑ دیا۔ ٹھا قلابازیاں کھاتا، اچھلتا کودتا ہوا مارٹی کے ساتھ چوک کی طرف بھاگنے لگا۔

✽ شام کو ججل درمیان ہی کا گاؤ تکیے کے سہارے چوکے پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں جامو اور کالتے تھے۔ پاڑے کے پرانے لوگ بھی چوکے پر اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ججل کے آگے ہاروں اور پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چوکے کے نیچے بھی پاڑے کے بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ علاقے سے اچھی خبریں نہیں آئی تھیں۔ سہ پہر کو ججل میرے ساتھ عالم خان سے حال کیا ہوا اڈا ابھی دیکھ آیا تھا۔ علاقے میں پولیس موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ تیواڑی کے کئی آدمیوں نے علاقے میں گڑبڑ کرنے اور خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کی مگر پولیس موجود تھی اس لیے بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ میں نے اپنے آدمیوں کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ جہاں تک ہو سکے برداشت کریں۔ پاڑے کے گرفتار لوگوں کی ضمانت کل تک کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔ ججل کو دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پاڑے میں اور اس کے آدمیوں کے درمیان عرصے سے رہ رہا ہو۔ رات ہوئی تو اس نے مجھے حکم دیا کہ میں کالتے کو اپنے ساتھ لے کے گھر چلا

جاؤں۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلے مگر وہ وہیں ٹھہر گیا۔ میں آج رات وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ دن بھر تیواڑی کے آدمیوں کی طرح بے جا دھمکیاں کانوں میں پڑتی رہی تھیں۔ ججل نے سختی کے ساتھ مجھے گھر واپس جانے کا حکم دے دیا۔ پاڑے کے لوگ بھی میری طرف سے کچھ بے نیاز سے ہو گئے تھے اور ججل کے گرد مجمع لگائے بیٹھے تھے۔ مجبوراً مجھے کالتے کو لے کے گھر آنا پڑا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ججل زیادہ مشتعل نہ ہو جائے۔ وہ یہاں بمبئی میں اجنبی ہے۔ میں نے تیواڑی کی بابت اسے ہر بات بتا دی تھی۔ پھر بھی ججل سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کیا کر بیٹھے۔ پاڑے کے لوگ بھی اسے برانگیختہ کر سکتے تھے۔ میں وہاں سے چلا تو آیا لیکن میرا دل وہیں اٹکا رہا۔

انھوں نے ہماری آہٹ ہی سن کے دروازہ کھول دیا۔ جولین نے اپنے سینے پر فوراً صلیب کا نشان بنایا۔ چمپا کے ہونٹ بڑبڑانے لگے۔ وہ بہت بے چین تھیں۔ "وہ کہاں ہیں؟" جولین نے سراسیمگی سے پوچھا۔
"وہ کہیں اور ٹھہر گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
"سب خیریت تو ہے؟"
"ہاں مگر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"
"بس کیا بتاؤں۔" وہ بے تابی سے بولی۔
"تمھارے لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"
"کیسے نہیں ہے۔" وہ ترشی سے بولی۔

کالتے میرے ساتھ تھا۔ چمپا بھی موجود تھی۔ میں نے اس سے زیادہ بحث نہیں کی۔ جولین کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اتنی دبلی اور کمزور ہو گئی تھی جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ میں کالتے کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ چمپا کھانا لے کر وہیں آ گئی۔ کالتے میرے برابر کے بستر پر لیٹ گیا اور شیخ آباد سے میرے جانے کے بعد کا تمام حال سنانے لگا۔
"زرینہ کیسی ہے؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔
"بی بی تو تاج بی بی ہے لاڈلے! میں نے ایسی اچھی لڑکی نہیں دیکھی۔ استانی کے ساتھ میں اسی کی حویلی میں ٹھہرتا تھا۔ کیا مجال جو آنکھ اٹھا کے دیکھ لے۔ ہمیشہ نظریں نیچی رہتی ہیں اور دوپٹا سر پہ۔ مجھے بھائی کہتی ہے کالتے بھائی۔ جب وہ مجھے بھائی کہتی ہے لاڈلے تو میرا جی چاہتا ہے اپنی چھاتی میں چاقو مار لوں۔ اس پہ ساری دنیا کی دولت کا تختہ کر دیا جاتا ہے۔ پر میں اپنی جان ہی اس پہ نچھاور کر سکتا ہوں۔ جب تم نکلے ہو بی بی نے کبھی تمھارا نام نہیں لیا۔ کبھی استاد سے تمھارا نہیں پوچھا۔ وہ استانی کے آنے سے اتنی خوش ہوتی ہے کہ بس بتایا نہیں جا سکتا۔ استانی نے جب بھی تمھارا ذکر اس کے سامنے کیا، وہ اٹھ کے چلی گئی۔ نوکرانی بتاتی تھی کہ وہ چپکے چپکے روتی رہتی ہے۔ لاڈلے! کیا تجھے بی بی کی یاد آتی ہے؟"

۱؎ پولی تعمیر پختہ چبوترے کو یہاں چوکے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

"آتی ہے۔" میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔
"آتی ہوگی ضرور آتی ہوگی۔" وہ جھل کے بولا۔ "وہ یاد آنے کی چیز ہے۔ پر لاڈلے تو نے اسے ایک خط ہی لکھ دیا ہوتا۔"
"کالتے! ایسی باتیں مت کر۔" میں نے بیزاری سے کہا۔
"کیوں لاڈلے! کیا تیری اس سے لڑائی ہو گئی تھی؟"
"نہیں۔"
"تو پھر کیا بات ہے؟"
"پتہ نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "کچھ اور بات کر۔ آ باہر ٹہلنے چلتے ہیں۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی ہے۔"
"استاد نے حکم دیا ہے کہ رات گھر ہی گزاری جائے۔"

مجھ سے ایک پل بھی نہیں کاٹا جا رہا تھا۔ کالتے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ اس پر طویل سفر کی تھکن سوار تھی۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر تک میں لیٹے ہی لیٹے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے اندر جھانک کے دیکھا تو جولین ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں خاموش بیٹھی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں اس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کرسی پر گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ میں دیر تک وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی زرد ساٹن کا پلو کرسی کے بازو پر گرا ہوا تھا۔ روشنی میں اس کی ٹھوڑی اور ہونٹ چمک رہے تھے۔ میں دبے قدموں سے اس کے پاس پہنچا۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی تھی۔ چار ہی دن پہلے اس گھر میں موت ہوئی تھی اور مجھے اس کے باپ کے جنازے میں شریک ہونے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ میری آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا گئی۔ "کیسی طبیعت ہے تمھاری؟" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں پوچھا۔
"ٹھیک ہوں۔" وہ جلدی سے انگریزی میں بولی اور اپنی ساڑی کا پلو درست کرنے لگی۔ "تم سوئے نہیں؟"
"نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔
"کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟ دبا دوں؟"
"نہیں۔ درد نہیں ہے۔"
"بیٹھ جاؤ۔"
میں اس کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تم کیوں نہیں سوئیں؟"
"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"
"تو میں دبا دوں؟" میرے منہ سے نکل گیا۔
"تم!" اس کی آواز کانپ گئی۔ "نہیں نہیں۔"
"کیوں؟"
"بس نہیں۔" وہ کسمساتی ہوئی بولی۔
میں نے تکرار نہیں کی۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے ہچکچاہٹ

سے کہا۔ "تم کسی ڈاکٹر کو دکھا دو نا۔ صبح میرے ساتھ چلنا۔"
"ہاں۔" وہ بجھی ہوئی آواز میں بولی۔
"اور تم کسی بات کی فکر مت کرو۔"
"ہوں۔" اس نے ساڑی کا پلو دانتوں میں دبا لیا۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ مجھے احساس ہوا کہ لوگ مجھ سے بھی اسی طرح کہتے ہوں گے۔ کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر ایک آدمی دوسرے کے لیے اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ اگر اتنا بھی نہ کہے تو کیا کرے۔ میں جولین کے باپ کو مرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے فوراً بات بدل دی۔ جولین کے لیے اس کے باپ کا ذکر تکلیف دہ ہوگا۔ میں نے کہا۔ "تم کہتی تھیں کہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسکول چھوڑ دو اور آرام سے یونیورسٹی میں داخلہ لے لو۔ اب تمھیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے تمھارا دل بھی بہل جائے گا اور تم بہت لائق بھی ہو جاؤ گی۔"
"کیا تمھاری یہی خواہش ہے؟" اس نے مجھ سے خفا ہوتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"
"اور تم؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "تم نے مجھ سے یہ کیوں چھپایا تھا کہ تم پڑھے لکھے ہو۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا اب سوچتی ہوں تو۔"
میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ کیا اس نے یہ کہہ کے مجھے یاد دلایا کہ صبح ججل کی تمام باتیں اس نے سن لی ہوں گی۔ میں اس کو کرشناجی کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔
"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"اب تو سب کچھ بھول گیا ہوں۔"
"اب بھی چھپاؤ گے؟"
"ہاں اب چھپانے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔"
"بتاؤ نا۔ اچھا ابھی نہیں۔ ٹھہرو میں تمھارے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔" وہ کرسی سے اٹھ گئی۔ میں اسے روکتا رہا مگر وہ کب سنتیں۔ اس نے منٹوں میں چائے بنالی اور آ کے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اسے خوش دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کسی کو خوش دیکھ کے مجھے رشک آتا ہے کہ آدمی کتنی جلدی خوش ہو جاتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے سب کچھ بتا دوں گا اور کیا کروں گا تاکہ وہ ملے تو اس کے سامنے میرا سر نہ اٹھ سکے کہ میں مفلس، میں نظر والا، میں چھوڑا ساری دنیا سے ذلیل رہتا تھا۔ سب سے اس کی شکایت کرتا پھرتا تھا۔ جولین کی ضد پر اپنی تعلیم کے سوا میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ ظاہر ہے، چمپا کا پیٹ بہت ہلکا تھا۔ رہی سہی کسر ججل نے آ کے پوری کر دی۔ صبح ہی صبح کرشناجی کا ذکر چل نکلا۔ اس کا ذکر ہمیشہ نیا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے

اُن کی ایسی دلچسپ باتیں بتانے لگی جن کا خود میں نے بھی مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جولین کی نظر کتنی گہری ہے اور کیسی کیسی جزئیات پر جاتی ہے۔

جب رات بہت ہو گئی تو میں نے اُسے ہدایت کی وہ اپنے کمرے میں جا کے سو جائے۔ گلی میں کتے بھونک رہے تھے۔ چوکیدار کی آواز ایک تاثر کی گونجتی تھی اور دیر تک اُس کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ جولین ہچر مچر کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں ڈرائنگ روم کی روشنی گل کر کے واپس اپنے کمرے چلا آیا۔ کانتے گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس کی موجودگی میں مجھے اپنی بالکنی سے اکیلے رہتے اچھا نہیں لگا۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کے میں اُس کے دالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کہیں صبح کے آخری وقت میری آنکھ لگی ہو گی۔

میرا ارادہ تھا کہ ہم صبح سویرے باڑے کی طرف روانہ ہو جائیں گے لیکن کانتے کے اٹھنے نہانے اور لباس تبدیل کرنے میں دیر ہو گئی۔ میں نے اُسے اپنے کپڑے پہننے کو دے دیئے تھے۔ سفید کرتے اور پاجامے میں اُس کا رنگ روپ نکل آیا تھا۔

جولین کو دیکھ کے مجھے یاد آیا کہ میں نے رات اُس سے کیا کہا تھا۔ وہ بہت ہشاش بشاش تھی۔ کہنے لگی، اب طبیعت ٹھیک ہے ڈاکٹر کے پاس پھر کسی وقت چلیں گے۔ مجھے بھی باڑے پہنچنے کی جلدی تھی۔ ابھی ہم دروازے سے نکلے ہی تھے کہ ایک پولیس گاڑی آ کے رکی۔ کانتے نے میرا بازو پکڑ لیا مگر وہ ایس پی شکلا تھا۔ شکلا گاڑی سے اترتے ہی میرے گلے سے لگ گیا۔ "کہاں ہو تم؟" وہ کھنچے لہجے میں بولا۔ "میں نے اتنے پھیرے کیے مگر تم آج ملے۔"

"میں تو یہیں تھا شکلا جی!" میں نے بشاشت سے کہا۔

"کہاں تھے ـــــ جیا پیدی اور جولین سے پوچھو، میں کتنی بار آیا ہوں، انھوں نے تمھیں کچھ نہیں بتایا؟"

"بس اتفاق ہے کہ میں آپ کو نہیں مل سکا۔"

"اور تم نے بھی میری طرف آنے کی کوشش نہیں کی۔ خیر یہ بتاؤ، اب تم کیسے ہو، کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا "آپ اندر بیٹھیے۔"

"نہیں میں پھر آؤں گا۔ دریں قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ظہیر خاں! تم کسی وقت ملو تو میں تمھیں بڑی دلچسپ باتیں بتاؤں۔" اس نے کانتے کی طرف دیکھ کے پوچھا "یہ کون ہیں؟"

"یہ میرے دوست ہیں کانتے۔"

"کانتے۔" اس نے کانتے کو نمسکار کیا۔ کانتے شرمانے لگا۔

"اندر بیٹھیے نا۔"

"مگر چند منٹ۔ اور کوئی تکلف نہیں ہو گا۔"

"بالکل نہیں۔ جیسا آپ حکم کریں گے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

ہم ڈرائنگ روم میں آ کے بیٹھ گئے۔ شکلا نے منع کیا مگر جیا چائے لے آئی۔

"تم نے سنا۔" شکلا میرے کان میں رازدارانہ انداز سے بولا "سیٹھ شمبھو قتل ہو گیا ہے۔"

"ہاں سنا تو ہے۔"

"بس اب کچھ دنوں ہی میں تمھیں ایک خوشخبری اور سناؤں گا۔"

"وہ کیا ـــ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ دن اور انتظار کرو۔"

"کچھ بتائیے تو۔" میں نے اصرار کیا۔

"مگر پیٹ تک رکھنا۔" وہ ادھر اُدھر نظریں گھما کے بولا۔ کانتے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے وعدہ کیا تو شکلا نے سرگوشی کی "کرشنا جی کے قاتلوں کا اب جلد ہی پتہ چل جائے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"بس کیسے، یہ مت پوچھو۔"

"کون لوگ تھے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

"سامنے آ جائیں گے، سامنے آ جائیں گے ظہیر خاں!" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "شمبھو کے مرنے کے بعد صورت حال خاصی بدل گئی ہے۔"

"وہ شمبھو ہی تھا؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ......" وہ فکرمندی سے بولا "مگر پولیس کے جو افسران کرشنا جی کی بہت عزت کرتے تھے، وہ اب خاصے مطمئن نظر آتے ہیں۔"

"صرف مطمئن؟" میں نے زہرخند سے کہا

"کسی حد تک مسرور۔" وہ جوش میں بولا۔

"تو وہ کون تھے؟ مجھے ذرا اشارہ کر دیجیے۔"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ چند دن اور انتظار کرو بڑے بڑے انکشافات کی توقع ہے۔ مرکزی حکومت کے دل میں بھی تمھاری طرح کرشنا جی کی موت کی پھانس چبھی ہوئی ہے۔"

"پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کرشنا جی کی موت اتنی آسانی سے ہضم کر لی گئی تو پولیس کی ملازمت چھوڑ دوں گا لیکن اب شاید مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑے۔ میں اپنے طور پر کام کر رہا تھا ظہیر خاں! میں نے مرکزی حکومت کو خود ہی چھپے بہت سے خط لکھے ہیں۔"

"تو کیا شمبھو کا قتل مرکزی حکومت نے کرا دیا؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیسے ہوا۔ میں سمجھتا ہوں"

شمبھو کے لوگ ہی اس سے ناراض ہو گئے ہوں گے یا شمبھو کے مخالف گروپ نے ایسا کرایا ہو گا لیکن اس سے وہ رکاوٹ ضرور دور ہو گئی جو اس کی زندگی میں ہر قدم پر آڑے آتی تھی۔"

"آپ تو تمام راز فاش کیے دے رہے ہیں۔"

"اوہ۔" وہ گھبرا کے بولا "مگر یہ صرف ایک قیاس ہے۔"

"ٹھیک ہے شکلا جی! آپ اپنا کام کیے جائیے ......" میں نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی "میں آپ کا منتظر رہوں گا۔"

"اب میں آتا رہوں گا بشرطیکہ تم ملتے رہو اور ہاں ایک خاص بات۔" وہ ٹھٹک کے بولا۔

"وہ جگہ سے میرے ٹیلی پرنٹر کے جواب آئے ہیں۔"

"کیا ـــ؟" میں گھبرا گیا۔

"یہ جواب آیا ہے کہ تمھارے آباجان جیسی شکل و صورت کے ایک آدمی دیکھے گئے تھے لیکن اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ ایک خط سورت سے آیا ہے ایک بھوپال سے۔ گویا وہ بھوپال اور سورت میں بھی رہے ہیں۔" وہ تاسف سے بولا۔

"اور کیا لکھا تھا؟" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ بھی اس لیے ہوا کہ میں نے آس پاس کے تمام تھانوں پر پھر بیانات دوڑائے جن پر کرشنا جی نے سرکلر بھیجے تھے۔ وہ جگہ سے جواب آ گیا۔ مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی تم کوئی اچھی خبر سن لو گے۔"

"آپ نے بھوپال اور سورت بتایا تھا؟"

"سورت کے خط میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ کبھی ایک صاحب اس شکل و صورت کے سورت کے ایک محلے میں رہتے تھے مگر برسوں گزر گئے، اب وہ وہاں نہیں ہیں۔"

"اور بھوپال میں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"بھوپال کے خط میں ذرا وضاحت ہے۔ لکھا ہے کہ یہ صاحب اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ محلے والوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ شاذ و نادر ہی باہر نکلتے تھے۔ پھر ایک دن اپنے خاندان سمیت اچانک کہیں چلے گئے۔ کسی کو ان کا پتہ معلوم نہیں ہے کیونکہ وہ کسی کو بتا کے نہیں گئے تھے۔ جواب آئے ہوئے تو تین چار روز ہو گئے۔ میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آ سکا اور سوچتا تھا کہ یہ جواب بتا کے میں تمھیں اور پریشان کر دوں گا۔ اس وقت بات منہ سے نکل گئی۔ مجھے معاف کرنا تمھیں دکھ ہوا ہو گا۔"

"نہیں شکلا جی! کس کس بات کا دکھ کیا جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مارے مارے پھرتے ہوں گے۔ وہ یہاں نہیں ہیں مگر کسی نہ کسی شہر میں تو ضرور ہوں گے۔"

"مگر ایسا کیوں ہے؟" وہ اداسی سے بولا۔

"ایسا یوں ہے کہ اس خاندان میں ایک میں پیدا ہو گیا تھا۔" جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں شکلا کے سامنے یہ کیا کہہ رہا ہوں "شکلا جی! کہیں سے کوئی اور خط آئے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔"

ہماری گفتگو یہیں تک محدود رہی۔ کسی اور نے اُسے نہیں سنا۔ البتہ کانتے بے چین ہو رہا تھا۔ شکلا کو ہم سے زیادہ عجلت تھی۔ اُس کے جاتے ہی ہم گھر سے نکل گئے۔ کانتے مجھ سے پوچھتا رہا کہ ایس پی شکلا مجھ سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے ٹال دیا لیکن میں خود کو نہیں ٹال سکا۔ شکلا نے آباجان کا ذکر کر کے میرے اوسان چھین لیے تھے۔ اتفاق سے ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ علاقے میں آج پولیس کل سے زیادہ تھی۔ بڑے چوراہے پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں نے ٹیکسی رکوا کے اُترنا چاہا مگر کانتے نے مجھے روک لیا اور سیدھے باڑے چلنے پر زور دیا۔ باڑے کی گلی کے نکڑ پر بھی پولیس موجود تھی۔ عمارت کے باہر بھی معمول سے زیادہ سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ کانتے نے ٹیکسی عمارت کے سامنے ہی رکوائی۔ ابھی میں اندر داخل نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوا، رات کسی وقت تیواڑی کے آدمیوں نے علاقے میں گھس کے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لڑائی میں نندو مارا گیا اور تین زخمی ہو گئے۔ صبح سے پولیس کے کئی افسر باڑے آ چکے تھے مگر استاد مچھل نے سب کو منع کر دیا تھا کہ وہ تیواڑی کے آدمیوں کا نام نہ لیں کہہ دیں کہ حملہ آور پہچانے نہیں گئے۔ پولیس میں یہی بیان لکھوا دیا گیا تھا۔ تین اسپتال میں پڑا تھا اور نندو کی لاش آنے والی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو مچھل حقہ پی رہا تھا۔ زورا اُس کے بائیں بازو بیٹھا ہوا تھا۔ منّا اُس کے پیر دبا رہا تھا اور جامو ایک طرف گاؤ تکیے سے لگا سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"لو لاڈلا آ گیا۔" مچھل نے مجھے دیکھتے ہی صدا لگائی۔ جامو نے ذرا دیکھا۔ "اس کے ساتھ کون نواب کا بچہ حرام زادہ آ رہا ہے؟"

جامو کی نظر جیسے ہی کانتے پر پڑی، وہ اپنی نشست سے اچھل پڑا "یہ تو کچھ کانتے دکھائی پڑتا ہے" اس نے دبے لہجے میں کہا۔

میں تیزی سے چبوترے پر چڑھ گیا "یہ دروازے میں لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" میں نے پریشان لہجے میں پوچھا "کیا ہوا؟"

"سانس سنبھال۔" مچھل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا "آنے میں دیر کیوں کی شہزادے؟" وہ بھیگی آواز میں بولا۔

"نکلتے نکلتے دیر ہو گئی مگر ...... مگر ......"

"جو تو نے سُنا ہے ٹھیک ہے۔" وہ سکون سے بولا "پر تو نے کوئی غلط بات تو نہیں سنی ہے اور نہ یہ کوئی نئی بات ہے۔ سپاہی میدان میں مارا گیا، تیراک پانی ہی میں ڈوبتا ہے۔"

"مگر یہ ہوا کیا؟" میں نے غصے سے کہا۔

"ہونا کیا۔ نندو کا وقت آ گیا تھا۔"

"اوہ نہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "آج یہ ہوا ہے کل کچھ اور ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ہمارے علاقے میں گھس کے ہمارے آدمی کو مار دیا۔ وہ کیسے لوگ ہیں؟"

"اور کیا وہ اپنے علاقے میں لے جا کے مارتے؟" وہ مسکرا کے بولا۔ "جاتے کہاں تھے پولیس اُو گھر رہی تھی۔ وہ آ گئے۔ کیا تیرا بابا کوئی قلعہ ہے رے؟"

"مگر یہ ناقابلِ برداشت ہے۔" غصے سے میری آواز لرزنے لگی۔

"ہے تو۔ ! تو اطمینان سے تو بیٹھ۔"

"تم ..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔ "تندو کی موت کا مجھے بھی دکھ ہے۔"

"پھر؟" میں نے وحشت سے کہا۔

اس نے میز پر زانو دبایا اور آنکھیں بند کر کے مجھے تحمل کی تلقین کی۔ میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ تجمل نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے خاموش کر دیا۔ "وہ آیا نہیں۔" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں زورا سے پوچھا۔

"بس آتا ہی ہوگا دادا!" زورا نے تردد سے جواب دیا۔

"کون؟" میں نے درمیان میں دخل دیا۔

"چھیدا۔" تجمل نے آہستگی سے کہا۔ "اسے ذرا کام سے بھیجا ہے۔"

میں نے کام کی نوعیت نہیں پوچھی اس لیے کہ مجھے تجمل سے کسی اطمینان بخش جواب کی توقع نہیں تھی۔ "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" موقع دیکھ کے میں نے چپکے سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پہلی بار توجہ دی۔

"یہاں مناسب نہیں ہے۔" لیکن وہاں سے اٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے اس کے کان میں بات ڈال دی۔ "صبح ایس پی آیا تھا۔"

"اچھا!" وہ میرے نزدیک کھسک آیا۔ "کیا کہتا تھا؟"

"کہتا تھا کہ اب کرشنا جی کے قاتلوں کو پکڑنے میں کچھ ہی دیر جاتی ہے۔ اس نے نام تو نہیں لیا لیکن اس کا اشارہ اسی طرف تھا۔"

"پھر؟" وہ کسمسا کے بولا۔

"اس سے پہلے کہ وہ اس کا انجام طے کرنے کے لیے طویل وقت گزاریں اور ہزار باتیں سامنے آئیں، ہمیں کچھ سوچ لینا چاہیے۔ اس کے اندر جانے کے بعد دونوں باتیں ممکن ہیں، وہ واپس بھی آ سکتا ہے اور ہم ایک لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے۔"

"میں تیری بات سمجھ گیا۔" وہ یکایک اٹھ کے بولا اور چند لمحے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا۔ "کچھ دیر صبر کر۔"

معلوم ہوا کہ تندو کی لاش لینے کے لیے پاڑے کے کئی آدمی اسپتال گئے ہوئے ہیں۔ تندو اسی علاقے میں رہتا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں اس کے ساتھ تھی۔ تندو کی شادی ہو گئی تھی لیکن اس کی بیوی پہلے بچے کی پیدائش پر ہی مر گئی تھی۔ پھر تندو نے شادی نہیں کی۔ وہ بہت جی دار شخص تھا۔ اس کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔

جب چھیدا پاڑے میں داخل ہوا تو تجمل چونک کے اٹھ گیا اور اس نے چھیدا کو درمیان ہی میں روک لیا۔ چھیدا نے نپی تلی آنکھوں سے اسے کچھ بتایا۔ تجمل کا نچلا ہونٹ باہر نکل آیا۔ وہ چھیدا کے کندھے پہ ہاتھ رکھے ہوئے چند قدم خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اور جامو کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ کالے نے بھی ہمارے ساتھ اٹھنا چاہا لیکن تجمل نے اسے وہیں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور زورا سے آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا۔ ہم چاروں پاڑے سے نکل کے گلی میں آ گئے۔ تجمل کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ بڑی سڑک پہ چھیدا نے ایک ٹیکسی روک لی۔ ٹیکسی والا اسے جانتا تھا۔ تجمل، جامو اور میں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ چھیدا ٹیکسی والے کو ہدایت دیتا رہا اور ٹیکسی مختلف راستوں سے گزرتی رہی۔ مجھ سے خاموشی برداشت نہیں ہوئی۔ آخر میں نے جامو سے پوچھ ہی لیا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم استاد پیرو کے پاس جا رہے ہیں۔" جامو کے بجائے تجمل نے جواب دیا۔ استاد پیرو کا نام اس کے بیسیوں کانوں میں پہنچا تھا۔ میں حیرت سے تجمل کا منہ تکنے لگا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ پیرو بمبئی کا ایک مشہور استاد تھا۔ ترواڑی کے بعد اگر بمبئی میں کسی کا نمبر آتا تھا تو پیرو کا۔ تجمل سے پیرو کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، ممکن ہے وہ اس کا واقف کار ہو۔ ایک ساتھ بے شمار سوال میرے ذہن میں سر اٹھانے لگے مگر بمبئی میں تجمل کا کوئی شناسا موجود ہوتا تو وہ سب سے پہلے مجھے اس کے متعلق لکھتا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر تجمل اور پیرو کا کوئی تعلق میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں ٹیکسی والے کی موجودگی میں نہ حیرت کا اظہار کر سکتا تھا، نہ وہاں جانے کا مقصد پوچھ سکتا تھا۔ میں گھٹ کے رہ گیا۔ چھیدا کا اختلاط کرنا اور اس کے آتے ہی تجمل کا چبوترے سے اٹھ جانا، پھر اچانک پیرو کی طرف جانے کا ارادہ کر لینا، یہ سب بڑی انوکھی باتیں تھیں لیکن میں تجمل کی عادت سے واقف تھا۔ وہ اپنے فیصلوں پہ دوسرے کی رائے نہیں کرتا تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ ٹیکسی جامو کے علاقے میں داخل ہو گئی اور گلیوں سے گزرتی ہوئی گیرے رنگ کی ایک دو منزلہ مضبوط عمارت کے سامنے ٹھہر گئی۔ تیسری منزل اُدھڑی ہوئی تھی۔ گلی چوڑی تھی اور زیادہ گنجان نہیں تھی۔ یہ عمارت گلی کے آخری سرے پہ واقع تھی۔ اس طرح اس کے دروازے تین اطراف کھلتے تھے۔ اونچی دیوار عمارت کا احاطہ کرتی تھی۔ چھیدا سب سے پہلے اترا اور اس نے دیوار کے ساتھ بنے ہوئے اسٹولوں پہ بیٹھے ہوئے لوگوں سے کچھ کہا۔ وہ پیرو ہی کے اڈے کے آدمی تھے۔ اندر سے جب تک آدمی واپس نہیں آیا، ہم ٹیکسی ہی میں بیٹھے رہے۔ آدمی اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کے تین اور عمر آدمی بھی تھے۔ وہ ٹیکسی کی جانب لپکے۔ ہم تینوں ٹیکسی سے اتر آئے۔

ان کی معیت میں ہمیں اندر لے جایا گیا۔ ایک بڑے کمرے کے دروازے پہ ہلکے بھورے رنگ کے نہایت متناسب اعضا کا ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔ رنگ صاف تھا۔ "پیرو دادا! کلکتے والا استاد تجمل۔" چھیدا کی آواز میں لکنت آ گئی۔

"آؤ، آؤ استاد! اندر آؤ۔" اس نے تجمل کا بازو پکڑتے ہوئے رسیلے انداز میں کہا۔ "آؤ آؤ! ارے ہوا، ہوا، اینڈ! جو، ہوا۔ سا۔" ایڈ میٹ! وہ ہمیں ایک ہلکی روشنی والے ہال میں لے گیا۔ اس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ چوکی پہ بیٹھنے سے پہلے اس نے ہمیں گلے لگایا۔ وہ ایک سلجھا ہوا، صاف اور تیز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ "کلکتے سے کب آنا ہوا؟"

"کل سویرے۔" تجمل نے سکون سے جواب دیا۔ "پیرو دادا! مجھے تم سے کچھ خاص بات کرنی ہے۔ چھیدا نے میرے بارے میں تمھیں بتایا ہوگا۔"

"باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے یہ بتاؤ استاد کہ پیو گے کیا؟ ولایتی، دیسی، بیئر یا کوئی اور چیز؟" اس کے چھوٹے چھوٹے دانت چمکنے لگے۔

"کچھ نہیں کھائیں گے پئیں گے بعد میں، اس وقت تمھارے پاس ایک کام سے آئے ہیں۔ کھانے پینے کے لیے تو بہت وقت پڑا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ تم ایدھر بمبئی میں اپن کا مہمان ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "مہمان کے لیے بس ایک ہی ہوگا، اپن اپنے مہمان کے لیے کریں گا۔"

"بات بڑی ہے پیرو دادا!" تجمل نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "لیکن تمھارے سامنے کلکتے کا استاد تجمل بیٹھا ہے۔ یہ فیض آباد کا استاد جامو ہے اور یہ تمھارا راجا ہے جس نے چھنگا سے پاڑا لیا ہے۔"

"یہ راجا ہے!" وہ تعجب سے بولا۔ "اپن نے اس کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اپن راجا کو دیکھنے کا تڑپ رکھتا تھا۔"

"پیرو دادا! مجھے یقین ہے کہ تم نے ادھر بمبئی میں جو نام بنایا ہے وہ اپنی بہادری اور سوجھ بوجھ سے بنایا ہے۔"

"استاد! بولو بولو۔ کام بولو۔"

"دادا! ہم بہت صاف بات کرنے آئے ہیں۔ بات عجیب ہے لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تم ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔"

"بولو دادا! بولو۔ اپن وعدہ کرتا ہے کہ اپن سوچ سمجھ کے جواب دے گا۔ اپن کو کام بولو۔ ایدر اُودر کی بات مت کرو۔"

"پیرو دادا! ہم تم سے پھوکوں کے لیے تمھارا اڈا چاہتے ہیں۔"

"کیا ..... ؟ تم کیا بولتا ہے استاد تجمل!" وہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ دادا! بیٹھ جاؤ۔ میری بات غور سے سنو۔ ہم کچھ دنوں کے لیے تمھارا اڈا چاہتے ہیں۔ اس کے بدلے میں تم چاہو تو ہم تمھیں راجا کا پاڑا، کلکتے کا اڈا اور فیض آباد کا اڈا، تینوں کی ایک ساتھ پرچی لکھ کر دے سکتے ہیں۔"

"پر یہ تم کیا بولتا ہے استاد تجمل!" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "کرے کی دیواروں سے لگے ہوئے اس کے تینوں آدمی چوکنے ہو گئے۔ "ایسے کیسے ہوتا ہے استاد تجمل!"

"ایسا ہو سکتا ہے پیرو دادا! تم چاہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔" تجمل آہستگی سے بولا۔ "یہ اڈا تمھارا ہے اور ہم تم سے اسے مول کے لیے نہیں مانگ رہے ہیں۔ ہم کو اس اڈے کی آمدنی سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ سب تمھاری اور تمھارے آدمیوں کی۔ ہم تو صرف تھوڑے دنوں کے لیے یہ اڈا لینا چاہتے ہیں۔ تم سوچ لو۔"

"سوچنا کیسا استاد!" وہ تُرشی سے بولا۔ "کیا تم یہی بولنے آیا ہے؟"

"ہاں!" تجمل نے تنا تنگی سے کہا۔ "ہم اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔"

"تم کلکتے کا استاد تجمل ہے۔" وہ بلند آواز سے بولا۔ "اپن نہیں سمجھتا کہ استاد ہو کے ایسا بات بولتا ہے۔"

"اگر اسے سودے کے طور پر دیکھا جائے تب بھی یہ برا نہیں ہے۔" تجمل کے لہجے میں کسی قدر تندی آ گئی۔ "لیکن ہم سودے بازی کرنے کے لیے نہیں آئے۔ ہم تو تم سے ادب کی بات کر رہے ہیں۔ پیرو دادا! ہم یہ اڈا تمھارا حق سمجھتے ہیں۔ یہ تمھارا ہے اور تمھارا رہے گا۔ ہم کو معلوم ہے کہ تم نے اسے کیسے حاصل کیا ہوگا اور تمھیں اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے کتنے جتن کرنے پڑتے ہوں گے۔ ہر استاد کو یہی کرنا پڑتا ہے۔" مجھے حیرت ہوئی اسی قسم کی باتیں میں نے چھنگا سے کی تھیں لیکن تجمل کا انداز بالکل مختلف تھا۔

"اپن کا مغز پھر جائے گا۔" وہ سر پکڑتے ہوئے بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بات بڑی ہے اور نئی بھی ہے۔ پر تم اپنا دل اور سر کھول دو تو اعتبار کر سکتے ہو۔ ہماری بات کا اعتبار کرو دادا! اڈے پہ تمھارے ہی آدمی رہیں گے، یہی عمر جماعت ہوگا۔ ہم اپنے آدمی یہاں نہیں لائیں گے۔ ہماری بات مان لو، ایسا کر کے دیکھو۔"

"تم ..... تم استاد تجمل ہو۔" وہ قہقہے لگانے لگا۔

اس کے قہقہے رکے تو تجمل نے سنجیدگی سے کہا۔ "پیرو دادا! ہم تم سے یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ اب تم یہ اڈا چلانے کے لائق نہیں رہے۔ ہم تم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ استادوں کی طرح یہ جماعت کے یہ اڈا چھوڑ دو۔ چاہے اگر تم چاہو تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ استاد جامو، راجا اور مجھ میں سے تم جسے چاہو اپنے لیے چن سکتے ہو۔"

"ہو ..... ہو۔" وہ پھنکارنے لگا۔ اس نے چوکی پر زور سے گھونسا مارا مگر تجمل کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پیرو چند لمحوں تک تلملاتا رہا۔ اس کے آدمی چوکی کے نزدیک آ گئے تھے۔ اچانک وہ بے حس و حرکت ہو کے نہیں گھورنے لگا۔

"کوئی استاد دو ہی باتوں سے اڈا چھوڑتا ہے یا تو وہ مر جائے یا کوئی دوسرا اس سے اڈا چھین لے مگر ایک تیسری بات بھی ہو سکتی ہے

"پیرو دادا!" تجمل نے نرمی سے کہا۔ "وہ یہ کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تم اس پر عمل کرو۔ یہ کوئی حکم نہیں ہے ہم تم سے منت کر رہے ہیں۔"

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اپن کو شک ہے کہ تم ہی استاد تجمل ہو۔ تم کلکتے کا راجا ہو۔ نہیں... نہیں..... ابھی تمہارا کچھ فرینا ہو گیا ہے۔"

"اتنی بے عزتی مت کرو پیرو دادا!" تجمل نے آنکھیں چڑھا کے کہا۔ "کوئی اور تمہارے پاس اس طرح نہیں آ سکتا تھا۔"

"پر..... پر تم اڈا کیوں لینا چاہتے ہو؟"

"یہ بعد کی بات ہے پہلے تم اڈا میرے حوالے کرنے کی بات کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس حالت میں تم اسے دو گے، میں اسی حالت میں اسے واپس کر دوں گا۔ ہمارے تمہارے درمیان صرف بات کی بات ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"استاد تجمل! اڈا اپن نے بازو سے حاصل کیا ہے۔" اس نے سر اُچھالتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی اسے بازو ہی سے لے سکتا ہے لیکن تم..... تم بڑی مسخری کی بات بولتے ہو۔ اپن کو یہ کیسے پتہ چلے کہ تم ہی استاد تجمل ہو۔ اگر تم تجمل ہو تو اپن نے نام ضرور سنا ہے، پر اپن اس طرح کیسے تم سے لگ کے بات کرے۔"

"میں نہیں چاہتا کہ میں اور تم آمنے سامنے آئیں لیکن تمہاری تسلی کیلئے ضروری ہے کہ تم اپنے کسی آدمی کو اشارہ کرو۔ تم کو ابھی پتہ چل جائے گا۔" تجمل نے ناگواری سے کہا۔

پیرو دادا کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ آدمی بار بار چاقو اُچھال رہا تھا اور ہمیں شروع شروع نظروں سے مسلسل گھور رہا تھا۔ وہ بہت پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔ وہ قد کا لمبا اور جسم کا مضبوط تھا۔ تجمل نے اسے نہیں دیکھا۔ "معاف کرنا استاد تجمل!" تجمل نے چونک کے دیکھا۔ "تم ابھی بچے ہو۔ اسے اپنے چاقو پر بڑا مان ہے۔ اس سے چاقو چھین لو۔"

تجمل کی آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ "پیرو دادا! ماچی کا مان مت توڑو۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا ہے۔ تم بات کرو۔"

"ماچی کے بعد میں تم سے ضرور بات کروں گا۔"

"استاد تجمل نہیں اُٹھے گا۔ ماچی کو میں دیکھوں گا۔" جامو نے پہلی بار زبان کھولی۔ "استاد تجمل کی بے عزتی مت کرو پیرو دادا!"

"تم میں سے کوئی بھی ہو۔ اپن کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"اسے میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

جامو نے مجھے دھکا دے کے بٹھا دیا اور پھرتی کے ساتھ کرسی سے اُٹھ گیا۔ اس نے نہ جانے کس لمحے اپنا چاقو کھول لیا تھا۔ "استاد تجمل! اجازت ہے؟" وہ چاقو لہراتے ہوئے بولا۔

تجمل نے گردن ہلائی۔ جامو بجلی کی طرح تڑپ کے پلٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی لپک تھی۔ جامو نے انتظار کیا۔ ماچی اس پر حملہ کرنے کیلئے فرش پر تھرکنے لگا۔ اس کے برعکس جامو ایک جگہ جا کھڑا تھا۔ جامو نے دو تین مرتبہ اُسے متزلزل کرنے کے لیے مختلف زاویوں سے اپنے جسم کو جنبشیں دیں۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتا اور اپنا قدم پھر پیچھے ہٹا لیتا۔ اس کی گردن آگے جھکی ہوئی تھی اور آنکھیں ماچی کے چاقو کی نوک پر جمی ہوئی تھیں۔ جنبشوں سے ماچی کو غصہ آ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جامو صرف چند لمحوں میں فیصلہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ شاید اس بات کے انتظار میں تھا کہ ماچی حملے میں پہل کرے۔ ماچی بھی پوری طرح مستعد تھا۔ اس کا جسم رواں تھا اور اُسے چاقو چلانا آتا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ جامو مجھ سے پہلے چلا گیا۔ میں نے خود نہیں کیا حالانکہ تجمل نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ فیض آباد کا استاد جامو ہے مگر پیرو کا مطلب بھی کچھ اور تھا۔ جامو اور ماچی ایک دوسرے کو تولتے رہے۔ ماچی نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی۔ جامو اپنا چاقو چمکاتا ہوا چیتے کی طرح اچھل کے چشم زدن میں اس کے سر پہ پہنچا۔ چاقو گرنے کی آواز ماچی نے بھی سنی ہوگی۔ اس نے اس طرف دیکھا ہی تھا کہ دوسرے لمحے اس کا چاقو والا ہاتھ جامو کے پنجے میں تھا۔ جامو نے ادھر ماچی کا ہاتھ پکڑا اور دیکھتے دیکھتے اُسے اپنے کندھے پہ رکھ کے اس کا بھاری جثہ ایک جھٹکے سے فرش پہ پٹخ دیا۔ ماچی نے پھر بھی چاقو سنبھالے رکھا لیکن جامو نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ جامو اس پر پوری طرح حاوی آ چکا تھا۔ اس نے اس کے گلے پہ چوٹ مار کے ہاتھ موڑا۔ ماچی کی انگلیوں سے چاقو دبایا نہیں جا سکا۔ چاقو گرتے ہی جامو نے ماچی کو چھوڑ دیا اور اپنے بال درست کرتا ہوا چوکی پہ آ کے بیٹھ گیا۔ جامو نے کوئی نیا داؤ نہیں آزمایا تھا۔ اس نے ساری توجہ تیزی اور پھرتی کی طرف دی تھی کیونکہ فیصلہ چند ہی لمحوں میں ہونا چاہیے تھا۔ پیرو نے چوکی پہ کھڑے ہو کے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ جامو دوبارہ اُٹھ کے اس کے گلے سے لگ گیا۔ "سنا تھا، پر صرف سنا تھا۔" وہ اُسے زور سے لپٹاتے ہوئے بولا۔ "کہ آگرہ دلّی یا دربھنگا بانکا پڑا ہے۔ استاد تجمل! معاف کرنا۔ اپن کو معاف کرنا۔"

"تمہاری تسلی ہو گئی پیرو دادا! اب کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات کیا کرے تم نے اپن کا سر جھکا دیا ہے۔"

"نہیں پیرو دادا! یہ اڈا تمہارا ہے۔ اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا مال تمہارے پاس رہے۔ ہمیں واپس اپنے شہر جانا ہے۔ ہم ادھر بمبئی میں نہیں رہنا چاہتے۔"

"اپن کو اب تمہاری ہر بات کا اعتبار ہے۔" وہ جوش میں بولا۔ "آج سے یہ اڈا تمہارا ہے۔ اور بولو اپن کے پاس کیا ہے۔"

تجمل نے آگے بڑھ کے اُسے بھینچ لیا۔ "پیرو دادا! بس یہی بہت ہے۔ تم یہاں کے بادشاہ ہو۔ تم یہیں رہو گے۔ آئندہ آؤ تو ہمیں تم سے

کچھ بات کرنی ہے۔"

"چلو، چلو۔" وہ بے قابو آواز میں بولا۔ تجمل اس کے ساتھ اندر کسی کمرے میں جانے لگا۔ پیرو جاتے جاتے پلٹ پڑا اور اپنے آدمیوں پر برسا۔ "مائیں! ابھی تک کی خال پڑا ہے۔ استاد تجمل آیا ہے۔ سالا تم لوگ کھڑا کھڑا کیا دیکھتا ہے۔" وہ دہاڑتا ہوا بولا۔ "مہمان کے لیے کچھ لاؤ۔ کرو جلدی۔"

تجمل اُسے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ ان کے جاتے ہی چھیدا جامو کے گال چومنے لگا۔ پیرو کے آدمی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ماچی بھی فرش سے اُٹھ کے جامو سے لپٹ گیا تھا۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہے تھے لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ تجمل کی بات اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ چوکی پہ کھانے پینے کے سامان کا انبار لگا دیا گیا۔ سب نے تجمل اور پیرو کی واپسی کا انتظار کیا۔ وہ دونوں بہت دیر میں باہر نکلے لیکن دونوں ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ پیرو بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ میں اندازے ہی لگا سکتا تھا کہ انھوں نے اندر کیا بات کی ہوگی۔ پیرو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ فلاں فلاں آدمی کو فوراً پاٹے پہ بلا لائیں۔

جتنی دیر میں لوگوں نے آنا شروع کیا اتنی دیر میں ہم سب کھانا کھاتے رہے۔ پیرو تجمل کے قریب بیٹھا اس کی خاطریں کر رہا تھا۔ کمرے میں کسی دعوت کا منظر نظر آتا تھا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد پیرو تجمل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے بولا۔ "سالا لوگ! ذرا اپن کی بات سنو۔ یہ اپن کا دوست استاد تجمل ہے اور یہ استاد جامو ہے اور میرا جانا ہے۔ اپن آج سے پاٹے کا سارا انتظام تجمل استاد کو دیتا ہے۔ تم سالا کسی کو کوئی شک ہو تو اپن کو ابھی بولو۔"

سب حیرانی سے پیرو کو دیکھنے لگے۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ لوگ کسمسانے اور ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ "آج سے تم لوگ استاد تجمل اور استاد جامو اور استاد راجا کی بات سنے گا۔ جو یہ بولیں گا کرے گا۔ یہ پاڑا اب پیرو دادا کی جگہ استاد راجا کا پاڑا سمجھے گا۔ اپن کا یہ فیصلہ دُور دُور جا کے بول دو۔ راجا کا پورا نام پاڑا بالم خاں کا پاڑا بھی اسی پاٹے میں مل گیا ہے۔ سمجھا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "جس سالا کو پیرو کی مرضی پسند نہیں ہے، وہ علاقے سے کلٹی ہو جائے۔ اپن بھی ادھر ہی رہے گا پر استاد تجمل کے دوست کا مالک۔ اپن کچھ نہیں بولیں گا اور اپن آگے کچھ بولے تو اپن کی بات سننے سے انکار کر دو۔ سمجھا۔" وہ دوبارہ چلایا۔ وہ سب گنگ ہو گئے تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہر شخص کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں مگر پیرو کی باتوں میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ پیرو چپ ہوا تو تجمل نے اونچی آواز سے کہا۔ "سب کچھ اسی طرح رہے گا۔ کسی کام میں کوئی فرق نہیں آئے گا لیکن بات ہم ہی سے چلے گی۔"

تجمل نے جامو اور چھیدا کو وہیں چھوڑا۔ پھر مجھے اور پیرو دادا کو اپنے ساتھ لے کے چل پڑا۔ باہر کئی ٹیکسیاں تیار کھڑی تھیں۔ ایک ٹیکسی میں ہم تینوں بیٹھے۔ دوسری اور تیسری میں پیرو دادا کے اڈے کے آدمی بیٹھ گئے۔ جب ہم اپنے پاٹے پہنچے تو ہمارے ساتھ پیرو اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کے لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پاٹے میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا۔ تجمل نے بڑی محبت کے ساتھ پیرو کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ تندو کی لاش آ گئی تھی لیکن بیماری کی وجہ سے اُسے روک لیا گیا تھا۔ پیرو کا خیال تھا کہ تندو کے جنازے میں تینوں پاٹوں کے لوگ شریک ہوں اور اسے دھوم دھام سے اٹھایا جائے مگر تجمل نے اس کی رائے مسترد کر دی۔ تندو کے مردہ جسم پہ پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پیرو نے اس کی ماں کے لیے فوراً تین ہزار روپے نقد اور پچاس روپے ماہانہ وظیفے کا اعلان کیا۔ میں نے اپنا اعلان منسوخ ہی رہنے دیا۔

تندو کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کی بائیں آنکھ کٹ گئی تھی۔ آخری دیدار کے لیے اس کی لاش اٹھائی گئی تو پاٹے کے بہت سے لوگ بری طرح رونے لگے۔ تودا نے بتایا کہ رتن کی حالت اب کسی قدر بہتر ہے اور اسے ہوش آ گیا ہے۔ اسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے بیان میں تجاری کے آدمیوں کا نام نہ لے۔ مجھے ابھی اسپتال جانے کا وقت نہیں ملا تھا۔ کچھ دیر پاٹے میں رہ کے تجمل، پیرو اور میں علاقے میں گشت کے لیے نکلے۔ تندو کی موت کی وجہ سے علاقے بھر میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ ہمیں موجود پا کے لوگوں کے چہروں پر اطمینان نمایاں ہو جاتا۔ ہمارے پیچھے پیچھے بہت سے آدمی چل رہے تھے۔ مادی اور مُنّا بھی ان میں موجود تھے۔ مادی مجھ سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ پیرو نے یہاں بھی ایسا اعلان دہرایا تھا۔ سب حیرت سے کہ اُس نے اپنا پاڑا میری نگرانی میں دے دیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ساتھ موجود ہے۔

تندو تمام کارروائی سے دفن کر دیا گیا۔ پاٹے کے چند ہی لوگ جنازے میں شریک ہوئے اس کے علاقے کے لوگوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پیرو واپس چلا گیا مگر اس کے کئی آدمی ہمارے پاٹے میں رہ گئے۔ رات ہوئی تو میں نے تجمل کے کہنے پہ پیش بندی کر دی کہ میں آج رات گھر نہیں جاؤں گا۔ اس نے میری بات ان سنی کر دی۔ اُس رات وہ خود مجھے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ مادی اور مُنّا بھی ہمارے ساتھ تھے۔ میرا خیال تھا کہ تجمل رات بھر آرام کرے گا لیکن ٹیکسی باہر کھڑی رہی اور وہ جلدی جلدی چند باتیں کر کے کہیں چلا گیا۔ مُنّے کو میرے پاس ہی چھوڑ دیا گیا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ان حالات میں وہ مجھے گھر میں آرام کرنے کے لیے کہتا تھا۔ میں نے رات کے گھر سے نکلنے کی ٹھانی مگر گلی میں چند قدم چل کے واپس آ گیا۔

شہر کے دور دراز علاقوں میں پیرو کی سفاک وحشی اور اس کے اڈے پر پیرو کے اور تجمل کے قبضے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ تین دن گزر گئے۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں یہ سب کچھ ایک تماشے کی طرح دیکھتا رہا۔ علاقے میں پھر کوئی واردات نہیں ہوئی۔ دوسرے ہی دن تیواڑی کے چھ آدمی لوٹ کے پیرو کے پاٹے میں شامل ہو گئے یعنی اس پاٹے میں جو اب پیرو کے نام سے موسوم تھا۔ ان کا بہت احتیاط سے خیر مقدم کیا گیا۔ تیسرے دن علاقے سے پولیس بھی ہٹ گئی۔ اب تجمل کا زیادہ وقت پیرو کے اڈے پر گزرتا تھا۔ کالتے اور جامو کبھی ادھر کبھی ادھر دونوں جگہ آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے کئی بار ان سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر انھوں نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ تجمل جب کوئی بات بتانا پسند نہیں کرتا تھا تو پھر کوئی بھی اس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ پیرو کے اڈے میں بیٹھا ہوا ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کا پرانا آدمی ہو اور کلکتے کا اڈا بمبئی میں منتقل ہو گیا ہو۔ پیرو نے اس کے لیے یہاں بھی حقے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ عموماً اس کے ساتھ ہی رہتا تھا مگر تجمل کی کسی بات پر زبان نہیں کھولتا تھا۔ بس مسکراتا رہتا تھا اور تجمل کو احکام دیتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ تیسرا دن ہی تھا کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کچھ تنہائی ملی تو میں نے تلخی کے ساتھ تجمل سے پوچھا: "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"جو تو چاہتا ہے۔" وہ ہنس کے بولا۔

"لیکن تم یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے ناراضی سے کہا۔

"کیا تیری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے؟" وہ نرمی سے بولا۔

"تم نے قلعہ ضرور بنا لیا ہے مگر......"

"پہلے قلعہ بنا لینا اچھا ہوتا ہے لاڈلے! تو ہی تو کہتا تھا کہ تیواڑی بہت بڑا استاد ہے۔ آدھی بمبئی اس کے پاس ہے۔ ہر طرف اس کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں اور اسے کسی بات میں کوئی لالچ نہیں ہے۔ تو نے اس کے متعلق بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ بڑے استاد کے لیے انتظام بھی بڑا کرنا پڑتا ہے۔ کام مناسب طریقے سے ہونا چاہیے نا۔ اپنی بھی عزت کی بات ہے لاڈلے! اور پھر تجھے جلدی بھی ہے۔ میرا بھی اس شہر میں دم گھٹ رہا ہے۔"

"میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"ابھی میں تجھے کیا جواب دوں لاڈلے!"

"کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"سب کچھ تیرے سامنے ہے۔"

وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ آخر میں نے تنگ آ کے اس سے بات کرنا ہی بند کر دیا۔ جامو اور پیرو بھی وہاں آ گئے تھے۔ ہوتے ہوتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ تجمل اور جامو پیرو کے علاقے میں صبح و شام گشت کرتے تھے۔ علاقہ بڑا تھا لیکن وہ پیدل ہی نکل جاتے۔ کبھی پیرو ان کے ساتھ ہوتا، کبھی وہ تنہا ہوتے۔ رات گئے تجمل مجھے گھر واپس بھیج دیتا۔ تینوں پارٹیوں میں غیر معمولی سرگرمی پائی جاتی تھی۔ عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہو گئی تھیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ کہتا تھا۔ تجمل شاید ہی کسی وقت آرام کرتا ہو۔ میں صبح آتا تو اس کی آنکھیں سرخ دیکھتا۔ وہ یقیناً رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ اس سے کہوں تم اپنی صحت کا خیال رکھو اور پھر تم ایک اجنبی جگہ بیٹھے ہوئے ہو۔ کسی وقت بھی کوئی بڑا حادثہ ہو سکتا ہے مگر مجھے اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تینوں پارٹیوں کے آدمی اس کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ ہر وقت چاقو بازی اور زور آزمائی کی مشقیں جاری رہتی تھیں۔ چاقو میں کالتے کا ہاتھ بہت رواں تھا۔ وہ پیرو کے اڈے کے زیادہ تر لوگوں سے زور آزمائی کرتا رہتا تھا اور سب کو دنگ کر دیتا تھا۔ تجمل موجود ہوتا تو وہ کالتے کے سامنے تنہا کھڑا ہو جاتا۔ کالتے اس پر چاقو کے حملے اور مختلف داؤ آزماتا۔ تجمل خود کو بچاتا رہتا اور آخر کالتے کے ہاتھوں سے چاقو چھین لیتا۔ پیرو کا خاص آدمی ماجھی اب تجمل کے گرد بیٹھا رہتا اور جب بھی موقع ملتا اس کے پاؤں دبانے لگتا۔ پاٹے کے دوسرے لوگوں کا حال بھی یہی تھا۔

دوسرے دن رات کو خلاف توقع تجمل نے مجھ سے گھر جانے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ جامو اور کالتے دوپہر سے غائب تھے۔ اڈے پر سکون چھایا ہوا تھا۔ پیرو کچھ بے چین نظر آ رہا تھا لیکن تجمل کے چہرے پر تشویش کی کوئی علامت نہیں تھی۔ "اب تم کلکتے کا ارادہ کب کرو گے پیرو دادا؟" تجمل کی آواز گونجی۔

"تجمل بھائی! جیسے ہی تم ملا' اپن اوور بھاگیں گا۔" پیرو جلدی سے بولا۔ "پر اپن ابھی تم کو جانے نہیں دیں گا۔"

"مجھے بہت دیر ہو گئی ہے پیرو دادا! تم نے ہماری بات کو لی۔ میں سدا اسے یاد رکھوں گا۔" تجمل نے ملائمت سے کہا۔

"فکر مت کرو تجمل بھائی!" پیرو نے تجمل کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "کبھی کسی بات کی ضرورت ہو تو ہم کو لکھنا۔"

"اپن کا جی کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کے تمہارے ساتھ چلے۔"

"نہیں پیرو دادا! ابھی تم کو بمبئی میں بہت کام کرنا ہے۔"

میں حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تجمل کچھ ہی دیر بعد روانہ ہونے والا ہے۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی اور آنکھیں بھاری تھیں۔ وہ باتیں پیرو سے کر رہا تھا اور [illegible] کے بیچ رہا تھا۔ گھنٹوں گزر گئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کچھ مجھے بھی اندازہ ہو چلا تھا۔ میری رگوں میں خون کا دوران تیز ہو گیا تھا۔

"دیر ہو گئی۔" اچانک پیرو نے اضطراب سے کہا۔

تجمل نے منہ بنایا۔ "راستے میں ہوں گے۔"

ابھی اس نے ایک گہری سانس ہی لی تھی کہ باہر گاڑیوں کا شور ابھرا۔ پیرو نے بے قراری سے تجمل کو دیکھا۔ تجمل نے گردن ہلائی اور چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ [illegible] سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر کچھ ہی دیر بعد دروازے پر جو دکھائی دیا میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ میں جھپٹ کے دروازے کی جانب بھاگا۔ کالتے اور جامو خون میں لت پت تھے۔ ان کے کپڑے لال ہو گئے تھے لیکن وہ دونوں اپنے قدموں سے [illegible] پکڑے ہوئے تھے۔ کالتے کی پیشانی اور کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ جامو کا سارا بازو سرخ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اونچے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک زخمی شخص موجود تھا۔ وہ نہایت بپھرا ہوا اور وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ میں اسے نہیں پہچانتا تھا۔ جامو اور کالتے اسے لیے ہوئے آگے آ گئے۔ ان تینوں کے پیچھے ایک ہجوم تھا۔ کئی آدمی زخمی تھے۔ زودا بھی تھا، چھیدا بھی تھا، مارتی بھی تھا۔ پاٹھان کے پاٹے کے بھی کچھ لوگ تھے۔ ماجھی بھی تھا اور پیرو کے پاٹے کے کئی آدمی بھی تھے۔

"تجمل بھائی! اوپر والے نے لاج رکھ لی۔" جامو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اسے زندہ لے آیا ہوں۔"

"جامو! مجھے یقین تھا کہ تو خالی ہاتھ واپس نہیں آئے گا۔" تجمل نے آگے بڑھ کے اسے گلے سے لگا لیا۔

میں نے کالتے کو زور سے پکڑ لیا۔ "کالتے! یہ کیا ہے؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ہم تیواڑی کو لینے گئے تھے لاڈلے راجا!" اس نے مسکرا کے میری ٹھوڑی پکڑ لی۔ "سالے کا پاٹہ چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ایک آدمی کو اس کی گلی سے نکلنے نہیں دیا۔ سڑک پر لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ پر ہم اسے لے آئے ہیں۔ بڑا زور کیا حرام کے جنے نے۔" کالتے نے زمین پر تھوک دیا۔ اس کے تھوک میں خون ملا ہوا تھا۔

تجمل غور سے تیواڑی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ تیواڑی بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ تجمل پیرو کا بازو پکڑ کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ "لاڈلے!" اس نے بلند آواز میں مجھے پکارا۔ "اسے سنبھال!" اس نے تیواڑی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے چاقو نکال لیا۔ میری نظروں میں [illegible] سارا جسم گھوم گیا۔ میں اس کی بوٹی بوٹی کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ تجمل نے ہاتھ بلند کر کے مجھے روک لیا۔ "تیواڑی! کوئی آخری خواہش ہو تو بیان کر۔" تجمل نے سرد لہجے میں کہا۔

"ایک ہی آخری خواہش ہے دادا! اپن کو ایک چاقو دے دو۔ اپن ایسے نہیں مرنا چاہتا۔ تم اپن کو چاقو کے بغیر مارو گے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔" تیواڑی نے بھاری لہجے میں کہا۔

"چاقو کی موت تو عزت کی موت ہوتی ہے تیواڑی! میں تجھے لڑتے لڑتے مرنے کی عزت نہیں دینا چاہتا۔ یہاں تیرا آنا ہی تیری موت کے برابر ہے۔ استاد جامو سے کہا گیا تھا کہ وہ تجھے زندہ پکڑ کے لائے۔ تو تو ویسے ہی مر چکا ہے۔" تجمل کی آواز بھی جیسے اس کی آنکھوں کی طرح سرخ تھی۔

"اپن نے تم سے اپنی آخری خواہش بول دی ہے اور اپن تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگتا ہے۔" تیواڑی نے گرج کے کہا۔

جامو نے اس کی طرف چاقو اچھال دیا۔ "تجمل بھائی! اسے اپنی حسرت نکال لینے دو۔ اسے چاقو سے مارا نہیں جائے گا۔"

"تیری مرضی جامو!" تجمل نے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"نہیں تجمل بھائی! تم نہیں۔" جامو تجمل کے سامنے مزاحم ہو گیا۔ ادھر کالتے تیواڑی کی طرف چاقو لے کے بڑھنے لگا۔

"تم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تیواڑی کو میں دیکھوں گا۔ تم ہٹ جاؤ۔"

"لاڈلے!" تجمل دہاڑنے لگا۔

"مجھے منع مت کرو تجمل بھائی!" میں نے تلملا کے کہا۔

"تیرا کام چاقو چلانا نہیں ہے۔" تجمل غضب ناک آواز میں بولا۔

"مجھے مت روکو۔" میں ایک جست لگا کے تیواڑی کے سامنے پہنچ گیا۔ کالتے نے پھر آگے آنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دھکا دے دیا۔ اردگرد کھڑے ہوئے لوگ پیچھے ہٹ گئے اور کمرے میں ہمارے لیے ایک دائرہ بن گیا۔ چاقو میرے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ میرے رگ پٹھے میں سنسنی دوڑی ہوئی تھی۔ مجھے تیواڑی کے مقابل دیکھ کے تجمل چپ ہو گیا۔ کمرے میں ہر آواز معدوم ہو گئی تھی۔ میں اس کے حملے کا انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ کوئی داؤ آزمانے کی خواہش رکھتا تھا لیکن اسی لمحے مجھے تجمل کی بات یاد آ گئی۔ اس نے جیل میں مجھے نصیحت کی تھی کہ لڑتے وقت دماغ ٹھنڈا اور جسم گرم رکھو۔ میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم بہ جبر روک لیے ورنہ میں نے تو اپنا چاقو بھی پھینک دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جامو کا جو چاقو تیواڑی کے ہاتھ میں تھا، اسے اسی سے لہولہان ہونا چاہیے تھا۔ تیواڑی اپنی زندگی کی آخری لڑائی لڑ رہا تھا۔ زخمی ہو جانے کے باوجود اس کے جسم میں طوفان کی لپک تھی۔ اگر وہ زیادہ زخمی نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی اس کے خلاف چاقو اٹھانے پر آمادہ نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ جامو نے اس کے گال اور سینے پر خون کی لکیریں بہت احتیاط سے کھینچی ہیں۔ یہ لکیریں کھینچنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ اسی وقت کھینچی جاتی ہیں جب رعایت کا کوئی گوشہ ذہن میں موجود ہو ورنہ ہاتھ ذرا بہک جائے تو گوشت نکل آتا ہے۔ تجمل کہتا تھا کہ لکیر کھینچو تو ایسی کہ ناخن کا گمان ہو اور خون کی بوندیں

پسینے کی طرح پھوٹ رہیں۔

"تیواڑی نے بندر کی طرح آگے پیچھے اُچھلتے کودتے ہوئے سب سے پہلے میرے گلے کو نشانہ بنانا چاہا۔ مجھے اب مجمع کا کوئی ہوش نہیں تھا اور نہ دنیا کی خبر تھی۔ میرے سامنے تو بس تیواڑی تھا۔ میں اُس کی پھرتی تو دیکھ رہا تھا۔ اس پھرتی میں ایک تحمل بھی تھا حالانکہ یہ تحمل کا موقع نہیں تھا۔ وہ نپے تلے انداز میں وار کر رہا تھا اور میں نپے تلے انداز میں بچ رہا تھا۔ دو ایک بار میں نے بھی اُسے اپنے چاقو کی زد پر لانا چاہا مگر وہ اپنا جسم صاف بچا گیا۔ اگر نگاہ مخالف کے چاقو کی پابند کر دی جائے کہ جدھر چاقو جائے اُدھر نگاہ بھی اُس کے ساتھ جائے تو مخالف کا وار عموماً ناکام ہو جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جسم بھی نگاہ کا پابند ہو۔

تیواڑی نے دوسرا شدید وار میرے سینے پر کیا۔ وار اتنا غیر متوقع اور بے ساختہ تھا کہ میرے پاس اپنی جگہ سے ہلنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ اگر میں برق رفتاری سے اُس کا بڑھتا ہوا چاقو اپنے چاقو پر نہ روکتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے اُسے روکا میرے ذہن میں فوراً ایک خیال شعلے کے مانند لپکا۔ میں نے چاقو پر زور برقرار رکھتے ہوئے اپنا جسم کسی قدر پیچھے کر کے ایک جھٹکے سے ہاتھ نیچے گرا لیا۔ اس جھٹکے سے میرا چاقو نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اُسے دانستہ گرایا تھا۔ تیواڑی سمجھا کہ میں حواس باختہ ہو گیا ہوں مگر اب تیواڑی کی کلائی میرے پنجے کی گرفت میں تھی۔ یہ ایک خطرناک قدم تھا۔ میرے ہاتھ سے چاقو گرنے کی وجہ سے تیواڑی سخت برہم ہو گیا تھا۔ اُس نے میری گرفت سے کلائی چھڑا لینے کے لیے پے در پے کئی جھٹکے دیے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ یہی کرے گا لیکن میں اپنا جسم ڈھیلا کر کے اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے نیچے جھول گیا تھا۔ کچھ اس طرح کہ میرے جسم کا سارا وزن تیواڑی کے ہاتھ پر آ گیا تھا۔ یہ دباؤ برداشت کرنا اُس کے لیے سخت اذیت ناک ہو گا۔ میں نے اُس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ظاہر ہے اُس کے توازن کے ساتھ اُس کی سوچ بھی بگڑ گئی۔ وہ مجھ سے اس داؤ کی توقع نہیں کر رہا ہو گا۔ تجمل سچ کہتا تھا کہ بہت سے داؤ موقع پر خود بخود تخلیق ہو جاتے ہیں۔ تیواڑی اب میری گردن اور منہ پر بھی ضربیں لگا سکتا تھا۔ میں اپنے گھٹنوں کے بل فرش پر تقریباً بیٹھ گیا تھا۔ میں نیچے جھکا تو اُسے بھی جھکنے پر مجبور ہونا پڑا اور بر بنائے احتیاط اُسے کوئی مناسب ضرب لگانے کے لیے کچھ سوچنا پڑا۔ اُس نے اچھا کیا۔ میں نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ اُس کا جھکاؤ لازماً اُسی ہاتھ کی سمت ہو سکتا تھا جس ہاتھ سے میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ میرے بائیں شانے تک جھک آیا۔ ان چند لمحوں میں میں نے اپنا جسم اور اپنے پیر لوہے کی طرح تابو میں کر لیے تھے۔ جیسے ہی اُس کا جسم میرے شانے سے ٹکرایا۔ میں نے پھرتی سے اپنے جسم کو جنبش دی اور تمام تر طاقت سے شانہ کسی قدر اُوپر کر کے اُس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ میرے شانے سے گزرتا ہوا فرش پر چت گر گیا۔

اس جھونک میں چاقو اُس کے ہاتھ میں تھا مگر رہتا تو مجھے اُس کی
خلا میں معاف کر دینی چاہیے تھیں۔ میری توقع کے مطابق چاقو
نیچے گرا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ وہ درد سے کراہا۔ میں نے اُسے چھوڑ
اُس کا چاقو اٹھا لیا۔ ابھی میرا ہاتھ اٹھا ہی تھا کہ تجمل چیخنے لگا "
نہیں ذرا ٹھہرو۔" میرا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ "ایسے آسان موت
ہے یہ لوگ۔" اُس نے چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا۔
اُس نے مجھے دُور دھکیل دیا اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا
پر جھپٹا۔ تیواڑی کی کرب ناک چیخ سے کمرہ لرز گیا۔ صرف ایک
تجمل اُس کے جسم سے ہٹ گیا۔ اُس نے اپنی بند مٹھی میرے
میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ میرے ہاتھ میں تیواڑی کی کٹی ہوئی ناک تھی۔

میں نے پلٹ کے حیران آنکھوں سے تیواڑی کی طرف دیکھا
دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ہوئے فرش پر تڑپ
رہا تھا۔ اُس کی کٹی ہوئی ناک میری ہتھیلی پر رکھی تھی اور تجمل میرے
کھڑا تھا۔ مجھے چکر سا آنے لگا اور میں بے اختیار اُس کے گلے سے
لگ گیا۔ کمرے میں تیواڑی کی کراہوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی مگر
کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے دوڑ کے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا
آگے پیرو تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں میں
کی کوشش کی۔ تجمل نے مجھے چھوڑ کے اُسے گلے لگا لیا۔ جامو
نے مجھے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا اور میرے گال چومنے لگا
ایک دوسرے کو دھکیلتا اور کھینچتا ہوا آگے آتا اور ہم سے لپٹ
کسی نے تجمل کا شانہ، کسی نے اُس کا گھٹنا، کسی نے اُس کی پیٹھ
رکھی تھیں۔ پیرو دادا تجمل کی گردن میں باہیں ڈالے کھڑا تھا اور
دہاڑ رہا تھا لیکن لوگ ہمارے اطراف سے نہیں ہٹتے۔ پیرو چیخ کر
جاؤ کالے، زورا، پھیدا، مارٹی، ماجھی اور دوسرے لوگ
سے بشیر کے کپڑے خون اور پسینے سے تر بتر تھے جیسے وہ کہیں
ہولی کھیل کے آئے ہوں۔ چند لمحوں تک لوگ اسی طرح شور کرتے
دوسرے پر لوٹتے اور آپس ہی میں گتھم گتھا ہوتے رہے پھر جب تجمل نے
ہاتھ بلند کر کے انھیں خاموش ہو جانے اور دُور ہٹنے کی تلقین کی
کمرے کا شور کسی قدر کم ہوا۔ تجمل اونچی آواز میں ماجھی کو پکارا
ماجھی بوکھلاتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ تجمل نے مضطرب لہجے میں اُس
پوچھا۔ "گنتی کر لی ہے نا؟"

ماجھی کو جواب دینے میں تامل ہوا۔ شاید تجمل کی بات اُس کی
میں نہیں آئی تھی۔ "سب ٹھیک ہے تجمل بھائی!" ماجھی کے بجائے
جامو نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کسی کو تجمل تو نہیں آئے؟"

"اپن کا اکیلا آدمی موجود ہے۔" ماجھی ہانپتے ہوئے بولا۔

ہونے کو ہے۔" تجمل نے ناگواری سے کہا۔ "کیا اُن کے
طرح آؤ گے؟" تجمل کا اشارہ واضح طور پر پولیس کی جانب
میں بھنبھناہٹ سی ہونے لگی۔ "وہ ماسٹر مارٹی کا بچہ کدھر
تجمل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ مارٹی میری پیٹھ
تھا۔ تجمل کی آواز پر وہ تجمل کے سامنے آیا اور سر جھکا کے اُس
ہو گیا۔ اُس کا بایاں بازو خون میں نہایا ہوا تھا۔ تجمل نے
اُس کا ہاتھ اوپر اُٹھا کے چھوڑ دیا۔ مارٹی کی سسکی نکل
تجمل نے اُس کی کمر پر تھپکی دی۔ مارٹی اپنا سر اُس کی
رگڑنے لگا۔ "جا پیچھے جا کے مرہم پٹی کرا۔" تجمل نے اُس کا
ل پر ایک چپت رسید کیا۔ [illegible] تجمل
گیا۔ تجمل کے اشارے پر دو لڑکوں نے اُسے اُٹھایا اور مارٹی کا حال
کے باہر نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے تجمل نے سب کو منتشر
کرانے اور کپڑے بدلنے کا حکم دیا۔ جن لوگوں کے زخم گہرے
پہلے ہی تہ خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ پیرو کے اڈّے کی یہ
بڑی تھی۔ یہاں بہت سے آدمی مستقل رہتے تھے اور ہر
موجود تھا۔ پیرو کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ زخمیوں سے نمٹنے کے لیے
تیاری کر لی گئی تھی۔ یہاں تک کہ پچاس ساٹھ آدمیوں کے کپڑے
بھی رکھا گیا تھا۔ جن آدمیوں کے زخم بھرنے میں دیر لگتی تھی
کے لیے موقعے کی مخفیہ جگہوں کا تعین بھی کر لیا گیا تھا۔ پیرو دادا
چند دوسرے ساتھیوں کو حکم پر حکم دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں
کالو، کالتے اور پھیدا کے علاوہ اور میرے سوا تمام کمرہ خالی ہو
وہاں ایک اور آدمی بھی موجود تھا۔ تیواڑی۔ اُس نے
ہاتھ چہرے سے ہٹا لیے تھے۔ اُس کا چہرہ لہولہان تھا۔ "اس
استاد؟" پیرو نے تیواڑی کو گھورتے ہوئے وحشت سے پوچھا۔
کا کیا کرنا ہوتا۔ اس کا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔"
یہ استاد! تجمل بھائی!" پیرو نے تذبذب سے کچھ کہنا چاہا تھا
تیواڑی کی ٹوٹی ہوئی آواز کمرے میں اُبھری۔ "اپن کو ایک
" وہ فریادی انداز میں بولا۔
چاقو چھوڑ دیا گیا تھا پر تو نے اُسے کر دیا۔ اب پھر تجھے چاقو
پھر اس کا غلط استعمال کرے گا۔ چاقو تو دوسروں پر اُٹھتے
ہے تیواڑی! اپنے آپ پر اُٹھاتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔
بار اپنی شکل تو دیکھ لے۔"
نہیں۔" تیواڑی درد و کرب سے چیخنے لگا۔
وٹلے! ٹھیک ہے نا؟" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔
ہے۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
جانے دیا جائے کیوں پیرو دادا؟"

"مگر .... مگر تجمل! تجمل بھائی!" پیرو نے اٹک اٹک کے کہا۔

"تم اسے کچھ دن اپنے پاس رکھنا چاہو تو رکھ لو۔ اس کا زخم بھر جائے تو اُسے چھوڑ دینا۔ اب بیچنے کا خرچ بھی بچ جائے گا۔ جامو! اسے سامنے سے اُٹھا لے اور تو بھی اپنا حلیہ ذرا ٹھیک کر کے آ۔" [illegible] تجمل جھنجلا کے بولا۔

جامو نے بڑھ کے تیواڑی کو ایک جھٹکے سے کھڑا کیا مگر وہ اُس پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ تیواڑی نے زمین پر پڑا ہوا ایک چاقو جھک کے اُٹھا لیا تھا۔ اُس نے اُسے اُٹھا تو لیا مگر وہ اپنے سینے میں پیوست نہیں کر پایا کیونکہ کالتے نے بجلی کی طرح لپک کے اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ درمیان ہی میں پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے جبڑے پر مکا مارا۔ تیواڑی پہلے ہی اوسان کھو چکا تھا اور اب وہ کسی ایک آدمی کے بس کا نہیں رہا تھا اس لیے جامو کو پھر اُس کے نزدیک جانا پڑا۔ اُس نے اُس کی گردن اپنے بازوؤں کے شکنجے میں لے کے اُسے دوبارہ قابو میں کیا۔ اس اثنا میں کالتے اُس سے چاقو چھین کے میری طرف اُچھال چکا تھا۔ جامو اور کالتے تیواڑی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے مگر تجمل کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے۔ "جامو! استاد!" تجمل نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اس حرام کی اولاد کو ہوش آئے تو بول دینا کہ چاقو کے ساتھ ساتھ آنکھ کی دھار بھی تیز رکھا کرتا ہے اور بول دینا کہ غنڈے کی آنکھ قتل ہو جائے تو چاقو بھی نہیں چلتا اور اس سوٹے کو یہ بھی بول دینا کہ اچھا آدمی کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ بس اب اسے لے جا۔ لے جا۔" پیرو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُس کی زبان بند کی۔

اُن کے جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے کمرے پر سکوت چھا گیا۔ فرش پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ میری مٹھی میں ابھی تک تیواڑی کی ناک دبی ہوئی تھی۔ پیرو دادا ہم دونوں کے ہاتھ تھامے بڑبڑاتا ہوا ہمیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔

ہم کوئی آدھے گھنٹے بعد منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑے بدل کے اڈّے کے سب سے بڑے ہال جیسے کمرے میں آئے۔ یہاں پہلے سے کئی آدمی موجود تھے۔ درمیان میں سماوار رکھا ہوا تھا اور چائے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم تینوں کو گلاسوں میں بغیر دودھ کی چائے پیش کی گئی۔ اس دوران میں وہاں کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ ہماری طرح سب نے اپنے حلیے درست کر لیے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد جامو اور کالتے ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ تجمل نے انھیں اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ جامو نے ایک ڈھیلا ڈھالا کرتا پہن رکھا تھا مگر کرتے کی ایک آستین پھولی ہوئی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ آستین کے نیچے کلائی پٹیوں سے لپٹی ہوئی ہے۔ کالتے کی پیشانی اور گال پر روئی چپکی ہوئی تھی۔ روئی کا رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اُس کے سر کے درمیانی

حصے سے تھوڑی تک ابھی ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں پر بشاشت نمایاں تھی۔ پٹی کے باہر نکلتے کے بال سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ تنگ لباس میں اُس کا چوڑا سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا تھا۔ ہیرو دادا جگل کے کان میں کچھ کہہ کے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ جامو اور کالنتے نے چائے ختم ہی کی تھی کہ جگل نے مجھے ٹہوکا مارا اور نرم آواز میں ہدایت کی کہ میں جامو اور کالنتے کو ساتھ لے کے جلد از جلد گھر روانہ ہو جاؤں۔ وہ دونوں جز بز ہونے لگے۔ میں سمجھتا تھا، وہ انکار کر دیں گے کیونکہ تیج گھر جانے کا نہیں تھا لیکن وہ دونوں کسمسا کے رہ گئے۔ میں نے مانی اور دوسرے لوگوں کو دیکھنے کا ارادہ ظاہر کرنا چاہا مگر جگل نے میرا منہ بند کر دیا۔ اُس نے مجھے تاکید کی کہ میں جامو اور کالنتے کو گھر ہی روکے رکھوں۔ اس تاکید کے بعد میل رعجت کی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے جگل کا مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ ابھی اندھیرا تھا اور ہم روشنی پھیلنے سے پہلے گھر پہنچ سکتے تھے۔

"اور تم ۔۔۔؟" میں نے منتشر لہجے میں جگل سے پوچھا۔

"میں ہیرو دادا کے ساتھ رہوں گا۔" وہ درشتی سے بولا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی جامو اور کالنتے اُٹھ گئے۔ مجبوراً مجھے بھی اُن کے ساتھ اُٹھنا پڑا۔ باہر پورٹر تیار کھڑی تھی۔ ہم تینوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کالنتے نے اپنا سر میرے کندھے پر ڈھلکا دیا تھا۔ میرا دماغ جل رہا تھا۔ ڈرائیور کی موجودگی میں اُن سے کچھ پوچھنا نازیبا تھا۔ سارے راستے خاموشی رہی پھر گھر سے خاصے فاصلے پر میں نے گاڑی رکوا دی۔ مجھے اس احتیاط کا اچانک خیال آگیا تھا۔ ہم دبے دبے قدموں سے اندھیرے میں گزرتے ہوئے چند منٹ میں گھر پہنچ گئے۔ دروازہ پہلی ہی دستک پہ کھول دیا گیا۔ جولین سامنے کھڑی تھی۔ ہم تینوں تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ ڈرائنگ روم میں ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ ایک کتاب فرش پر گری ہوئی تھی، باقی کتابیں صوفے پہ بکھری ہوئی تھیں۔ جولین نے جلدی جلدی اپنا لباس درست کیا۔ وہ سراسیمگی سے ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔ "تم اب تک جاگ رہی ہو؟" میں نے اُس کی حیرت اور پریشانی کم کرنے کے لیے نرمی سے پوچھا۔

اُس کی پلکیں پٹ پٹانے لگیں اور اُس نے تیزی سے گردن ہلائی۔

"جامو اور کالنتے بھائی آرام کریں گے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہمارے لیے کوئی تکلیف مت کرنا۔" کالنتے درمیان میں بولا۔

"یہ کیا ہو گیا؟" وہ کالنتے کی پٹیوں کی طرف انگلی اُٹھا کے دہشت سے بولی۔ "جگل بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ بھی جلدی آجائیں گے۔ ذرا معمولی سا جھگڑا ہو گیا تھا۔ کالنتے اور جامو بھائی کو کچھ چوٹیں آئی ہیں۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ دودھ ہو تو گرم کر کے انھیں پلا دو۔"

"دودھ والا ابھی آتا ہی ہوگا۔" اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں بازار سے دودھ لے آتا ہوں تم ان کے لیے بستروں کا انتظام کر دو۔" جامو اور کالنتے نے منع کیا لیکن جولین بھاگی ہوئی باورچی خانے سے دودھ کا برتن لے آئی۔ میں اُن دونوں کو وہیں چھوڑ کے گلی میں آگیا۔ دودھ کی دکان پہ جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دودھ والا راستے ہی میں مل گیا۔ جب میں واپس آیا تو جامو اور کالنتے بیڈ روم میں جا چکے تھے۔

جولین نے اتنی دیر میں دونوں کے لیے بستروں کا انتظام کر دیا تھا۔ نیپا بھی جاگ گئی تھی۔ ہم نے کالنتے کا لباس بدلوا دیا اور اُس کے پاس بیٹھ کے اُس کا سر دباتا رہا۔ صبح کی روشنی اُجاگر ہو رہی تھی۔ جامو نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ جولین کی آہٹ پر وہ دونوں ہڑبڑا کے اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ جولین دودھ کے ساتھ مکھن اور بسکٹوں سے بھری ہوئی کشتی ساتھ لائی تھی۔ دودھ پیتے ہی جامو نے مجھے بھی اپنے ساتھ سو جانے کا مشورہ دیا۔ میں تھوڑی دیر بعد آنے کا بہانہ کر کے باہر آگیا۔ میرے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا اور میری آنکھیں اُن کی طرح بوجھل نہیں تھیں۔ ڈرائنگ روم میں جولین مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگی۔ میں نے تیواڑی کی ناک کاغذ میں لپیٹ کے جیب میں رکھ لی تھی۔ سوچا تھا اُسے دکھاؤں گا تو وہ ڈر جائے گی اور جب اُسے معلوم ہوگا کہ یہ کس کی ناک ہے تو اُس کی حالت قابلِ دید ہوگی۔ وہ کرشنا جی کو اپنے باپ سے زیادہ یاد کرتی تھی۔ یہ مکان بھی اُسے کرشنا جی ہی نے دلایا تھا۔ اُس نے ہر کمرے میں اُن کی تصویر سجا رکھی تھی۔ تیواڑی کی ناک میری جیب میں پڑی رہی اور میں اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلاتا رہا لیکن خود میری زبان بہک رہی تھی اور میرے منہ سے اوندھے سیدھے لفظ نکل رہے تھے۔ میں نے اُسے جامو اور کالنتے کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ اُن کا ذکر نہ کرے اور پڑوسیوں کی نظریں اُن پہ نہ پڑیں تو بہتر ہے۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں ایسی باتیں کر کے خود اپنی کسی [illegible] کی نفی کر رہا ہوں۔ اُس کی آنکھوں کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ میں نے اپنے ہونٹ بند کرنے کی کوشش کی تو میری خاموشی سے وہ اور پریشان ہو گئی۔ حالانکہ اندیشے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جگل نے انھیں محض احتیاطاً گھر بھیج دیا تھا کہ وہ آرام بھی کر لیں گے اور آئندہ پولیس کے آنے کے بعد کوئی الجھن بھی پیدا نہیں ہوگی۔ دوسرے زخمی لوگوں کی طرح جگل انھیں کسی اور جگہ بھی بھیج سکتا تھا اور اگر زیادہ تشویش کی بات ہوتی تو وہ انھیں کسی بھی گاڑی سے روانہ کر سکتا تھا۔ جتنی دیر میں پولیس تفتیش شروع کرتی، وہ کسی اور شہر میں گھوم رہے ہوتے۔

کالنتے کا سر دباتے ہوئے مجھے اُس سے چند ہی باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُن کے ساتھ ستر کے قریب منتخب آدمی تھے۔ وہ آدمی رات گزرنے کے بعد تیواڑی کے اڈے کے اطراف پھیل گئے تھے۔ انھوں نے اپنے راستے میں مزاحم ہونے والے ہر آدمی کو خاموش کر دیا

[...] نے انھیں مختلف مقامات پر اُتارا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مختلف گلیوں [...] اور تیواڑی کے آدمیوں کو چلتے ہی چلے میں ختم کرتے ہوئے [...] میں داخل ہو گئے جہاں تیواڑی کا اڈا تھا۔ چند روز ہوئے تیواڑی، آقا بھلی کے یہاں آ گیا تھا۔ کچھ لوگ باہر پہرا دیتے رہے اور اُن کی [...] تعداد عمارت میں داخل ہو گئی۔ جو باتیں جولین کی آمد کے باعث [...] نہیں بتا سکا تھا، اُن کا میں خود اندازہ کر سکتا تھا۔ عمارت میں [...] کے وقت انھیں کسی قدر دشواری پیش آئی ہوگی لیکن وہ سب [...] واپس آگئے۔ کالنتے کہتا تھا کہ تیواڑی کے اڈے میں اور اُس [...] لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ کاش وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میری [...] پر تو انھوں نے پردہ ڈال دیا تھا۔ رات ہیرو دادا اور جگل کی [...] سے میں کھٹک گیا تھا کہ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ [...] کی خاموشی گراں گزر رہی تھی۔ تیواڑی نے اپنی حفاظت کے [...] انتظامات کر رکھے ہوں گے اسی لیے اُس نے اڈا بھی بدل دیا تھا۔ [...] کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ اتنی [...] میں اور اس طرح اڈے میں اچانک آجائیں گے۔ رات کو کچھ [...] نہیں ہوا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، میری حیرانی [...] جا رہی تھی۔

اب صبح ہو چکی تھی۔ پولیس نے تمام علاقہ گھیرے میں لے لیا [...] انھیں صرف تیواڑی کے آدمیوں کی لاشیں نظر آئیں گی۔ لیکن [...] کے چند آدمی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں اور بھاگ گئے [...] انھوں نے کسی آدمی کو پہچان لیا ہو تو پولیس مخبری کا امکان نہیں [...] کا پورا اڈا تاراج ہو چکا تھا۔ مخبری کرنے والے اس حقیقت [...] طرح باخبر ہوں گے کہ تیواڑی کے بعد اُس کے دشمن ہی اُس [...] سنبھالیں گے اور اُن کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی کہ فلاں آدمی [...] میں مخبری کی ہے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پولیس کو [...] پیچھے چلے وہ چلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیں گے۔ اگر تیواڑی کے [...] ساتھی نے اپنی زبان پہ کھل کے پولیس کی توجہ ہیرو دادا اور جگل کی [...] مبذول کرانی چاہی تو اُس کی شہادت کی تصدیق کے لیے پولیس کو [...] کھپانا پڑے گا۔ اول تو کسی آدمی کے بچ نکلنے کا امکان نہیں [...] نے پوری طرح احتیاط برتی ہوگی اور تمام شہادتیں مٹا کے [...] گے۔ کالنتے کو افسوس تھا کہ اُسے تیواڑی کے بیٹے کو آگ دکھانے [...] نہیں ملا۔ اِدھر تیواڑی اور اُس کے قریبی ساتھیوں کی گمشدگی [...] کے لیے ایک معما ہوگی۔ تیواڑی ایسے موقع پر غائب تھا جب [...] کے بقول اُس کے خلاف کرشنا جی کے معاملے میں از سر نو [...] ہو رہی تھی۔ اس سے بھی پولیس بہت سے نتیجے اخذ کر سکتی [...] بھی ہو، شہر کے مختلف اڈوں کی جانب پولیس کا رجوع ہونا

لازم تھا۔ وہ گرفتاریاں بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میں تو اپنے طور پر ہی سوچ سکتا تھا۔ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں صرف اندازے لگائے جا سکتے تھے۔ یہ امکان بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ واقعات بالکل مختلف نوعیت سے پیش آئیں اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ میں جلد سے جلد جگل کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ چاہے مجھے دیکھ کے وہ کتنا ہی ناراض ہو۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر جگل پر کوئی حرف آیا تو میں ساری ذمے داری اپنے سر لے لوں گا۔ میرے آگے پیچھے دنیا میں ہے ہی کون۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ جامو اور کالنتے گہری نیند سو چکے ہوں گے تو میں نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ کمرے میں گیا اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر میں نے الماری سے اپنے کپڑے نکال لیے۔ وہ دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ غسل خانے میں آ کے میں نے جیسے تیسے لباس تبدیل کیا۔ جو کپڑے رات ہیرو کے اڈے پہ پہنائے گئے تھے، اُن میں جیبیں نہ تھیں۔ جیبیں ٹٹولتے وقت میرے ہاتھ میں پھر تیواڑی کی ناک آگئی۔ میں اُسے نالی میں پھینکتے پھینکتے رہ گیا۔ نالی میں پھر بھی کسی قدر صاف پانی تھا۔

جولین اور نیپا کو ایک بار پھر جامو اور کالنتے کے بارے میں خیال رکھنے کا کہہ کے میں گھر سے نکل آیا لیکن کچھ دور پہنچ کے مجھے اپنی خالی جیبوں کا احساس ہوا۔ میری جیب میں چند ہی سکے تھے۔ دوبارہ گھر واپس آ کے میں نے جولین سے چند روپے لیے اور ایک لمحہ بھی گھر میں ضائع نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ہیرو کے علاقے میں تھا۔ ٹیکسی راستے میں چھوڑ کے تیز قدموں سے میں اڈے کی طرف بڑھنے لگا۔ علاقے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ تقریباً ساری دکانیں کھل گئی تھیں۔ آگے مجھے ہیرو کے اڈے کے دو ایک آدمی گشت کرتے دکھائی دیے۔ میں نے اُن سے نگاہ چرانے کی کوشش کی مگر مجھے دیکھ کے وہ خود ہی بھاگتے ہوئے میری جانب لپکے۔ "کیا حال ہے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں اُن سے پوچھا۔

"اکّی خیر ہے راجا جی!" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اور اُس طرف؟" میں نے نگاہیں نچاتے ہوئے پوچھا۔

اُن میں سے ایک نے آنکھ ماری اور دوسرے نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے بانسری بنائی اور سیٹی بجانے لگا۔ میں اُن کے شانے دباتا ہوا آگے نکل گیا۔ علاقے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ ہیرو کے آدمی موجود تھے۔ یہ احتیاط بے سبب نہیں ہوگی۔ آگے کہیں بھی نہیں تھی پولیس۔ دور ہی دور سے انھیں اشارے کرتا ہوا اڈے پہ پہنچ گیا۔ عمارت میں قدم رکھ کے مجھے اپنا ذہن کچھ ہلکا محسوس ہوا۔ وہاں معمول کے مطابق چہل پہل تھی۔ وہ سب مجھے دیکھ کے بات کرنا چاہتے تھے مگر میں سیدھا جگل کے کمرے میں آگیا۔ ہیرو سامنے کی چوکی پر بیٹھا ہوا [illegible] رہا تھا۔ وہ صرف ایک

جانگیا پہنے ہوئے تھا۔ ایک آدمی اُس کے کھنچے ہوئے سڈول جسم کی مالش کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پیرو نے اُن دونوں کو ہاتھ مار کے جگا دیا اور چوکی سے اُٹھ گیا۔ "کیا ہے لاڈلے؟" وہ تشویش سے بولا۔ "تم اتنی جلدی کیسے واپس آ گیا؟"

"تجمل بھائی کہاں ہیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اپن نے بڑی مشکل سے اُسے کمرے میں بند کیا ہے۔ تجمل بھائی کئی دن سے جگائی کر رہا ہے لاڈلا! ابھی اپن نے بولا کہ تم اندر نہیں جائیں گا تو اپن تم سے کبھی بات نہیں کریں گا۔" پیرو ہنسنے لگا۔ "تو استاد مان گیا۔"

"مادی اور دوسرے لوگ کدھر ہیں؟"

"سب سالا اپنے اپنے ٹھکانوں پہ پارسل کر دیا گیا ہے۔ کوئی بات نہیں لاڈلا جانی! اب ٹنٹ ناٹ ہے۔ تم ادھر بیٹھو، بول کیا پئیں گا؟ کیا کھائیں گا؟" وہ میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ "ایسا جلدی کیسے آ گیا؟"

"بس آ گیا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"تو ادھر بیٹھو۔ بیٹھو راجا! ابھی تم سے بات کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ سالا رات بھر کائیں کائیں چوتا رہا۔ رات اپن نے پہلی بار تیرا کھیل دیکھا راجا! وہ سالا تیواڑی کا پلا "آخی" شہر میں کا ڈا بھرتا پھرتا تھا۔ جب تو نے چاقو پھینکا تھا تو اپن کا مغز بھی فرطا ہو گیا تھا۔ اپن نے تجمل بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیران تھا کہ سالا کیا داؤ تیرے جیسے میں آ گیا ہے کہ تو نے لین کٹاک چاقو پھینک دیا۔ پھر اُس کے بعد تجمل بھائی نے تو سالا سب کی آنکھ فیوز کر دیا۔ اپن نے ایسا جادو کبھی نہیں دیکھا۔ ایک پل میں بھاگ کے اُس کے پاس پہنچا اور دیکھتے دیکھتے ناک کاٹ لایا۔ تو اگی کا لالا سپیل تیواڑی کرنے کا ٹائم بہانہ بھکنے کا ایسا جان پڑتا ہے جیسے تیواڑی ناک آگے کیے سالا تیار بیٹھا تھا کہ آؤ استاد تجمل! اپن کا ناک کاٹ لو۔ پتہ نہیں تجمل بھائی کب گیا اور کب واپس آیا۔ سالا لوگ، پاگ سویرے سے ہمارا مغز کھا رہے ہیں کر دادا! رات کو اپن لوگوں نے کیا دیکھا تھا۔ ہم بولا جلوہ دیکھا تھا۔ سپنا دیکھا تھا سالا!"

میں چپ بیٹھا سنتا رہا۔ وہ میرے سے جلوہ کاٹنے اور تجمل کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ میرے کچھ اور قریب کھسک آیا اور سرگوشی میں اصرار کرنے لگا کہ میں تجمل سے کہہ کے بمبئی میں اس کا قیام چھ دن کے لیے اور بڑھوا دوں۔ میں نے کہا "یہ سب تجمل کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کب یہاں سے جانے کا ارادہ کرتا ہے۔" وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ کم از کم پھر میں ہی اس شہر میں رک جاؤں کیونکہ تیواڑی کا اڈا آ جانے کے بعد اتنا بڑا علاقہ سنبھالنا اس کے لیے دشوار ہو گا۔ میں نے کہا کہ مجھے اڈوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے تو ایک مجبوری کے سبب جھگڑا استاد سے پالا پڑا تھا ورنہ مجھے تو کب کا بمبئی سے چلا جانا چاہیے تھا۔

"اپن کا سب کچھ تیرا ہے لاڈلا! اپنا ایک بار ہاں کر دے۔" وہ جلے "دل" سے بولا۔

"تو اگر اڈا چلانے کا کام کرنا نہیں چاہتا تو مت چلانا۔ تو راجا بن کے رہنا اور کبھی اڈے میں مت آنا۔ اپن تجھ کو تجمل کی طرح سمجھے گا راجا!"

"پیرو دادا! میں نے سر جھکا کے کہا۔ "مجھے جانا ہے۔"

"اپن کو پتہ ہے تجھے جانا ہے۔ تجمل نے اپن کو کچھ کچھ تیرے بارے میں بولا ہے۔ پر بہت زیادہ نہیں۔ اپن پوچھتا رہ گیا، بولا پیرو دادا! لاڈلا اپنے آپ کو بند کرتا ہے تو تجھ سے اس کو مت کھلوا۔ بول لاڈلے! اپن تیرے لیے کیا کر سکتا ہے؟"

"تمہارا بہت بہت شکریہ پیرو دادا! تم نے تیواڑی کے معاملے میں ہماری مدد کی۔ یہی بہت ہے۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔"

"اپن نے کچھ بھی نہیں کیا لاڈلا! اپن تو بیٹھا سالا دیکھتا رہا۔" وہ اضطراب سے بولا۔ "لاڈلا! اپن نے تیرے لیے ایک بات سوچا ہے۔ ذرا تسلی سے سنا۔" میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "لاڈلا! اپن چاہتا ہے کہ اپن تجمل بھائی سے ایسا رشتہ بنائے کہ کبھی نہ ٹوٹے۔ اپن نے تجمل بھائی سے کوئی بات نہیں بولا ہے۔ اپن نے سوچا پہلے تجھ سے بات کریں گا۔" وہ میرا ہاتھ دبا کے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "پھر او مت سمجھنا۔ خیال کر لینا کہ تیرے سامنے پیرو دادا بول رہا ہے جس کا کوئی عزت ہے۔ اپن تجھے ایک راز کی بات کھول رہا ہے۔ تجمل بھائی کی طرح اپن کا بھی ایک اللہ دے ہے۔ وہ اپن کا بیٹا بھی ہے، بیٹی بھی۔ اپن نے اُسے پاڑے کی زندگی سے چھپا رکھا ہے۔ اس کی ماں مجھے گھرانے کی عورت ہے۔ اپن اُسے لے آیا تھا۔ یہ ایک لمبا کہانی ہے۔ بس اتنا جان لے کہ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں گیا اور اپن بھی اُسے ادھر نہیں لایا۔ اپن نے اُسکی زندگی اُسے جینا کھیلتا دیکھنے کے لیے بنا دیا ہے۔ جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی اُسی کے لیے ہے۔ اپن اُس کے ماتھے پر ایک لکیر دیکھنا نہیں مانگتا تھا۔ جو کچھ اپن سے ہو سکا، اُس کے لیے کیا۔ یہ پاڑا، یہ سالا اڈا، یہ دھندا اُسی کے لیے ہے۔ سن بھائی! اپن کی رانی کا ایک بیٹی ہے۔ ابھی اپن اپنے منہ سے اپنی بیٹی کے بارے میں کیا بولے۔ وہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ اپن تجھے اُس کو دینا چاہتا ہے۔ اپن پیرو دادا ہے لاڈلا! کوئی باپ اپنی بیٹی کے بارے میں ایسا نہیں بولتا۔ پر اپن نے تجھ سے کوئی شرم نہیں کیا ہے کیونکہ اپن کا من صاف ہے اور اپن صاف بات مانگتا ہے۔ تو اُسے لے لے۔"

میرے کان سن سنانے لگے۔ "پیرو دادا!" میں نے وحشت سے کہا۔

"ایسی کوئی باتیں مت کرو جن کا جواب سنتے ہوئے تمھیں دکھ ہو۔ تم مجھے اس لائق سمجھتے ہو، یہ تمہارا بہت احسان ہے۔ بہت شکریہ۔ میری قسمت کہاں... مگر میں... میں کسی لائق نہیں ہوں۔ مجھے تو تجمل بھائی کے پاس رہنا ہے، نہ کہیں اور۔ زبان بند کر لو پیرو دادا! بھول جاؤ... کہ تم نے ابھی مجھ سے یہ باتیں کی ہیں۔ مجھے اپنی نظروں میں مت گراؤ۔ مجھے اتنا نادم مت کرو۔"

"اپن کا کوئی زور نہیں ہے، اپن جانتا ہے۔"

"اس سے آگے کوئی بات مت کرنا پیرو دادا!"

"لاڈلا! اپن تجھ سے منت نہیں کرتا، سوچنے کو بولتا ہے۔ اپن جانتا ہے یہ باتیں زور دینے کی نہیں ہوتیں۔ یہ سب تیرے ہی پر چھوڑ کے اپن نے تیرے سامنے ایک بات رکھی ہے۔ تو چاہے تو اُسے ایک بار دیکھ لے۔ تیرے لیے اپن یہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ بہت اچھا بیٹی ہے۔ ایک دم ایک نمبر ہے۔"

"وہ ضرور اچھی ہوگی لیکن میں بہت بُرا ہوں پیرو دادا! کچھ اور بات کرو۔ میرے لیے سر اُٹھانے کی کوئی گنجائش باقی نہ رکھو۔"

"تو سوچ لے۔" وہ افسردگی سے بولا۔ "اچھی طرح سوچ لے۔ اپن تجمل بھائی سے مانگ نہیں جانتا، کہ چاہتا تو اٹھا لے۔ اپن تجھ کو وہی دیکھنا مانگتا ہے جو تجمل دیکھنا مانگتا ہے اور جیسا تو خود ہے۔"

میں نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ "سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے دادا!" میری آواز بھرّانے لگی۔ "اپنے لفظ واپس لے لو پیرو دادا!"

وہ کسی بُت کی طرح ساکت ہو گیا۔ مجھے اپنے سامنے جسم پر اُس کی نظریں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ جی میں آیا اُٹھ کے بھاگ جاؤں لیکن پیرو جھر جھری لیتا ہوا خود سنبھل کے بیٹھ گیا۔ اُس نے میرے ہاتھ اپنے پیروں سے ہٹائے اور انھیں اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ... لگا۔ پھر اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں لفظ ہی ڈھونڈتا رہا کہ اُسے کس طرح بتاؤں۔ کیا کہوں۔ وہ اب کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن اس کی خاموشی بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پیرو میرا ہاتھ جھٹک کے ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ اُسی وقت ایک آدمی بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اُس نے پیرو کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ پیرو کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ "آنے دو۔" وہ گرج کے بولا۔ "آنے دو۔"

"کون ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"پولیس کا آدمی۔" وہ تلملا کے بولا۔ "لاڈلا! تم اندر جاؤ۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ جاؤ تم اندر جاؤ۔" وہ مجھے دھکا دینے لگا۔

"میرے یہاں بیٹھنے میں کیا حرج ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"نہیں لاڈلا! تم بات سمجھا کرو۔ وہ علاقے کی پولیس کا آدمی ہے۔ کوئی خاص بات بولنا چاہتا ہوگا۔ ابھی اپن نے بھی اپنا کئی آدمی اُدھر بھرتی کرایا ہے۔ تم ادھر سویرے سویرے کیسے واپس آ گیا؟ تم کو تجمل بھائی نے گھر بھیجا تھا۔ تم اُن دونوں کو چھوڑ کے ادھر کیوں آ گیا؟ ابھی تم اندر بھی مت جاؤ بلکہ پاڑے سے باہر جا کے ٹیکسی پکڑو اور سیدھا گھر جاؤ۔ کوئی بات ہوگا تو اپن آدمی بھیج دیں گا۔"

"میں تو گھر سے یہاں آیا ہوں اور تم واپس جانے کو کہتے ہو؟ جاؤ اور کالے گھر میں سو رہے ہیں۔ جس طرح تم اور تجمل بھائی یہاں ہو، میں بھی ہو سکتا ہوں۔"

"تم بھی ہو سکتا ہے پر تم کو تجمل بھائی نے کیا بولا تھا؟ تم سامنے مت آؤ تو اچھا ہے۔ ابھی ہم سالا ادھر کیا کھچڑی مار رہا ہے۔"

"مجھے یہیں بیٹھنے دو۔ آخر تم مجھے کیوں واپس کرنا چاہتے ہو؟"

"لاڈلا! بچہ مت ہو۔" وہ جھنجلا کے بولا۔ "اپن بولتا ہے تم جاؤ۔ وہ علاقے کا آدمی ہے۔ تم کو اوپر نہیں دیکھے تو ٹھیک ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی اور بھی نیا آدمی ہو سکتا ہے۔ اپن ادھر موجود ہے تم کیوں فکر کرتا ہے؟"

"اگر انھوں نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہوئیں گا پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی اپن نے اپنا جیسا سوچا ہے۔ سالا اُن کا رات جاگتے ہوئے کیا ہو گیا ہے۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ پیرو دادا! اب میرے بارے میں پتا ہے کیا علاقے کی پولیس اس بات سے بے خبر ہوگی؟ میں یہاں نہیں ہوں گا تو وہ اور مشکوک ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ پوچھیں گے نہیں کہ راجا کون ہے اور کدھر ہے؟ پھر تم کیا جواب دو گے؟ ہم سب کو اُن کا سامنا کرنا چاہیے۔ جو زخمی ہیں اُن کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن میرے جسم پہ کوئی نشان نہیں ہے۔ میں بھی تمہاری طرح اُن کے سامنے آ سکتا ہوں اور اُن سے بات کر سکتا ہوں۔"

"لاڈلا! بیواقا تیرے نام سے مردود ہے اور تیواڑی ہے۔ یہ تو نے آج تک علاقے کا پولیس کا آدمی سے بات نہیں کیا۔ اب بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپن زیادہ بات نہیں بولتا۔ وہ اب آتا ہی ہو گا۔ جا پیچھے والے رستے سے نکل جا۔ وہ کوئی بھی ارادہ جل کے ہلے کے آ سکتا ہے۔ وہ اپن سب کو چوڑیاں بھی پہنا سکتا ہے۔ لاڈلا! بابا واردات بھی تو دیکھ۔ پولیس سالا پبلک کو اور بڑا افسر کو کیا منہ دکھائیں گا۔ کچھ نہ کچھ تو اُسے کرنا ہی پڑیں گا۔ پولیس والا یہ نہیں سمجھیں گا کہ تیواڑی کے اڈے پہ جگہ جگہ پان کا پیک کس نے تھوکا ہے۔ کس پلٹنے والا آدمی نے ایسا کیا ہوگا۔ وہ ہر طرف آئے گا۔ ادھر بھی آئے گا اور ادھر پہلے آئے گا کہ اپن کا اور تیواڑی کا بہت پہلے سے لگتا تھا۔ اپن سالا تیواڑی سے سدا یاد کیا کہ اپن وہ دھندا نہیں کر سکتا تھا جو تیواڑی کرتا تھا۔ وہ سالا تو آدمی نہیں کُتّا تھا۔"

"اگر تم پکڑے گئے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

"لاڈلا! دھیا مست لگاؤ۔" وہ ناراضی سے بولا۔ "تم کو یہ سب نہیں کرنا تو تم ایسا کیوں سوچتا ہے۔ جو اپن بولتا ہے وہ کرو۔ تم کیوں جانیں گا جب اپن اِدھر بیٹھا ہے۔ زیادہ آدمی جانا ٹھیک ہے یا کم آدمی؟"
"وہ تھانے اور تجمل بھائی کے بیٹے کہیں چلا جاؤں گا۔"
"اور اپن تجھے جانے دیں گا؟" وہ طیش میں بولا۔ دروازے سے ایک اور آدمی بھاگ کے آیا۔ پیرو نے مجھے سخت لفظوں میں خفیہ دروازے سے باہر نکلنے کی تلقین کی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میری کوئی بات اُس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ میں نے جیل میں سات سال گزارے ہیں اور ان پولیس والوں سے میرا واسطہ کچھ کم نہیں رہا ہے۔ یہاں سے ایک چوہے کے لیے چھپنے کو میرا بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے حالات کی نزاکت کا پوری طرح احساس تھا۔ تجمل اندر موجود تھا۔ جبار اس کا مشیر ہوتا وہ بھی بیزار بھی ہوتا مگر پیرو کا اصرار اتنا شدید تھا کہ مجھے اُس کی بات ماننی پڑی۔ پولیس اندر آئی تو ایک آدمی نے مجھے اشارہ کیا اور باڑے کے خفیہ دروازے سے باہر نکال دیا۔ یہ دروازہ سڑک پہ کھلنے کے بجائے برابر کی عمارت کے ایک فلیٹ میں کھلتا تھا۔ فلیٹ میں پیرو کے ایک آدمی کا کنبہ رہتا تھا۔ اُس آدمی نے مجھے فلیٹ میں روکنا چاہا مگر میں سیڑھیاں اترتا ہوا گلی میں آ گیا۔ علاقے میں ہر طرف پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ میں باڑے سے کچھ دُور ہوٹل میں جاکے بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں باڑے کا پھاٹک ہوا صاف دیکھ سکتا تھا۔ چائے کے دوران میں میری نظریں اُسی دروازے پر مرکوز رہیں۔ ہوٹل میں باڑے کے کچھ اور آدمی بھی تھے لیکن وہ مجھ سے بے نیاز بیٹھے رہے۔

مجھے سنسنی سی ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین گھونٹوں میں چائے ختم کر لی۔ ہوٹل میں بہت شور تھا۔ زور زور سے گراموفون بج رہا تھا۔ میں نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے اور میز پہ کہنیاں ٹیک کے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا ہوٹل میں آنے والے کے لیے گانا سننا شرط ہے۔ پیرو کے جو آدمی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے، اُن سب کی نظریں مجھ پہ جمی ہوئی تھیں۔ انھیں بھی معلوم ہوگا کہ باڑے میں پولیس موجود ہے اور وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اُسی کے خوف سے یہاں آکے بیٹھ گیا ہوں۔ جب خود میرا یہ حال ہے تو اُن پہ اس کا کیا اثر ہوگا۔ میں نے سوچا۔ واپس باڑے چلا جاؤں۔ اس سے بہتر تھا کہ میں اس ہوٹل ہی میں نہ آتا بلکہ کہیں اور نکل جاتا لیکن یہاں آنے کے بعد اچانک اُٹھ جانا اُن کے لیے اور تشویش کا سبب ہوتا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ یہ ایک موزوں ترین جگہ تھی۔ یہاں سے میں باڑے کی عمارت میں آنے جانے والے ہر شخص کو دیکھ سکتا تھا۔ خاصی دیر ہوگئی۔ اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی کہ میں نے پیرو کی بات رد کیوں نہیں کر دی۔ یہاں تماشائی کی طرح آکے کیوں بیٹھ گیا۔ پھر سویرے سویرے میرے گھر سے واپس آنے کا کیا مقصد تھا۔

میرے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں تھی۔ سر میں کھجلی سی چل رہی تھی۔ پولیس والے ابھی واپس نہیں ہوئے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ جب وہ باہر نکلیں تو تجمل، پیرو اور باڑے کے بہت سے آدمی اُن کے ہمراہ ہوں۔ اگر نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ رات کو تیواڑی کے باڑے میں گھس کے چاقوؤں کی دھار آزمائی جائے اور اُسے کسی نہ کسی طرح کھلی آنکھوں اور جلتے ہوئے جسم کے ساتھ پٹیالے کے سپرد کر دیا جائے اور صبح اس واردات کے الزام میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے تو یہ خوب لطیفہ تھا۔ یہ نتیجہ بھگتتے ہوئے پیرو اور تجمل مجھے شریک نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نتائج کی ساری زد تیواڑی پر آنی چاہیے۔ جیسے تیواڑی سے تو انھی کا معاملہ تھا۔ میں تو ایک درمیان کا آدمی تھا اور میں نے تو انھیں اس کام کا ٹھیکا دیا تھا۔ نہ میں اُن کی سوچ میں شریک تھا نہ میں نے عملی طور پر اُن کا ساتھ دیا تھا۔ وہ چلے جائیں اور میں دیکھتا رہوں خوب۔ نہ جانے وہ کیا سمجھتے تھے۔

اگر تجمل کو یہ اندیشہ تھا کہ کرشنا جی کی وجہ سے بہت سے پولیس افسر میری صورت آشنا ہیں۔ میں یہاں موجود ہوں گا تو ان میں سے کوئی بھی مجھے پہچان سکتا ہے۔ مجھے خود بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ مرنے کے بعد کرشنا جی کے نام پر کسی قسم کا داغ آئے۔ مجھے پہچان لیا جاتا تو اخبارات اور شہر بھر میں قسم قسم کی افواہیں پھیلائی جاتیں۔ مشتاق کا واقعہ دہرایا جاتا اور کہا جاتا کہ راج کرشنا ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ رکھتا تھا جس کا تعلق شہر کے مشہور داداؤں سے ہے۔ مگر وہ تو میں کسی وقت بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ کرشنا جی کے ہاں بڑے عہدے کے افسر آتے تھے۔ ان کا تعلق پولیس ہیڈ کوارٹر سے تھا یا ہیڈ آفس سے۔ علاقوں کے چھوٹے افسروں سے اُن کا رابطہ کم رہتا تھا۔ اس لیے علاقوں کے پولیس والے مجھ سے واقف نہیں تھے۔ ادھر میں نے اپنے آپ کو دور رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مجھے اس بات کا بہت پہلے سے خیال تھا۔ باڑے کے تمام معاملات زیادہ اور چھپا ہی پولیس سے طے کرتے تھے۔ رات کو بھی عموماً باڑے میں نہیں ہوتا تھا۔ پھر کرشنا جی کی موت کو کئی مہینے گزر گئے تھے جب میں نے جھنگا استاد کے باڑے میں قدم رکھا تھا۔ باڑا لینے کے بعد کرشنا جی کے اصل مجرموں کی نشان دہی میں بھی خاصا وقت لگ گیا۔ یوں سڑک پہ کوئی جانے والا افسر کبھی دیکھ لیتا تو اُسے یہ کیسے پتہ چلتا کہ جھنگے کے باڑے پھینکنے والا شخص میں ہی ہوں۔ جھنگے کے باڑے میں خود بخود میرا نام داخل پڑ گیا تھا لیکن کسی واقعے اور پولیس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو میں کسی جاننے والے کی نظروں میں آسکتا تھا۔ میری شناخت کرشنا جی کی رسوائی تھی مگر اُن کے قاتل آزادانہ گھومتے رہیں یہ بے شرمی اُس رسوائی سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ کرشنا کے سامنے میری سبکی نہیں ہوئی۔ جب بھی اُن کی تصویر پہ نظر

پڑتی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی آنکھیں مجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ تاہم مجھے اس بات کا قلق تھا کہ یہ سب کچھ اُن کے مرنے کے بعد ہوا۔ میرے پیچھے چلے ہوتا تو وہ مجھے لپٹا کے خوب پیار کرتے، اُن کا بہت نام ہوتا اور وہ زندہ رہ جاتے۔

میری شناخت اب بھی اُن کے لیے ایک نازیبا بات تھی حالانکہ اب صورت بالکل بدل ہوئی تھی لیکن اب تجمل موجود تھا۔ تیواڑی کے عوض اگر تجمل کے اندر جانے کا امکان تھا تو بات ایک ہی تھی۔ مجھے کیا کسی کو بھی یہ سودا منظور نہیں ہو سکتا تھا۔ تجمل نے کرشنا جی کی روح کے سامنے مجھے نہال کرنے کے لیے اپنے ذہن میں یہ مفاہمت کر لی تھی تو اُس نے یہ کیوں سمجھ لیا تھا کہ میں بھی اسے قبول کر لوں گا۔ کرشنا جی کی رسوائی کی قیمت تجمل کو نہیں چکانی چاہیے تھی۔ کرشنا جی موجود ہوتے تو وہ ہرگز اپنی یہ قیمت مقرر نہ کرتے۔ میرا سینہ اندر سے جل رہا تھا اور سر بیٹھا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا، کیا ہونے والا تھا۔ کیا سوچ کے تجمل نے اتنے لوگ اکٹھے کیے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کیا نکل سکتا تھا۔ اُس نے اتنا شور کیوں مچایا۔ ہر جگہ یہ منادی کیوں کرائی کہ اب پیرو کا اقتدار جانے کے نام سے چلے گا اور تینوں باڑے ایک ہو گئے ہیں۔ شک گزرنے کی تو یہی بات تھی کہ پیرو نے کسی تامل کے بغیر اپنا اقتدار اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا ہے۔ شک کی دعوت تو خود تجمل نے دی تھی۔ ڈنڈا گھمایا جاتا، زور کرایا جاتا، بچوں کی پر بیٹھ کے حکم چلایا جاتا اور پیرو کا خاموش بیٹھے رہنا۔ یہ ایسی باتیں نہیں تھیں جو دوسرے باڑوں میں نہ پہنچی ہوں۔ اگر یہ سب تیواڑی کے لیے تھا کہ وہ ایک بہت بڑے باڑے کا مالک ہے، چھوٹے موٹے باڑے شامل کرکے تقریباً آدھا شہر اُس کے زیر اثر آجاتا تھا اور اُس کے پاس آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ بہت بڑا کنبہ تھا اور تجمل نے یہ سب کچھ دیکھ کے اپنے دماغ میں کسی کے لیے موت سے بدتر سزا تجویز کر رکھی تھی تو اسے اور باتوں پر بھی توجہ دینی چاہیے تھی۔ ممکن ہے اُسے یہی یہ سزا نہ سنے پاتا مگر مثل رفتہ رفتہ اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ جھونواس کی موت کے بعد وہ آدھا رہ گیا تھا۔ باقی آدھا بھی کسی نہ کسی صورت سے مجھے ہی ختم کرنا تھا مگر اس طرح نہیں ہونا۔ جھونواس کی طرح پولیس کھوج لگاتی رہتی۔ پیرو نے ابھی ابھی جس لہجے میں بات کی تھی، اُس میں خوف کا رنگ شامل تھا۔ گویا اُس کا یقین بھی متزلزل ہوگیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اور ہو چکا ہے، اُس میں اُس کا دامن صاف رہے گا۔ اُس نے مجھے باڑے سے نکال دیا تھا کیونکہ اُسے حالات بگڑ جانے کا اتنا ہی خدشہ تھا جتنا مجھے۔ شاید یہی کوئی چھپا ہوا خوف تھا کہ اُس نے اپنی بچی کا ذکر مجھ سے کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ اُس نے اپنی بچی اور بیوی کے لیے جو کچھ ہو سکتا ہے فراہم کیا ہے۔ تیواڑی کے بعد شہر میں دوسرا بڑا باڑا پیرو کا تھا۔ شہر میں دوسری بڑی آمدنی کا باڑا۔

لُٹے آنے والے دونوں پر اعتبار نہیں ہوگا جبھی وہ مجھ سے کہتا تھا کہ اب سب کچھ میں سنبھال لوں یعنی وہ بھی اب اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ تجمل کے اقدامات غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ تجمل کے خیال سے کھل کے اپنے تذبذب کا اظہار نہیں کر رہا تھا مگر وہ متردد ضرور تھا۔

تجمل اندر مصروف تھا۔ چاہے وہ رکھتے اُدھر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پیرو جاگ رہا تھا اور میں جاگ رہا تھا۔ کسی آدمی نے اطلاع دی ہوگی کہ میرے سامنے ایک اور چائے رکھ دی۔ میں بیزار ہو گیا اور میں نے اپنے دماغ کی دھول جھاڑنے کے لیے بے اختیار کئی بار سر جھٹکا۔ اُسی وقت مجھے باڑے کے پھاٹک کی کھڑکی کھلی۔ میں نے اپنی کرسی سیدھی کر لی۔ میری نگاہ وہیں ٹکی ہوئی تھی۔ باڑے کے دو تین آدمی کھڑکی سے باہر نکلے۔ پھر ایک باوردی شخص برآمد ہوا۔ اُس کے ساتھ تین سپاہی تھے۔ میں انتظار کرتا رہا مگر اُن کے بعد کوئی اور نہیں نکلا۔ باڑے کے آدمیوں نے چند قدم تک پولیس والوں کا ساتھ دیا پھر واپس ہو گئے۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ پولیس والے ہوٹل کے قریب آ گئے۔ وہ علاقے کے تھانے کا کوئی چھوٹا افسر تھا۔ میں نے اُس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ فکر زدہ تھا۔ جب وہ ہوٹل سے گزر گئے تو میں نے اُٹھنے میں دو تین منٹ کا توقف کیا۔ ہوٹل والے نے مجھ سے چائے کے پیسے نہیں لیے۔ پیرو کے آدمیوں نے منع کر دیا ہوگا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ باڑے کی عمارت کے باہر اسٹول پہ بیٹھے ہوئے لوگ میرے وہاں پہنچنے پر کھڑے ہوگئے۔

"کیا بات ہے!" میں نے اپنا تجسس چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"بیلا نام آیا تھا۔" ایک نے بے پروائی سے کہا۔ "اپن کا بھی کبوتر ہے۔ دادا کو بولنے آیا تھا کہ ذرا نرم گرم ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"ابھی سُنا ہے کہ سالا کچھ قتل و خون کا اُدھر رفتاری کرے گا۔ پہلے کرنے" وہ ناک چڑھا کے بولا۔ "استاد کو بولتا تھا کہ ایک دن آدمی اُدھر لے جائے گا۔ ابھی اپن نے استاد کو بولا کہ اپن کو بھیج دو۔ چھٹی کیے ہوئے بہت دن ہو گیا۔ کچھ کمر و مر لگا لے گا۔"

اُس کی باتوں پہ اُس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ میں نے اُن کا ساتھ دینے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ میرے لبوں پہ تھرا کے رہ گئی۔ عمارت میں جانے کے بجائے میں وہاں سے آگے چل دیا۔ کچھ آگے جاکے میں نے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ میرے اپنے علاقے میں بھی پولیس گشت کر رہی تھی بلکہ ٹیکسی جہاں جہاں سے گزری، چوراہوں پہ ٹولیوں میں پولیس موجود تھی۔ ٹیکسی والا راستے بھر مجھ سے رات کے واقعے پہ باتیں کرتا رہا کہ اُدھر آنے جانے پر سخت پابندی ہے۔ پولیس نے تیواڑی دادا کا باڑا صبح سے اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ گاڑی بھر بھر کے پولیس آتی ہے اور علاقے میں بکھر جاتی ہے۔ تیواڑی کے باڑے کے قریب کا سارا بازار بند پڑا ہے اور

...وں میں گھسے بیٹھے ہیں یا دُگر کی سڑکیں سنسان پڑی ہیں۔

میرے علاقے میں کوئی غیرمعمولی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں اندر پہنچا تو زور والے تابازانڈے کے میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا۔ یہاں آ کے مجھے کچھ سکون ملا۔ یہاں تمّا بھی موجود تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اُچھلنے لگا۔ زور والے نے مجھے بتایا کہ مادی کو سیٹھ دینا کے گودام میں رکھا گیا ہے۔ اُس کے ساتھ دو تین آدمی اور ہیں۔ مادی کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ خون بہت نکل گیا ہے۔ پیرو کے خاص ڈاکٹر نے بازو میں کئی ٹانکے لگائے ہیں۔ سیٹھ دینا کا گودام پیرو کے علاقے میں تھا۔ زور والے نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ جگہ نہایت محفوظ ہے۔ میرے علاقے سے چند لوگ پکڑے لے گئے تھے۔ زور ااس پر فکرمند نہیں تھا۔ اُسے توقع تھی کہ جلد یا بدیر پولیس افسران اُسے بھی تھانے بلائیں گے یا خود یہاں آئیں گے۔ واپس آنے سے پہلے میں نے بالم خان کے اڈے کا بھی ایک چکر لگایا۔ پولیس نے وہاں سے بھی چند آدمی گرفتار کر لیے تھے۔

پیرو کے علاقے میں واپس پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو گئی۔ میں پاڑے نہیں گیا۔ علاقے میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ وہیں مجھے پاڑے کے کئی آدمی مل گئے۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ تجمل اور پیرو عمارت میں موجود ہیں۔ کچھ دیر ہوئی تجمل سو کے اُٹھا ہے اور اُس نے چوکی سنبھال کے پیرو کو آرام کے لیے اندر بھیج دیا ہے۔ صبح سے دو مرتبہ پولیس آ چکی ہے اور کوئی پندرہ بیس آدمی حوالات میں بند کر دیے گئے ہیں۔ پیرو تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا تھا اور علاقے کے ایک مختصر گشت کے بعد واپس چلا آیا۔ پھر جب انھوں نے تیواڑی کے پاڑے میں پولیس کو ملنے والی لاشوں کے بارے میں بتایا تو مجھے یقین نہیں آیا۔ میں گنگ رہ گیا۔ وہ اُن کی تعداد ۲۷ بتا رہے تھے۔ میں نے اُن سے دوبارہ تصدیق کی اور مجھے ایسا گمان ہوا جیسے اونچا سننے لگا ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پولیس کو کوئی بھی زخمی نہیں ملا۔ خود تیواڑی کے بہت سے آدمیوں کو پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ اُس کے ماتحت دوسرے پاڑوں کے کئی داداؤں کو بھی حوالات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اُن میں شعلہ استاد بھی شامل ہے۔ میں نے اُن کے سامنے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چپ چاپ ایک طرف بڑھ گیا۔ میرے قدم بوجھل ہو گئے تھے اور جسم اینٹھنے لگا تھا۔ شاید یہ پہلا دن تھا کہ میں نے راہ گیروں کو غور سے نہیں دیکھا۔ شام ہو گئی اور روشنیاں آنکھوں میں چبھنے لگیں تو مجھے گردوپیش کی خبر ہوئی۔ میں نہ جانے کہاں نکل آیا تھا۔ یہ شہر کا کوئی ایسا علاقہ تھا جہاں میں اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔ پیرو کے علاقے سے یہاں تک ہزاروں لوگ سڑکوں پر گزرے ہوں گے۔ لیکن جیسے اُن میں کوئی بھی گزر رہی ہو۔ مجھے اپنی اس بے خبری سے وحشت ہونے لگی اور کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اِدھر سے ضرور گزری ہے۔ میں نے اُسے پھر کھو دیا ہے۔ اُس نے مجھے گم دیکھا ہوگا تو منہ پھیر لیا ہوگا کہ جب مجھے اس کا کچھ ہوش ہی نہیں ہے تو وہ مجھے کیوں آواز دے۔ میں نے اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹ لیا اور جیسے دل میں آیا کہ میں ابھی اسی لمحے شہر سے نکل جاؤں۔ جو تجمل کا حشر ہوگا، اُسے میں نہیں روک سکتا۔ میں نے اُسے نہیں بلایا تھا اور میں نے اُس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کرے۔ مجھے تو کورا کی تلاش میں آگے جانا ہے۔ میں یہاں رہوں گا تو پھر کوئی نہ کوئی بات ہو جائے گی، پھر کوئی زنجیر میرے پیروں میں پڑ جائے گی۔ کورا آگے بڑھتی رہے گی اور دیر ہو جائے گی۔ میں دیر سے اُس کے پاس پہنچوں گا تو وہ کہے گی، اب بھی کیا ضرورت تھی آنے کی۔ ابھی اور دو چار کام نمٹا کے آتے۔ میں قریب کے اسٹیشن جانے والی ایک بس میں بیٹھ گیا۔ راستے میں میں نے اپنے ذہن میں کوئی اور خیال نہیں آنے دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جو بھی گاڑی نظر آئی، اُسی میں بیٹھ جاؤں گا لیکن اسٹیشن پہ قدم رکھتے ہی میرا ارادہ منتشر ہو گیا۔ میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا تنگ ہونے لگی اور اس کے دانے چبھنے سے لگے۔ ایسا لگا جیسے کورا شکایت کر رہی ہو کہ میں اُس سے ملوں گا تو وہ مجھ سے نہیں بولے گی۔ کہے گی کہ میں تجمل کو چھوڑ کے کیوں چلا آیا۔

وہ اتنی ہی اچھی تھی، اُس کا دل اتنا ہی نرم و نازک اور صاف و شفاف تھا۔ وہ ایسا ہی کہتی۔ وہ مجھے کسی کی نظروں میں کم نہیں دیکھنا چاہے گی۔ چاہے وہ خود تکلیف برداشت کر لے۔ اسٹیشن سے پیرو کا علاقہ کچھ نزدیک ہو گیا تھا۔ میں ایک عزم کے ساتھ بس میں بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا تھا، تجمل کے سامنے جاتے ہی اعتراف کر لوں گا کہ اس موقع پر اُسے چھوڑنے کا خیال میرے دل میں آیا تھا۔ جب میں رات کو اپنی مالا دیکھوں گا اور کورا میری بند آنکھوں میں کہیں سے اُتر آئے گی تو مجھے اُس کے سامنے ندامت نہیں ہوگی۔

علاقے میں صبح جیسی بات نہیں تھی۔ پولیس کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن سنبھالے رکھی۔ تجمل سے اگر کوئی لغزش ہو گئی تھی تو ایسا ہونا ممکن تھا۔ کسی سے بھی ایسا ہو سکتا تھا۔ بڑے بڑے اندازے غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ تجمل پہلے بھی کئی بار جیل جا چکا تھا۔ ایسی واردات کے بعد علاقے میں پولیس کا آنا، تفتیش کرنا اور گرفتاریاں کرنا کوئی توقع کے خلاف بات نہیں تھی۔ توقع کے خلاف بات یہ تھی کہ وہ اتنی آسانی سے تجمل اور اُس کے ساتھیوں تک پہنچ جائیں اور کسی اور طرف سوچنے اور منتشر ہونے کے بجائے اسی جانب اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیں۔ توقع کے خلاف بات یہ تھی کہ خود تجمل نے پیچیدہ طریقۂ کار اختیار کر کے اُن کے لیے راستہ آسان کر دیا تھا۔ مگر تجمل نے ایسا کیوں کیا؟ پاڑے جانے سے پہلے مجھے معلوم ہو گیا کہ ابھی تک پیرو اور تجمل پاڑے ہی میں ہیں، دن بھر پولیس کے کارندے آتے جاتے رہے ہیں لیکن انھیں اہتمام کے ساتھ رسمی تفتیش کے لیے تھانے نہیں بلایا گیا ہے۔ تجمل نے ضرور تمام پہلوؤں پر غور کیا ہوگا۔ میری بے یقینی کی وجہ

شاید کورا ہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو مجھے پھر دیر ہو جائے گی۔ وہ تجمل کو تھانے بلا لیں، جیل میں بند کر دیں مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انھوں نے تجمل پر فردِ جرم عائد کر دی۔ تجمل نے اپنے دفاع کی ہر تدبیر ذہن میں محفوظ اور ملحوظ رکھی ہوگی۔ اس کے باوجود کوئی حادثہ رونما ہو جائے، کوئی روزن کھل جائے تو تجمل کیا کر سکتا ہے۔ پھر تو آدمی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہے اور کرشنا جی کو ختم کرنے کے بعد تیواڑی سر اُٹھا کے چلتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اُسے سونے کی دیوار میں چھپا لیا ہے۔ تجمل نے یقیناً ہر امکان نظر میں رکھا ہوگا۔

پیرو کے آدمیوں نے مجھے پاڑے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ پھاٹک کے سامنے پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پتہ چلا کہ اندر علاقے کے تھانے کے بڑے افسر کے ساتھ وہ افسران بھی موجود ہیں جنھیں تیواڑی کے پاڑے کی واردات کے سلسلے میں تعینات کیا گیا ہے اور انھیں آئے گھنٹے بھر کا وقت گزر گیا ہے۔ میں دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو راستے سے ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ تجمل کے ہونٹوں میں حقے کی نے دبی ہوئی تھی۔ پیرو اُس کے بازو میں بیٹھا تھا۔ چوکی پر پولیس کے چار افسر موجود تھے۔ تین سپاہی دروازے سے لگے ہوئے کھڑے تھے۔ افسروں کے سامنے لیمن کی بوتلیں کھلی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے تجمل نے مجھے دیکھا۔ اُس کی بھویں سکڑ گئیں۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چند لمحوں بعد دوبارہ کھولیں تو اُن میں تاسّف اور پریشانی کے اثرات تھے جیسے وہ مجھے دروازے سے لوٹ جانے کی تلقین کر رہا ہو۔ میں کشمکش میں دروازے پہ ٹھٹکا کھڑا رہا لیکن واپس جانا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ میں تیزی سے چوکی کے پاس پہنچ گیا۔ دروازے کی طرف جن افسروں کی پشت تھی وہ اب میری سمت مڑے تھے۔ میری آنکھیں اُن پر جمی ہوئی تھیں۔ اُن میں میرا ایک شناسا تھا۔ مجھے اپنے حواس بحال رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ اُس کا بھی یہی حال ہوا۔ میرے ہاتھ سلام کے لیے اُٹھتے اُٹھتے رہ گئے۔ اُس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ وہ مجھے جلتی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں نہیں جھکائیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ تجمل کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ "شعلہ جی!" تجمل نے بڑے اسی لہجے میں کہا۔ "کوئی اور بات پوچھنی ہو تو جھجک نہ کریں۔ جو کچھ ہم جانتے اور سمجھتے تھے، ہم نے آپ کو بتا دیا ہے۔ آگے بھی جب آپ کا جی چاہے اِدھر آئیں۔ جو خاطر ہم سے ہو سکی کریں گے۔ اگر ہمارے اندر جانے سے آپ کا بھلا ہو سکتا ہے تو ہم آپ کے لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں۔"

شعلہ خاموش رہا۔ اُس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔ اُس کے بجائے ایک دوسرے افسر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تجمل دادا! واردات بہت سنگین ہے۔"

"ہے تو۔" تجمل سر ہلا کے رہ گیا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔

"اور اپن کیا بول سکتا ہے۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔

"اور ہم کسی کوشش سے گریز نہیں کریں گے۔"

"ایسا ہونا بھی چاہیے۔" تجمل نے نرم انداز میں کہا۔ "یہ کام کسی پاڑے کے آدمیوں ہی نے کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے انھوں نے کسی کے بولنے پہ ایسا کیا ہو۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ پولیس والے ہیں، یہ باتیں اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ پاڑے سے کئی لوگوں کو پاڑے کے آدمیوں سے بیر ہوگا۔ بستی والوں کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ آپ بولتے ہیں کہ گلی کا چوکی دار بھی محفوظ رہا تو یہ کوئی دشمنی کی بات لگتی ہے صاحب لوگو!"

"اور تیواڑی کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟"

"وہ اپنا دشمن خود ہو سکتا ہے اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ہم بھی اُس کے دشمن ہیں۔" تجمل نے کہا۔ "ہمیں تو جان کے خوشی ہوئی ہے۔ تیواڑی کا ریکارڈ تو آپ کے پاس ہوگا لیکن کسی نے اُسے چھپا دیا ہو، نہ ملے تو ہم سے پوچھ لیجیے۔ پہلے علاقے کی پولیس، علاقے کے باسیوں، لوگوں اور بستی والوں کو اب اُس کا اتنا خیال نہیں ہوگا۔ ابھی اُس کے اڈے کے بہت سے آدمی زندہ ہیں۔ آپ زندوں ہی کو شاید بے نقاب کریں۔ پولیس چپ ہے تو ہم بھی چپ تھا۔ آپ پوچھتے ہو تو زبان کھولیں، پر آپ باہر کے لوگ اب جاتے ہو لاگے۔"

"تم تو کلکتے سے آئے ہو، تمھیں تیواڑی کے بارے میں اتنی باتیں کیسے معلوم ہیں؟" ایک افسر نے تندی سے کہا۔ وہ سب سے زیادہ مضطر تھا۔

"بڑے صاحب!" تجمل خوش دلی سے بولا۔ "پیرو تو اِدھر رہتا ہے اور بھی اپنی جان یہاں رہتا ہے۔ اپنے بولتے ہیں اور سالے پہرہ کے ہاتھ پاؤں کے ساتھ دیکھنے اور سننے کے لائق ہیں، پر بول نہیں سکتے۔ ناک الف دکھتی پڑتی ہے۔"

"اور ہم لوگ اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہو جناب!" پیرو نے اُسی قدر نرمی سے کہا۔ "ذرا دم تو لیجیے۔ وہ ابھی سالا اپن کو خود اُس مائی کا لال کا کھوج ہے جو اُدھر اُس شان سے پہنچا۔ کل وہ اُدھر جا سکتا ہے تو آج اِدھر بھی آ سکتا ہے۔ ابھی اپن بھی آپ کا مالک۔۔۔۔"

تجمل نے اُس کی بات پوری نہیں ہونے دی، ہاتھ بڑھا کے وہ مجھ سے بولا۔ "بیٹھ جا راجا! کھڑا کیوں ہے۔ آ اِدھر آ۔" میں بیٹھ گیا۔ شعلے نے ہم دونوں کو دیکھ کے سر جھکا لیا۔

"دیکھو پیرو دادا! کسی کو معاف نہیں کیا جائے گا۔" شعلہ کے برابر بیٹھے ہوئے افسر کے لہجے میں غصہ شامل تھا۔ "ہم انھیں نہیں چھوڑیں گے۔ چاہے وہ ہمارا باپ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ۲۷ آدمیوں کی زیست ہے، معاف نہیں کی جائے گی۔ اگر تمھیں کچھ پتہ ہے تو ہمارا ساتھ دو۔ قانون کی صورت میں رعایت ضرور ہو سکتی ہے ورنہ۔۔۔۔ ورنہ" وہ جھجک کے الفاظ

بہت خراب ہو سکتی ہے۔ ہم بولے دیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ان کی گردنوں تک پہنچیں اور رعایت کی کوئی گنجائش نہ رہے، وہ خود کو ہمارے حوالے کر دیں تو اچھا ہے۔ اس مرتبہ پولیس کے وہ لوگ سامنے نہیں ہیں جو پہلے تھے۔"

"صاحب وہ لوگ کہاں سامنے ہوں گے۔ تیواڑی کا معاملہ ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے ممبئی کے جنگل کا شیر ہے۔ اب تو سب کچھ بدل جائے گا۔" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بڑے آدمی کے لیے قانون بھی بڑا ہونا چاہیے۔ زیادہ سخت لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔ زیادہ بڑے قانون والے تجمل جیسے افسر لوگوں کی۔ جناب! صاف صاف بات کرو۔ ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ چلو ہیرو دادا! اب تھانے۔ یہاں سے اپنا دانہ پانی شاید اٹھ ہی گیا ہے۔"

"سادہ لباس پولیس والوں کو بھی ہمارے ساتھ لیتے چلیے جن کی جگہ آپ آئے ہیں اور جنھیں بلانے کی آپ نے اب ضرورت سمجھی۔" میں نے شکلا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو چپ رہ، بڑے آدمیوں کے بیچ میں بولتا ہے۔"

"یہ کون ہے؟" معمر افسر نے پوچھا۔

"یہ اپن کا راجا ہے۔" ہیرو میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔

تجمل نے میرے بال کھینچ لیے۔ "اسے معاف کر دیا صاحب! یہ نہیں، اس کی عمر ابل رہی ہے۔ ابھی افسروں میں اٹھنا بیٹھنا نہیں ہے۔"

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہی ہے؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"نہیں، غلط نہیں، بے موقع بات کہی ہے اور بے موقع بات بھی غلط بات کے برابر ہے۔" تجمل آہستگی سے بولا۔ پھر اس کی آواز بتدریج اونچی ہوتی گئی۔ "ہر بات کہنے کے لیے ایک وقت اور موقع ہوتا ہے۔ قانون کی کتاب اندھا بھی پڑھ سکتا ہے بچے! یہ عدالت، وکیل، منصف، ایک حاکم کے اوپر دوسرا حاکم، یہ سب گورکھ دھندا کس لیے ہے۔ موقع آئے گا تو منہ سے نکلی ہوئی بات اچھی بھی لگے گی۔"

"تجمل دادا! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں صاحب!" میں راجا کو سمجھا رہا تھا۔ اس کی زبان اس کے ہاتھ اور سر کی طرح اس کے بس میں نہیں ہے۔ آپ بولیں، آپ نے پورے باڑے کی تلاشی لے لی ہے۔ سب کچھ جان بوجھ لیا ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس سے زیادہ کیا بولیں۔ کچھ اور تمھیں دہی منگوائیں؟ رات کے کھانے کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔ یہ جگہ آپ لوگوں کی شان کے مطابق نہیں اور ٹائم بھی ایسا نہیں کہ آپ سے کھانے کے لیے بولا جائے۔" تجمل حقہ گڑگڑانے لگا۔

ایس پی شکلا کے سوا ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔

"ہم تمھیں ایک موقع اور دیتے ہیں۔ ہم پھر آئیں گے۔"

"ضرور آئیں۔ آپ کو دروازہ ہر وقت کھلا ملے گا۔ مجھے جانا تھا، ہیرو کی وجہ سے رک گیا تھا۔ اب آپ لوگوں کی وجہ سے رکنا پڑے گا۔"

ایس پی شکلا اچانک کھڑا ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے افسروں نے بھی چوکی چھوڑ دی۔ تجمل اور ہیرو بھی فرش پر آ گئے۔ "ابھی اپن ایک بات بولیں۔" ہیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بولو۔" معمر افسر نے پلٹ کے پوچھا۔

"اپن سمجھتا ہے کہ پہلے آپ اپنا ٹائم خراب کرنے کے بجائے کسی اور طرف جاؤ۔ اور شاید تم کو کچھ مل جائے۔ اپنا تو اپن ہر ٹائم پر موجود ہے۔ جب بولے گا، چلا جائے گا۔ اپن کا تجمل بھائی بولتا ہے کہ ہر دادا کا دو گھر ہوتا ہے۔ کبھی اس گھر میں کبھی اس گھر میں۔ اور بولتا ہے کہ مرنے سے پہلے جیل یا موت کا مزہ چکھنا چاہیے۔ انھیں یاد ہو گا تو دادا سالا انھیں خبر ہے۔" اس کی جھڑکتی ہوئی آواز جلد ہی ماند پڑ گئی۔ "ابھی اپن کے منہ سے کوئی نامناسب بات نکل گیا ہو تو معاف کرنا۔ اپن سے بولنا نہیں آتا۔ سالا سارا ٹائم چاقو میں لگ گیا۔ کوئی اور کام ہو تو بولو۔"

معمر افسر کے ہونٹوں پر سوکھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کی گردن معنی خیز انداز میں ہلتی رہی۔ باری باری اس نے ہم تینوں پر نظر ڈالی۔ پھر وہ مسکرایا اور قدم بڑھا دیے۔ ہم تینوں انھیں جیپ تک پہنچانے گئے۔ ایس پی شکلا ان سب سے آگے تھا۔ موٹر میں بیٹھنے سے پہلے اس نے سر اٹھایا۔ میں سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ چھوٹی ہو گئی تھیں اور مجھی پر مرکوز تھیں مگر موٹر فوراً چل پڑی۔ ہم چند منٹ تک جاتی ہوئی موٹریں دیکھتے رہے۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئیں، ادھر ادھر بیٹھے ہوئے آدمی لپک کے ہمارے پاس آ گئے۔ "کیا ہو رہا ہے دادا؟" ماچھی کی آواز گونجی۔

"واپس چلا گیا ہے۔" ہیرو نے بوجھل لہجے میں جواب دیا۔

"کیا بولتا تھا؟"

"پریشان تھا۔"

"ٹھیک تو رہا؟" ماچھی نے آنکھ دبا کے پوچھا۔

"ہاں۔" تجمل اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ اور میری کمر پکڑتا ہوا اندر چلا آیا۔ "تو پھر آ گیا ہے؟" وہ جماہی لیتا ہوا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تجمل بھائی! میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔ یہ کیا..... یہ سب کیا ہے؟" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں ہے؟"

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ "لاڈلے! کیا یہ تیری آواز ہے؟"

"یہ کیسی باتیں ہو رہی تھیں؟"

"تو تو بہت دیر سے آیا۔ اس سے پہلے بہت سی باتیں ہو چکی تھیں، ابھی اور ہو سکتی ہیں۔ یہ آنا جانا، سننا سنانا تو لگا رہتا ہے۔"

مسکراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مگر یہ کس طرح کی باتیں تھیں؟"

"یہ تیری سمجھ میں ابھی نہیں آئیں گی۔ بالوں کا رنگ بدلتا ہے تب یہ نرم گرم سمجھ میں آتی ہے۔" وہ چوکی پر بیٹھ کے چلم کی آگ کریدنے لگا۔

"یہ تو بہت بے معنی، کچی، مشکوک اور فرسودہ باتیں تھیں۔"

"اسی طرح ہوتا ہے لاڈلے! کبھی اونچی، کبھی نیچی، کبھی سرد، کبھی گرم، جان بوجھ کے کچی پکی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ چلے گئے نا؟"

"ہاں چلے تو گئے لیکن پھر واپس آ سکتے ہیں۔"

"پھر چلے جائیں گے، پر اب انھیں آنے میں دیر لگ سکتی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم نے یہ قدم اٹھاتے ہوئے کچھ جلدی کی، زیادہ نہیں سوچا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "مجھے آثار اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"لاڈلے! میں نے تجھے اسی لیے گھر بھیج دیا تھا کہ تو اپنے دماغ پر بوجھ نہ ڈالے۔ مگر تو کانتے اور ماں کو چھوڑ کے یہاں آ گیا۔"

"میں اس لیے آ گیا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔"

"تو کبھی گھبرا جاتا ہے۔ اچھا اور بات کر۔ لیلی ماما اور کانتے کا کیا حال ہے اور وہ گڑیا کیسی ہے؟ کیا نام ہے اس کا؟....."

"میں صبح سے گھر نہیں گیا۔" میں نے تنک کے کہا۔

"پھر تو دن بھر کہاں رہا؟"

"یوں ہی گھومتا رہا۔"

"اب تو گھر جا کے سو جا۔ جب تک میں نہ آؤں ادھر مت آنا۔ اپنا چلنے کی تیاری کرتا ہے۔ میرا خیال ہے، میں جلد ہی تیرے پاس آ جاؤں گا۔"

"ہونہہ۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تمھیں بس ایک دو دن ہی میں چل دینا ہے۔ مجھے تو اب یہاں سے جانا ہی مشکل معلوم ہو رہا ہے۔"

"لاڈلے! ضرور چلیں گے۔ دل چھوٹا مت کر۔"

"اور ہاں!" میں نے بوکھلا کے کہا۔ "یہی ایس پی شکلا تھا تجمل بھیا! اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا ہو گا۔"

"جو تو سوچ رہا ہے، وہی وہ بھی سوچ رہا ہو گا۔ تو نے بات اُلٹی کی ہے۔ اس نے تجھے نہیں دیکھا۔ تو نے اُسے اپنے آپ کو دکھا دیا۔"

"مگر وہ اس سے پہلے بھی تو مجھے دیکھ سکتا تھا اور میں بھلا اس کا باہر کیسے رہ سکتا تھا۔ میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔"

"میں تیرے کہنے پر گھر میں بیٹھا رہتا۔"

"بالکل نہیں۔ تم تو گھر جاتے ہی نہیں۔"

"اب جانے دے، کون کیا کرتا، کیا نہ کرتا۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہر آدمی اپنی جگہ ہوتا ہے لاڈلے! آدمی ایک دوسرے کی جگہ حل لیا کرے تو پھر یہ دنیا بڑی ہلکی ہو جائے۔"

"تم خفا ہو گئے۔ یقین کرو، میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔"

"لاڈلے! میری جان!" اس نے مجھے دلاسا دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تو کیا سوچ رہا ہے۔ یہ تو آنا تھا۔ سوچ میرے پاس بھی۔ ایسے وقت تو گزرنا ہی تھا۔ تو دیکھنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بڑا اچھا تھا کہ تو میری بات مان کے گھر چلا جا۔ وہاں ماں اور کانتے اکیلے ہوں گے۔ یہاں تیرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ شکلا نے تجھے دیکھا تو اچھا تھا۔ اب اس نے تجھے دیکھ لیا ہے تو دیکھنے دے۔ زیادہ سے زیادہ یہی سمجھے گا کہ تو باغی ہو گیا ہے۔"

"کچھ اور بھی سمجھ سکتا ہے۔ مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔" میں نے اداسی سے کہا۔

"اب خیال آنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ تیرے آتے ہی اس کی زبان پر تالا لگ گیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ہم لوگوں کو بہت تنگ کیا تھا۔ تو سچ کہتا تھا، وہ اچھا اور سچا آدمی ہے۔"

"تمھیں یاد ہے، میں نے تم سے کہا تھا کہ شکلا نے مجھ سے استاد تیواڑی کا ذکر کیا تھا۔ اس نے نام تو نہیں لیا تھا لیکن وہ سلسلہ ملتا ہے۔"

"بلا سے کچھ اور وقت لگ جائے گا۔ میرے لیے تو میں پہلے ہی یہ بات تھی لیکن اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم اتنے مطمئن کیوں ہو؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"کیا تجھے میرا اطمینان برا لگتا ہے؟" وہ مسکرانے لگا۔

"نہیں، کچھ عجیب لگتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ مجھے اس کی ہنسی بہت بری لگی۔ اتنے میں ہیرو آ گیا اور تجمل سے کچھ پوچھے بغیر اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ "کیا ہے تجمل بھائی! ابھی سالا کھانے والے کا بھی کچھ ہونا چاہیے۔" وہ تجمل کے ہاتھ سے حقے کی نے لے کر کش لینے لگا۔ پھر بے تحاشا کھانسنے اور ہنسنے لگا۔

"تمھارے بس کا نہیں ہے ہیرو۔" تجمل نے اس کے ہاتھ سے نے چھین لی۔ "تمھارے لیے وہ مالی پری کی چھاپ ہی ٹھیک ہے۔"

وہ دونوں آپس میں فضول باتیں کرتے رہے۔ جب کھانا آیا تو بہت سے لوگ آ گئے۔ سب کھانے پر ایسے پلے جیسے کئی دنوں کے فاقے سے ہوں۔ میں بھی لگا رہا۔ صبح سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران میں ہیرو کے آدمی تجمل سے اصرار کرنے لگے کہ گروا ناچنے والی چندیا بائی آئی ہوئی ہے۔ آج رات اُسے بلایا جائے۔ تجمل نے جز بز ہو کے اجازت دے دی۔ باڑے میں شور مچنے لگا۔ بجلی اور ماچھی فوراً چندیا کو لینے چلے گئے۔ فرش پر سفید چاندنی بچھا دی گئی۔ میں نے تجمل سے ماں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے منع کر دیا اور مجھے تسلی دی کہ ماں کی پوری دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔ اس کی حالت صبح سے اچھی ہے۔

چند منا جیسے تیار ہی بیٹھی تھی۔ وہ اُسے ایک گھنٹے کے اندر لے آئے۔ وہ بُرقے میں دُبلی اور گندمی رنگ کی ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ جُوڑا بندھا ہوا تھا اور کانوں میں پھولوں کی بالیاں لٹک رہی تھیں۔ راجہ اور راقیے کے دوسرے آدمیوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر جمّل نے مجھے ٹھیرنے نہیں دیا۔ میں خود بھی اب وہاں رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ گولا شروع ہونے سے پہلے میں وہاں سے چلا آیا۔ علاقے میں پولیس کا راج تھا۔ میں کچھ دُور تک گلیوں گلیوں راستہ طے کرتا رہا۔ پھر ایک موڑ پر آکے بس میں بیٹھ گیا۔

گیارہ بجے سے پہلے میں گھر پہنچ گیا۔ جامو اور کانتے ڈرائنگ روم میں چوپٹ کھیل رہے تھے۔ جولین، چچا اور جولین کی ماں آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے انتظار میں کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جامو اور کانتے نے کھیل بند کر دیا اور تکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے اشاروں میں انھیں بتایا کہ ابھی سنانے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن میرے اشاروں سے اُن کا اضطراب بڑھ گیا۔ جولین، چچا اور جولین کی ماں نے بھی محسوس کر لیا کہ ہم لوگ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ یکے بعد دیگرے کھسک گئیں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ انھیں ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤں گا۔ پھر ارادہ بدل دیا اور دن بھر کی روداد جستہ جستہ سنائی۔ اُن پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا لیکن جب جامو کر میں اُن کے منہ تک لوں میں سے برگشتہ ہو کے تمام خطرے اُن کے کان میں ڈالے۔ جامو سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھا سنتا رہا۔ مجھے پھر لاڈ آیا لیکن اُس کی سنجیدگی چند لمحے برقرار رہی۔ اُس نے منہ بنا کے زور سے سر جھٹکا اور جیسے میری تمام باتیں دوسرے کان سے اُڑا دیں۔ میں نے اُسے پھر متنبہ کرنا چاہا تو وہ بھڑک گیا۔ بھڑک کے کہنے لگا "لاڈلے! لے لے نے جمّل بھائی کو کیا ٹ کا بچہ سمجھ لیا ہے۔ اپنی یاری اُس سے ایک سال سے اوپر کی نہیں ہے۔ تُو نے تو اُس کے ساتھ ایک وقت گزارا ہے۔ پھر ایسی بے ادار بند باتیں کیوں کرتا ہے کہیں رکھ لاڈلے!" وہ ٹھلاکے بولا "پولیس محض چکر دے رہی ہے۔ سالا ہم ایک ایک آدمی جن جن کے آنا کر آئے ہیں اور تیواڑی کی لاش بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ اُس کے سات آدمی بھی غائب ہیں۔ تین چار روز میں اپنے کچھ زخمی اچھے ہو جائیں گے اور اپنے اپنے اڈوں پر واپس آ جائیں گے۔ باقی لوگ تو موجود ہی ہیں۔ پولیس کی ابھی نگاہ بھی نہیں جا سکتی کہ کون موجود نہیں ہے۔"

"اور اُن میں سے اگر کوئی اوچھا نکل گیا؟"

"ایسے اُن میں ایک ساتھ دس اوچھے نکلیں تب بات بنے گی۔ ایک دو تو سالے حکومت کرتے رہ جائیں گے۔ اُن کو یقین ہے کہ ہم کر جاتا ہے۔ پھر سارا مُن اُنھی پر ہے گا۔ وجہ بھی لاڈلے! ہم نے اتنے لوگوں کو اس لیے اکٹھا کیا کہ ایک تو تیواڑی کے اڈے پر زیادہ لوگوں کی وجہ سے کوئی خرابی نکے کے نہیں جائے گا اور تیواڑی کو زندہ پکڑنے میں بھی آسانی ہوگی۔ دوسرے اتنے بہت سے لوگ شامل ہوں گے کہ کیس پٹ کرتے کرتے سالوں کی بیتا مرے گی۔ واردات بھی اپنی جگہ انیا ناک ہو گی اور پولیس بھی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔ اس کیس میں ہر بات کا خیال رکھا تھا۔ اب دیکھو ایسی ناچ رہی ہے۔ وہ جمّل بھائی اور ہیرو پر ہاتھ ڈال کے دکھیں۔ خدا بامیں مگر بس یا پانا سفر سے چلیں کرے۔ اس کے سوا کچھ ہوا تو سالی بیوقی کو کون روک سکتا ہے، ہو جائے۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو گیا ہائے! وہ لوٹ نہیں سکتا۔ اب ٹھسے ہائیں کیا۔ جیل جن اُس نے آواز لگائی "کوئی اُتار دے۔"

جامو نے کچھ کہنے کے لیے چھوڑا ہی نہیں تھا۔ بس نے بھی بیچارہ ل سائیں کی ایک ہی بات دل کو لگی کہ گوشے بیٹھنے وقت پر سرکھیا! فضول ہے۔ اُس نے یہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی تھی مگر وہ اور کہہ گیا۔ وہ بے بات پریشانی سے بھی کہتا تو ایک ہی مطلب تھا۔ جامو کو بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔ وہ ایس پی شنکلا کو نہیں جانتا تھا لیکن اگر اُسے تمام واقعات اور تمام سلسلے معلوم بھی ہوتے تو یہی کہتا۔ ہم ہیرو کو تنہا چھوڑ کے فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ یہیں رہنا تھا اور جو ہونا تھا، اُسے قبول کرنا تھا، اب کچھ بھی ہو جائے۔

میز پر کھانا لگا تے ہی جولین نے ہم سب کو بُلا لیا۔ میں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ میں تھوڑا بہت کھا کے آیا ہوں۔ میں بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میز پر بہت اہتمام تھا۔ جولین نے بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوش خوش تھی۔ صرف ایک دن میں وہ سب اتنے گھل مل گئے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ چچا کو جولین نے اپنے ساتھ ہی بٹھا دیا تھا۔ مجھے چچا پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ سب اُسی کا کیا دھرا تھا۔ نہ وہ جمّل کو خط لکھتی نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ کچھ دنوں بعد خط لکھ دیتی۔ بارہ بج چکے تھے لیکن وہ سب دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے۔ جولین کانتے کے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور کانتے اُس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اُسے گٹ پٹ سکھا دے۔ جولین میری طرف دیکھ کے کہنے لگی کہ ایک کو سکھایا تھا، بعد میں بہت شرمندگی ہوئی۔ کانتے مچلنے اور ضد کرنے لگا۔ آخر جولین کو وعدہ کرنا پڑا کہ وہ اُسے ضرور انگریزی سکھائے گی۔

"اور میں اپنی پیاری بہن کو سونے میں لاد دوں گا۔" کانتے جوش میں بولا "پھر میں بنگلا اور ہندی میں بات نہیں کروں گا۔ میں تو جولین کی طرح ایک ہیم لائن لگا اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے گردن اُٹھا کے لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ چلوں گا۔ وہاٹ لیو ڈیل ٹو آئی ایم ٹو..."

جولین کی ہنسی کمرے میں کھنکنے لگی۔ وہ اتنے زور سے ہنسی جیسے اوپر سے کسی نے ڈھیر سی چوڑیاں زمین پر گرا دی ہوں۔ جامو نے اُلٹا ہاتھ سے کانتے کو طمانچہ رسید کیا۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ جیسے دولا کل جیسے انھوں نے خرید لیا ہو۔ وہ ٹھاٹ سے پاؤں پھیلائے چلے جا رہے تھے۔

جولین نے بہ اصرار انھیں اُن کے کمرے میں بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ مجھے بھی سلانا چاہتے تھے مگر میں ڈرائنگ روم کے صوفے پر لیٹ گیا۔ جولین کچھ دیر تک تو بیٹھی رہی۔ پھر جب میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی تو اٹھ کے اندر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا اور مالا گردن سے اُتار لی۔ میں نے اُس کے ایک ایک دانے کو خوب پیار کیا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

* * *

سویرے سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے جلدی سے مالا گردن میں ڈال اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں صوفے پر کروٹیں بدلتا رہا اور مجھے ایس پی شنکلا کا خیال ستانے لگا کہ وہ نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ ممکن ہے وہ یہ سوچ رہا ہو کہ میں نے کرشنا جی کی بدولت ادھر اُدھر کی خرچ کر دی ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ تیواڑی کو ختم کرانے کے لیے میں نے کرشنا جی کی دولت سے آدمی خریدے ہوں گے۔ سب سے پہلا خیال اُس کے دل میں یہی آئے گا کہ ہیرو کے پلٹنے سے میرے سلسلے کا سبب یہی ہو سکتا ہے اور جب یہ بات اُس کے دل میں گھر کرے گی تو وہ کھوج لگاتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ اُسے یہ راز مل جائے گا تو کھوج لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میں نے طے کیا کہ وہ آئے گا تو میں اُسے بینک کے سارے کاغذات دکھا دوں گا کہ میں نے ایک پیسہ بھی بینک سے نہیں نکالا ہے۔ ابھی ہم نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا کہ دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہوئی۔ جولین نے دھا کر اُٹھ کھولا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جامو اور کانتے اُٹھ کے میرے کمرے میں چلے گئے۔ دروازہ کھلنے میں ذرا سی دیر ہوئی۔ ایس پی شنکلا عام لباس میں اندر داخل ہوا۔ میں اپنی نشست سے اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ شنکلا کی آنکھیں سُرخ تھیں اور چہرہ بجھا ہوا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ جولین اور چچا اُس سے اُس کے گھر والوں کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ وہ انھیں سرسری جواب دے رہا تھا اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں نے بھی اندازہ کر لیا کہ شنکلا آج پریشان ہے اور شاید اسی خیال سے وہ ہٹ گئیں کہ صبح صبح اُس کے آنے کا کوئی خاص ہی مقصد ہو سکتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ وہ بیٹھی رہیں۔ پھر مجھے جامو کی بات یاد آگئی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو زیادہ سے زیادہ کیا سزا سنا سکتا ہے۔ میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "کیا تم رہی ہو۔ تم نے کل رات رکھی تھی؟" اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

کچھ اور کہنے سے پہلے وہ میری صورت دیکھنے لگا۔ اُس کی پلکیں لرز نہیں رہ گیا... "کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"آپ کو پورا اختیار ہے شنکلا جی!" میں نے مایوسی سے کہا۔

"عہدے کا اختیار یا اپنا؟"

"دونوں۔ لیکن اس وقت آپ گھر آئے ہیں۔"

"میں تمھیں کس نام سے پکاروں؟"

"کسی بھی نام سے جو آپ کو اچھا لگے۔"

"یہ میں نے کیا دیکھا تھا؟" وہ کرب سے بولا۔

"آپ نے راجا کو دیکھا تھا۔ ظہیر خاں عرف راجا حرف......"

میں نے اپنی زبان منہ میں دبا لی۔ "شنکلا جی! آپ نے راجا کو دیکھا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" اُس کی آواز کہیں دُور سے آئی۔

"میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

"ظہیر خاں!" اُس کی آنکھیں کسمسانے لگیں۔ "تم یہاں کب پہنچ گئے؟"

"بہت دن ہو گئے۔"

"مگر کیسے؟" اُس کی گھُٹی ہوئی چیخ نکلی۔

"بس یوں ہی۔ مجھے تھوڑا بہت چاقو چلانا آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے دھندے کے طور پر کیوں نہ اختیار کیا جائے۔"

"غلط! تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تمھیں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے مدراس میں تمھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں تو اپنے گھر اور ملاقاتیوں میں تمھارا حوالہ دیتا تھا۔"

"اب مت دیجیے گا۔ تردید کر دیجیے گا کہ جو کچھ آپ نے میرے بارے میں کہا تھا، سب غلط تھا۔"

"نہیں نہیں۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا لیکن میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم سے کسی ایسی جگہ ملاقات ہو جائے گی۔"

"شنکلا جی! مجھے اندازہ تھا کہ آپ پہلی فرصت میں میرے پاس آئیں گے اور مجھ سے ایسی باتیں کریں گے لیکن میرے پاس آپ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے یا یوں سمجھیے کہ میں آپ کو کچھ بتانا نہیں چاہتا۔"

"مجھے احساس ہے کہ میں کرشنا جی نہیں ہوں لیکن میں اُن کا ایک خادم تھا۔ میں تمھارے بارے میں اُن کی طرح نہیں سوچ سکتا لیکن یقین کرو کہ میں رات بھر نہیں سو پایا۔ مجھے بار بار اپنی آنکھوں پر دھوکا ہو رہا تھا۔"

"کیوں شنکلا جی! کیا وہ لوگ آدمی نہیں ہیں؟"

"وہ لوگ آدمی ضرور ہیں مگر کرشنا جی ہوتے تو اُن کے درمیان تمھیں دیکھ کے اُن کا سینہ پھٹ جاتا۔ تم تو بہت اچھے لڑکے ہو ظہیر خاں! کرشنا جی اپنے دل میں تمھارے لیے کیا کیا اُمیدیں رکھتے تھے۔ میں پوچھتا ہوں تمھیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ تمھارے پاس کس چیز کی کمی تھی؟ تمھیں ایسی کون سی ضرورت وہاں کھینچ لے گئی؟ اگر مجھے یہ سوال کرنے کا حق پہنچتا ہے تو تم جواب دو۔ میں وجہ جاننا چاہتا ہوں؟" میں اُسے کیا وجہ بتا سکتا تھا۔ وجہ شاید وہ خود بھی جانتا ہو گا۔ پھر میرے ہی منہ سے سننے کی اذیت کا خواہش مند کیوں تھا۔ "بولو ظہیر خاں! بولو، تم چپ کیوں ہو۔ مجھے جواب دو۔" میں سوچتا ہی رہا کہ اُسے کیا جواب دوں۔

"سنو ظہیر!" چند ثانیوں کے سکوت کے بعد وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ "میں آج سے طویل رخصت پر جا رہا ہوں۔ یہ کاغذ ہے۔ چاہو تو اسے پڑھ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے گھبراہٹ سے کہا۔

"یہ چھٹی کی درخواست ہے۔ اس کے بعد شاید میں پولیس میں واپس بھی نہ آؤں۔ مجھے اپنے بارے میں اب کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔"

"مگر آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ تم غور کرو تو اس کی وجہ تمھاری سمجھ میں آ جائے۔ اب میری تم سے ایک درخواست ہے۔ تم اسے حکم بھی سمجھ سکتے ہو اور منت بھی۔ تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ بہت دور چلے جاؤ۔"

"کیوں شکلا جی؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بس ظہیر خاں!" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "میری بات مان لو۔ میں کرشنا جی کی آتما سے معذرت کر لوں گا کہ جو کچھ انھوں نے مجھے سکھایا تھا، میں اس کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ شاید اس سبب سے کہ مجھے اُن کے ساتھ رہنے کا کم ہی وقت ملا۔ ظہیر خاں! یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مگر شکلا جی! کیوں؟"

"اس لیے ظہیر کہ کرشنا جی نے تمھارے بارے میں جو خواب دیکھا تھا، میں اُس کی تعبیر الٹی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں تمھیں کرشنا جی کا واسطہ دیتا ہوں۔ میں تو جا ہی رہا ہوں لیکن تم بھی ان لوگوں کو چھوڑ کے کہیں نکل جاؤ اور سب کچھ بھلا دینے کی کوشش کرو۔ پھر کبھی اس طرف کا رُخ مت کرنا۔ جب انگلیاں ٹھیک کام کرتی ہوں تو چاقو اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ انگلیوں سے قلم بھی چلایا جا سکتا ہے۔ انگلیوں سے بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں ظہیر خاں! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کس طرح بات کروں۔ تم نے رات کی گفتگو سن لی ہو گی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ حالات کیا رُخ اختیار کریں لیکن میں تمھارے حوالے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ حالات بہت بگڑ بھی سکتے ہیں۔ راستے مسدود بھی ہو سکتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو؟"

"شکلا جی!" میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "آپ نہ چھٹی کی درخواست دیجیے، نہ ملازمت ترک کرنے کا خیال کیجیے۔ اپنا کام کرتے رہیے۔ رہا میرا سوال تو میں یہاں سے بہت جلد چلا جاؤں گا بشرطیکہ حالات نے اجازت دی مگر ابھی نہیں جا سکتا۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟"

"میرے ساتھ کچھ مجبوریاں ہیں۔ انھیں مجبوریاں نہیں، آپ کے خیال سے کہہ رہا ہوں حالانکہ مجھے ذمے داریاں کہنا چاہیے۔"

"کیسی ذمے داریاں؟" وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔

"کچھ ایسی ہی باتیں ہیں۔"

"ظہیر خاں! تم آگ میں بیٹھے ہوئے ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے سانس کھینچ کے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ شکلا جی کے علاوہ آپ کی ایک اور حیثیت بھی ہے اور بدقسمتی سے پولیس کی بھی۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی سخت مرحلے سے دوچار ہوں۔ ہم اپنی دوسری حیثیتیں یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے۔ آپ بھی میری مجبوری سمجھیں۔ آپ بھی صاف بات کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں اور میں بھی کوئی ایسی بات کرنا نہیں چاہتا جس میں آپ سے اپنے تعلق کی بنا پر کسی رعایت طلبی کا پہلو نکلتا ہو۔"

"تم کیسی سمجھ بوجھ کی باتیں کر رہے ہو۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "ایسے نہیں ہو سکتے۔ میں رات کو بھی تمھارے پاس آ سکتا تھا لیکن جب میں یہ کاغذ لکھنے میں کامیاب ہو گیا، تب میں نے تمھارے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔"

"آپ اپنے کام پر جائیے شکلا جی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے کبھی کوئی سوال نہیں کروں گا۔ میں شکرانہ تو ڑ سکے آپ کے سامنے آؤں گا۔"

"نہیں ظہیر! نہیں۔ میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔ تم میرے لیے کرشنا جی کا ورثہ ہو۔ کرشنا جی میرے بہت محترم تھے۔ وہ مجھے بہت عزیز تھے۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے تمھارے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔" شکلا نے آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ "ظہیر! میں اپنے آپ کو کمزور محسوس کر رہا ہوں۔ میں کام نہیں کر سکتا۔"

"پھر آپ مجھے گرفتار کر دیں گے۔"

"مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر لگی ہے اور تمھاری باتیں سن کے اب اس فیصلے کی توثیق بھی ہو گئی ہے۔"

"میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس میں آپ کے فیصلے کی توثیق کا کوئی مفہوم پوشیدہ ہو۔" میں نے تندی سے کہا۔ "میں تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اپنا فیصلہ بدل دیجیے۔ بھول جائیے کہ آپ نے مجھے وہاں دیکھا تھا۔ آپ کی دست برداری اور خاموشی غلط ہے۔"

"لیکن بڑی بُرائی سے چھوٹی بُرائی بہتر ہوتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے، آپ نے اپنے ذہن میں کوئی حتمی رائے قائم کر لی ہے اور وہی آپ کی اُلجھن کا سبب ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کی رائے درست نہ ہو۔"

"میں نے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی ہے۔ میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں، نہ میں نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا نادرست لیکن اگر یہ صحیح ہوا تو۔۔۔۔ تو؟"

"تو آپ اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش میں نہ پڑیے گا۔ آپ کوئی لاف زنی کیجیے گا۔" میں نے سنگ دلی سے کہا۔

"شاید یہ میں نہ کر سکوں۔" وہ آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "اسی لیے میں اپنی بات دہرا رہا ہوں۔ میں یہ تم سے کہے بغیر آفس جا رہا ہوں۔ تم۔۔۔۔ تم

بھی ہو سکے تو اُدھر مت جانا۔ میں تم سے یہی کہہ سکتا ہوں۔ سوچ لینا ظہیر اور ہو سکے تو مان لینا۔"

یہ کہتے ہی وہ اُٹھ گیا۔ مجھ میں اسے روکنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے منہ چھپایا اور جولین کا انتظار بھی نہیں کیا۔ تیزی سے دروازہ کھول کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ موٹر چلنے کی آواز آئی تو میں بھاگ کے گلی میں پہنچا۔ اس کی موٹر نکل چکی تھی۔

میرے خون کی گردش رُک گئی تھی۔

اُدھر وہ گیا، اِدھر جامو اور کانتے نے مجھے آ کے گھیر لیا اور کرید نے لگے کہ ایس پی شکلا کیا کہنے آیا تھا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ وہ کچھ کہنے نہیں، کچھ سنانے آیا تھا۔ بیان لینے نہیں، بیان دینے آیا تھا۔ میری خاموشی پر وہ ناراض سے ہونے لگے تو میں نے انھیں ساری بات بتا دی کیونکہ ان باتوں کا تعلق اُن سے بھی تھا۔ وہ کچھ سوچنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری طرح اُن کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے سکوت کے اُن کی طرف دیکھا۔ جامو کا سر جھک گیا تھا۔ کانتے بھی اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ جولین نے اُن کے سامنے چائے لا کے رکھ دی۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔ وہ خاموش دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھے رہے۔ پھر جامو نے سر اُٹھایا اور بوجھل آواز میں بولا۔ "لاڈلے! مجھے بتا تو کس نتیجے پر پہنچا ہے؟"

"یہ تم نے عجیب بات کہی جامو بھائی!" میں نے زہرخند سے کہا۔

"دیکھ لاڈلے! اور باتوں کے سوا ہم کو اس وقت پہلے تیرہ دیکھنا ہے۔ تیری باتوں سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلے سن لینا، چرا جرح بعد میں کرنا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شکلا کو پتہ چل گیا ہے کہ پرسوں رات واردات سالی کس نے کی تھی۔ اب وہ تجھ کو جتانے اور مشورہ دینے آیا تھا کہ ابھی وقت ہے تو اُن سے بچ جا۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ اب ذرا تصویر اُلٹ کے دیکھ۔ اُدھر کوڑا کا فتنہ ہے۔ بالکل چٹیل میدان۔ کوئی گھاس پھوس نہیں۔ کچھ نہیں کھا کوئی لکیر نہیں پڑی۔ ایس پی نے کل رات تجھے پیرو کے اڈے پر دیکھا تو تصویر کے کوری طرف اسے کچھ دکھائی دینے لگا۔ اپنا آدمی بیچ میں نظر پڑ جائے تو سالا اپنا آپ ہونے لگتا ہے۔ شکلا کے سر میں شک بھر گیا۔ شک کیا، خوف بھر گیا کہ کہیں تو تو ان لوگوں میں شریک نہیں ہے۔ اس کو پتہ ہے کہ تو پادری کا اور اس کے آدمیوں نے کرشنا جی کو ختم کیا ہے۔ اس لیے اُس نے شک کرا اور بھاگا اور وہ شک کی حالت میں تیرے پاس آیا کہ تجھے ہوشیار کر دے۔ مطلب یہ کہ وہ دو حالتوں میں سے ایک میں تیرے پاس آیا۔ شک کی یا یقین کی۔ دونوں میں اُس کے لیے مرن ہی مرن تھا۔ سالا نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اب ہم کو یہ جانچنا ہے کہ وہ کس حالت میں تیرے پاس آیا۔ لاڈلے! یقین کی بات ہوتی تو ایک تو اس کی باتوں کا ڈھنگ دوسرا ہوتا، دوسرے واردات کے بارے میں جو میں نے تجھ سے مغز ماری کی تھی، اب بھی وہی کہتا ہوں۔ تو کہتا ہے کہ تو نے مجھل بھائی کو شکلا کے بارے میں بول دیا تھا۔ مجھل بھائی کے سر میں ایس پی شکلا کا دھیان ضرور ہو گا۔"

وہ خاموش ہو گیا اور اس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے انڈیل لی۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں خود سے باتیں کر رہا ہوں۔ "تم نے تمام۔۔۔۔"

"ابھی نہیں۔" اس نے مجھے بات نہیں کرنے دی۔ "ابھی میری بات ادھوری ہے۔" وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا۔ "تو نے شکلا سے بہت کی کہ وہ چھٹی واپس لے لے۔ اس نے منع کر دیا۔ ہم شکلا سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ دُکھی تھے اور ہمیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ یہ جاننے کے بعد بھی اپنی جگہ کام کرنا نہیں چاہتا۔ سمجھا لاڈلے! اب اپنی طرف آ جا۔ ہم تو جیل جانے کے بعد جیل سے نکلنے کا ہر جتن کرتے رہیں گے اور شکلا بھی سامنے آیا تو گردن ہلاتے رہیں گے۔" جامو تو روزا ایسے نفی میں گردن ہلانے لگا۔ "ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تو تو پڑھا لکھا ہے۔ اگر تجھے کچھ دکھائی دے رہا ہے تو مجھے بتا دے۔ شکلا کو اتنا خیال تو ہو گا اور ہونا چاہیے کہ ہم نے یہ سب کیوں کیا ہے۔ اب تو کچھ بول۔ چاہیے تو بے دھڑک بول۔ میں نے اپنی بات ختم کر دی ہے۔"

میں نے جامو کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

اُس دن میں دن بھر گھر ہی رہا۔ رات کو تھوڑی دیر کے لیے مجھل کے پاس گیا تو وہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ کل والی طوائف نہیں تھی، کوئی دوسری لڑکی تھی، دُبلی پتلی۔ جس کی آواز سریلی تھی۔ سب گم تھے اور وہ مجھل کے سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی تھی ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی

کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

میرا جی چاہا کہ میں وہیں بیٹھ کے سنتا رہوں مگر جب اُس کے گھنگرو بجے تو مجھے رتی یاد آنے لگی۔ میں مجھل کو ایس پی شکلا کی بابت کچھ نہ بتا سکا، صرف چند باتیں ہو سکیں۔ جب میں چلنے لگا تو دروازے کے پاس پڑے میرے سر پہ نوٹوں کی گڈی رکھ کے مجھے روک لیا۔ مجھل نے اسے آواز دی مگر بے رونق تھا۔ لڑکی ناچتی گاتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اُس کی پیشانی اور گالوں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کھڑے کھڑے کانپنے لگا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ لڑکی گاتی رہی۔ جیسے ہی اُس نے میرے بال پکڑ کے سر سے نوٹوں کی گڈی اُٹھائی، میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکرا رہی تھی اور مجھل قہقہے لگا رہا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔ دُور تک اُن کے قہقہے سنائی دیتے رہے۔

باڑے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے احتیاطاً پوچھ لیا تھا کہ اندر پولیس تو موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ

پولیس آج سارا دن نہیں آئی۔ البتہ علاقے میں اُن کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ جب میں گھر پہنچا تو رات زیادہ ہو گئی تھی۔ جولین ڈرائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ میں دن میں دیکھ چکا تھا کہ پچھلی رات کی واردات کے بارے میں کیا کیا خبریں چھپی ہیں۔ جولین کے خیال سے میں نے اخبار صوفے کے نیچے پھینک دیا تھا لیکن وہ اُس کے ہاتھ لگ گیا۔ آج کی خبروں میں سب سے نمایاں خبر اسی واردات کی تھی۔ اخبار نے مرنے والوں کے نام اور اُن کی روداد شائع کی تھی کہ اُن میں کون کتنی بار کس کس جرم میں جیل گیا۔ اُس نے اسے اپنی نوعیت کی سب سے منفرد اور سنگین واردات قرار دیا تھا اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی تھیں۔ ایک جگہ سرسری طور پر کرسٹینا کا ذکر بھی تھا۔ لکھا تھا کہ اس موقع پر وہ بہت یاد آ رہے ہیں۔ اخبار میں چھپنے کے بعد ہر بات انوکھی اور حیرت انگیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ واقعہ بھی اخبار نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تھا اور توقع ظاہر کی تھی کہ جلد ہی اہم انکشافات ہونے والے ہیں۔ اخبار میں ایک اور نامہ نگار کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں پولیس کی ناکامیوں پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا۔ جولین کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اُس نے خبر ضرور پڑھ لی ہے۔ جامو اور کالنٹے زخمی حالت میں اُس کے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ صبح ایبی پل نکلا آیا تھا پھر جامو اور کالنٹے دن بھر آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے تھے۔ جمل غائب تھا۔ جب میں واردات والی صبح منہ اندھیرے واپس آیا تھا تو میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے۔ سوچنے کے لیے جولین کے پاس بہت کچھ تھا۔ میں نے اُس سے رسمی بات کی اور جلدی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ دونوں ابھی جاگ رہے تھے۔ میں کالنٹے کے پاس ہی لیٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ جب دروازہ بند ہونے کی آواز آئے گی تو ڈرائنگ روم میں جا کے سو جاؤں گا۔ میں نے دیکھا تھا اُس کی آنکھیں آئی ہوئی تھیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اُس کے سامنے آنسو نچوڑ لیتا۔ وہ ہنستی ہوئی بالکل پھول کے مانند کھل جاتی تھی۔ اُس کی ہنسی چھلکتی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ ہمیشہ ہنستی رہے۔ ہنستے ہوئے اُس کے دانت اس طرح چمکنے لگتے تھے جیسے اُس کے منہ میں دودھیا روشنی بھر گئی ہو۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اُس کے پاس جاؤں اور کہوں کہ تم کیوں روتی ہو دوست مگر میں سوچتا ہی رہ گیا۔ بہت دیر بعد آہٹ ہوئی۔ میں دبے قدموں وہاں پہنچا۔ پہلے میں نے جھانک کے اطمینان کر لینا چاہا۔ وہ ابھی تک موجود تھی۔ اُس کا آدھا بدن چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور بند آنکھوں سے آنسو رس رہے تھے۔ چہرہ اوپر اُٹھا ہوا تھا۔ میں دیکھتا رہا اور رینگتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ پھر دوبارہ آہٹ ہوئی لیکن میں پلنگ پر پڑے پڑے اندھیرا گھورتا رہا۔

پانچویں دن وہ زخمی اپنے اپنے پاڑے واپس آ گئے جن کے زخم معمولی تھے اور جن کی حالت ابھی ٹھیک نہیں تھی، وہ ابھی تک چھپے ہوئے تھے۔ مارٹی کا حال پہلے سے اچھا تھا۔ اُس کا زخم خشک ہو رہا تھا۔ میں اُسے دیکھنے گیا تو وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ مارٹی کے ساتھ دو ایک زخمی اور تھے۔ اُن کے قریب پھلوں کا انبار تھا۔ ایک آدمی اُن کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ بیرٹے کے علاقے کا خاص ڈاکٹر روز رات کو انھیں دیکھنے آتا تھا۔ اس اثنا میں پولیس افسروں کا زور کچھ بڑھ گیا۔ میں نے اپنا زیادہ وقت گھر پر ہی گزارا۔ جولین جامو اور کالنٹے کی نرسنگ کرتی تھی۔ کالنٹے کی پیشانی اور کان کا زخم بھر گیا تھا البتہ تھوڑی خشک ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔ جامو کے بازو میں چاقو لگا تھا۔ وہ دیسی دواؤں سے اپنا علاج خود کر رہا تھا۔ جولین کی ماں بازار سے سودا لینے جاتی تھی تو اُن کی دوائیں بھی لے آتی تھی۔ اخباروں میں روز خبریں چھپ رہی تھیں۔ ہر طرف تیوادی کی تلاش جاری تھی۔ اب خبروں کا رجحان تیوادی کی گمشدگی یا فرار کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اُس کے باقی آدمی بھی بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ بہت سوں نے بیرٹے کے پاڑے میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ بیرٹے نے کہہ دیا کہ وہ کچھ عرصے بعد ادھر کا رخ کریں۔ تیوادی کا علاقہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پولیس کی موجودگی کے باوجود علاقے میں لوٹ مار کے واقعات ہونے لگے تھے۔ پولیس نے ہر طرف گرفتاریاں کی تھیں۔ چند ہی آدمیوں کو چھوڑا تھا۔ وہ بیرٹے کے پاڑے کے کچھ اور آدمی پکڑ کے لے گئے تھے۔ شعلات ابھی جیل میں تھا۔

ایبی پل نکلا اُس کے جھگڑے میں نہیں آیا۔ ہو نہ ہو وہ اُن افسروں میں شامل تھا جو بار بار بیرٹے کے پاڑے آتے تھے اور ہر بار نئے نئے سوال اُٹھاتے تھے۔ میں نے جولین کو اسکول جانے سے روک لیا تھا۔ جس دن سے اُس نے خبر پڑھی تھی، اُس دن سے وہ گم صُم ہو گئی تھی۔ کالنٹے اُسے بہلانے کی کوشش کرتا تو وہ دبی دبی کھنچی کھنچی ہنسی ہنستی تھی۔ تیا بھی چپ چپ رہتی تھی۔ یا تو نماز پڑھتی رہتی یا مصلے پر بیٹھی تسبیح گھماتی رہتی۔ کئی دن گزر گئے تھے۔ اب تنہائی کے چند لمحے بھی مشکل سے نصیب ہوتے تھے۔ رات کو وہ لوگ دیر تک جاگتے رہتے تھے۔ آدمی مر جائے تو اُس کے پاس جانا آسان ہوتا ہے۔ زندہ لوگوں کے پاس جانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ نہیں ملتی تھی لیکن میں اپنے کمرے میں بند ہو کے کسی نہ کسی طرح اُسے بلا لیتا تھا۔ اُس کی پرچھائیاں وہاں آ جاتی تھیں۔ میں اُس کی بالی کے والوں میں اُس کی خوشبو سونگھ لیتا تھا۔ اب تو گردن سے بالا نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ لوگ ہر وقت سامنے رہتے تھے۔ دل ہر وقت اُکتایا اُکتایا رہتا تھا۔ کسی سے بات کرنے کو طبیعت نہیں کرتی تھی اور سب سے بات کرنی پڑتی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ دن کب ختم ہوں گے اور وہ کون سا دن ہو گا جب کوئی دیوار سامنے نہیں رہے گی۔

رات کے وقت میں روز پاڑے جاتا تھا اور جلد ہی واپس آ جاتا تھا۔ چھٹے دن رات کو میں جمل کے پاس خاموش بیٹھا تھا کہ تنڈا اور کلیمے بھاگتے اور ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ "دادا! — دادا!" تنڈے نے آتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "دادا! — وہ ...... وہ اپن کا زور آور کو اریسٹ کر کے لے گیا۔" تنڈے نے ہذیانی سے کہا۔ "پولیس کا لوگ راجا جی کو لوٹا تھا۔" زور بولا۔ "راجا نے پالا اپن کو مرے دیا ہے۔ سالا اس ٹائم نہیں ہے۔ جب بولو اور چلا جائے گا۔ ابھی کوئی اس پاڑے کا بات کرنا ہو تو اپن سے کرو۔ وہ سالا زور آور کر کے گیا دادا!"

جمل کے ہاتھ میں بھری ہوئی چلم تھی۔ دفعتاً وہ ٹھٹے کی چلم تاک کر کمرے میں گر گئی۔ جمل نے چلم اُس کے منہ پر کھینچ ماری تھی۔ فرش پر چنگاریاں بکھر گئیں۔ تنڈا اپنا منہ ٹکسوتے اور بری طرح چلانے لگا۔ "ابھی!" جمل کی گرج دار آواز پر ابھی بجلی کی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی! اس کمرے کے باہر کو اُٹھا کے نکالتے ہیں۔ ٹک اس کو بات کرنا آ جائے گا۔" تنڈا چیختا چلاتا رہا لیکن ابھی اُسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہر طرف سکوت مسلط ہو گیا تھا۔ چند لمحوں بعد جمل کی بھری ہوئی آواز نے یہ خاموشی توڑی۔ وہ کلیمے سے مخاطب تھا: "کلیمے! اچھا ہوا کہ تو نے زبان نہیں کھولی۔ سالا تم اپنی سسرال والوں سے گھبراتے ہو۔ پیر وا یہ گدھے کے بچے بدمعاشی کرتے ہیں۔ ان ننگوں کو اتنا نہیں معلوم کہ ہتھکڑی چاقو والے کا زیور ہے اور جیل خانہ۔" وہ بلند آواز سے بولا: "جیل خانہ سسرال ہے۔ جن کو یہ پتہ بھی نہیں معلوم وہ حرام کے تخم زنخے بن جاتے ہیں۔"

"جمل بھائی! اتنا غصہ تھوک دو۔" پیرے جیسے لہجے میں بولا۔ "یہ سب سالا ایک ٹم تو کا کام ہے۔ یہ بمبئی ہے۔ سالا ہر اونگا بونگا دادا بننے کے شوق میں ادھر آتا ہے۔ جیسے سالا دادا نہیں ہوا، چڑی مار ہو گیا۔ ہر کسی کا نوکر ہو گیا۔" وہ تھوک کے بولا۔

جمل نے اُسی وقت بیرٹے کے خاص آدمی کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ کلیمے کے ساتھ زور آور کے پاڑے میں جا کے کہہ دے کہ زور آور کیا، سارا پاڑا چلا جائے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ہم لوگ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جاتے جاتے اُس نے کلیمے کو آواز دی: "کلیمے! چھوڑے سے بول دینا کہ حوالات میں زور آور سے جا کے مل لے اور بتا دے کہ خبر ہو گئی ہے۔"

کلیمے سر تا پا لرز رہا تھا۔ اُس نے سر جھکایا اور کلیا کے ساتھ فوراً باہر نکل گیا۔ جمل کے کہنے سے پہلے ہی میں بھی وہاں سے چل دیا۔ دوسرے دن دوپہر کو پولیس نے بیرٹے کو گرفتار کر لیا۔ رات کو جب میں حسب معمول علاقے پہنچا تو پاڑے سے کچھ دور ہی مجھے یہ اطلاع مل گئی۔ میرے پیر زمین سے اکھڑنے لگے۔ سنبھل سنبھل کے میں نے عمارت میں قدم رکھا۔ جمل کو جلد سے جلد دیکھنے کی خواہش میرے سینے میں آندھی کی طرح اٹھی تھی مگر

میں سب سے پہلے میری نظر اُسی پر پڑی۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے جمل کے درمیان میں بیٹھا تھا۔ ارد گرد لوگ بیٹھے تھے۔ خلاف توقع وہ بہت خوش خوش نظر آ رہا تھا اور کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ جیسے ہی میں اُسے دکھائی دیا، اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ اُس کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ پرے ہٹ گئے۔ میں نے اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ اُس نے کھینچ کے مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ "سب خیر ہے؟" میں نے مضطربانہ پوچھا۔

"ہاں۔" وہ سرسری انداز میں بولا۔

"کوئی نئی بات؟"

"وہ تو نے باہر سن ہی لی ہو گی۔"

"کیا؟" میں نے جان بوجھ کر تعجب کا اظہار کیا۔ میں بیرو کی خبر اُسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ میری صورت دیکھ کے وہ انگڑائی لینے لگا۔

"تیری ہی کمی رہ گئی ہے۔ کیسے بڑے بڑے بنتے ہیں۔ بیرو چلا گیا ہے۔" وہ تیزی سے انگلیاں کھولنے اور بند کرنے کی مشق کرتے ہوئے بولا۔

"پھر —؟" میں نے تجسس سے کہا۔

"پھر کیا، پھر۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اب جیلنے کی تیاری کر۔ انداز ذرا سا ٹیڑھا ہو گیا۔ دیر زیادہ ہو گئی۔ اب کوئی کام رہ گیا ہو تو جلدی سے نمٹا لے۔"

"تم ... تم پرکشش میں ہو؟" میں نے ہکلا کے کہا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ وہ پرکشش میں ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بولا۔ "اب کیا یہیں بیٹھا رہے گا سالے! چلنا نہیں ہے کیا؟"

"مگر ہم کیسے جا سکتے ہیں۔"

"اب دیر کیا رہ گئی ہے۔ تھوڑا سا کام اور ہے۔"

"ابھی بیرو بند ہے۔" میں نے ہکلا کے کہا۔

"وہ بھی آ جائے گا۔ منہ کا مزہ جانے لگا ہے۔ کبھی کبھی کسرت ہوتی رہنی چاہیے۔ مجھے بھی دن بہت ہو گئے۔" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔

میں نے نہیں پوچھا کہ بیرو کب اور کیسے آ جائے گا۔ وہ کسی بنیاد ہی پر یہ بات کہہ رہا ہو گا۔ میں نے اُس سے بحث نہ کی تھی جو وہ کہتا تھا، میں مان لیتا تھا کیونکہ اُس سے کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ کوئی اور بات نہ ہو جائے۔ جو وہ کہہ رہا ہے، سچ ثابت ہو جائے۔ مجھے اپنی دعاؤں سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے میں نے دعا نہیں مانگی۔ میری زبان ہی کالی تھی۔ جیل چھوٹنے کے خیال سے میری رگوں میں خون اچھلنے لگا۔ رواں رواں کھڑا ہو گیا۔

"ہم کب تک چل سکیں گے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"اب دن اور وقت کی بابت تو میں تجھے نہیں بول سکتا۔ پر جلدی ہی لاڈلے! مجھے پتہ ہے کہ تو یہاں سے نکلنے کے لیے کتنا بے چین

ہوگا۔ بس کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔"
"تمھیں اندازہ ہے کہ میں کس طرح . . . . ."
"ہاں ہاں! اُس نے مجھے تُو کی دیا، انتظار کرلا ڈالے!"
"اور کیا ہو رہا ہے؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔
"زندگانی انتظار ہی انتظار ہے۔ اچھے دن، اچھی رُت کا انتظار، بچھڑے ہوؤں کا انتظار، بچپن سے جوانی کا، جوانی سے بڑھاپے کا انتظار اور موت کا انتظار۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔

جامو اس قابل تھا کہ بانٹے جا سکے۔ دوسرے دن میں پہلی بار اُس کے ساتھ وہاں پہنچا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پیرو وہاں بیٹھا تھا۔ کمرے میں پیرو کے تمام خاص خاص آدمی موجود تھے۔ زورا اور چھیلا بھی تھے۔ جامو کو دیکھ کے سب اُس کی طرف دوڑ پڑے اور اُس سے گلے ملنے لگے۔ جھل بھی اپنی نشست سے اٹھ کے آ گیا اور جامو کو لے کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ پیرو جامو کو وہ پیسے دے چکا تھا اور اُس سے وہی بات کر رہا تھا جو ایک بار اُس نے مجھ سے کہی تھی۔ جامو جھل کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگا۔ جھل نے پھر معذرت چاہی۔ "آئیں گے پیرو دادا! پھر آئیں گے۔ اب جانے دو۔ اب ہم لوگ کے اِدھر رکنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اگر ایسا سمجھتے ہو تو کہہ دو۔"
"نئیں جھل بھائی؟" پیرو اضطراب سے بولا۔ "ابھی اپن سالا سب سنبھال لے گا۔ اِس بار تمھارے رکنے کو نئیں بولتا۔ اپن کا مطلب پکا ہے۔ آگا دن تو سالا اُٹھک بیٹھک میں خلاص ہو گیا۔ اپن تو تم سے ٹھیک بول سکا، نہ تمھارے پاس بیٹھ سکا۔ ابھی کچھ ٹائم دو تا کہ پیرو اپنے جھل بھائی کو سیٹھ کا جلوہ شلوہ دکھائے۔"
"وہ بعد میں ہو جائے گا پیرو دادا۔ تم کو بہت کام پڑا ہے۔"
"کام سالا ہوتا رہے گا۔" پیرو جھل سے بولا۔ "تم کوئی روز روز آتا ہے۔ اپن کی بات پہ ناصت بولو۔ بولو ہاں، ہاں، ہاں۔" اُس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔
"ہاں کیسے بول دے پیرو!" جھل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور پیرو کو سمجھانے لگا مگر سامنے بیٹھے ہوئے آدمی بھی پیرو کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اُن کی باتیں میرے پلے بالکل نہیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ مجھے سنانے کے لیے کر رہے ہوں اور مجھے چھیڑ رہے ہوں یا بہلا رہے ہوں۔ ممکن ہے جھل نے پہلے سے کہہ رکھا ہو کہ جب میں آؤں تو وہ میرے سامنے اس قسم کی باتیں کرنے لگیں۔ اس طرح کچھ وقت اور نکل جائے گا۔ پرسوں رات زورا کہ کل دوپہر پیرو بگڑ گیا۔ اُن کی مایوسی اس بات کی ضمانت نہیں تھی کہ اب کچھ باقی نہیں رہا۔ پیرو کے اصرار اور جھل کے انکار کا سلسلہ دیر تک جاری رہا

تا ایسی کہ درمیان میں جامو کو دخل دینا پڑا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ ہم چند دن اور ٹھہر جائیں گے۔ جامو کی یقین دہانی پہ وہ سب نعرے لگانے لگے اور پیرو نے جامو کے گالوں کی چٹکی لے لی۔
کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ ہر شخص زور زور سے بول رہا تھا، اُچھل رہا تھا اور ایک دوسرے کو گھونسے مار رہا تھا اور گلے مل رہا تھا۔ مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ سب دل سے یہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ میری حیرت اُس وقت کچھ اور سوا ہو گئی جب کمرے میں جھل کی آواز پہ سکوت طاری ہو گیا۔ اُس کے مخاطب بھی لوگ تھے اور وہ پاڑوں کے انتظام اور تقسیم پہ کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارے آنے سے پہلے اُن کے درمیان کچھ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تیواڑی کے پاڑوں پہ ہاتھ ڈالنے کا وقت نہیں آیا ہے لیکن کچھ عرصے بعد یہ سب پیرو کے پاس آ جائیں گے۔ راجا کے دونوں پاڑے بھی اب پیرو کے پاڑے میں شمار ہوں گے۔ جھل جامو کا نئے اور راجا تیواڑی سے ملنے والے پاڑوں میں سے کسی کے حق دار نہیں ہیں۔ یہ سب پیرو کے ہیں اور پیرو کو اختیار ہے کہ وہ کسے کون سا پاڑا دے۔
اس موقع پہ پیرو اٹھ کھڑا ہوا۔ "تیواڑی کا پاڑا تمھارا ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔ "یہ بھی تمھارا ہے۔ سب تمھارا ہے جھل بھائی! تم ادھر رک کے کر لو۔"
جھل نے پیرو کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ اُس کا بازو پکڑ کے بولا۔ "تم میں سے بہت سے آدمی پاڑا سنبھالنے کی جانکاری رکھتے ہیں لیکن اصل جانکاری کیا ہے، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ جس کا ہاتھ صاف ہے اور جس کا سر صاف ہے، وہی جان کار ہے۔ ہم کو خوشی ہوگی، اگر تم یہ سب اپنے پاس ہی رکھو۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ تم میں یہ کتنا سماتا ہے۔ تم سالا اچھلے برتن نکلتے ہو یا کنواں بن جاتے ہو۔ بس ہم کو اتنا کہنا تھا۔"
یہ کہہ کے جھل چپ ہو گیا۔ پھر ایک دم پیرو اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی اپن کو بھی بولنے دو۔ سالا جھل بھائی کے آنے کے بعد اپن کا کھوپڑی چھل ہو گیا ہے۔ اپن بولتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے تم سب لوگوں کا ہے۔ پیرو سالا تمھارے بغیر کچھ نہیں اور تم سالا ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں۔ ابھی اپن کے دل میں بلبلہ سا اٹھتا ہے۔ پیرو اپنا پاڑا چھوڑتا ہے۔ اپن یہ تم کو دیتا ہے۔ بولو منظور ہے؟"
سب حیرت سے اُسے گھورنے لگے۔ کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر یہ سناٹا بھنبھناہٹ میں بدل گیا اور شور ہونے لگا۔ "نامنظور ہے۔" ماہکی نے بول کے سب نے چلا کے اُس کی تائید کی۔
"پیرو ٹھیک ہے گا۔" جامو نے ترشی سے کہا۔ "پیرو کو تمھاری محبت سے اور تمھیں پیرو کی۔ تم نے پیرو کو کھو دیا تو تم نے سالا سب کھو دیا۔ اس

کو بچائے رکھنا۔ اپنی بات یاد رکھو۔"
"ابھی جامو بھائی مسخری کرتا ہے۔" پیرو ہنسنے لگا۔
پھر اُن میں سے ہر آدمی بڑھ چڑھ کے مشورے دینے لگا کہ پاڑوں کا انتظام کس طرح کیا جائے کہ آپس میں جھگڑے فساد کا امکان کم سے کم ہو جائے۔ ہر آدمی اپنی اپنی بولی بولنے لگا۔ ہم تینوں چپ چاپ سنتے رہے۔ انھوں نے طے کیا کہ پیرو جسے چاہے گا، اپنی مرضی سے پاڑے پر بٹھائے گا۔ اب چونکہ شہر کا بڑا حصہ ان پاڑوں پر مشتمل ہو گا اس لیے مختلف آدمیوں کو پاڑے تفویض کیے جائیں گے اور ان کی مدت مقرر نہیں ہوگی۔ ہر پاڑا اپنے دادا کے نام سے پکارا جائے گا لیکن ان کا نگران پیرو ہوگا اور یہ بات پولیس سے پوشیدہ رکھی جائے گی۔ ہر پاڑے سے آمدنی کا دسواں حصہ پیرو کے پاس آئے گا۔ پیرو اپنے پاس صرف ایک پاڑا رکھے گا۔ ہر مہینے کی کسی ایک تاریخ کو تمام پاڑوں کے دادا پیرو کے پاڑے میں جمع ہوں گے اور کوئی پریشانی یا شکایت ہوگی تو پیرو کے سامنے رکھ دیں گے۔ پیرو کے پاس تمام پاڑوں سے لیے ہوئے آدمیوں کا ایک خاص گروہ ہوگا جو کسی پاڑے کے دادا کی مخالفت پہ اُس کے سر پہ پہنچ جائے گا۔ اُن میں سے ہر آدمی کی حیثیت دادا کے برابر ہوگی۔ کسی پاڑے کی آمدنی کم ہے تو دسواں حصہ لیے بغیر معاف بھی کیا جا سکتا ہے بلکہ اپنی طرف سے اُس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ ضرورت پڑنے پہ پیرو کی منشا کے مطابق داداؤں کا تبادلہ بھی ہو سکے گا۔ ہر پاڑے میں چاقو زنی اٹھائی گیرے وغیرہ کا باقاعدہ انتظام ہو گا۔ آپس میں مقابلے ہوتے رہیں گے۔ اگر کوئی آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ دادا بننے کا اہل ہے تو اُسے سیدھے پیرو کے پاس آنا پڑے گا۔ پیرو اُس کے مقابلے کا انتظام کرے گا۔ جیتنے کی صورت میں آزمائشی طور پہ پہلے اُسے کوئی چھوٹا پاڑا دے دیا جائے گا۔ اگر اُس نے ٹھیک طرح پاڑا چلایا تو اُسے کسی بڑے پاڑے پہ منتقل کر دیا جائے گا۔ ہر پاڑا اپنے اپنے علاقے میں آزاد ہو گا۔ پیرو کی طرف سے محض مجبوری کے عالم میں دخل اندازی کی جائے گی۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جائے گی جو داداؤں کی آزادی میں حائل ہو، جس سے اُن میں بددلی پیدا ہو، اُن کی ہمت شکنی ہو، وہ خود کو پیرو کا غلام سمجھیں۔ پیرو کے خاص آدمیوں کے گروہ کا کوئی آدمی پیرو کی اجازت کے بغیر کسی پاڑے کے معاملات میں دخل نہیں دے گا۔ اس انتظام کی بنیاد یہ تھی کہ پاڑوں کے درمیان میل جول قائم رہے اور جو حال لگ گیا ہے، وہ آپس کے انتشار میں کھو نہ دیا جائے۔ چھیلا نے تجویز پیش کی کہ علاقے میں پھیلے ہوئے آدمیوں کے کام بھی طے کر دیے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ طاقت کے زعم میں بے لگام ہو جائیں اور جو کچھ اب تک نہیں ہوا ہے، وہ ہونے لگے اور تیواڑی کی طرح انھیں کسی بات کا خیال نہ رہے۔
وہ بار بار ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ جھل گردن جھکائے حقہ پینے میں مصروف تھا۔ جامو کے لبوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دلچسپی

سے اُن کی باتیں سن رہا تھا اور میرے سینے میں بلبلے اٹھ رہے تھے۔ جب وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں تو یقیناً انھیں تیواڑی کے معاملے میں اب کسی بڑی الجھن کا اندیشہ نہیں ہے اور جھل کی بات سچ ہے کہ اب جانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب میری آنکھیں سپنے یاں ہوں گی اور میں انھیں اُسی کے لیے وقف کر دوں گا۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اب اگر راستے میں کوئی رشتہ بھی نظر آئے تو میں نظریں چرا لوں گا، راستہ ہی بدل دوں گا۔
جب بہت دیر ہو گئی تو پیرو بھڑک اٹھا اور چیخ کر بولا۔ "بس سب ٹھیک ہے۔ جیسا تم بولتے ہو، وہی ہوئے گا۔ اگر اس مافک کام ٹھیک نئیں چلا تو تین مہینے بعد اپن سب لوٹ دے گا۔ سمجھا۔ اب اپنے منہ پہ تالا لگا دو۔ سالا یہ سوچ کر جھل بھائی جانے والا ہے۔ وہ جا کے اُدھر کیا بولے گا کہ تم لوگوں نے اُس کے ساتھ کیا کیا؟ ہم ادھر ٹائم کھوٹا کر رہا ہے۔"
پیرو انھیں برا بھلا کہتے اور گالیاں دینے لگا۔ اُس نے حکم دیا کہ فوراً ایک بڑے جشن کا انتظام کیا جائے۔ سارے شہر سے طوائفیں لائی جائیں اور تین دن تک ناچ رنگ کیا جائے۔ دوسرے علاقوں کے استادوں کو بھی مدعو کیا جائے اور دیگیں چڑھا دی جائیں۔
مگر جھل اس جشن کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ اُس نے سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ یہ موقع جشن منانے کا نہیں ہے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ جھل کے انکار سے اُن کے چہرے لٹک گئے۔ پیرو اداس ہو کے بیٹھ گیا۔ جھل نے اُسے سمجھایا کہ جشن کے اور بہت سے موقعے آئیں گے۔ جھل نے جیسے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میری خواہش بھی یہی تھی کہ وہ انکار کر دے۔ وہ نہ بولتا تو میں منع کر دیتا لیکن میرے کچھ کہنے کی نوبت نہیں آئی۔

جب میں اور جامو پاڑے سے باہر نکلے تو رات بہت گزر گئی تھی۔ میرے پیر زمین پہ ٹھیک نہیں پڑ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی اور ہلکی ہلکی پھوار نے اُسے گیلا کر دیا تھا۔ بس موجود نہیں تھی۔ ہم کچھ دور گئے ہوں گے کہ ایک آدمی بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ وہ چھیلا تھا۔ اُس نے بتایا کہ پیرو نے تجھے کل دوپہر پاڑے آنے کی ہدایت کی ہے۔ میں اُس سے وجہ پوچھنا چاہتا تھا مگر جامو میرا ہاتھ کھینچ کے آگے بڑھ گیا۔ میں ہر روز رات کو پاڑے جا ہی رہا تھا، پھر دوپہر کو خاص طور پر بلانے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ میں راستے بھر الجھا رہا۔ خاصی دیر کے بعد ہمیں ٹیکسی ملی۔ برسات کی وجہ سے ٹیکسی والے بھی سڑکوں سے بھاگ گئے تھے۔ جامو کا زخم ابھی ہرا تھا۔ پانی پڑنے سے بگڑ سکتا تھا۔ تاہم گھر سے کچھ فاصلے پہ ہمیں ٹیکسی چھوڑنی پڑی۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ میں نے جامو کا بازو اپنی اوٹ میں لے لیا لیکن چلنے کے دوران یہ ایک مشکل کام تھا۔ جیسے تیسے بھاگتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے۔ جولین نے فوراً دروازہ کھول

دیا۔ ڈرائنگ روم روشن تھا لیکن جولین کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ مجھے بھیگا ہوا دیکھ کے وہ جلدی سے تولیا لے آئی اور مجھے اس نے ایک پاؤڈر دی۔
"ارے جولی، تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟" جامو نے حیرت سے کہا۔ ڈرائنگ روم بے ترتیب پڑا تھا۔ جولین بھی کچھ بے ترتیب سی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اسے ساڑی کا ہوش نہیں تھا۔ جامو کے ٹوکنے پر اسے خیال آیا۔ اس نے جلدی سے انگلی سے اپنی ساڑی درست کی اور نظریں نیچی کر لیں۔ "تم نے تو کہہ دیا تھا کہ تمہیں دیر ہو سکتی ہے۔" جامو نے ندامت سے کہا۔ "بس اب تمہیں کچھ دنوں کی تکلیف اور ہے۔ ہم جلد ہی چلے جائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے تو نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ مختصر لہجے میں بولی۔ "آپ کپڑے بدل لیجیے جامو بھائی! بہت بھیگ گئے ہیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

"اب تم سو جاؤ۔ میں اس وقت چائے نہیں پیوں گا۔" جامو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں چند لمحوں تک وہیں کھڑا ہوا جولین کو دیکھتا رہا پھر میں بھی چلا آیا۔ کپڑے بدل کے میں کانپنے کے ساتھ بستر پر لیٹنے کے بجائے کرسی پر بیٹھ گیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں جولین کی آواز آئی۔ وہ مجھے باہر بلا رہی تھی۔ جامو نے فوراً چادر اوڑھ لی کیونکہ اس نے قمیص اتار دی تھی۔ میں باہر گیا تو جولین چائے لیے کھڑی تھی۔ میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ ٹرے اس کے ہاتھ میں لرز رہی تھی اور پیالیاں بج رہی تھیں۔ ٹرے لے کے میں اندر آ گیا۔ جب بھی یہاں سے جانے کی کوئی امید پیدا ہوتی تھی، مجھے جولین کا خیال آنے لگتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے جانے کا سن کے کتنی اداس ہو جائے گی۔ اب تو اس کا باپ بھی نہیں تھا اور نہ ہی کرشنا جی۔ ایک بوڑھی ماں تھی۔ دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ دور کے چند رشتے دار ہوں گے تو وہ اس ماحول میں واپس جانا نہیں چاہتی تھی، نہ ہی اس کا وہاں جانا مناسب تھا کیونکہ وہ ایک علیحدہ لڑکی تھی۔ جولین اس اکیلی زندگی سے بہت گھبرائے گی۔ ویسے بھی ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہے۔ اس کا دل بہت کمزور ہے۔ وہ مارٹی سے کتنا ڈرتی تھی۔ میں نے اس کے لیے مارٹی سے لڑائی مول لی، کرشنا جی نے اسے نئے مکان میں منتقل کر دیا اور اچھی ملازمت دلا دی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ خوش رہے، ہنستی رہے لیکن وہ روز بہ روز اداس ہوتی جاتی تھی۔ اس کا خیال میرے دماغ سے چپکا ہوا تھا۔ کرشنا جی نے میرے لیے بڑی دولت چھوڑی تھی مگر جولین اس سے بھی بڑی دولت تھی۔ اس کی خوب صورتی صرف چہرے تک محدود نہیں تھی۔ رات دن، صبح و شام وہ ہر وقت کرشنا جی کی طرح مجھے آرام پہنچانے کی جستجو میں لگی رہتی تھی۔ اب جانے کی کوئی صورت بندھی تو اسے اطلاع دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی حالانکہ میں اس سے بارہا کہہ چکا تھا کہ مجھے یہاں ٹھہرنا نہیں ہے۔ اسی لیے میں اس کے ساتھ گھر میں بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے بہت پہلے سے احساس تھا کہ اس کے ساتھ رہوں گا تو اسے اور پریشان کروں گا۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک مارٹی کے آزار سے نجات دلا دی کون سی بڑی بات تھی اور مارٹی بھی اس کے ساتھ مجھے دیکھ کے زیادہ تنگ کرنے لگا تھا ورنہ وہ اس سے پہلے بھی وہیں رہتی تھی۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں کسی کے لیے کر بھی کیا سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پیر تو ٹوٹے ہوئے تھے۔ میرا کام ان لوگوں کو دکھ پہنچانا رہ گیا تھا جو میرا خیال کرتے تھے۔

چائے پی کے جامو جلد ہی سو گیا۔ میں کرسی پر بیٹھا جاگتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ابھی تک جاگ رہی ہوگی۔ جامو نے میرے سامنے اس سے کہا تھا کہ وہ چند دن کا مہمان ہے۔ اس نے میری اور جمیل کی تمام گفتگو سنی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ سوچتی ہوگی کہ مجھے روکنے کا اسے کیا حق پہنچتا ہے۔ وہ بہت سی باتیں سوچ رہی ہوگی مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ جو میرے بس میں نہیں ہے، وہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ کیا میں جولین جیسی بے سہارا لڑکی کو سہارا دینے کے لیے بمبئی میں ٹھہر جاؤں؟ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ ہم دونوں بہت سکون سے رہیں گے۔ بمبئی میں جی نہ لگا تو کہیں اور چلے جائیں گے مگر پھر جولین تو میرے ساتھ رہے گی مگر میں خود کس کے ساتھ رہوں گا؟ میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں رہوں گا ورنہ پھر میں زرین کے پاس سے کیوں چلا آیا تھا؟ میں نے جمیل سے کیوں فرار اختیار کیا اور جیل سے نکلنے کے بعد اس کی تلاش میں کیوں نکل کھڑا ہوا؟

بہتر ہے کہ میں اسے جلد کے بتا دوں جولی! اچھی جولی! مجھے بہت کام ہے۔ تم خود اپنے بارے میں کچھ سوچو۔ کسی نہ کسی دن تو مجھے اس سے یہ بات کرنی ہی ہے۔ فرض کرو، میں نہ ہوتا اور اس کا باپ بھی مر گیا ہوتا اور کرشنا جی بھی نہ ہوتے تو وہ کیا کرتی۔ دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ بے سہارا ہیں اور میں کس شمار و قطار میں ہوں۔ میں کرسی سے اٹھ گیا اور بغلی راہداری سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ جولین صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میری آہٹ پر وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ اس نے ساڑی کے پلو سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ خشک کیا اور پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ "تم رو رہی ہو؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔ اس کے بدن میں ارتعاش سا ہوا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی گردن کچھ اور جھک گئی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ "جولین!" چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے اسے پکارا۔ اس نے کسمسا کے ایک ثانیے کے لیے نگاہیں اٹھائیں اور اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے اس سے بات کرنے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔ اس وقت

شاید وہ مجھ سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی اور نہ شاید وہ کچھ سننا چاہتی تھی چنانچہ میں نے سکوت اختیار کر لیا مگر یہ خاموشی نہ بولنے سے زیادہ بری تھی۔ "جولین!" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں اسے پھر مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا تاکہ کہیں میری زبان نہ رک جائے۔ "مجھے اب چند دنوں میں یہاں سے جانا ہے۔" اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس اطلاع سے دکھ ہوگا۔" میری آواز بھی بھرانے لگی۔

"میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا ہے مگر میری عقل کام نہیں کرتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ جولین! میں رک نہیں سکتا اور نہ تمہیں اس طرح تنہا چھوڑ کے جانے کو جی چاہتا ہے۔ تمہی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟"

وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ "مت رو، مت روؤ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم بہت اچھی ہو جولین! یقین کرو، میں تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ تمہیں خوش دیکھ سکوں اور تمہارے لیے خوشی مہیا کر سکوں مگر جو چیز میرے پاس نہیں ہے، وہ میں کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ شاید تمہیں میرے متعلق پہلے سے کچھ معلوم ہو گیا ہو یا جامو اور کمال نے تمہیں باتوں باتوں میں کچھ بتا دیا ہو لیکن جو کچھ انھوں نے تمہیں بتایا ہوگا یا تم نے خود اندازہ کیا ہوگا، وہ بہت کم ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھنا مت۔ بس میں تم سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے جانا ہے اور مجھے نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔ تم ایک ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے کہ میں تمہیں وہاں لے جاؤں اور پھر تمہارے سامنے ایک بڑی زندگی پڑی ہے۔ فیض آباد میں ایک لڑکی زرین رہتی ہے۔ مجھے خیال آیا تھا کہ میں تمہیں وہیں پہنچا دوں۔ وہ بھی تمہاری طرح بہت اچھی اور تنہا ہے۔ تمہاری تو ماں بھی ہے، اس کا کوئی نہیں ہے۔ ایک بڑی حویلی میں رہتی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے سے مل کر تو بہت خوش ہوتیں۔ تم وہاں ملازمت بھی کر سکتی ہو اور تعلیم بھی جاری رکھ سکتی ہو مگر جب میں نے سوچا تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اس طرح کوئی کسی کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ شاید تم بھی اسے پسند نہ کرو۔ جولین! کرشنا جی نے میرے نام بہت بڑی رقم چھوڑی ہے۔ وہ رقم میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ تم اس رقم میں سے جو چاہو لے لو یا سب اپنے پاس رکھو۔ پھر تم ایک بہت اچھا گھر بنا سکتی ہو، ملازم رکھ سکتی ہو اور ملازمت چھوڑ کے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہو۔ تم چاہو تو اپنی ماں کا کہیں انتظام کر کے ہوسٹل میں بھی رہ سکتی ہو، ولایت بھی جا سکتی ہو۔ اس رقم سے تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ خبر ہے کتنی رقم ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کے پوچھا۔ اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے۔

میں گھبرا گیا۔ "ساڑھے آٹھ لاکھ کے قریب۔"

اس نے اپنی بھیگی لرزتی ہوئی پلکیں اٹھائیں اور اپنا منہ چھپا لیا۔

"تم نے سنا، کرشنا جی مجھے کیا سمجھتے تھے۔" میری آواز بھیگنے لگی۔ "میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا۔ اس لیے کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ وہ رقم بینک میں محفوظ ہے۔ میں نے اس میں سے ایک پائی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ کرشنا جی نے نہ جانے کیوں اسے میرے نام کر دیا تھا۔ تم اس قدر رو کیوں رہی ہو؟ جولین! میری باتوں کا جواب دو۔" میں نے وحشت سے کہا۔ "رونا بند کرو۔ مجھے بھی رونا آ رہا ہے۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا دیے۔ وہ نڈھال ہو کے میرے سینے پر گر پڑی۔ میری سانس بند ہونے لگی اور جسم سن ہو گیا۔ میرے ہاتھ پتھر کے ہو گئے۔ جولین میرے سینے پر سسک رہی تھی۔ میں دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ پھر میری سانس پھولنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ اسے خوب زور سے گلے لگا لوں، خوب پیار کروں اور کہہ دوں کہ میں نہیں جاؤں گا، میں نہیں جاؤں گا لیکن میری زبان اور ہاتھوں پہ سخت پہرہ داری ہو گیا تھا۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کس طرح ڈر کے جولین کے بازو میرے ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ میں نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ "مت رو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ میری بلند آواز سے گھر میں کوئی بھی جاگ سکتا ہے۔ جولین خود ہی سنبھل گئی۔ "میری بات سنو جولین! میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ درست سمجھو کہ مجھے تمہاری فکر نہیں ہے لیکن تم ... تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہیں کون روک سکتا ہے۔" وہ سسکتی ہوئی بولی۔

"اس طرح مت کہو۔ میں رک جاؤں تو تمہیں پریشان ہی کرتا رہوں گا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "نہ خود چین سے بیٹھوں گا، نہ تمہیں چین لینے دوں گا۔ میں ہر لمحہ تمہیں رلاتا رہوں گا۔ اب تک تم نے رونے ہی کیا ہے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یہاں رہ کے میں نے تمہیں کیا دیا۔ اب میرے پاس اور ہے بھی کیا۔ میں تو کب کا چلا جاتا۔ ایک کام نے روکے رکھا لیکن اب میں ایک طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں۔ سمجھ لو، کرشنا جی نے مجھے کچھ کام سونپا تھا۔ وہ اب ختم ہو چکا ہے۔" وہ حیرت سے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔

"لیکن میں تمہاری جانب سے فکر مند ہوں جولی! میں نے تمہارے سامنے کئی باتیں رکھی ہیں۔ تم اپنے لیے جو بات مناسب سمجھو، مجھے بتا دو۔ میرا خیال ہے تم ایک نیا مکان لے لو۔ یہ پیسے آخر کس کام آئیں گے۔"

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔" وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیوں نہیں چاہئیں؟ کرشنا جی تمہیں بھی اتنا ہی عزیز رکھتے تھے جتنا مجھے۔ ان کے پیسوں پر تمہارا بھی حق ہے اور اب تو یہ میرے پیسے ہیں۔ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ تمہارے دل میں کچھ اور خیال آ رہا ہے

کیا؟" نہیں۔۔۔۔ نہیں اسے دل سے نکال دو۔ میں یہ بات تم پر ترس کھا کے تمھیں عزت مند سمجھ کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تم خوش رہو، سمجھیں۔"

"تم چلے جاؤ" وہ سسکتی ہوئی بولی۔

"مگر تمھارا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں زندہ رہ لوں گی" اس کی زبان ڈگمگا رہی تھی۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہ کچھ تو سوچنا پڑے گا" اس کی ٹھٹھری ہوئی آواز ابھری۔ "زندہ رہنا ہے۔"

"ہاں جولین! میری اچھی جولین! کچھ نہ کچھ ضرور سوچو۔ میں تمھیں اپنے ساتھ لے چلتا مگر میری کوئی منزل کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اگر خدا نے میری بات سن لی تو میں کبھی ضرور واپس آؤں گا۔ یہاں میں مارٹی سے کہہ دوں گا۔ وہ میری عدم موجودگی میں تمھارا خیال رکھے گا اور میں تمھیں چند ایسے نام بتا کے جاؤں گا کہ جب بھی میرا نام لے کے تم ان سے ملو گی اور تمھیں کوئی پریشانی ہوگی تو وہ فوراً حاضر ہو جائیں گے۔ وہ میرے نام کا اتنا پاس ضرور رکھیں گے۔ وقت پڑا تو وہ تمھارے لیے جان بھی لڑا سکتے ہیں۔ جولین! تم یہ بھی تو سمجھ سکتی ہو کہ میں مر گیا ہوں۔ کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ کرشنا جی کو جو چاہتے تھے کیا وہ سب مجھے مل جاتے ہیں؟"

جولین مُہت بنی بیٹھی تھی۔ وہ نہ میری طرف دیکھ رہی تھی نہ رو رہی تھی۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ گیلے رخساروں پر لیمپ کی پیلی روشنی رینگ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بار بار تھرتھرانے لگتے تھے۔

"تم بولتی کیوں نہیں؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"کچھ تو ضرور سوچ رہی ہوگی؟"

"وہ گم صم بیٹھی رہی۔" میں بھی سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔ باہر مسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ پرنالے گرنے کا شور اندر تک گونج رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی کبھی مدھم پڑ جاتی تھی کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ شاید بجلی جانے والی تھی۔ جب دیر ہو گئی اور اس کے بدن کی کوئی آہٹ نہیں ابھری تو میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔ جولین کا بدن ساکت تھا۔ صرف سینہ متحرک تھا۔ صبح تک میں یوں ہی بیٹھا رہا۔ وہ بھی بیٹھی رہی۔ صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔ دودھ والے نے آواز لگائی تو وہ چونک پڑی۔ گھبرا کے اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکی۔

نماز کے لیے چچا کے اٹھنے سے پہلے میں اندر چلا آیا۔

صبح بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ میں اپنے کمرے ہی میں پڑا رہا۔ مجیب

آٹھ بجے میں نے منع کر دیا کہ میرا جی ناشتہ کو نہیں کر رہا ہے۔ پھر کافی اصرار کر کے مجھے ناشتے کی میز پر لے آیا۔ میری نظریں جولین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ ناشتہ کر کے میں کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گیا اور سڑکوں پر گھومتا رہا۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک۔ ایک چوک سے دوسرا چوک۔ بار بار مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جولین میرے پہلو میں چل رہی ہو اور مجھے پیچھے سے آوازیں دے رہی ہو۔ راستے میں کئی بار میں نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا کہ نہ جانے جولین کی طبیعت کیسی ہو لیکن میں آگے ہی بڑھتا رہا۔

جولین کو کیا اندازہ تھا کہ کوئی اس سے بھی زیادہ تنہا ہو سکتا ہے۔ اس کا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اس سے تو سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ دشمن جگہ جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ مولوی محمد شفیق نے نہ جانے کب تک ساتھ دیا ہوگا۔ کوئی جولین سے اس طرح نہیں بچھڑ گیا تھا جس طرح اس سے بچھڑا۔ کسی نے اس کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ اس پر وقت کی گرد پڑ جائے۔ وہ تو میرے دل میں روز بہ روز روشن ہو رہی تھی۔ جولین کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے سینے میں کیسی جلن ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ سر سے پاؤں تک اپنے جسم میں چاقو کھینچ دوں۔

فٹ پاتھوں پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی بارش بند ہوئی لوگ چیونٹیوں کی طرح سڑکوں پر آن پہنچے ——— بھیڑ زیادہ ہوتی تھی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا کہ کہیں نگاہ چوک نہ جائے۔ راہ گیر تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے کیونکہ ابھی تک آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں وہاں تک جانا چاہتا تھا جہاں تک آدمی نظر آتے ہیں۔ کسی دن انھی آدمیوں کے درمیان وہ مجھے مل جائے گی۔ میں نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا۔ دھوپ نکل آئی تو مجھے یاد آیا کہ پیرو نے آج دوپہر مجھے آنے کی ہدایت کی تھی۔ جب میں اڈے پہنچا تو مجھے کچھ سکون تھا کہ میں نے صبح سے اب تک کا وقت ضائع نہیں کیا ہے۔ پیرو میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اور مجھل نے اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے "لاڈلے بھائی! اتنی دیر کر دی!" وہ مجھے دیکھتے ہی چلایا "اب چل، جلدی چل۔"

"کہاں چلنا ہے؟" میں نے اداسی سے پوچھا۔

"پیٹ پوچھو اپن نے مجھل بھائی کو بھی نہیں بولا ہے۔"

"چلو" میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ دونوں تیار ہی بیٹھے تھے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں کے سوا کوئی اور آدمی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ علاقے میں کچھ دور پیدل چل کے پیرو نے ایک ٹیکسی روک لی۔ چند منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک بڑے جنرل اسٹور کے سامنے رک گیا اور ادھر ادھر دیکھ کے باہر ہی کھڑے کھڑے اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو اشارہ کیا۔ اس کے اشارے کی دیر تھی۔ ایک آدمی لپکتا ہوا اسٹور سے باہر آیا اور اس نے پیرو کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھما دیا۔ اسٹور کے برابر ہی گیراج

تھا۔ پیرو نے وہاں سے ایک موٹر نکال لی۔ وہ خود اسے چلا رہا تھا۔ آگے نشست پر مجھل اور پچھلی پر میں بیٹھ گیا۔ موٹر کی رفتار تیز تھی۔ پیرو ایک لمبا راستہ عبور کرتا ہوا ایسے علاقے میں داخل ہو گیا جہاں اونچے اونچے مکانات تھے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اب میری کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ پیرو ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد موٹر ایک سبز پوش آہنی پھاٹک کے پاس رک گئی۔ ہارن کی آواز پر کسی تاخیر کے بغیر دروازہ کھلا اور موٹر اندر داخل ہو گئی۔ چوکیدار نے پیرو کو جھک کے سلام کیا۔ وہ ایک بہت بڑی کوٹھی تھی۔ عمارت کے سامنے میدان میں سبزہ بچھا ہوا تھا۔ پیرو نے پورٹیکو میں موٹر کا انجن بند کر دیا۔ مجھل اسے متجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ مجھل بھائی!" وہ مجھل کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا "بائی سے ملنے اندر آؤ۔"

"یہ تم کہاں لے آئے پیرو دادا؟" مجھل نے مسکرا کے پوچھا۔

"مجھل بھائی! اپن کسی کو آج تک یہاں نہیں لایا۔ باڑے کے صرف ایک آدمیوں کو پتہ ہے کہ اپن ہفتے میں ایک بار کہاں جاتا ہے تا بھی وہ نہیں بتا رہا تھا کہ اندر سے ایک خوش لباس جوان عورت برآمد ہوئی۔ اے اودھیڑ کہنا غلط ہوگا۔ اس کا قد جولین کی طرح لانبا، رنگ سرخ و سفید، جسم متوازن اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کے وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ "مجھل بھائی! پہچانو، کون ہے؟" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

مجھل چند لمحے سوچتا رہا پھر پرسکون آواز میں بولا "بھابی!"

"واہ مجھل بھائی!" وہ اچھل پڑا "تم نے کیسے جانا؟"

"تم دونوں کی آنکھوں سے۔"

عورت نے دونوں ہاتھ جوڑ کے پہلے مجھل کو نمسکار کیا پھر مجھے۔ "رانی! یہ پیرو سنت بناتی ہوئی آواز میں بولا "اپن کا مجھل بھائی اور لاڈلا بھائی۔" پیرو نے ایک ہی سانس میں ہمارے متعلق نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ رانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے ہمیں اندر چلنے کے لیے کہا اور ایک سجے ہوئے کمرے میں لے آئی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور دیوار گیر تصویریں آویزاں تھیں۔ صوفے لگے ہوئے تھے۔ رانی شائستگی سے ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے بندے لٹکے ہوئے تھے اور گلے میں پتلا سا ایک ہی گلو بند، گلے میں ہیروں کی مالا کی طرح موتیوں کی مالا پڑی تھی۔ جوڑا بندھا ہوا تھا اور چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے پیرو دادا؟" مجھل نے مضطرب ہو کے سرگوشی کی۔

"بس مجھل بھائی!" پیرو کھل کھلانے لگا "اپن نے تم کو نہیں بولا تھا۔ یہ بھی اپن کا پاپ ہے۔ ابھی مجھل بھائی! اپن نے سوچا تم سے کوئی پردہ ہو گیا تو اپن کو بعد میں بہت خواری ہوگا۔ سالا ٹائم ہی نہیں ملا۔ اپن تم کو بہت پہلے ادھر لے آتا اور یہیں بچھڑنے کو بولتا۔ یہ مرو سالا چھپڑا جواری جو اُدھر چلا آ رہا تھا یا اپن کا رانی ہے مجھل بھائی!" وہ ہنکی ہوئی آواز

میں بولا "ابھی مجھل بھائی کی خاطری کر دو رانی! اپن کو آنے میں دیر ہو گئی۔ بابی گھر میں بچے لے آؤ اور وہ۔۔۔۔ وہ پیرو کا بچی بلاؤ کیسا کیسا ہے! اُسے بولو چاچا مجھل آیا ہے۔ جلدی آؤ۔ بولو دیکھو کون آیا ہے۔"

پیرو کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رانی اٹھ کے اندر چلی گئی۔ پیرو بہت خوش تھا۔ اس نے وہی داستان مجھل کو سنانی شروع کر دی جو چند دن پہلے سرسری انداز میں مجھ سے بیان کر چکا تھا۔ مجھل اشتیاق اور تعجب سے سنتا رہا "اپن اس کو بالکل یقین دلا سکتا ہے مجھل بھائی! رانی کو پتہ ہے کہ اپن کہاں رہتا ہے پر چھوکری کچھ نہیں جانتا۔ سالا اپن بہت اچھا لگتا ہے مجھل بھائی! ایک دم سونمبر ہے۔ وہ اس کو سمجھاتا ہے کبھی ایک بات کہتا ہے کہ بس ایسا ہی ہے، ادھر واپس نہ جاتے۔ پیرا اپن کیا کرے تم جانتا ہے مجھل بھائی! اچھا تو سالا ایک بار ہاتھ کو جھٹکا مارا ہے تو پیچھا نہیں چھوڑتا۔" پیرو اداسی سے بولا۔ وہ بتانے لگا کہ اسے لوگوں کی نظروں سے دور رکھنے میں کتنی مشکل پیش آتی ہے اور اس کی بیوی نے کسی موقع پر اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے کبھی اپنے ماں باپ کا نام نہیں لیا۔ اسی وقت دروازے سے چوڑیاں کھنکیں۔ پیرو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اس نے درمیان میں ہی آنے والی لڑکی کو جھپٹ کے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اس کی پیشانی پر اور ہاتھ چومنے لگا۔ "مہارانی بابا!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا "کیسا ہے تم!"

جب پیرو سامنے سے ہٹا اور اس کا ہاتھ تھامے مجھے ہمارے پاس لایا تو میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پیرو نے اس کے بارے میں جو کچھ مجھ سے کہا تھا، وہ بہت کم تھا۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اس کے گالوں سے خون چھلک رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے رنگ روپ پر گئی تھی۔ وہی قد، وہی نقوش، وہی سیاہ بال اور بڑی آنکھیں۔ وہ دونوں چھوٹی بڑی بہنیں معلوم ہوتی تھیں "چاچا کو نمستے بولو" پیرو نے اسے ٹوکا۔ لڑکی نے آگے آ کے مجھل کے پیر چھو لیے۔ مجھل نے کھڑے ہو کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ مجھل کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ "جیتی رہو" وہ بھاری آواز میں بولا "پیرو! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں خالی ہاتھ گھر آ گیا۔" مجھل نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے تاراضی سے کہا اور جتنے نوٹ اس کی جیب میں تھے۔ اس نے نکال کے لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیے۔ لڑکی تامل ہوا تو پیرو نے اسے ڈپٹ دیا۔ اس نے دوبارہ مجھل کو پرنام کیا "اور یہ لاڈلا بھائی" پیرو نے اسے میری طرف متوجہ کیا "لاڈلا! یہ اپن کی گڑیا ہے۔" اس کے لہجے میں لرزش تھی "یہ اپن کا مہارانی ہے۔ اپن اس کا غلام ہے۔"

"پتا جی! گیتا نگاری سے بولی "پھر آپ نے!"

"اوہ!" پیرو ہنس کے بولا "اپن بھول گیا۔ یہ گیتا اپن کا بیٹی ہے لاڈلا! اپن اس کا باپ نہیں غلام نہیں۔ اپن کا بہت پیارا بیٹی ہے۔"

پیرو نے اُسے اپنے اور تجمل کے درمیان بٹھا لیا۔ "تجمل بھائی! ابھی تمہارا بھتیجی نے گیارہویں درجہ پاس کیا ہے۔ فٹ فٹ ولایتی بولتی ہے۔ اپن کا جان ہے۔" وہ گیتا کو اپنے بازو میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

گیتا کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ وہ ڈھیلی موری کا پاجامہ اور کرتا پہنے ہوئے تھی۔ چھپا ہوا دوپٹا گلے میں پڑا تھا۔ وہ شرمائی شرمائی سی تھی۔

"چاچا تجمل کہاں سے آئے ہیں؟" اُس نے جھجکتے ہوئے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"چاچا کلکتے سے آیا ہے بیٹا!" پیرو نے ایسے لہجے میں اُسے جواب دیا جیسے گیتا چھوٹی سی بچی ہو۔ وہ کن انکھیوں سے ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

"تو یہ یہاں کیوں نہیں ٹھہرے؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"کیا بولے بیٹا! چاچا کو جانے کا جلدی ہے۔ اپن نے بہت مغز مارا۔ اب تم بول کے دیکھو۔ چاچا اپنی بھتیجی کی بات نہیں ٹالیں گا۔"

"پھر آئیں گے بیٹا!" تجمل نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چاچا کلکتے میں کیا کرتے ہیں؟"

"چاچا..." پیرو ہکلانے لگا۔ "چاچا کا اودر بڑا کاروبار ہے۔"

"کیا کاروبار ہے!" وہ تجسس سے بولی۔

پیرو نے تذبذب سے تجمل کو دیکھا۔ "ابھی تم چاچا سے ملنے کلکتے جائیں گا نا، تو دیکھنا۔" پیرو اٹک اٹک کے بولا۔ "یہ بہت سوال کرتا ہے تجمل بھائی!"

"ہاں تم اُدھر آنا تو خود دیکھ لینا۔" تجمل نے سانس بھر کے کہا۔

"تم اُودھر جا کے ماں سے بولو کہ جلدی کھانا دلو۔ ایک دم جلدی آجی۔" وہ گیتا کے کان مروڑتے ہوئے بولا اور ابھی وہ اٹھی بھی نہیں تھی کہ اُس سے پوچھنے لگا۔ "واپس آگیا؟"

"آگئی۔" وہ پیرو کے سامنے سیدھی کھڑی ہو گئی اور چھن چھن ہنسنے لگی۔

"دیکھا تم نے تجمل بھائی اکتا شریر ہے یہ۔" پیرو نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کے اُس کے چہرے کی طرف کیے اور غصہ کر کے اُسے ڈرانے لگا۔ وہ اُچھلتی بھاگتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ پیرو تجمل سے اُسی کی باتیں کرنے لگا کہ وہ کتنی ذہین، کتنی شوخ اور کتنی سعادت مند لڑکی ہے۔ تجمل اپنا بھاری سر ہلاتا رہا۔

چند ہی لمحوں میں وہ واپس آگئی۔ "رانی جی کہتی ہیں ابھی دیر ہے، صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" وہ سامنے کرسی پر جم کے بیٹھ گئی۔

"دیکھا دیکھا تجمل بھائی! کیا کیا بات اس کو پتہ ہے۔" پیرو ہنستے ہوئے بولا۔ "ابھی اتنا چھوٹا عمر میں یہ ایسا بڑی بڑی باتیں بولتا ہے۔"

ایک بوڑھی ملازمہ نے میز پر پھلوں کا شربت اور مٹھائیاں لا کے رکھ دیں۔ گیتا نے گلاس بھرے۔ تجمل کو گلاس دینے کے بعد وہ میرے پاس آئی۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو اُس نے نظریں نیچی کر لیں۔ گیتا جب مجھ سے جدا ہوئی تھی، اُس سے خاصی چھوٹی تھی لیکن وہ مجھے بہت بڑی معلوم ہوتی تھی اور جب میں اُسے گھر سے لے کے آیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اچانک میری عمر ڈھل گئی ہے۔ میرے کو گلاس دینے کے بعد وہ اپنی جگہ جا کے بیٹھ گئی مگر اب وہ بار بار میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس نے میرے بارے میں پیرو سے کچھ نہیں پوچھا تھا اور نہ پیرو نے میرے نام کے سوا اُسے کچھ بتایا تھا۔ اُس کے پیر تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور وہ اپنے دوپٹے کی چُنٹیں کھول رہی تھی۔ پھر پیرو کو خود ہی خیال آگیا یا شاید اُس نے محسوس کر لیا کہ گیتا میرے متعلق کچھ جاننا چاہتی ہے۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم دونوں چپ بیٹھے تھے۔ "گیتا تم راجا سے نہیں ملا۔ یہ راجا ہے۔ راجا تجمل بھائی کا..." وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "تجمل بھائی کا بیٹا ہے۔ راجا اپن کا تجمل بھائی کے مافک ایک دم فس کلاس ہے۔ تم اس سے بات بولو۔ ارے تم دونوں چپ کیوں بیٹھا ہے؟" وہ ہم دونوں کو ڈانٹنے لگا۔ "بولو، بولو راجا! یہ تمہارا گھر ہے۔ ابھی تم گھوم پھر کے آؤ۔ راجا کو باغ کا سیر کراؤ۔ راجا! گیتا پھولوں کا عاشق ہے۔ سالا پچھواڑے ایک سے ایک پھول لگا رکھا ہے۔ کالا، پیلا، نیلا۔"

"آپ پڑھتے ہیں؟" گیتا نے ہچکچاہٹ سے پوچھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"پڑھ چکے ہیں؟" وہ سمٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کہاں تک؟" اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تھوڑا بہت۔"

گیتا میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن بات اُس کے ہونٹوں پہ آتے آتے رہ گئی۔ پیرو نے اُسے دوبارہ ٹوکا۔ وہ کسمساتی ہوئی اٹھی اور اضطراری نظروں سے میری جانب دیکھ کے بولی۔ "آئیے۔" اُس کا لہجہ شرمیلا تھا۔

مجھے اُس کا ساتھ عجیب سا معلوم ہوا۔ میں منع کر دینا چاہتا تھا مگر گیتا کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کوٹھی کے پچھلے حصے میں لے آئی۔ یہ چمن تھا۔ بڑے سلیقے سے باغ کیا ہوا تھا۔ یہاں ہر طرف ہریالی تھی اور قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چمن کے ایک کونے میں چھوٹا سا تالاب تھا۔ اس میں سفید بطخیں تیر رہی تھیں۔ گو چمن کا رقبہ زیادہ نہیں تھا مگر پودے بہت سلیقے سے لگائے گئے تھے۔ سارا منظر بہت پیارا تھا۔ فرصت ہو تو آدمی کرسی ڈال کے بیٹھ جائے اور سوچتا رہے۔ گیتا کی پھولوں سے دلچسپی کے بارے میں پیرو نے بالکل سچ کہا تھا۔ مجھے اس کی تعریف میں کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ میں چپ

چاپ اُس کے ساتھ گھومتا رہا۔ "آئیے یہاں بیٹھ جائیے۔" اُس نے پتھر کی ایک بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کی ہدایت پہ عمل کیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔ "آپ کلکتے میں رہتے ہیں؟" اچانک اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے بے سوچے سمجھے جواب دیا۔

"پھر... پھر آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"میں بس ایسے ہی شہروں شہروں گھومتا رہتا ہوں۔"

"اچھا!" وہ تذبذب سے بولی۔ "آپ کا کام ہی ایسا ہو گا؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔"

"آپ کو پھولوں سے شوق نہیں ہے؟" کچھ توقف کے بعد اُس نے پوچھا۔

"ہے۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"مجھے تو بہت ہی شوق ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔ "آپ کو چمن پسند آیا؟"

"بہت اچھا ہے۔"

"آپ ایک مہینے پہلے آتے تو دیکھتے۔ پتے نظر نہیں آتے تھے۔"

"جی۔" میں نے ہنکاری بھری۔

اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ "آپ... آپ کی طبیعت کیا خراب ہے؟"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کیا آپ ہمیشہ اتنا ہی بولتے ہیں؟"

"جی۔!" میں نے گھبرا کے کہا۔ "کیا میں نے آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا؟"

"دیا تو مگر... مگر آپ نے اپنی طرف سے کوئی بھی بات نہیں کی۔" وہ تیزی سے بولی۔ "کیا آپ پتاجی اور تجمل چاچا سے بھی بس اتنی ہی باتیں کرتے ہیں؟"

"مجھے زیادہ بولنا نہیں آتا۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"پھر آپ کو کیا آتا ہے؟" وہ چہک کے بولی۔

"زیادہ سننا۔"

"میں بھی یہی کوشش کرتی ہوں مگر میری زبان نہیں رکتی۔ ماتاجی کہتی ہیں کہ کم بولنا، کم کھانا دونوں تن درستی کے لیے ضروری ہیں۔"

"آپ کی ماں سچ کہتی ہیں لیکن وہ ایک بات کہنا شاید بھول گئیں۔ کم سوچنا بھی تن درستی کے لیے مفید ہوتا ہے۔"

"اچھا!" وہ تعجب سے بولی۔ "میں اُن سے پوچھوں گی کہ انہوں نے یہ کیوں نہیں بتایا۔ کیا آپ سوچتے بھی کم ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"پھر بھی آپ کی... آپ کی صحت بہت اچھی ہے۔"

"اور آپ کی بھی بہت اچھی ہے۔"

اُس کے لبوں پہ مسکراہٹ چھلک پڑی۔ "مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"کیا بتاؤں؟"

"کچھ بھی یہی کہ آپ کے بہن بھائی کتنے ہیں؟"

"اب تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میری آواز گلے میں پھنس گئی۔

"اب تو سے کیا مطلب؟ یعنی..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں اب کوئی بھی نہیں ہے۔"

"تو آپ چاچا کے اکیلے بیٹے ہیں!"

"ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔

"اور کوئی بھی نہیں ہے؟"

"نہیں کوئی بھی نہیں ہے۔"

"آپ کی ماتاجی!"

"وہ بھی نہیں ہیں۔"

اُس کی پلکیں پھڑکنے لگیں۔ "پھر تو آپ بہت تنہائی محسوس کرتے ہوں گے؟"

"ہاں۔" میں نے تندی سے کہا۔ "چلیے اندر چلیں۔"

"چلیے۔" وہ افسردگی سے بولی۔ ہم آٹھ ہی رہے تھے کہ ملازم نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ کھانے کا کمرہ دوسرا تھا۔ ایک بڑی میز کے اطراف کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پیرو، تجمل اور رانی تخت پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دو ملازم موجود تھے اور وہ اندر سے سامان لا کے تخت پر رکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی پیرو چلانے لگا۔ اُس نے اپنے ایک طرف گیتا کو اور دوسری طرف مجھے بٹھا لیا اور مجھ سے چمن کا حال پوچھنے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے پیرو چمن کے بارے میں کم اور گیتا کے بارے میں زیادہ پوچھ رہا ہے اور مجھے جتا رہا ہے کہ اُس نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی تھی۔ گیتا سچ مچ کی طرح خوب صورت تھی۔ میرے دل میں آیا کہ یہ بات بتا دوں کہ چمن اور گیتا دونوں مجھے اچھے لگے۔ مگر میں نے لفظ سنبھل سنبھل کے ادا کیے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب لوگوں سے کم بات کیا کروں گا اور دوسروں کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔ میرے اختصار کے باوجود پیرو بہت خوش ہوا۔

گیتا کی ماں رانی کے آنے کے بعد ہم نے کھانا شروع کر دیا۔ اہتمام زیادہ نہیں تھا لیکن کھانا لذیذ بے حد تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ سب کچھ اتنے کم وقت میں تیار ہو گیا تھا۔ "یہ کچھ کھا ہی نہیں رہے ہیں۔" گیتا کی ماں نے پیرو سے میری شکایت کی۔

"یار راجا مہمان بنا ہے تجمل بھائی!" پیرو ہنس کے مجھے پر زور سے کہنی مارتے ہوئے بولا۔ "کھا راجا خوب کھا۔" رانی نے جھجکتے ہوئے مرغ کا ڈونگا میرے آگے کر دیا۔ پیرو نے میری پلیٹ میں مسلّم مرغ لوٹ دیا اور

گپتا نے جلیبی بکھیر دی۔ کھانے کے دوران میں پیرو ہی زیادہ باتیں کرتا رہا۔ گپتا نے ایک بار پھر مچل سے کہا کہ وہ چند دن کے لیے یہاں ٹھہر جائے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں مچل آمادہ نہ ہو جائے لیکن اس نے گپتا سے معذرت کر لی۔ رانی اپنی کمی ہوئی ابھی ہوئی آواز میں بار بار مجھے ٹوکتی تھی۔ جب بھی میں نے سر اٹھایا، اُسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ بھی پیرو کے مانند بہت پُرجوش تھی جیسے ہم اس کے رشتے دار ہوں اور بہت دن بعد اس کے ہاں آئے ہوں۔ جو تھوڑی بہت اجنبیت باقی تھی، وہ کھانے کے دوران میں ختم ہو گئی۔ چلتے وقت رانی نے مجھے ایک سو ایک روپے دیے۔ ہم ایک بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہوئے۔ وہ دونوں دروازے تک ہمیں پہنچانے آئیں اور اصرار کرنے لگیں کہ جانے سے پہلے ہم ایک بار اور ان کے گھر آئیں۔ گپتا نے مجھ سے کہا کہ اگر میں کسی دن شام کو آ جاؤں تو وہ مجھے اپنی موٹر میں بمبئی کی سیر کرائے گی۔ میں نے ڈھیل ہل یقین وعدہ کر لیا۔ پیرو نے جنرل اسٹور کے گیراج میں گاڑی کھڑی کی اور اسی طرح پلٹ کے واپس آ گیا جس طرح گیا تھا۔ وہاں پہنچ کے پتہ چلا کہ پولیس افسران کی ایک جماعت پیرو سے بات کرنے کے لیے آئی تھی۔ اس کے آدمیوں نے کہہ دیا کہ پیرو شام کو مل سکتا ہے۔ پولیس کے ذکر سے میرے کان کھڑے ہوئے۔ علاقے میں ابھی تک پولیس کا زور کم نہیں ہوا تھا۔ پیرو ایک دن گزار کے واپس آ چکا تھا لیکن اس کی واپسی اس کے بری الذمہ ہونے کی دلیل نہیں تھی۔ پولیس کا پھر اس طرف آنا بے مقصد نہیں ہو گا۔ انھوں نے متعدد بار اڈے کی تلاشی لی تھی اور مختلف لوگوں کو گرفتار کیا تھا لیکن نہ اڈے سے انھیں کچھ حاصل ہوا، نہ گرفتار ہونے والوں نے کچھ بتایا۔ شاید یہ تیواری کے کسی خاص آدمی نے انھیں پھر پیرو کو ٹٹولنے پر اکسایا ہو گا یا کوئی اور بات ہو گی۔ ادھر مچل اور ماموں واپسی کے ارادے باندھ رہے تھے۔ وہ واپسی کا ارادہ اسی وقت کر سکتے تھے جب پیرو کو مکمل طور پر محفوظ سمجھتے ہوں۔ جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اتنی بڑی واردات کے بعد پولیس یوں چپ نہیں بیٹھ جائے گی۔ اوپر سے دباؤ پڑ رہا ہو گا۔ اطلاع سن کے پیرو کے چہرے پر بھی سرخی چھا گئی لیکن وہ محض کچھ دیر قائم رہی۔ پھر پیرو اڈے کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ شام کا وقت تھا۔ ہر طرف سے آدمی آ رہے تھے۔ اڈے میں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ رات کو اڈے کے آدمیوں نے باورچی بلا کے اڈے ہی میں کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے بعد ناچ گانے کے لیے ایک طوائف بھی بلائی گئی تھی اور نقلیں اتارنے والا ایک مسخرا بھی۔ اس نے نقلیں اتارنی شروع ہی کی تھیں کہ پولیس کے آنے کی اطلاع ملی۔ مچل نے مجھے اشارہ کیا۔ پولیس ابھی اڈے سے دور تھی۔ میں وہاں سے پہلے ہی نکل آیا اور پیدل چل دیا۔ سڑکوں پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک جگہ اندھیرے میں ایک سپاہی نے میرا راستہ روک لیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے تلخی سے پوچھا۔

"گھر۔" میں نے بیزاری سے جواب دیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ گھر کدھر ہے؟ میں نے اسے پتہ بتا دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ جیب میں چاقو موجود تھا۔ میں نے اس کا پنجہ پکڑ لیا۔ "جیب سے ہاتھ نکالو۔" میں نے غصے سے کہا۔

"چاقو!" وہ طنز سے بولا۔ "اور نوٹ بھی؟ کدھر سے آ رہا ہے؟" وہ اپنا پنجہ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے حقارت سے بولا۔

"میں نے چوری نہیں کی ہے، یہ روپے میرے ہیں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"تیرے ہیں، تیرے باپ کے ہیں۔ تھانے چل۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "چل۔" وہ مجھے دھکا دینے لگا۔ ایک لمحہ مجھے یاد آیا کہ میں بھی اسی طرح ایک سپاہی نے مجھے پکڑ لیا تھا اور ایک بیوہ عورت ارجمند بیگم نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ سپاہی سمجھ گیا کہ میرا ارادہ آسانی سے اس کے ساتھ جانے کا نہیں ہے۔ اس نے فوراً سیٹی بجا دی۔ اس کے جواب میں دور سے سیٹیاں گونجیں اور گرد و پیش میں سیٹیاں ہی سیٹیاں بجنے لگیں۔ ساتھ ہی کتے بھونکنے لگے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھے سپاہی سے نرم لہجے میں بات کرنی چاہیے تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ سے سیٹی چھین لی۔ "تم شور کیوں مچا رہے ہو؟"

"سیٹی واپس کر۔" وہ چیختے ہوئے بولا اور میرے ہاتھ سے سیٹی چھیننے کے لیے اچھلنے کودنے لگا۔ "تو اکیلے میرے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"میں نے تمھارا بگاڑا کیا ہے بھائی! میں اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔ کیا تم نے مجھے کوئی جرم کرتے ہوئے پکڑا ہے؟ مجھے جانے دو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ابھی تم نے ایک پولیس مین کی ڈیوٹی میں خلل ڈالا۔ اس سے سیٹی چھینا اور اس کے ساتھ اکڑ کے بات کیا۔ زیر دفعہ ۳۳۲ دست اندازی پولیس میں چھ مہینے کاٹے گا تو پتہ چل جائے گا کہ تو نے کیا جرم کیا ہے۔"

سیٹیاں قریب ہو رہی تھیں۔ یہ سیٹیاں جن کے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ ایسی ہی سیٹیاں اس وقت بھی تھیں جب کرا کو بدمعاش لیے جا رہے تھے۔ ان سیٹیوں سے میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ دوسرے سپاہی اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں چند لمحے سوچتا رہا۔ مجھے دوسروں کے آنے سے پہلے بھاگ جانا چاہیے تھا ورنہ وہ جلد ہی مجھ تک پہنچ جاتے اور مجھے دھکے دیتے ہوئے تھانے لے جاتے۔ تھانے جانے میں کوئی بات نہیں تھی۔ میں انھیں بتا سکتا تھا کہ میرا نام راجا ہے۔ تھوڑی سی تصدیق کر کے وہ مجھے چھوڑ دیتے۔ یہ بات میں سپاہی کو بھی بتا سکتا تھا مگر ان حالات میں سپاہی کو یا تھانے جا کے اپنا نام پتہ بتانے سے اور الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں اور اگر میں اپنا نام صحیح نہ بتاتا تو وہ چاقو کی موجودگی سے شک میں پڑ جاتے اور صبح ہونے سے پہلے مجھے ہرگز نہ چھوڑتے۔ جیب میں جتنی بھی رقم تھی وہ میں نے سپاہی کو دینے کا خیال کیا لیکن اگر سپاہی رقم لینے سے انکار کر دیتا تو بات اور بگڑ سکتی تھی۔ دوسرے سپاہی کسی لمحے بھی یہاں پہنچنے والے تھے۔ میں نے اپنے سامنے دائیں بائیں دیکھا۔ سیٹیاں تیز ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی سیٹی زمین پر دور پھینک دی۔ سپاہی اکھلا کے اسے حاصل کرنے کے لیے دوڑا۔ اس نے میری جیب چھوڑ دی۔ میرے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ جھکا، میں نے جھپٹ کے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کیا اور کسی تاخیر کے بغیر دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پر ضرب لگائی۔

سپاہی کی ایک ہلکی کراہ بلند ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں اُسے دکان کے تختے پر ڈال کے آہستگی سے رینگتا ہوا ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں تعفن پھیلا ہوا تھا۔ شاید یہاں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے تھے یا کسی کا پانی گڑھوں میں جمع تھا۔ میرے پاؤں کیچڑ میں دھنستے رہے لیکن میں تین روڈ پر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور میرے پاؤں تک میرا جائزہ لے کے مجھے بٹھانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اسے دو تین میلوں کی پیشکش کی تھی۔ میں نے غور نہیں کیا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے کیونکہ جس جگہ سے ٹیکسی چلی تھی، وہ میری دیکھی ہوئی نہیں تھی۔ ڈرائیور کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے ایک سنسان جگہ گاڑی روک لی۔ میں سمجھا گاڑی خراب ہو گئی ہے لیکن اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور وہ مجھ سے جیب کی ساری رقم نکالنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اسے سارے پیسے دے دوں گا، پہلے وہ مجھے میری منزل پر تو پہنچائے۔ اس نے چاقو میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے اس سے دوبارہ کہا کہ وہ میری بات کا یقین کر لے۔ اسے کچھ خیال آ گیا مگر اس نے یہ شرط رکھی کہ میں پہلے سارے پیسے اس کے حوالے کر دوں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے تمام روپے اسے تھما دیے۔ روپے ہاتھ میں آ جانے کے بعد وہ مجھے ٹیکسی سے فوراً اترنے کا حکم دینے لگا۔ مجھے غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ "چلو، اترو اور بھاگ جاؤ۔" اس نے چاقو میری گردن کے گرد لہراتے ہوئے سختی سے کہا۔ میں نے اس کے چاقو والے ہاتھ پر سکون سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک دم اچھل گیا۔ اسے میری جانب سے اس برتاؤ کی توقع نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ ہلنے کے وقفے میں، میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے زور کیا۔ میں اس کا ہاتھ اس کے سینے تک لے گیا۔ میرے انگوٹھے کے ناخن سے اس کی نس دبی ہوئی تھی جس سے اس کے ہاتھ کی طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ وہ چاقو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کے چاقو چھوڑ دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے چاقو اٹھا کے اسے بند کر دیا۔

"چلو، اپنی نشست سے کھسکو۔" ہٹتے ہوئے میں نے کہا۔

"واوا! ان کو معاف کر دو۔" وہ التجا کرنے لگا۔

"سیدھی طرح چلو۔" میں نے اسے چاقو واپس کر دیا۔

ڈرائیور نے راستے میں کئی دفعہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنا منہ بند کر لیا۔

گھر سے فاصلے پر میں ٹیکسی سے اتر گیا۔ ڈرائیور نے باہر آ کے میری پنڈلیاں چھوئیں اور تمام روپے واپس کر دیے۔ میں نے اسے مقررہ کرایہ دینا چاہا، اس نے وہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ "نہیں واوا! ان کے لیے ایک ڈبل حرام ہے۔"

میں نے اس سے زیادہ ضد نہیں کی۔ گلیوں میں چوکیداروں کی آوازیں اور لاٹھیوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔ ابھی گھر دور تھا اور پھر کوئی بھی درمیان میں آ سکتا تھا۔ کیا پتہ کون کس وقت کس ارادے سے سامنے آ جائے۔ میں چاروں طرف دیکھ دیکھ کے محتاط انداز میں قدم بڑھاتا ہوا گھر سے قریب ہو رہا تھا۔ یہ احتیاط بے کار تھی جب تک دوسرے بھی احتیاط نہ برتیں۔ دوسرے خود مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ اپنے طور پر رابطے کی ہوئی ہر بات ادھوری ہے جب تک دوسرے اس کا ساتھ نہ دیں۔ بچنے کے لیے کوئی اور دنیا تو ہے نہیں۔ اگر میں خاموش رہتا تو گھر پہنچنے کے بجائے اس وقت کہیں اور ہی۔ اپنے گھر واپس آنے والے اشخاص کو نہ جانے کتنی مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہو گا۔ راستے میں طرح طرح کے لوگ ملتے ہوں گے۔ ان لوگوں سے بچ کے گھر پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔ ہر شخص اپنے پاس چاقو تو نہیں رکھ سکتا۔ میرا جی متلا رہا تھا۔ ہر آدمی کو اس سے خار ہے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ میں اس کے پاس پہنچ سکوں۔ جلیبی نے دروازہ کھولا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا اور فرش پر چادر بچھا کے لیٹ گیا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں بجتی رہیں اور آنکھوں سے پانی بہتا رہا۔

دوسرے دن اسپیشل پولیس نے شہر کے مختلف اڈوں پر اچانک چھاپے مارے، تلاشی لی اور بہت سے آدمی پکڑ لیے۔ انھوں نے اڈوں کے کئی داداؤں کو بھی گرفتار کر لیا۔ پیرو کے اڈے سے انھیں کچھ دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ دوسری جگہوں سے انھیں منشیات، مسروقہ مال اور ہتھیاروں کا انبار ملا۔ ہر جگہ سے کئی سو آدمیوں کو بیک وقت پکڑا گیا تھا۔ ان میں سے بعض آدمی ایسے بھی تھے جنھیں پہلے گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ چھنگا اور ابراہیم خان کے اڈے بھی خالی ہو گئے۔ اس مرتبہ پولیس نے نام بنام بہت سے لوگوں کو طلب کیا تھا۔ زیادہ تر مچل واپس آ چکے تھے۔ ماموں بھی دو ایک دن میں آنے والا تھا۔ فہرست میں اس کا نام نہیں تھا لیکن وہ ایسے نام فہرست میں شامل تھے جو ابھی تک مخفی جگہوں پر اپنے زخم سہلا رہے تھے۔ ان کی واپسی میں ابھی دیر تھی۔ پیرو نے ان کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی

لاوہ گذشتہ دو روز سے غائب ہیں، شاید اپنے گاؤں چلے گئے ہیں، آئیں گے تو انھیں تھانے بھیج دیا جائے گا ساتویں آدمیوں میں سے دو کا موقع پر نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ کئی اور زخمی بھی تھے جن کا نام اُن کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ ہر آدمی روزانہ باڑے میں آ کے حاضری دے۔ ویسے تجمل نے ایسے لوگ منتخب کیے تھے جن کے گھر دور نہیں تھے اور جو باڑوں میں مستقل طور پر یا اِدھر اُدھر رہتے تھے۔ جن لوگوں کے گھر بار تھے، انھیں واردات کی رات تیواڑی کے اڈے کے آس پاس متعین کیا گیا تھا تاکہ وہ کاری زخم لگنے سے محفوظ رہ سکیں۔ باڑے سے متعلق لوگوں کا زخمی ہونا عام بات تھی۔ پولیس انھیں پکڑ بھی لیتی تو یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ وہ کہاں زخمی ہوئے ہیں اور انھیں کس نے زخمی کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے ہی باڑوں کے کسی آدمی کا نام لے سکتے تھے۔ جامو اور کانتے بھی اب باہر نکل سکتے تھے۔ اُن کی روپوشی محض احتیاطاً تھی۔

اخبارات پولیس کی ناکامی پر بہت جز بز تھے۔ ان تازہ گرفتاریوں کے بعد خبروں میں پھر سے سرگرمی نظر آنے لگی۔ اب کے پیرو نے اپنے باڑوں سے گرفتار ہونے والوں کی ضمانت کا انتظام کرنے میں عجلت نہیں کی۔ دو دن سخت پوچھ گچھ کر کے پولیس نے بیشتر آدمیوں کو خود چھوڑ دیا۔ اُن پر خاصا تشدد کیا گیا تھا مگر کسی نے اقرار نہیں کیا۔ پولیس کی بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت اس بات سے عیاں تھی کہ اس نے باڑوں پر چھاپے مارنے میں کوئی تخصیص نہیں برتی تھی۔ تیواڑی کے ماتحت باڑوں پر بھی اسی طرح اچانک چھاپے مارے گئے تھے۔ انھوں نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں لیکن تیواڑی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ اسے تجمل اور پیرو نے کہاں چھپایا ہوا ہے، وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے، ایسے حالات میں انھوں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں رکھا ہوگا۔ اُن کی لاشیں کہیں کسی پختہ فرش کے نیچے دبا دی گئی ہوں گی یا انھوں نے تیواڑی کو چھوڑ دیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیواڑی میں کچھ غیرت باقی تھی، وہ اپنی کٹی ہوئی ناک لے کے اپنے لوگوں یا پولیس کے پاس نہیں جا سکا۔ میں نے بہت کریدا مگر کسی نے مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

اخبارات تیواڑی کی بازیابی پر مسلسل زور دے رہے تھے۔ تجمل نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں اب رات کو بھی باڑے نہ آؤں۔ گھر میں روز جاتا رہا۔ گھر میں ہر وقت جولین تھی۔ اس کا چہرہ اب دیکھا نہیں جاتا تھا۔ برسوں کی بیمار معلوم ہوتی تھی۔ دن بھر میں بھی اپنے کمرے میں بند رہتا تھا۔ اس دن کے بعد سے نہ اس نے مجھ سے کوئی بات کی تھی نہ میں نے اُس سے بات چیت بند بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے کھانے کے لیے بلاتی، میں چلا جاتا۔ وہ مجھے چائے دے جاتی، میں لے لیتا۔ جامو اور کانتے دن میں کئی بار ڈرائنگ روم میں جا کے بیٹھتے تھے۔ وہ مجھے بھی بلاتے تھے مگر میں کوئی نہ کوئی عذر کر کے انھیں ٹال دیتا تھا۔ جولین نے اُن کی خاطر داری میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ کانتے اُسے ہنسانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ مسکراتی تھی لیکن کانتے اُس کی مسکراہٹ دیکھ کے خود اداس ہو جاتا تھا۔

گرفتاریوں کا چوتھا دن تھا۔ میں باڑے پہنچا تو اس دن سرگرمی کچھ زیادہ نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ پیرو نے آج تمام باڑوں کا انتظام اچھی انداز میں کر دیا ہے جو کچھ دن پہلے ایک رات اُن سب کے درمیان طے پایا تھا۔ مچھنگا والا باڑا مستقل طور پر نعما کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ مجید کو پیرو نے اپنے پاس رکھنے کا اعلان کیا تھا اور بالم خاں کا باڑا ماسٹر راشد کو دے دیا گیا تھا۔ پیرو نے اپنے باڑوں پر بھی مختلف آدمی بٹھائے تھے اور اگرچہ ابھی تیواڑی کے باڑے اُس کے قبضے میں نہیں آئے تھے لیکن انھیں سنبھالنے والے آدمیوں کی نامزدگی کی جا چکی تھی۔

اُس رات تجمل میرے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ جولین اُسے دیکھ کے بوکھلا سی گئی۔ تجمل نے آتے ہی اُس کی خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ اُس کا رنگ اُڑا اُڑا کیوں ہے؟ جولین کچھ جواب نہیں دے سکی۔ واردات کے بعد تجمل پہلی بار گھر آیا تھا۔ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تجمل کو جانے کی جلدی بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ چائے کے بعد اُس نے بتایا کہ برسوں اُس کی روانگی ہے۔ میرے کانوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ میں نے بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھا۔ تجمل کی نظریں جولین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جولین سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ چھپا اور جولین کی ماں ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ تجمل نے جولین کو آواز دی۔ وہ چونک پڑی۔ تجمل نے اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ جامو اور کانتے پرے ہٹ گئے۔ جولین ڈگمگاتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور تجمل کے پاس جا کے چپ بیٹھ گئی۔ "جولی بیٹا! ہم جا رہے ہیں۔" تجمل نے آہستگی سے کہا۔ جولین کے بدن میں جنبش نہیں ہوئی۔ "میں لاڈلے کو بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ لاڈلے کو آگے بہت سے کام ہیں۔ شاید تم کچھ جانتی بھی ہو۔ مجھے پتہ ہے کہ تم اکیلی ہو جاؤ گی لیکن اگر میں لاڈلے کو چھوڑ کے بھی چلا گیا تو یہ یہاں نہیں رہے گا۔ ہم تم کو اپنے ساتھ لے چلتے پر وہ جگہ تمھارے رہنے کی نہیں ہے اور ہمارا بھی کوئی بھروسا نہیں ہے کہ ہم آج کہاں ہوں، کل کہاں۔ ہمت کرو کہ تم کو اِدھر ہی رہنا ہے۔"

"نہیں استاد!" کانتے نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "جولی بہن ہمارے ساتھ جائے گی۔ تمھاری ذمے داری ہو نہیں، میری ذمے داری پر۔ میں اسے کلکتے لے جاؤں گا اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا، وہ اس کے لیے کروں گا۔"

"چپ رہ۔" تجمل نے تلخی سے کہا۔ "اپنا آپ سنبھالا نہیں جاتا، جوان بہن کو سنبھالے گا۔ کتنے دن سنبھالے گا نقشین! چلے یہ جیل کے مثالے جو تیرے کھال پر جگہ جگہ لگا رہے ہیں، بہن کو رسوا کرے گا؟"

"استاد!" کانتے بگڑ کے بولا۔ "اس پیچ تم چپ ہو تو بہتر ہے۔"

"منہ کھولا کانتے!" تجمل نے گرج کے کہا۔ "بہن کے سامنے گال..."

"میں نہیں رہوں گی بابا!" جولین اکھڑی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں رہنے میں تیرا سکھ ہے جولی بیٹیا!" تجمل نے اپنا لہجہ نرم کرنے کی کوشش کی۔ "جو تیرے لیے بہتر ہے وہی میں بول رہا ہوں۔"

"جولی بہن اگر ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہے تو ہمیں منع نہیں کرنا چاہیے تجمل بھائی!" جامو ترشی سے بولا۔ "ہم اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ کیا ہم ایک عورت اور ایک لڑکی کا بار نہیں اٹھا سکتے؟"

"جامو!" تجمل نے ناگواری سے کہا۔ "تو بھی ایسی لونڈوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ کیا جولی کوئی لاچار لڑکی ہے۔ اس نے موٹی موٹی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایسی کتابیں اسی لیے لکھی جاتی ہیں کہ آدمی اکیلا نہ ہے۔ کتابوں کی دھار چاقو کی دھار سے تیز ہوتی ہے۔ سالا روز یہ منوں ٹنوں کاغذ کیا یوں ہی ردی کیا جاتا ہے۔ جولی اپنا اچھا بُرا تجھ سے بہتر جانتی ہے جامو! ابھی جولی کی ماں موجود ہے۔ سب کے باپ زندہ نہیں ہوتے اور تو... تو اور کانتے کیا اپنی بات پکڑ لیں سکتے ہیں۔ رہنے دے جامو! بس کر۔ زرین بٹیا کا حال نہیں دیکھا۔ جولی تو رہنے والی اور چیز بھی نرالی ہے۔ جامو استاد! ان کی ان کی رہنے دے۔"

"آپ لوگ کیوں ایک دوسرے سے ناراض ہو رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے میں یہیں رہوں گی۔ میں اور میری ماں۔ اگر ظہیر نہ ملتا تو کیا ہم لوگ زندہ رہتے۔" جولین نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم جولی کو زرین بہن کے پاس ٹھہرا سکتے ہیں۔ وہ بھی اکیلی ہے اور وہ بھی بہت اچھی ہے۔ جولی کو دیکھ کے خوش ہوگی۔" کانتے بولا۔

"ہاں ضرور خوش ہوگی۔" "تم لوگ اگر جولی کے بجائے زہر لے جاؤ گے تو بھی وہ خوش ہوگی۔ پر کانتے! کیا ہم زرین بٹیا کو خوش کر سکے؟" تجمل کا لہجہ بوجھل تھا۔ "بس زیادہ مت بول۔"

"پر استاد! جولی بہن...؟"

"جولی یہیں رہے گی کانتے!" تجمل نے بلند آواز میں کہا۔ کانتے اپنے کان نوچنے لگا۔ "جولی یہیں رہے گی کانتے! اور عزت سے رہے گی۔ جولی! اگر تم کو کسی بات کی ضرورت ہو تو ہم کو بولو، پر جو اپنے ہاتھ میں نہیں ہے، وہ ہم تم کو نہیں دے سکتے۔ تم سمجھتی ہوگی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں جولی! جب بھی تم جامو کو کانتے کو یا مجھ کو کسی کام کے لیے بولو گی، ہم تیسرے دن اِدھر آ جائیں گے۔ بس ہم اتنا ہی بول سکتے ہیں۔"

"بابا! آپ کا بہت شکریہ۔" جولین رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں جولی! ایں بول کے ہم کو چھوٹا مت کرو۔ ہم ویسے ہی بہت چھوٹے ہیں۔ تم اپنے بھروسے پر کلکتے آنا چاہتی ہو تو آ جاؤ۔ یا جہاں تم بولو، پر جولی! جگہ بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آدمی کوشش کرے تو جدھر جائے وہ اِدھر اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ دنیا میں آدمیوں کی کمائی نہیں۔ نظر سنبھال کے ڈال جائے تو مرضی کے آدمی مل جاتے ہیں۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" جولین سراسیمگی سے بولی۔

"چل پھیرا ہے استاد!" کانتے نے بپھر کے کہا۔

"پر لو جو بری نہیں ہے، تیرے ہاتھ پاؤں میں باتیں مت بنا۔"

"میں اس کے لیے اپنے ہاتھ صاف کر لوں گا۔" کانتے غصے سے بولا۔

"ساری دنیا کا مال خرچ ہو جائے گا کانتے! کر لے اگر تو یہ کر سکتا ہے تو کر لے۔ تو اس بیچ کو ساری عمر ڈبیا میں بند کر کے رکھنا۔"

"کانتے بھائی! آپ بابا کے ساتھ جائیں۔" جولین نے اپنی آنکھیں چھپا لیں۔ "میں یہاں بالکل خوش رہوں گی۔ بہت آرام سے رہوں گی۔"

کانتے نے کچھ اور کہنا چاہا مگر جامو نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اُسے تحمل کی تلقین کی۔ "چھپا باجی!" تجمل نے چھپا کو مخاطب کیا۔ اُس کی آواز بگڑی ہوئی تھی۔ چھپا سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ "تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں... میں کیا سوچوں۔" وہ ہکلاتی ہوئی بولی۔

"چھپا باجی!" تجمل نے مدھم لہجے میں کہا۔ "تمھیں ہی کچھ سوچنا تو ہوگا۔ تم چاہو تو یہیں جولی کے پاس رہ سکتی ہو، چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتی ہو۔"

"میں تو ظہیر میاں کی وجہ سے یہیں آ گئی تھی اور اسی کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔" چھپا جھجکتی ہوئی بولی۔

"مگر تم میرے پاس کیسے رہو گی؟ میں تمھیں کہاں رکھوں گا؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "مجھے تو خود بہت دور..."

تجمل نے میری بات کاٹ دی۔ "بابا جی! لاڈلے ابھی کسی ایک جگہ نہیں رہے گا۔ جب کبھی اس کا گھر ہو جائے تم اس کے پاس چلی آنا۔ میں لاڈلے کو تمھاری طرف سے بول دوں گا۔ ابھی تم اپنے آپ کے بارے میں فکر مت کرو۔ جیسا تم بولو گی، وہی ہو سکتا ہے۔ جولین بھی اپنی بٹیا ہے۔ تم اِدھر بھی رہ سکتی ہو اور چلنا چاہو تو چل بھی سکتی ہو۔"

چھپا باجی میری طرف دیکھنے لگی۔ جولین کی ماں نے پہلی بار زبان کھولی۔ "ابھی چھپا کو ادھر ہی چھوڑ جاؤ۔ ہم بالکل اکیلا ہو جائیں گا۔"

"اس کا فیصلہ خود چھپا باجی کرے گی۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔

"کیوں چھپا باجی! ابھی تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گی؟" جولین کی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں ممی! چھپا دیدی کو مجبور مت کرو۔" جولین کی جھنجلائی ہوئی آواز ابھری۔ "یہ وہاں سے آنے کے بعد کہیں بھی جا سکتی تھی لیکن انھیں ظہیر کے پاس آنا تھا، اسی کے پاس رہنا تھا۔ میری کوئی خواہش نہیں تھی۔ اب بھی یہی ہے لیکن اب مجھے ظہیر کی طرف سے کچھ سکون ہے کیونکہ یہ تمھارے ساتھ جا رہا ہے تجمل بھائی! میں ابھی جولین کے ساتھ رہوں گی

لیکن مجھے رہنا تو ظہیر ہی کی چوکھٹ پہ ہے۔ میں اس کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔" جولین کی ماں نے چہرا کو زور سے چپٹا لیا۔

کچھ دیر بعد تجمل کل آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے اُٹھ گیا۔ میں، جاسوا اور کانتے اُسے ٹیکسی تک پہنچانے گئے۔ کانتے بہت چُپ چپ تھا۔ واپس آکے بھی وہ کسی سے بات کیے بغیر پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں رات بھر جولین کے پاس جانے کے لیے سوچتا ہی رہا، پھر صبح ہو گئی۔

صبح اُٹھ کے سب سے پہلے میں نے کرشنا جی کی جائداد اور بینک سے متعلق تمام کاغذات نکالے۔ مدراس سے آنے کے بعد انھیں میں نے اب تک نہیں چھوا تھا۔ ایس پی شکلا کے گھر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ جولین اور چچا غالباً ایک دو بار وہاں جا چکی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ پتہ پوچھتے پوچھتے آخر میں اس کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا نام سُن کے شکلا بے تابی سے باہر آیا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کے متجسس نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ مجھے فوراً اندر لے گیا اور میری اس غیر متوقع آمد کا مقصد پوچھنے لگا۔ "شکلا جی!" میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ میں جا رہا ہوں۔ آپ اپنی ڈیوٹی پر واپس جائیں۔ میں یہ کاغذات اپنے ساتھ لایا ہوں، انھیں دیکھ لیجیے میں نے ان میں سے ایک پیسہ استعمال نہیں کیا ہے۔"

"مگر تم یہ مجھے کیوں دکھانا چاہتے ہو؟" وہ مضطرب لہجے میں بولا۔ "یہ پیسہ تمھارا ہے۔ تم اسے جہاں چاہو خرچ کرو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن تم اسے اچھی جگہ خرچ کرو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"میں نے اسے خرچ ہی نہیں کیا ہے اور اب میں جا رہا ہوں، چلتے وقت مجھے آپ سے ملنا بھی تھا اور آپ سے ایک کام میں مدد بھی لینی تھی۔"

"کہو کہو کیا کام ہے؟" میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنا سارا روپیہ جولین کے نام منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں جو ضروری قانونی کارروائیاں ہیں، اُن کی تکمیل میں وہ میری مدد کرے۔ چونکہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں ان باتوں سے ناواقف بھی ہوں۔ "ظہیر خاں!" وہ حیرت زدہ آواز میں بولا۔ "کیا تمھارا دماغ ٹھیک ہے؟"

"کیوں شکلا جی! کیا میں یہ پیسہ کسی کے نام نہیں کر سکتا؟"

"ضرور ضرور، تم اسے آگ بھی لگا سکتے ہو، کنویں میں بھی پھینک سکتے ہو۔ تم مالک ہو، تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔"

"شکلا جی! مجھے احساس ہے کہ یہ رقم کرشنا جی کی ہے، میں اسے کہیں اور ضائع نہیں کر رہا ہوں، جولین کو دے رہا ہوں۔ کرشنا جی اسے بھی خود سے بہت قریب سمجھتے تھے۔"

"مجھے شک ہے کہ اس وقت تمھاری طبیعت ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس چلو۔ تم یہ سارا روپیہ جولین کے نام کر دینا چاہتے ہو۔ وہ لڑکی اسے سنبھال سکے گی؟" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "اگر تمھیں جولین کی کچھ مدد ہی کرنی ہے تو اُسے چند ہزار دے سکتے ہو، ایک لاکھ دے سکتے ہو، اس سے کچھ اور زیادہ دے سکتے ہو مگر یہ...... اوہ۔ کرشنا جی ہوتے تو! مگر کرشنا جی کیوں ہوتے۔"

"کیا وہ ناراض ہوتے؟"

"وہ اپنا سر پیٹتے ظہیر خاں!"

"وہ کچھ بھی نہیں کہتے۔ وہ اگر یہ سب کچھ اپنی زندگی میں میرے نام کر دیتے اور میں اسے جولین کو دے دیتا تو وہ زبان پہ ایک حرف بھی نہ لاتے۔"

"تم جولین کو یہ کیوں دینا چاہتے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں اُسے مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ اُس کا باپ مر گیا ہے۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ وہ اکیلی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔"

"وہ پیسہ تو اُس کی پریشانی اور بڑھا دے گا ظہیر خاں! روپے سے اگر پریشانیاں دُور ہو جاتیں تو تم اس قدر پریشان نہ ہوتے۔"

"وہ اور بات ہے۔"

"وہ اور بات نہیں ہے ظہیر خاں! میرے دوست! ذرا غور کرو۔" شکلا میرا ہاتھ دباتے ہوئے ملائم آواز میں بولا۔ "میں تمھیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا اور نہ اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد کروں گا۔"

"شکلا جی! میں آپ سے مشورہ لینے نہیں آیا ہوں۔ آپ مناسب نہیں سمجھتے تو یہ رقم آدھی کر دیجیے۔ جولین کو واقعی روپے کی ضرورت ہے۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے، وہ ولایت چلی جائے۔ وہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ اُس کی ترقی میں جو رکاوٹ ہے، وہ روپے سے بڑی حد تک دُور ہو سکتی ہے۔"

"تم نے جولین سے اس کا تذکرہ کیا تھا؟"

"ہاں، پہلے اُس نے منع کر دیا۔"

"منع کر دیا! تو جان لو کہ وہ اب بھی اسے قبول نہیں کرے گی۔"

"میں اُسے بتاؤں گا ہی نہیں۔ رخصت ہوتے وقت کاغذ دے جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد وہ دیکھے گی تو خود بخود اسے قبول کرنا ہوگا۔"

"نہیں نہیں۔" اُس کی پیشانی شکنوں سے بھر گئی۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا مگر میں اپنی بات پہ قائم رہا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ رقم اُس کی جیب سے نہیں جا رہی ہے اور جولین کو وہ خود بھی پسند کرتا ہے مجھے سوچنا چاہیے کہ پھر اُس کی ناآمادگی کی کیا وجہ ہے۔ "تم کب جا رہے ہو؟" اُس نے افسردگی سے پوچھا۔

"کل رات۔"

"اور کہاں جا رہے ہو؟"

"کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔"

"کوئی تو منزل ہوگی؟" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی شاید کلکتہ سمجھیے۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"وہاں تمھارا پتہ کیا ہوگا؟"

"میرا پتہ!" میں سوچنے لگا کہ اُسے کیا پتہ بتاؤں۔ مجھے کلکتے میں [illegible] جانا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر میں کلکتے گیا تو وہاں شاید چند [illegible] ٹھیروں گا پھر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ "مگر آپ پتہ کیوں پوچھ رہے [illegible]" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھارے بارے میں کوئی خط آیا تو کہاں مطلع کروں؟"

"چھوڑیے شکلا جی! خط آنا ہوتا تو اب تک آ جاتا۔"

"مجھے اب بھی اُمید ہے۔ فرض کرو، تمھاری عدم موجودگی میں کوئی [illegible] سے آ جائے تو میں تمھیں کہاں ڈھونڈوں؟"

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے اُسے فیض آباد میں زرین کا [illegible] دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے خط لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی [illegible] اُس نے لکھا بھی تو زرین کے پاس وہ خط محفوظ رہے گا۔ وہ تجمل کو مطلع [illegible] گی۔ یہ پتہ کسی اڈے کا نہیں تھا، زرین کا تھا۔ شکلا نے اسے [illegible] میں نوٹ کر لیا۔ میں نے دوبارہ اُس کی توجہ رقم کی طرف دلائی۔ اُس [illegible] مشورہ دیا کہ مجھے اور سوچ لینا چاہیے۔ یہ رقم بعد میں بھی کسی وقت [illegible] ہو سکتی ہے۔ اُس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شاید بعد میں میرا [illegible] بدل جائے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کاغذات کی تکمیل کے [illegible] وقت میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں اُٹھ گیا۔ میں نے اُس [illegible] لیا کہ وہ اپنی ملازمت پہ واپس چلا جائے گا۔ اُس نے مجھے [illegible] گلے لگایا، میرے گال چومے اور کہا کہ کل کسی وقت مجھ سے ملنے [illegible] لیے وہ گھر آئے گا۔

باہر آنے کے بعد ہی میں نے کسی وکیل کی تلاش شروع کر دی۔ [illegible] ایک جگہ ایک بورڈ پہ میری نظر پڑی۔ میں جھجکتے جھجکتے وکیل [illegible] میں پہنچا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اُس نے میری بات پوری توجہ [illegible] اور سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ اُس نے کئی بار میری شکل دیکھی۔ [illegible] کوئی مجرم ہوں۔ میں نے اُسے اپنی پوری نائل دکھائی۔ پھر وہ مجھ [illegible] طرح طرح کے سوال کرنے لگا کہ جولین میری کون ہوتی ہے اور میں یہ [illegible] اُسے کیوں دے رہا ہوں۔ میں نے کہا، "تمھیں اس سے کیا؟ تم تو کاغذ [illegible] کے مجھے دے دو اور اپنی فیس بتا دو۔" وہ بڑی مشکل سے آمادہ [illegible] اُس نے بتایا کہ زیادہ لمبے چوڑے طریقۂ کار میں پڑنے کی ضرورت [illegible] ہے۔ میں جولین کے نام جس رقم کا چاہوں، ایک چیک کاٹ [illegible] اور چیک کے ساتھ احتیاط کے طور پہ بینک کو خط بھی لکھ سکتا [illegible] خط کا مضمون بھی اُس نے مجھے بتا دیا۔ میں نے فیس کے لیے

کہا تو اُس نے انکار کر دیا کہ وہ مشورے کی فیس نہیں لیا۔ میری جیب میں پیسے بھی کم تھے اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ زیادہ پیسے نہ مانگ لے۔ اب تمام کام مجھے کرنا تھا۔ وکیل سے بات کر کے مجھے اپنا وزن کچھ کم محسوس ہوا۔

بائیڈے میں تجمل کی وہ آخری رات تھی۔ جاسوا اور کانتے میرے ساتھ تھے۔ آج معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ ہر طرف رنگا رنگی اور سجے ہوئے گوشت کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ آج وہاں مارتی بھی نظر آ رہا تھا۔ زورا اور چھیدا بھی تھے۔ پیرو گو تجمل کے پاس بیٹھا ہوا تھا مگر کسی سے بہت کم بات کر رہا تھا۔ میں نے مارتی کو جولین کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ وہ رونے لگا اور بولا کہ راجا! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں پھر کبھی ضرور ملاقات ہوگی۔ جاسوا اور کانتے بھی لڑکوں کے درمیان گھرے رہے۔ سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ملنے کی جگہ پر سازندوں اور طوائفوں نے قبضہ کر لیا۔ آج ایک نہیں چار چار طوائفیں موجود تھیں۔ سب زرق برق لباس پہنے اور سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ گانے میں ہم بس تھوڑی دیر بیٹھے۔ جاسوا اور کانتے کی وجہ سے مجھے بھی رکنا پڑا۔ جب ہم چلنے لگے تو محفل درہم برہم ہو گئی۔ تجمل اور پیرو کے ساتھ بھی ہمارے ساتھ گلی میں آ گئے اور بار بار ہمیں اپنے سینوں میں بھینچتے رہے۔

جولین نے میرے لیے ایک سوٹ کیس خرید لیا تھا۔ میرے تمام کپڑے اُسی سوٹ کیس میں بھر دیے گئے تھے۔ یہ کپڑے کرشنا جی نے بنوائے تھے اور بعد میں جولین نے سلوائے تھے۔ ہم گھر پہنچے تو یہی تیاری ہو رہی تھی۔ جولین نے تجمل کانتے اور جاسوا کے کپڑے بھی بنوائے تھے۔ جولین کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ میں تو اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ دونوں رات گئے تک باہر ہی بیٹھے رہے۔ صبح ہوئی تو میں آخری بار ملنے، تلاش کرنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ ممکن ہے، وہ اسی شہر میں ہو اور اب تک میری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔ میں گھنٹوں سڑک چوراہوں پر کھڑا ہوا لوگوں کو تکتا رہا۔ شام کو واپس آیا تو میرے ہوش میں گھٹن ہو رہی تھی۔ گھر کے باہر ایک نئی لمبی سیاہ موٹر کھڑی تھی اور باوردی ڈرائیور موٹر میں اونگھ رہا تھا۔ یہ موٹر میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ڈرائیور سے پوچھ لینا مناسب سمجھا کہ اندر کون آیا ہے۔ اُس نے نورین کا نام لیا۔ مجھے تسلی ہوئی۔ اندر نورین ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں اکثر آتی رہتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل بھی آئی تھی اور چچا نے اُسے میری روانگی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ میرے لیے ایک گل دستہ لائی تھی اور کافی دیر سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُسے بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ وہ نیلی قمیص اور اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے گلے میں ایک مفلر بندھا تھا۔ بالکل کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہو رہی تھی۔ "اگر میں کل نہ آتی تو مجھے پتہ بھی نہ چلتا۔" وہ شکایت کرنے لگی۔ میں نے اُس سے معذرت کی کہ میں زیادہ مصروفیت کی وجہ سے اس دوران میں اُس سے نہیں مل سکا اور نہ اُس

کے گھر آسکا۔ زرین نے میری معذرت قبول کرلی اور کرسٹ نا جی کا ذکر کرنے
لگی کہ کلب میں لوگ انھیں بہت یاد کرتے ہیں اور کبھی کبھی میرا تذکرہ بھی
ہو جاتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہاں لوگ میرے بارے میں مختلف قسم کی
باتیں کرتے ہیں اور ڈیڈی بھی تمھیں پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ یہ باتیں مسکراتی
آنکھوں سے کر رہی تھی۔ جولین بھی موجود تھی۔ زرین نے اُس سے اذن طلب
کیا اور جولین جیسے ہی اندر گئی، زرین کھسک کے میرے قریب آگئی۔ اُس
نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کچھ وقت ہے؟ میں نے
جواب دیا کہ گاڑی رات کو جاتی ہے، ابھی خاصا وقت پڑا ہے۔ "مجھے تم
سے کچھ باتیں کرنی ہیں مگر یہاں نہیں۔ چلو ذرا دیر کے لیے میرے ساتھ چلو۔ میں تمھیں
یہیں پہنچا دوں گی۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔
"کیسی باتیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔
"کچھ اہم باتیں۔" میں نے تجسس سے اُسے دیکھا۔ وہ تیزی سے
بولی۔ "ایسی کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ بس تم سے کچھ کہنا ہے۔"
میں نے بے تابی سے اقرار میں گردن ہلا دی۔ جولین کے آنے پر
وہ چپ ہو گئی۔ میرے دل کو بے کلی ہو گئی کہ وہ مجھ سے ایسی کیا باتیں
کرنا چاہتی ہے۔ چند منٹ بعد وہ واپس جانے لگی۔ میں بھی اُس کے ساتھ
موٹر میں بیٹھ گیا۔ جولین اور چمپا بھی دروازے سے باہر آگئی تھیں۔ زرین نے
اُن سے کہا کہ وہ مجھے ابھی کچھ دیر بعد واپس لے آئے گی۔ وہ دونوں دیکھتی
رہ گئیں۔ موٹر فرّاٹے سے روانہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اعلیٰ درجے کے ایک
پرسکون اور ٹھنڈے ریستوران کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ "تمھارے
پاس وقت کم ہے اس لیے میں کسی تمہید کے بغیر بات کروں گی۔" وہ بیرے
کو کافی کا آرڈر دیتے ہوئے کچی پکی اردو میں بولی۔ "تم جانتے ہو کہ مجھے اِدھر
اُدھر کی باتیں کرنا نہیں آتا۔ میں تمھارے گھر کوئی دس بار آئی ہوں گی۔ تم
کسی بار نہیں ملے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید جولین اور چمپا تمھیں میرے بارے میں
کچھ بتاتی نہیں ہیں۔"
"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ انھوں نے ہر بار مجھے بتایا ہے۔"
"تو ٹھیک ہے۔" وہ عجلت میں بولی۔ "پہلے مجھے تم سے چند سوال
کرنے ہیں، جواب دیتے رہنا۔ پھر میں اپنی بات بتاؤں گی۔" اُس کی آواز
میں لرزہ تھا۔
"پوچھیے۔"
"یہ بتاؤ کہ میں تمھیں کیسی لگتی ہوں؟"
"جی!" میں نے حیرت سے کہا۔
"ہاں مجھے بتاؤ کہ میں کیسی لگتی ہوں؟"
"تم..... تم بہت اچھی ہو۔"
"نہیں۔" وہ مچل کے بولی۔ "مجھے بتاؤ کہ میں تمھیں کیسی لگتی ہوں؟
صرف چہرے مہرے اور رنگ روپ سے نہیں، دونوں طرح تمھیں پوری
آزادی ہے کہ تم جس طرح سمجھتے ہو، کسی جھجک کے بغیر کہہ دو۔ مجھے کوشش

کرنے کے لیے جواب دو۔ بنا اب تم جانتے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پھر کبھی
نہ ملیں اور ایک دوسرے سے شرمندہ نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھے تم سے
صاف جواب کی اُمید نہ ہوتی تو میں یہ سوال کرتی ہی نہیں۔"
"یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"بس میری بات کا جواب دو۔"
"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" میں نے جھجک کے کہا۔
"تم بھی مجھے اچھے لگتے ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں۔
میں نے طے کیا ہے کہ تم مجھ سے اور میں تم سے شادی کر لوں۔"
"کیا۔؟" میں اچھل گیا۔
"ہاں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ "یہ بات تمھیں عجیب محسوس ہو گی
لیکن ہم ایک دوسرے سے کیوں جھجکیں اور غیر ضروری باتوں میں وقت کیوں
ضائع کریں۔"
"مگر..... مگر۔" میری آواز دھڑکنے لگی۔
"ہاں، تمھارے ذہن میں چند سوال آسکتے ہیں۔ پہلا سوال یہ آ
سکتا ہے کہ میں ایک پارسی لڑکی ہوں اور تم مسلمان ہو۔ میرے لیے یہ کوئی
اختلاف کی بات نہیں ہے۔ تمھارے لیے میں مسلمان ہو سکتی ہوں۔ دوسرا
سوال شاید تمھارے ذہن میں یہ ہو کہ میں ایک کروڑپتی باپ کی بیٹی ہوں
اور تم اتنی بڑی حیثیت کے آدمی نہیں ہو۔ میں اسے بھی مسترد کرتی ہوں۔
ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو جو کچھ تمھارا ہے، وہ میرا ہے
اور جو میرا ہے، وہ تمھارا ہے۔ تیسرا یہ سوال تمھیں پریشان کر سکتا ہے کہ
میرے ڈیڈی یہ سب کچھ کیسے اور کیوں تیار ہو جائیں گے تو اس کی فکر بھی چھوڑ
دو۔ میرے ڈیڈی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں اُن کی اکلوتی
بیٹی ہوں۔ انھوں نے بہت پہلے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں جسے پسند کروں
گی، انھیں اُس کے ساتھ میری شادی کر دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں
نے ایک بار اُن سے تمھارا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے تمھارے بارے میں اچھی
رائے ظاہر کی تھی۔ میں تمھارے لیے ایک اچھی بیوی ثابت ہوں گی اور
مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے لیے ایک عمدہ شوہر........"
"زرین۔ میں..... میں۔" میں نے سراسیمگی سے کچھ کہنا چاہا لیکن
ہے تمھیں کوئی اور لڑکی مجھ سے زیادہ پسند ہو۔ یہ بات میرے لیے دکھ کی
ہے لیکن میں تمھارے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تم اپنے لیے بہتر
فیصلہ کر سکتے ہو۔ میں چھ مہینے تک تمھارا انتظار کروں گی۔ یہ عرصہ
سوچنے کے لیے بھی کافی ہو گا اور تمھیں کام ڈھونڈنے کے لیے بھی۔"
"لیکن..... لیکن سوچنا کیا ہے۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔
"سوچنا ہے، ضرور سوچنا چاہیے۔ میں نے اپنے طور پر تمھارے بارے
میں خوب سوچ لیا ہے لیکن تم نے میرے متعلق اس انداز سے ممکن ہے
نہ سوچا ہو۔ یہ شادی ہے۔ ہم دونوں زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ ایک
دوسرے کے وفادار۔ ہم دو ہیں، ایک ہو جائیں گے۔ ہماری روحیں ایک

نے بندھ جائیں گی۔ سوچے بغیر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں
سوچنے کا پورا موقع دینا چاہتی ہوں۔"
زرین کے گال تمتما رہے تھے۔ میرا سارا جسم گنگ ہو گیا تھا۔ اُس نے
جلدی جلدی کافی بنائی۔ ایک پیالی میرے آگے رکھ دی۔ میں نے اپنے
حواس مجتمع کرنے کی بہت کوشش کی۔ اُس سے کچھ کہنے کے لیے میرے
ہونٹ کپکپانے لگے۔ "چلو اٹھو، تمھیں دیر ہو رہی ہے۔" اُس نے بیرے
کو ایک نوٹ دے دیا اور ریستوران سے نکل آئی۔ واپسی پر اُس نے
دکانوں سے میرے لیے سوٹ کا کپڑا، شیونگ کا سامان، جوتے، بسکٹ
اور بہت سی چیزیں خریدیں اور تمام سامان کے ساتھ مجھے چھوڑ
کر اندر نہیں آئی۔ موٹر روانہ ہونے سے پہلے اُس نے یاسیت سے کہا
کہ مثبت جواب کی توقع رکھے گی۔ اُس نے کچھ اور بھی کہا جو میں
سنا نہیں۔ موٹر چل پڑی۔
گھر میں سبھی میرے منتظر تھے۔ تجمل آچکا تھا۔ سوٹ کیس اور بستر
ڈرائنگ روم میں رکھے تھے۔ جولین، کلنتے اور جامو کے درمیان نظریں
ملتجی تھیں۔ میری سانس قابو میں نہیں تھی اور مجھے سفر کے خیال سے
ہول آرہا تھا۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ تجمل نے میرا بازو پکڑ کے مجھے جھنجوڑ دیا۔
"کیا بات ہے لاڈلے؟" وہ بے قراری سے بولا۔
"کچھ نہیں۔" میں نے سنبھل کے کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔"
"چلنا ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔
"ہاں چلو۔" میں نے بہکے بہکے انداز میں کہا۔ میں اُن سے اپنی اِس
خواہش کا اظہار نہیں کر سکا کہ بس آج کے لیے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا جائے۔
کلنتے ٹیکسی لینے چلا گیا تھا۔ دو ٹیکسیاں آئیں۔ جولین کی ماں گھر ہی پر
تھی۔ اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور دعائیں دے کے مجھے رخصت کیا۔
جولین، چمپا اور میں ایک ٹیکسی میں اور دوسری میں وہ تینوں بیٹھ گئے۔
ٹیکسی میں خاموشی طاری تھی۔ پھر چمپا کی روتی ہوئی آواز اُبھری۔
"پیارے میاں! خط لکھنا۔" میں نے گردن ہلائی۔ وہ آیتیں پڑھ پڑھ کے
مجھ پر پھونک رہی تھی۔ اسٹیشن پر پیری پہلے سے موجود تھا۔ اُس کے ساتھ
زُوزا، بھیدا، ماچمی، منّا اور مارتی تھے۔ گاڑی روانہ ہونے میں زیادہ
وقت نہیں تھا۔ میں نے چمپا کو علیحدہ لے جا کے ایک لفافہ دیا اور اُسے
تاکید کی کہ وہ گھر پہنچ کے کسی مناسب وقت لفافہ جولین کو دے دے۔
منّے نے میری ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں اور اپنا سر رگڑ رہا تھا۔
اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ وہ سب ہم سے بار بار
لپٹ جاتے تھے۔ گارڈ نے سیٹی بجائی تو پیری نے دونوں ہاتھوں سے
مجھے کھینچ لیے اور پیشانی سے سر لگاتے ہوئے بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔
"بھیّے! اپن کو تیرا انتظار رہے گا۔"
وہ دونوں ہم سے علیحدہ کھڑی ہو گئی تھیں۔ کلنتے انھی کے پاس
تھا۔ گاڑی بس حرکت میں آیا ہی چاہتی تھی۔ میں دوڑ کے اُن کے پاس

پہنچا۔ چمپا نے اپنی بانہیں پھیلا رکھی تھیں۔ میں بے اختیار اُس کے
سینے سے چمٹ گیا۔ "پیارے میاں! اللہ تمھارے ساتھ ہے۔ اللہ تمھیں
خوش رکھے، شاد آباد رکھے۔" وہ سسکتی ہوئی بولی۔ "تمھاری مرادیں پوری
کرے اور میرے لیے جینے مرنے کا انتظام کرے۔"
میں چمپا سے الگ ہوا تو اُس کے پہلو میں گم سم سی کھوئی کھوئی جولین
کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں ویران تھیں۔ سوتی سوتی خالی خالی سی۔ میں نے
اُسے دیکھا تو اُس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اگر میں اُس کا بازو نہ تھام لیتا تو شاید
وہ گر جاتی۔ مجھے نہ جانے کیا ہوا۔ میں نے اُسے زور سے کھینچ کے اپنے
بازوؤں میں بند کر لیا۔ جولین کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ تجمل نے مجھے
جھٹکا دیا۔ گاڑی حرکت میں آگئی تھی۔ چمپا نے ایک طرف، دوسری طرف سے
مارتی نے بھاگ کر جولین کو سنبھالا دیا۔
منّا دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔

ڈبے میں ہم چاروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ فرسٹ کلاس کا
ڈبا تھا۔ اسٹیشن سے چلتے ہی گاڑی اندھیرے میں ڈوب گئی اور
بتدریج تیز ہوتی گئی۔ ڈبے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب ایک دوسرے
سے دور نشستوں کے کونوں میں بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ دیر
تک سامان نشستوں ہی پر پڑا رہا۔ گھر سے جولین اور چمپا نے جو سامان ساتھ
کیا تھا اُس میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پیری اور اُس کے اڈّے والے کھانے پینے کی
اتنی چیزیں ساتھ لائے تھے کہ ایک مہینے کے سفر میں بھی بچ جائیں۔
جامو، کلنتے اور تجمل نے اپنے گلوں سے ہار اتار کے برتھ پر ڈال دیے
تھے۔ کچھ دیر بعد تجمل قریب آگیا اور میرے گلے میں ہاتھ ڈال کے آہستگی
سے بولا۔ "ٹھیک ہے نا؟"
"ہاں سب ٹھیک ہے۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
"تیواڑی کی ناک کا تو نے کیا کیا رے؟" وہ مسکرا کے بولا۔
"وہ میں نے گٹر میں پھینک دی تھی۔"
"بڑی ٹھیک جگہ پھینکی تو نے۔"
"اور تیواڑی کا کیا ہوا؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔
"وہ بھی کسی ایسی ہی جگہ پڑا ہو گا۔" تجمل اکتائے ہوئے لہجے میں
بولا۔ "جانے دے اب تو سو جا۔ آنکھیں صبح ہوں گی۔ کچھ کھا کے سو جا۔"
"مجھے بھوک نہیں ہے۔"
"کھالے، مجھے تو بہت لگ رہی ہے۔"
"تم کھاؤ، میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"
"اب جی سنبھال کے رکھ، کب تک بچہ گردی کرے گا۔"
میں نے گھور کے اسے دیکھا۔ "کیسی بچہ گردی؟"
"خفا ہو گیا؟" وہ ہنسنے لگا۔ "ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتا ہے۔
یہی تو بچہ گردی ہے اور کیا ہے۔ خیر سے تیری عمر کیا ہے۔ تجھ سے

کیا کم ہو گی۔"

"میں ناراض تو نہیں ہوا۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"لاڈلے!" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "اب کہیں اور مت نکل جانا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔

"میرے ساتھ ہی رہنا۔"

"تمہارے ساتھ! مگر مجھے تو۔۔!"

"ہُش! ہُش۔ بے صبری مت کر۔ بے صبری میں سارا کام خراب ہو جاتا ہے۔ تو اگر مجھے پہلے بتا دیتا تو شاید یہ بات نہ ہوتی۔"

"تم اسے بے صبری کہتے ہو؟ سات سال وہاں گزر گئے، ایک سال سے اوپر ہو گیا اور تم۔۔۔ تم کیا کر سکتے ہو؟ تم بھی میری طرح مجبور ہو۔ تم کیا کوئی جادوگر ہو۔"

"ہاں۔" وہ اداسی سے بولا۔ "میں بھی مجبور ہوں پر لاڈلے! فکری سوچ سے ذہری سوچ اچھی ہوتی ہے۔ میں تجھ سے کچھ سوچ سمجھ کے ہی بولتا ہوں۔"

"اب تو تمہیں تقریباً ساری باتیں معلوم ہیں۔ مجھے سوچ کے جواب دو کہ میں کیا کروں؟" میں نے زہرخند سے کہا۔ "تم تو مجھے کلکتے لیے جا رہے ہو لیکن میں تمہیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں، مجھے کلکتے میں نہیں رہنا ہے۔ تم وہاں جا کے اڈّے پر بیٹھو۔ جب تم اس معاملے میں کچھ کر ہی نہیں سکتے تو خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتے ہو۔ میں چلا جاؤں گا۔ کسی طرف بھی نکل جاؤں گا۔"

"میں نے تجھ سے کب بولا ہے کہ تو کلکتے میں رہنا۔ کون چاہتا ہے کہ تو اڈّے پہ بیٹھے۔ پر لاڈلے! اب تو جائے گا نہیں، میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔" وہ حکمیہ لہجے میں بولا۔ "اور اگر تو چلا گیا تو سمجھ لینا کہ میں تجھ سے کبھی بات تک نہیں کروں گا اور تو بھی کبھی میرا نام مت لینا۔"

"تو تم میرے ساتھ چلو گے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہاں ایسا ہوا تو میں تیرے ساتھ چلوں گا۔"

"کہاں تک؟" میں نے چڑ کے کہا۔ "تلووں میں چھالے پڑ جائیں گے۔"

"میرے دل میں چھالے پڑے ہوئے ہیں، تو تلووں کی بات کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "تم نے طے کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم نے تو کہنے کے لیے کوئی بات نہیں رکھی۔"

"لاڈلے! مجھے ایک بار تفصیل سے تمام باتیں بتا۔ دیکھ اب کچھ چھپانا نہیں۔ ہر بات بول دے۔" وہ اپنا بازو تنگ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر کوئی بات رہ گئی تو شاید میں کچھ فیصلہ نہ کر سکوں۔"

جاموا اور کالے تے اونگھنے لگے تھے۔ میں نے اُسے ساری باتیں ترتیب سے بتا دیں۔ گھر سے نکلنے کا سارا واقعہ، اپنا اصل نام مولوی محمد تشفیق کے ساتھ اور کلکتے کے مختلف ہوٹلوں میں قیام۔ بدھ گیا میں گرواکی تلاش میں بھٹکنے والے بھکشو کی بے تابی اور اُس کا قتل۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ وہ یہ سب کچھ سُن کے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ "کیوں؟ کیا سوچنے لگے؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"ابے! اجرات تو آٹھ سال سے سوچ رہا ہے۔ کیا مجھے اس کے لیے چند گھنٹوں کا وقت بھی نہیں دے گا؟" وہ بگڑ کے بولا۔

"گھنٹے کیا، دن لے لو، سال لے لو۔" میں نے تنک کے کہا۔ "بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ سوچنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو، کچھ نہیں ملے گا۔"

"کیسی باتیں کر رہا ہے رے!" وہ ناگواری سے بولا۔ "جب تُو اتنا مایوس ہے تو پھر خود کیوں کسی ایک جگہ نہیں ٹک جاتا۔"

"میرا کیا ہے۔ اگر میں کہیں دیر تک ٹھہر جاتا ہوں تو میرا جی گھٹنے لگتا ہے، میرے سینے میں جلن ہونے لگتی ہے۔ جب میں چلنے لگتا ہوں تو میری طبیعت ٹھہری رہتی ہے۔ میرے نصیب ہی میں یہ لکھا ہے۔ قمل بھائی! مجھے معلوم ہے، دنیا بہت بڑی ہے۔ اس بڑی دنیا میں اُسے تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ جدھر دیکھو اُدھر ہی ایک راستہ جاتا ہے مگر وہ آخر کسی جگہ تو رہتی ہو گی۔ رہتی ہو گی نا؟"

"کیوں نہیں بابو رے! شیر بیر! اُسے ڈھونڈیں گے۔ کلکتے جانا ضروری ہے۔ تھوڑے دن ٹھہر کے پھر نکل پڑیں گے۔"

"مگر کس طرف؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"سوچنے دے۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تو نے بتایا کہ وہ مولوی کلکتے کے ایک مدرسے میں پڑھاتا تھا اور مراد آباد شہر میں اس کا گھر ہے۔"

"ہاں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "مگر میں مدرسے بھی گیا اور مراد آباد بھی۔ اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ جیسا کہ میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے۔"

قمل پھر چپ ہو گیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے سفر طے کر رہی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے چونک کے مجھ سے کوئی بات پوچھتا، پھر کھو جاتا۔ سارے سفر میں اُس کا یہی حال رہا۔ جاموا اور کالے تے بیشتر وقت سوتے رہے اور میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا بھاگتی ہوئی بستیاں دیکھتا رہا۔ کبھی اسٹیشن آتا، میں اُتر جاتا۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتا

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں